100واں شمارہ

سہ ماہی

اسلام آباد

ادبیات

اکادمی ادبیات پاکستان

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

◆

پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

عجب خان

شمارے کا مصوّر

عجب خان ستمبر 1964ء میں ڈیرہ اسماعیل خان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی سکول میں حاصل کی۔ اقبال شاہد سے ڈرائنگ کی مشق سیکھتے رہے۔ آپ اردو ادب کے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہیں۔

1999ء میں ایک نمائش اپنے شہر میں اور 2000ء کو نیشنل آرٹ گیلری اسلام آباد میں کرائی۔ اٹھارہ کے قریب قومی مقابلوں میں شرکت کی اور 14 فرسٹ پرائز کے حقدار قرار پائے اور اب انٹرنیشنل مقابلوں میں بھی دو انعامات وصول کر چکے ہیں۔

نمایاں اعزازت میں تین صادقین ایوارڈ، دو علامہ اقبال ایوارڈ، ایس ایس حیدر ایوارڈ، گل جی ایوارڈ اور احمد فراز ایوارڈ سر فہرست ہیں۔

عجب خان پانچ انفرادی نمائش اور درجنوں اجتماعی نمائشیں کرا چکے ہیں۔ اِن کے آرٹ میں مٹی اور مٹی سے وابستہ خوشبوئیں کینوس پر پھیلی نظر آتی ہیں۔ ان کے پورٹریٹ علاقہ کی خوبصورتی کا مظہر اور لینڈ سکیپ چلتی پھرتی زندگی کا غماز ہوتے ہیں۔ عجب خان اسلامی خطاطی میں ایک جداگانہ اقلیدسی حیرت کدہ پینٹ کرتے ہیں۔

☆☆☆

سہ ماہی

ادبیات

شمارہ نمبر 100، جولائی تا دسمبر 2013

نگران: عبدالحمید

مدیر: محمد عاصم بٹ

معاون مدیر: اختر رضا سلیمی

اکادمی ادبیات پاکستان
پطرس بخاری روڈ، H-8/1، اسلام آباد

ضروری گزارشات

- ☆ مجلّے میں غیر مطبوعہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں جن کی اشاعت پر شکریے کے ساتھ اعزازیہ بھی اہلِ قلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔
- ☆ شاملِ اشاعت نگارشات کے نفسِ مضمون کی تمام تر ذمہ داری لکھنے والوں پر ہے۔ ان کی آراء کو اکادمی ادبیات پاکستان کی آراء نہ سمجھا جائے۔
- ☆ نگارشات اِن پیج فارمیٹ میں بذریعہ ای میل اس ایڈریس پر بھیجی جاسکتی ہیں:

adbiyaat@gmail.com

مجلسِ مشاورت: ڈاکٹر توصیف تبسم، احمد جاوید

قیمت فی شمارہ : -/100 روپے (اندرون ملک)　　40 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
سالانہ (4 شماروں کے لیے) -/400 روپے (اندرون ملک) 150 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
(رسالہ اندرون ملک بذریعہ رجسٹری اور بیرون ملک بذریعہ ہوائی ڈاک بھیجا جاتا ہے۔
ڈاک خرچ ادارہ خود ادا کرتا ہے)

قیمت موجودہ شمارہ: -/200 روپے

ترسیل: میر نواز سولنگی 051-9250578
مطبع: A Zephyr Printer, Lahore

ناشر: اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
رابطہ: 051-9250342/9235729

اداریہ

1987 میں ادبیات کا پہلا شمارہ شائع ہوا تھا۔ آج یہ بات ہم سب کے لیے بھی باعث مسرت ہوگی کہ ہم اس کے سوویں شمارے کی منزل تک آ پہنچے ہیں۔ 26 برسوں کے اس سفر میں ادبیات نے پاکستانی ادب کے فروغ کے لیے بہت سی شمعیں روشن کی ہیں 15 سے زائد خاص شماروں کے ساتھ ساتھ ادبیات کے عام شمارے بھی بر وقت منظر عام پر آتے رہے ہیں، جن میں نہ صرف اردو میں لکھی جانے والی نمائندہ تحریروں کو اس معتبر ادبی رسالے میں پیش کیا گیا اور یوں معاصر ادبی منظر نامے کو اجاگر کیا گیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ پاکستانی زبانوں میں لکھے جانے والے ادب کو بھی اردو میں ترجمہ کر کے اردو قارئین کے ذوق ادب کی پرورش کی گئی۔ اس کے ساتھ غیر ملکی زبانوں کے ادب کی نمائندہ تحریروں کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالا گیا اور یوں اردو کے قارئین کو عالمی ادبی منظر نامے سے متعارف ہونے کا موقع فراہم کیا گیا۔

ادبیات بہت افتخار کے ساتھ ان خاص شماروں کی کہکشاں کو سامنے لایا جن میں: عالمی ادب نمبر (چھ جلدیں)، سارک ادب نمبر، خواتین کا عالمی ادب نمبر، پاکستانی خواتین اہل قلم نمبر، بچوں کا ادب نمبر (تین جلدیں)، نثری نظم نمبر، امرتا پریتم نمبر، منیر نیازی نمبر، احمد ندیم قاسمی نمبر، فیض احمد فیض نمبر، احمد فراز نمبر، جوش ملیح آبادی نمبر، پرواسی ادب نمبر، پاکستانی زبانوں کے چار اہم شاعروں کے حوالے سے خصوصی شمارے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

دنیا بھر میں اردو میں شائع ہونے والے ادبی رسالوں میں ادبیات کو یہ افتخار حاصل رہا

ہے کہ اس نے بیک وقت عالمی ادب کے تراجم اور پاکستانی زبانوں میں لکھے جانے والے ادب کی نمائندہ تحریروں کے اردو ترجمے کے لیے خود کو وقف کیا تا کہ ایک طرف جہاں اردو ادب میں پاکستانی زبانوں کے ادب کی نمائندگی ہو، وہاں عالمی ادب کے متنوع اسالیب اور موضوعات کے ذائقے بھی اردو ادب میں جگہ پائیں۔

موجودہ شمارہ بھی پاکستانی اور عالمی ادبی منظر نامے کی نمائندہ تحریروں کے ساتھ حاضر ہے جس میں بیشتر نمائندہ اہل قلم کی تحریریں اور ان کے تراجم بھی شامل ہیں۔ اس کے ساتھ گذشتہ چند شماروں سے ہم نے نئے لکھنے والوں کے لیے علیحدہ گوشے متعارف کیے ہیں تا کہ پاکستانی ادب کے چمنستان میں نئے پھولوں کی افزائش کا سلسلہ بھی جاری رہے۔ امید ہے ہماری یہ کاوش آپ کے ذوق سلیم پر پوری اترے گی اور آپ آئندہ بھی ہمارے ساتھ قلمی و دیگر تعاون جاری رکھیں گے۔

عبدالحمید

فہرست

رب کعبہ مری توقیر زیادہ کرنے (عقیدت)

حمد

(پارٹ ون شروع)

غالب عرفان	ذہن وضمیر زندہ ہیں جس لاشعور سے	13

نعت

نورین طلعت عروبہ	وہ برگ زرد کو پھر سے نہال کرتا ہے	14
خورشید ربانی	ازل ، ابد کی کہانی حضورؐ جانتے ہیں	15
فیصل عرفان	ورفعنا لک ذکرک	15

مرثیہ

نصرت زیدی	وہ حرف اے قلم جسے حمد خدا کہیں	17
اختر عثمان	طمع چراغ ساز شفق رو ہے ان دنوں	22

میں کائنات سے ہم کلام ہو رہا ہوں (ناول)

حسن منظر	انسان اے انسان	29
احمد جاوید	جینی	35
آمنہ مفتی	باؤ اسرار	49

میں چپ رہوں بھی تو کیا کیا فسانہ بنتا ہے (افسانے)

الطاف فاطمہ	مسز پن ہیروز اسکول	59
رشید امجد	خواب کے پیچھے پیچھے	77
آغا گل	مس کنڈکٹ	82
علی تنہا	چہرہ اور چہرے	90
اخلاق احمد	بنجر بے رنگ زندگی والا	95
زیب اذکار حسین	اللہ دے منہ بندہ لے	110

خالد فتح محمد — اور طرح کی جنگ 114
محمد امین الدین — چار کا ٹولہ (پارٹ ون ختم) 121
عرفان عرفی — فریم سے باہر (پارٹ ٹو شروع) 125
غافر شہزاد — لمحے کی موت 133
فرخ ندیم — کچھ لکھنے سے پہلے 141
کرن شفقت — دل دریا دھڑکن دھمال!! 145
مبشر زیدی — فریبا 153
سعدیہ — ملبہ 157

سفر ہے شرط (سفرنامہ)

سلمیٰ اعوان — الیگزینڈر پشکن مالداویائی "ساشا" سے ملاقات 151
ڈاکٹر نجیبہ عارف — جگہیں، چہرے، یادیں اور خیال 178

اس سرا میں ہے دوسرا سا کچھ (نظمیں)

توصیف تبسم — آخری مکالمہ 203
عبدالرشید — ہاتھوں کی کہانی 205
محمود شام — اپنی دریافت 207
محمد اظہار الحق — خواب زار 208
نصیر احمد ناصر — محبت آخری نشانی ہے 210
تبسم کاشمیری — شہر کا نوحہ 212
صبا اکرام — کاسہ گیر 213
زاہد مسعود — خود ساختہ مشکلات کا نوحہ 214
ایوب خاور — اندھیرے کی مٹھی نہیں کھل رہی 215
آصف ہمایوں — ہجرت 215
ماہ طلعت زاہدی — آزادیٔ نسواں کے نام 217
فرخ یار — رودبار انگلستان کی کہانی 218
سعید احمد — قاصدی پھول کے خیال میں 220
بابر یعقوب — ہم دیوداسیاں ہیں 221
ارشد معراج — اشتہار گم شدگی 222
ناہید قمر — ایک دعا کا بیانیہ 223

شہزاد نیّر	کس گھاٹ لگوں	225
فاضل جمیلی	مجھے کمرہ بدلنا ہے......!	227
محسن شکیل	زلزلہ زدگان کے لیے	228
نوید صادق	میرا ذمہ نہیں	229
عبدالکریم خالد	ساعتِ خوش گماں	233
حفیظ اللہ بادل	لمس بے باک	235

روشِ سبز خورستہ کی شادابی پر (نئی آوازیں)

زاہد امروز	میں دشمن کو زخمی نہیں کر سکا	237
منیر فیاض	Lights Out	238
سید کامی شاہ	آپ بھیڑیوں سے مکالمہ نہیں کر سکتے ـ ـ ـ ـ	239
الیاس بابر اعوان	میں (پارٹ ٹو ختم)	240
نیناں عادل	جوالا مکھی (پارٹ تھری شروع)	241
صدف غوری	مسلسل چلتے رہنا ہے	242

غزل بناتا ہوں آئینہ خانہ بنتا ہے (غزلیات)

ظفر اقبال	جس کا انعام ہے تاوان سے ملتا جلتا	243
افتخار عارف	یادِ یاراں سے مہکتا ہے باغِ گلِ سرخ	244
خورشید رضوی	اے جانِ نشہ، روح مٹے تاب آ کبھی	245
امجد اسلام امجد	آنکھیں شکستِ دل کی اگر ترجماں نہ ہوں	245
پرتو روہیلہ	آگے بڑھ کر دیکھا اور پیچھے مڑ کر دیکھا	247
ناصر زیدی	چہرے پہ جبرِ یار کی یوں گرد اوڑھ لی	248
نذیر قیصر	صورتِ خاک بدل سکتے ہیں	249
سجاد بابر	قریۂ خاک میں تنہائیوں سے ٹکرائی ہو	250
احمد صغیر صدیقی	شہر کو دیوانگی اچھی لگی	251
صابر ظفر	مثالِ جلوۂ یکتائی تک رسائی نہیں	252
غلام حسین ساجد	طاقچے میں جب چراغِ اوّلیں رکھا گیا	253
عباس رضوی	سورج لمحے بھر میں خاک نہیں ہو سکتا	254
تحسین فراقی	سرفروشوں نے بھی کب سر دیا اس معرکے میں	255
نصرت صدیقی	ہو جائے اُجالا ہی اُجالا مرے آگے	255

سعید گوہر	بلا کا خوف، سناٹا، درو دیوار، خاموشی	257
عزیز اعجاز	ازل سے حسن کے معیار کی تلاش میں ہوں	258
خالد طور	مرے دماغ کو طاقت ربانی دیتا ہے	259
نسیم سحر	جس کسی سے بھی پوچھوں میں اپنا پتا	260
شاہدہ حسن	دل میں اک آگ سرِ شام جلاتی رہی میں	261
حسن عباس رضا	اک آس پہ رکھ لیتا ہے مرنے نہیں دیتا	262
طارق نعیم	مرے وجود کا اعلان ہی کہاں ہوا تھا	263
انجم خلیق	موت بنا بھی دل سے نکلے لفظ سنائی دیتے ہیں	264
نسیم عباسی	سارے چلن جدید زمانے کے اور ہیں	265
اشرف جاوید	اور ہے یہ دشت، وحشت اور ہے	266
محمد سفیان صفی	نکل آئے چراغ گوہر سے	267
شاہین عباس	ابتدا سا کچھ، انتہا سا کچھ	268
سعود عثمانی	جو دل قریب ہو پہلے نشانہ بنتا ہے	269
ڈاکٹر منیر رئیسانی	سوائے بخت سرِ آسماں نہیں کچھ بھی	270
بیرم غوری	ساعتِ رنج گراں ہے، کوئی ہے	271
افضل گوہر	مرے مزاج کا غصہ گیا نہیں مجھ سے	272
امتیاز الحق امتیاز	جتنا بھی ڈرنا تھا ڈر آیا ہوں	273
عائشہ مسعود	یہ اور بات ہم کبھی بدگماں نہیں	274
رحمان حفیظ	کسی گماں کسی امکان پر تو لکھوں گا	275
رخشندہ نوید	عکس بنتا گیا تھا پانی میں	276
نوید حیدر ہاشمی	خبر ملی تھی کہ اب میرا نام آ گیا ہے	277
میاں آفتاب احمد	آیا ہوں کہاں سے مجھے جانا ہے کہاں تک	278
طاہر شیرازی	مثالِ دشت کوئی بے شمار ہوتے ہوئے	279
شاہد ذکی	دشت جلتے ہوئے جنگل سے کہیں اچھا ہے	280
شہزاد عادل	پُر شور نالہ و آہ و فغاں یونہی نہیں تھا	281
جنید آزر	موسم کو ترس باغ کے افلاس پہ آیا	282
عنبرین صلاح الدین	خالی گونج میں ڈھل کر لوٹی ایک صدا کی سان	283
شمشیر حیدر	قریۂ شب سے نمودار مجھے ہونا ہے	284

علی یاسر	ہر گام پہ حیرت کا نیا باب کھلا ہے	285
دانیال طریر	پلٹ کر داستانوں تک پہنچنا چاہتا ہے	286
قاسم یعقوب	پھول شاخ خاک پہ آیا تو آوارہ جاتا ہے	287
ندا علی	دل بھی سنبھل ہی جائے گا کچھ درد کم تو ہو	288

روشِ سبز خورستہ کی شادابی پر (نئی آوازیں)

سرفراز زاہد	خود اپنی میزبانی میں دل لگ نہیں رہا	289
فخر شناس	شعر کے دیپ یوں جلائیے گا	290
سجاد بلوچ	دریدہ ایسے ہوئے عمر بھر سلے نہیں ہم	291
فیصل ساغر	میں گراں بار تھا اس واسطے کھایا تھا	292
حماد نیازی	دل کی گلیوں میں گونجتی آواز	293
دلاور علی آذر	یوں دیدۂ خوں بار کے منظر سے اٹھائیں	294
اخلاق احمد اعوان	غم زدہ شہر کو وہ آب و ہوا دی گئی تھی	295
تہذیب حافی	مری طرف مرا خیال کیا گیا	296
اسد اللہ اسد	پیٹھ پہ وار کیے جاتے ہو بزدل دشمن	297
سید شہناز گردیزی	دنیا نے مجھ کو زہر پلانے کی ٹھان لی	298

دُور تک کوئی مہرباں نہیں تھا (پرواسی ادب)

حمیدہ معین رضوی (برطانیہ)	کون سوچے گا	299
ڈاکٹر خالد سہیل (کینیڈا)	انکشاف	300
جمیل الرحمن (برطانیہ)	المیے کی رائیگانی	301
اقبال احمد قمر (سعودی عرب)	جو حقیقت ہے مرے وہم و گماں سے کم ہے	302
ثاقب ندیم (برطانیہ)	خیال آ گیا ترا	303
امتیاز علی گوہر (سکاٹ لینڈ)	دُور تک کوئی مہرباں نہیں تھا	304
محمد مختار علی (سعودی عرب)	خامشی میں ہیں مبتلا سب جی	305
ندیم اجمل عدیم (برطانیہ)	زخم کھاؤں، تجھے تلوار بھی میں لا کر دوں	306
ذیشان حیدر (آسٹریلیا)	عجیب خواب تھا چہرے کو دھو رہا تھا میں	307
ارشد سعید (آسٹریلیا)	خود پسندی سانحہ تھی فیصلوں کے درمیاں	308
اقبال نوید (برطانیہ)	اگرچہ پار کاغذ کی کبھی کشتی نہیں جاتی	309
حسین عابد (جرمنی)	ایک لمحہ کافی ہے	310

آتی ہیں غیب سے مضامیں

رضی عابدی خوف۔ جدید ناول کا ایک اہم عنصر 311
ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ہم ترجمہ کیسے نہ کریں 317
ڈاکٹر اقبال آفاقی تصوف: تہذیبِ اسلام کی دلآویز دنیا 325
ظفر سپل تصورِ زماں پر ایک نوٹ 344
عامر سہیل (پارٹ تھری ختم صفحہ ۳۵۵) ہزارہ میں اردو نعت کی روایت 350
ڈاکٹر عابد سیال (پارٹ فور شروع صفحہ ۳۵۶) پاکستانی اردو ادب کا معاصر منظر نامہ: چند باتیں 353

ہی وارث تخت تمنا کے (آفتاب اقبال شمیم ایک مطالعہ)

مکالمہ وحید احمد، رحمان حفیظ، ڈاکٹر صلاح الدین درویش 359
نظم کے ساتھ آفتاب اقبال شمیم 381
محبت کا آئینہ ڈاکٹر توصیف تبسم 384
لفظوں کی روشنائی وحید احمد 385
انتخاب کلام آفتاب اقبال شمیم ڈاکٹر توصیف تبسم 389

خس و خاشاک کے موسم میں سراغِ گلِ سرخ (در گزشت)

ظفر اقبال کھوئے ہوؤں کی جستجو 409

یادِ یاراں سے مہکتا ہے باغِ گلِ سرخ (یادِ رفتگاں)

اسلم کمال شفیع عقیل 419
محمد حمید شاہد چوتھا کونا دھندلا گیا اور احمد ہمیش 427

دل کی گلیوں میں گونجتی آواز (موسیقی)

عقیل عباس جعفری پٹیالہ گھرانا 433
ڈاکٹر نثار ترابی موسیقار نثار بزمی سے مکالمہ 439
انعام ندیم کلاسیکی موسیقی میں گھرانوں کا نظام 445
یاسر اقبال ہندوستانی اور ایرانی موسیقی کا امتزاج اور امیر خسرو 449

زبانِ یارِ من ترکی (تراجم)

عالمی ادب

شداما پانڈے / اسد محمد خاں شہر، شام اور ایک بوڑھا۔۔۔ میں (ہندی ادب سے) 457
تادیوش روزے وچ / اسد محمد خاں زندگی کے درمیان (پولش ادب سے) 459
منو بھنڈاری / انعام ندیم سیانی پھوپھی (ہندی ادب سے) 452
ایڈگر ایلن پو / ڈاکٹر شیخ اقبال دل بیتی (پارٹ فور ختم صفحہ ۴۷۰) (امریکی ادب سے) 457

خصوصی مطالعہ

ایلس منرو

تعارف: محمد عاصم بٹ (پارٹ فائیو شروع صفحہ ۴۷۱) 471
آوازیں ترجمہ: احمد فرہاد (کینیڈین ادب سے) 472
بجری ترجمہ: احمد فرہاد (کینیڈین ادب سے) 481

ڈورس لیسنگ

تعارف: نجم الدین احمد 493
سرنگ سری ترجمہ: نجم الدین احمد (برطانوی ادب سے) 498

خورخے لوئیس بورخیس

تعارف: محمد عاصم بٹ 509
کہانیاں (انجیل بمطابق مرقس/ظاہر/الف) ترجمہ: محمد عاصم بٹ (لاطینی امریکی ادب سے) 510

پاکستانی ادب

سندھی

خیر النساء جعفری/سعیدہ درانی قربتیں اور فاصلے 540
ادل سومرو/حیدار سولنگی مراقبہ 543
مصطفیٰ ارباب/حیدار سولنگی بہت چالاک ہو 544

پنجابی

احمد راہی/اختر رضا سلیمی جانے والے 545
افضل احسن رندھاوا/زاہد حسن عاشق ہیں کمزور دلے 545
حنیف باوا/ارشد چہال بیٹی 547
زاہد حسن/زاہد حسن بجھتے ہوئے اک چاند کی قاش 551
طارق عزیز/نوشین اختر گناہ کیا ہے ثواب کیا ہے 552

پشتو

غازی سیال/ارشد سائر کوہستانی دوشیزہ 553
صابر علی صابر/اسد اللہ اسد طلب معصوم 555

بلوچی/براہوی

غنی پرواز/غنی پرواز	چشمہ اور گلاب	557
صبا دشتیاری/مجھور بدر	سُوکھے پتوں کا سنگیت	550
یعقوب شاہ غرشین/یعقوب شاہ غرشین	سب مر گئے۔۔۔	553
افضل مراد/افضل مراد	آج میں پہاڑوں پر جاؤں گا	570
مبارک قاضی/عمران ثاقب	سایۂ دھوپ	571
محمد رفیق مغیری/غلام قادر خان بزدار	تو لاشریک و قادر و ربِ قدیم ہے	572
امرت مراد/امرت مراد	Nature Cannot be Changed	573

سرائیکی

مسرت کلانچوی/سلیم شہزاد	بند کھڑکی	575
طاہر شیرازی/خورشید ربانی	جان پہچان	579
ڈاکٹر غزالہ احمدانی/سلیم شہزاد	صدی کا سفر	580

ہندکو

سلطان سکون/نوشین اختر	مشکل بات	582
احمد حسین مجاہد/احمد حسین مجاہد	قینچی	583

پوٹھوہاری

شیراز اختر مغل/شیراز اختر مغل	بیٹی	585
شکور احسن/شکور احسن	آج اور کل	587

بلتی

علی احمد قمر/علی احمد قمر	(پارٹ فائیو ختم صفحہ ۵۸۸) اُن کے در تک تو موت ٹل جائے	588

☆☆☆☆

غالب عرفان

ذہن و ضمیر زندہ ہیں جس لاشعور سے
روشن ہے کائنات بھی اس رنگ و نور سے

آوازِ غیب میں جو سمایا ہے اس کا قول
سنتا ہوں روز و شب اُسے میں ذور دور سے

عیسیٰ میں اس کی ساری مسیحائی منعکس
موسیٰ نے اس کے نور کو پایا ہے طور سے

طائر نے اُڑنا سیکھا فرشتوں سے کس طرح
گر پوچھنا ہے پوچھیے غولِ طیور سے

مخلوق اس کی آگ میں کیسے پلی بڑھی
کھلتا ہے راز یہ بھی پرانے تنور سے

اعمال نامہ زیست کا نیکی بدی کے ساتھ
مربوط اس نے کر دیا یوم نشور سے

عرفانِ ہست و بود کا رمز آدمی کبھی
حل کیسے کر سکے بھلا فہم و شعور سے

نورین طلعت عروبہ

وہ برگِ زرد کو پھر سے نہال کرتا ہے
نبیؐ کے شہر کا موسم کمال کرتا ہے

جب اُنؐ کے در پہ پہنچنے کی بات چھڑ جائے
ہمارا شوق صبا کو مثال کرتا ہے

زمانہ سُونت کے آتا ہے اپنی تلواریں
دِل اُنؐ سے عشق کے جذبے کو ڈھال کرتا ہے

بہت ادب سے گزرنا ہے کہکشاؤں کو
سُخنی تصویرِ شہرِ جمال کرتا ہے

مثال کرتے ہیں وہ سب جنابِ مصعبؓ کو
جنہیں بھی عشقِ نبیؐ مالا مال کرتا ہے

کتابِ سیرتِ اقدس جواب دیتی ہے
جہاں شعور کوئی بھی سوال کرتا ہے

قدم قدم پہ مری آنکھ بھیگتی ہے کہ جب
یہ دل ثنائے شہِ خوش خصال کرتا ہے

خورشید ربانی

ازل ، ابد کی کہانی حضورؐ جانتے ہیں
ہر ایک سرِ زمانی حضورؐ جانتے ہیں
درود پڑھتا ہے جو بھی، جہاں بھی، جتنا بھی
ہر اک کا چہرہ ، نشانی حضورؐ جانتے ہیں
میں انؐ کی یاد میں روتا ہوں اور جانتا ہوں
کہ میری اشک فشانی حضورؐ جانتے ہیں
درِ حضورؐ پہ جا کر کھڑے رہو چپ چاپ
کہ حال چپ کی زبانی حضورؐ جانتے ہیں
کتابِ ہر دوجہاں کی گئی انھیں تعلیم
سو حرف حرف معانی حضورؐ جانتے ہیں
حضورؐ جانتے ہیں داستانِ شام و سحر
ہر ایک پل کی کہانی حضورؐ جانتے ہیں
ہرایک درد بھرے دل کو جانتے ہیں حضورؐ
اور اشکِ غم کی روانی حضورؐ جانتے ہیں
حضورؐ جانتے ہیں راز ہائے فردا بھی
اک ایک بات پرانی حضورؐ جانتے ہیں
نگاہ کیجیے خورشیدِ خستہ جاں پہ بھی
کہ بگڑی بات بنانی حضورؐ جانتے ہیں

☆☆☆☆

فیصل عرفان

ورفعنا لک ذکرک

وہ جوام الخبائث کے شیدائی ہیں
جن کو رشتوں کی پہچان کوئی نہیں
جن کے سینوں میں ایمان کوئی نہیں
جن کے لفظوں میں بھی جان کوئی نہیں
جن کے دامن میں برہان کوئی نہیں
جو حقیقت میں انسان کوئی نہیں
وہ ہمارے مقدس نبیؐ کی طرف
لاکھ انگلی اٹھاتے پھریں رات دن
ان کی حرکات سے، ان مہمات سے
میرے آقاؐ پہ کچھ حرف آنا نہیں
تذکرے عرش پر جس کے ہوتے رہیں
وہ حقیقت ہیں کوئی فسانہ نہیں

☆☆☆☆

نصرت زیدی

مرثیہ

(۱)

وہ حرف اے قلم جسے حمدِ خدا کہیں
اور لفظ وہ کہ مدحتِ خیرالورا کہیں
مضمون وہ مناقبِ آلِ عبا کہیں
انشا کا حُسن ایسا کہ صلِ علیٰ کہیں
ہوں منکشف حقیقتیں غیب و حضور کی
قرطاس پہ قلم کی تجلی ہو طور کی

(۲)

روزِ ازل کا آدم و حوّا کا ذکر ہو
ذکرِ خلیل و خانہء کعبہ کا ذکر ہو
یونسؑ کی بات ماہیِ دریا کا ذکر ہو
اِسحاقؑ اور مسجدِ اقصیٰ کا ذکر ہو
ذکرِ خلیل یوں ہو گلستاں ہو سامنے
یعقوب کا ہو ذکر تو زنداں ہو سامنے

(۳)

مریم کی بات ہو دمِ عیسیٰؑ کا تذکرہ
بات آسیہ کی ہو یدِ بیضا کا تذکرہ
کچھ ہو عصائے حضرتِ موسیٰ کا تذکرہ
اک برق اور وادیٔ سینا کا تذکرہ
اس طرح لکھ قلم کہ شجر بولنے لگیں
سر گنجلک زباں کی گرہ کھولنے لگیں

(۴)

شہر سبا کا تختِ سلیماں کا ذکر ہو
جاہ و جلال و شوکتِ شاہاں کا ذکر ہو
اس پرشکوہ قصر کا ایواں کا ذکر ہو
بلقیس اور دیدۂ حیراں کا ذکر ہو
داؤدِ خوش مقال و خوش الحان کی ہو بات
ایوب جیسے صاحبِ ایمان کی ہو بات

(۵)

کچھ بات ہاجرہ کی ہو سارہ کا تذکرہ
ہارونؑ کا شعیبؑ کا یحییٰ کا تذکرہ
الیاسؑ و خضرِ رہبرِ یکتا کا تذکرہ
یوسفؑ کا اور عشقِ زلیخا کا تذکرہ
ذکرِ زنانِ مصر بصد احتیاط ہو
کچھ ذکرِ ہودؑ و حضرت صالحؑ کی بات ہو

(۶)

بس اے قلم تمام کر اب ذکرِ انبیا
پیشِ نظر ہے سانحۂ دشتِ نینوا
اک قافلہ مدینہ سے ہے کربلا چلا
سردارِ قافلہ ہے نواسہ رسولؐ کا
افرادِ کارواں میں فقیہہ و ذکی بھی ہیں
صادق بھی ہیں امین بھی ہیں متقی بھی ہیں

(۷)

یہ کارواں ہے حق و صداقت کا کارواں
یہ کارواں ہے عدل و عدالت کا کارواں
یہ کارواں نفاذِ شریعت کا کارواں
اس کارواں کو کہیے شفاعت کا کارواں
جاں سے عزیز عظمتِ اسلام ہے اسے
تائیدِ ذوالجلال و الاکرام ہے اسے

(۸)

بچے بھی ہیں جوان بھی ہیں اور ضعیف بھی
جن کو شرف خدا سے ملا وہ شریف بھی
وہ جن پہ ناز زُہد کو ایسے عفیف بھی
ہر معرکہ میں دینِ خدا کے حلیف بھی
خود دار و حق پرست ہیں اک زیب و زین سے
وابستہ مرگ و زیست ہے جن کی حسینؓ سے

(۹)

اک نوجوان ہے علی اکبرؓ ہے جس کا نام
صورت میں ہم شبیہِ پیغمبر ہے لا کلام
سیرت میں مثلِ احمدِ مرسل شہِ انامؐ
خوش رو و خوش خصال و خوش آواز و خوش خرام
جس کی فضا قرأتِ زیبا ہے آج بھی
جس کی اذانِ صبح کا چرچا ہے آج بھی

(۱۰)

ماں اِن کی اُم لیلیٰ ہیں بیشک مگر جناب
زینب پھپھی نے پالا ہے بچپن سے تا شباب
میداں میں ہو جو ان کے مقابل کسے ہے تاب
عباس کے بھتیجے ہیں دادا ابو تراب
کم فہم ہے جو اِن کا شرف جانتا نہیں
وہ کون ہے کہ جو انہیں پہچانتا نہیں

(۱۱)

بھائی ہے اک حسینؓ کا عباسؓ باوفا
اُم البنیٰ کا لال ہے بتیس سال کا
بتلائے گا وفا کے معانی وفا ہے کیا
ساونت ہے شجاع ہے فرزندِ مرتضیٰؓ
حد سے سوا حسینؓ کا جو قدردان ہے
زینبؓ کو جس جری کی شجاعت پہ مان ہے

(۱۲)

اوصاف اس جری کے کرے کیا کوئی بیاں
ماں سے سنی ہیں طفلی میں جرات کی لوریاں
رطب اللساں ہے مدح سرائی میں اک جہاں
شیرِ خدا کا شیر ہے واللہ بے گماں
پرچم بدست جعفرِ طیارؓ کی طرح
دشتِ وفا میں حیدرِ کرارؓ کی طرح

(۱۳)

قاسم ہیں تیرہ سال کے نوخیز ہے شباب
زلفوں میں جگمگاتی جبیں رشکِ ماہتاب
وہ عارضوں کا حُسن کہ کھلتے ہوئے گلاب
رُخ پہ جلالتِ شہ مرداں ابوتراب
اک نو بہار گُل چمنِ پنجتن کے ہیں
ماں ان کی اُم فروہ ہیں بیٹے حسنؓ کے ہیں

(۱۴)

عبداللہؓ اور حضرتِ زینبؓ کے خوش خصال
اِسم گرامی عون و محمدؓ بہ اِتصال
بھیگیں جبیں مَسیں ابھی سن گیارہ سال
پیشانیوں میں تابشِ انوارِ ذوالجلال
چہروں پہ اک وقار ہے اک آن بان ہے
اس کم سِنی میں حمزہؓ و جعفرؓ کی شان ہے

☆☆☆☆

اختر عثمان

طبعِ چراغ سازِ شفق رو ہے ان دنوں

تلوار کیا تھی، برق گری تھی ہجوم پہ
یکساں تھی اس کی آنچ خصوص و عموم پہ
آفت جدا جدا تھی شقی اور شوم پہ
سیلی تھی نامیانِ رَے و شام و روم پہ
کس کی ہے ڈھال ، کس کی زرہ جانتی تھی وہ
کس کس مقام پہ ہے گرہ جانتی تھی وہ
لمسِ رسولِ پاکؐ و علیؑ اس کے ساتھ تھا
اصلِ اصولِ بت شکنی اس کے ساتھ تھا
ردّ و قبولِ حُسن و فنی اس کے ساتھ تھا
حاصل وصولِ پنجتنی اس کے ساتھ تھا
بدر و حنین کون، یہ تیور ہی اور تھے
کچھ فردِ جرم چڑھ گئے کچھ زیرِ غور تھے
یزداں مزاج عرش سے اتری ڈھلی ہوئی
دستِ خدا سے زیبِ دستِ علیؑ ہوئی
ایک ایک معرکے میں برابر چلی ہوئی
مولا علیؑ کے ہاتھ کی تھی وہ پلی ہوئی
تھی خانہ زاد ازل سے شہِ مشرقینؑ کی
بچپن سے جانتی تھی طبیعت حسینؑ کی

روحیں روانہ ہوتی تھیں اُس کے خیال سے
واقف تھی تیر و تیغ سے ، مِغفر سے، ڈھال سے
گِر گِر کے سَر اٹھاتی گروہِ رزال سے
کیا سرخرو پلٹتی تھی ہر ہر جدال سے
آخر کو پاس رکھنا تھا اِک پاک زات کا
تھا اُس کا منہ دھلا ہوا زہرؔا کے ہات کا
چل چل کے بھی وہی تھی، برابر کسی ہوئی
طوبیٰ کے تھی دوشاخے کے اوپر کسی ہوئی
پل بھر عدو کے دِل میں تھی، پل بھر کسی ہوئی
اتری تھی عرش سے وہ سراسر کسی ہوئی
کیسے بیان کیجئے اُس آن بان کو
یوں ہے کہ اُس کے لمس کی حسرت تھی سان کو
چہرے چھپائے پھرتے تھے زُودار و نامدار
کٹ کٹ کے گر رہے تھے نمودار و نامدار
کاوے میں پس گئے تھے غُلودار و نامدار
دستِ حسینؑ تھا ہی وضودار و نامدار
یکساں مکالمہ تھا اُسے خاص و عام سے
بیعت تھی وہ حسین علیہ السّلام سے
جن زمریوں کے جی تھے مرے ، یاد تھے اُسے
بدر و احد، فرار پَرے، یاد تھے اُسے
جو دِل تھے انتقام بھرے، یاد تھے اُسے
ایسی دولب تھی سب تجرے یاد تھے اُسے
اتری لہو میں تیغ و سپر کاٹتی ہوئی
ایک ایک پہ اٹھی تھی وہ لب چاٹتی ہوئی

عالی مقام، عرش نسب، منصف و خلیق
سہرے پہ تھے فریفتہ مونگے، گہر، عقیق
لب ھائے خندہ ور گہے سادہ، گہے عمیق
فرمانروائے حرب، یداللہ کی رفیق
جو منہ کو آئے جنگ میں وہ گوشت پوست تھا
اتنا معاملہ تھا مگر دوست، دوست تھا
پشتوں سے جانتی تھی وہ ہر بدشعار کو
قہر و غضب میں جانے نہ دیتی وقار کو
بے ڈھال روکتی تھی، خطاکار وار کو
رُکتی تو سجدہ کرتی تھی پروردگار کو
وہ دیں شناس اور زمانے سے آشنا
تھی جود و اِتّقا کے گھرانے سے آشنا
کیا کیجیے ثنا کہ وہ اصلاً اصیل تھی
میدان میں قضائے کمین و رزیل تھی
تیغوں میں سَربلند تھی ، گردوں مثیل تھی
گویا نبیؐ و آلِ نبی کی وکیل تھی
پڑاں سرورِ قربِ شہِ مشرقین میں
قبضہ تھا محو بوسہِ دستِ حسینؑ میں
کھولے جگر تو آپ سویدا تھی داغ میں
مصروف تھی سیاہ دلوں کے سراغ میں
ایسے ٹہل رہی تھی وہ زخموں کے باغ میں
شعلہ لپکتا پھرتا ہے جیسے چراغ میں
آہستگی میں بھی وہ مزاجاً شتاب تھی
قامت میں رشکِ سرو تھی ، بُو میں گلاب تھی

تن اس کا کٹ کے رہ گیا جس پر ذرا تنی
منہ پھیرا جس نے ہو گئی اس کے لیے غنی
سب زخم چاٹتے تھے کہ ہیرے کی تھی کنی
پوشاکِ احمریں میں دل آرا دلہن بنی
سرخی کا پھر بھی روپ میں نام و نشاں نہ تھا
سایہ تھا اور دھوپ میں نام و نشاں نہ تھا
ایسی کشیدہ سر کہ تنی کی تنی رہی
لے لے کے بھی خراج غنی کی غنی رہی
غرور تھا انی پہ اور انی کی انی رہی
دولہا بنے حسینؑ، بنی کی بنی رہی
ایسے ازل کے ساتھ کو تھامے ہوئے چلی
قبضے میں ان کے ہاتھ کو تھامے ہوئے چلی
سر شانۂ عریس پہ رکھتی تھی بار بار
سرخی حیا کی رخ سے ٹپکتی تھی بار بار
بوئے شہِ زمنؑ سے مہکتی تھی بار بار
لب وا تھے اور پھر بھی جھجکتی تھی بار بار
سرگوشیوں کی تاب نہیں تھی عروس کو
غیظ و غضب سے دیکھ رہی تھی جلوس کو
دو لب دکھائی دیتے تھے گھونگھٹ کی آڑ سے
گُل بیل سر اٹھاتی ہے جیسے دراڑ سے
جوں غنچے جھانکتے ہوئے سوسن کی باڑ سے
بیری نمود کرتی ہے جیسے پہاڑ سے
جڑ کوئی بھی ہو پھولنے پھلنے نہ دیتی تھی
اطراف میں کسی کو نکلنے نہ دیتی تھی

زاغانِ تیرہ بخت کو گویا غلیل تھی
شاخِ گُلو تک آئی تو آکاس بیل تھی
کیا اس کی چال ڈھال تھی، کیا ریل پیل تھی
سیلی تھی اَوج مَوج پہ، ایسی ڈھکیل تھی
غاصب پٹک رہے تھے سروں کو فرات پہ
پانی بہم تھا ناموروں کو فرات پہ
مینار تو کھڑا تھا مگر لاٹ اتر گئے
گھوڑوں پہ جو چڑھے تھے وہ قد کاٹھ اتر گئے
میزاں یونہی تُلی رہی اور باٹ اتر گئے
روکے تھے گھاٹ، موت کے سب گھاٹ اتر گئے
چار آئنہ کٹے تھے کہ چار آٹھ ہو گئے
درپَے جو تھے خیام کے خود ٹاٹ ہو گئے
یہ شان پرتوے کی، سما و سمک پہ تھا
گویا ابھی زمیں پہ، ابھی نُہ فلک پہ تھا
سَو جان سے ہلال نثار اس جھلک پہ تھا
صندل کا شاخچہ بھی فدا اس لچک پہ تھا
وہ تیغ تھی، تبر تھی، چھری تھی، سنان تھی
خم کھا کے استوار ہوئی جوں کمان تھی
مردُم کے عین بیچ بناتی تھی وہ جگہ
پھر کیا بھلا کہیں نظر آتی تھی وہ جگہ
کر کے اشارہ موت بتاتی تھی وُہ جگہ
اس کو فرس، فرس کو دکھاتی تھی وہ جگہ
قبضوں کو کاٹتی رہی سرکار کی طرح
تانے رہی وہ دائرہ پرکار کی طرح

خورشید کی شعاع، سِناں پہ سوار تھی
خم ہو گئی کماں کہ وہ جاں پہ سوار تھی
مقتل کے بیچ پیر و جواں پہ سوار تھی
جانے کہاں پیادہ، کہاں پہ سوار تھی
سَن سَن کا ساز موت کے آہٹ سمان تھا
دشتِ مصاف آن میں مرگھٹ سمان تھا
قبضے میں پھڑ پھڑا کے ستم کوش اُڑ گئے
کھوجے نشان ایسے کہ روپوش اُڑ گئے
مجنون اہلِ عقل ہوئے، ہوش اُڑ گئے
جنّت جنہیں نہ بھائی تھی وہ گوش اُڑ گئے
کٹ کر سروں سے دُور لَویں کانپتی رہیں
آنکھیں نکل گئی تھیں ، بھنویں کانپتی رہیں
قبل از وغا جو رستم و اہلِ تپاک تھے
مٹّی میں منہ چھپائے ہوئے اب وہ خاک تھے
لشکر کے سب نشان ہزیمت سے چاک تھے
کائی ہوئی سپاہ کے دِل ہولناک تھے
ایسے لپک رہی تھی وہ اپنی ترنگ میں
سب منتہی تمام تھے آغازِ جنگ میں
پہلو بدل بدل کے وہ ایک ایک کو پڑی
کٹ کر وہیں پہ مَر گیا اک ضرب جو پڑی
دو کو چہار ، پانچ کو دَس ، اک کو دو پڑی
ہاتھ اِس منجس کا قطع ہوا، اُس کی کھوپڑی
دل میں کبوتری سی وہ گُھٹکی، اتر گئی
چلّہ چڑھا رہا تھا کہ چُٹکی اتر گئی

ڈھالوں پہ رات چھا گئی ، سب پھول کٹ گئے
فولاد میں تھے جسم پہ ٹکڑوں میں بٹ گئے
جنگوں کے پیش رو صفِ ابر چھٹ گئے
بجلی چمکتے دیکھی تو پانی سے ہٹ گئے
عبّاسؑ یاد تھے شہِ والا صفاتؑ کو
پیاسے نے آنکھ اٹھا کے نہ دیکھا فرات کو

(طویل مرثیے سے اقتباس)

☆☆☆☆

حسن منظر

انسان اے انسان

جب کیس میں ابھی جان باقی تھی اور وہ وقت بھی ابھی دور تھا جب اس کی رحم کی درخواست ملک کے پریذیڈنٹ کے سامنے پیش کی جاتی ایک کانسٹیبل جو پابندی سے نماز پڑھتا نظر آتا تھا، اور اپنی ایمان داری کے لیے پہچانا جاتا تھا، رات کو اکثر اس کے سیل کے پاس آ بیٹھتا تھا۔ اس نے یہ بات اکثر تلمیذ سے کہی تھی ”تمہارے لیے صرف ایک آس ہے جو لگاؤ تو پوری ہوگی۔“

پہلی دفعہ تلمیذ نے بے دھیانی سے کہا تھا: ”کون سی؟“

”اللہ سے لَو، سکون مل جائے گا۔ یہ لوگ تمھیں نہیں چھوڑیں گے۔ نہ تم امپورٹینٹ ہو، نہ سیاست کے کام کے ہو، نہ قارون کے بھائی ہو کہ سب کا پیٹ سونے کے بسکٹوں سے بھر دو۔ اور تمہارا کیس تو دنیا جہان سے مختلف ہے : مرنے والے کے وارث تک سامنے نہیں آ رہے ہیں جنھیں خون کی قیمت دے سکو۔“

پہلی بار وارثوں والی بات سننے پر تلمیذ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا:

”تم خدا کو مانتے ہو؟“

”ہاں۔“

”تو مجھے پھانسی ہو جائے تو بھی یاد رکھنا میں چاہے کتنا بھی بُرا آدمی ہوں، کتنا ہی گنہگار، میں نے ساری زندگی میں کبھی نہ کسی کا خون کیا نہ خون کرنے کا ارادہ۔ بلکہ میں نے تو کبھی کسی حلال جانور تک کو ذبح نہیں کیا۔ میں بچپن سے لے کر بڑے ہونے تک بقرعید کے دن اس طرف نہیں جاتا تھا جدھر جانور ذبح کیے جاتے تھے، اس لیے کہ خون دیکھنے سے مجھے ہمیشہ سے...“

ایماندار کانسٹیبل نے کہا ”مجھے تمہاری بات کا یقین ہو گیا۔ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں۔ آج میں لوک اپ کے باہر ہوں : ان کا کہنا مانوں تو کل میں بھی بند ہوں گا۔ مجھے نہیں چھوڑتے۔“

”کون؟“ تلمیذ کے مُنہ سے نکلا۔ اور پھر فوراً ہی ”کاہے سے نہیں چھوڑتے؟“

”نوکری سے۔ سو دفعہ ریٹائر کر دیے جانے کے لیے درخواست دے چکا ہوں کہ دماغی کمزوری ہے، پاگل ہو جاتا ہوں بعض وقت۔ نیند، ہاضمہ، آنکھیں سب خراب ہو چکے ہیں۔ نہیں مانتے۔ لعنت ہے ایسی نوکری پر۔ مجھے عینی گواہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ قرآن پر ہاتھ رکھوا کر بے گناہوں کو مجرم بنواتے ہیں کہ ہاں اِسے میں نے جائے واردات پر دیکھا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اس نے قتل کیا تھا۔ پتہ نہیں کیسی مٹی کے بنے ہوئے ہیں یہ لوگ! لعنت ہے ایسی روزی پر۔ چھوڑ کر گھر بیٹھ رہوں تو ایسا پھنسوں کہ دن دیکھنا نصیب نہ ہو کہ جھوٹی گواہیاں دی تھیں — چت بھی ان کی، پٹ بھی ان کی۔ میں نوکری چھوڑ کر بھیک مانگنے کو تیار ہوں، یہ نہیں چھوڑتے۔ گواہی نہ دوں، بھاگ جاؤں بیوی بچوں کو مار دیں گے یا اغوا کرا دیں گے۔ ایسا پہلے ایک کانسٹیبل کے ساتھ کر چکے ہیں۔ بیوی کہتی ہے: ’نوکری چھوڑ دو، تمہارے لقات لگ گئے ہیں، سوتے میں اول فول بکتے ہو، بچے ڈر کر جاگ جاتے ہیں۔ اللہ رزّاق ہے۔‘ مگر یہ اللہ کو رزّاق بننے دیں، تب نا۔ وہ کہتی ہے: ’میں لوگوں کے برتن مانجھوں گی، کپڑے دھوؤں گی۔ تم گھر بیٹھ رہو۔‘ قرآن کی بے عزتی اور میں کروں! جی چاہتا ہے: دھریا یا کافر بن جاؤں تو عدالت جاتے ہوئے دل نہیں دہلے گا کہ اب۔۔۔“

برابر کے سیل سے آواز آئی: ”توبہ کر لو اور اللہ سے لو لگا لو اور کوئی راستہ نہیں ہے۔“

ایماندار کانسٹیبل کی بات کٹ گئی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

بات کاٹنے والے نے کہا: ”اگر قتل کیا ہے یا تمہارے بہتان کی وجہ سے کسی نے خودکشی کی تھی اور تمھیں سزائے موت ہوئی۔ پھر تم نے خون بہا دے کر آزادی خرید لی تو یاد رکھو مرنے کے بعد آخرت میں تم بے قصور نہیں ٹھہرائے جاؤ گے، قتل کا گناہ ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے۔ یہ نہیں کہ خدا بھی معاف کر دے۔“

بولنے والے کا لہجہ ایسا تھا کہ اس کی بدیاں لکھنے والا فرشتہ اپنے لکھے پر لکیر کھینچ کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا۔

تلمیذ نے جذبات کی مردنی دور ہوتی ہوئی محسوس کی۔ بولا: ”تم نے قتل خود کیا تھا، کسی اور سے کروایا تھا، یا تمہارے بہتان سے کسی نے خودکشی کی تھی جو یہاں پڑے ہو؟“

سعید الحسن نے کہا: ”تینوں میں سے ایک بھی نہیں۔ مجھ سے کسی نے کروایا تھا۔“

"کس نے؟"

"وہ تم نہیں سمجھو گے۔ تم روح کو نہیں مانتے تو ان باتوں کو کیا سمجھو گے۔ روح خدا خود جسم میں پھونکتا ہے، اس نے آدم کے جسم میں پھونکی تھی۔ اسی نے مریم کے رحم میں پھونکی تھی۔ روح بہت طاقتور ہوتی ہے، خدا کے بعد سب سے طاقتور۔"

"کیا مذہب کے نام پر کسی نے تم سے قتل کرایا تھا؟" سعید الحسن کے سیل کی دوسری طرف والے مجرم نے پوچھا لیکن سعید الحسن نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

تلمیذ جنگلے کے باہر ایک ہاتھ پھیلا کر دوسرے بازو پر سر رکھ کر فرش پر لیٹ گیا۔ جو دن جا چکا تھا اس کی شام جو باتیں سیل سے گھنٹہ بھر کی رہائی میں قیدیوں میں ہوئی تھیں تلمیذ کے ذہن میں آنے لگیں۔ جیسے خواب میں جو کچھ ہوا تھا اب جاگنے پر یاد آ رہا تھا:

"کچھ مجرم فیصلہ جلد چاہتے ہیں جیسے مکہ کے کفار قیامت کے جلد بپا کیے جانے پر اصرار کرتے تھے۔ یعنی محض ڈراوا ہے آئے گی نہیں۔ نہ قیامت کچھ ہے۔"

"یہاں معاملہ الٹ ہے۔ جانتے ہیں پھانسی ہوگی، اس کا ڈراوا نہیں ہے۔ تاریخ پر تاریخ پڑتی جارہی ہے۔ یہ جج نہیں ہے، وہ جج چھٹی پر ہے، وہ مرگیا۔"

"جیوری بیٹھے گی۔ آدمی کم پڑ رہے ہیں۔ جتنے ہیں متفق ہو ہوا کر چھٹی کریں، گھر والے بھی دوڑ بھاگ میں تھک چکے ہیں چاہے مُنہ سے نہ کہتے ہوں۔ وہ بھی آرام سے بیٹھیں۔"

"مردہ قبر میں آرام کرے، مقدمے سے گھر والوں کو کنگال ہوتا نہ دیکھے۔" مُمدُو نے کہا۔ یہ وہ آدمی تھا جس کی آنکھوں سے آنسو بہتے کسی نے نہیں دیکھا تھا لیکن زندگی سے بُری طرح بیزار نظر آتا تھا، ہمیشہ۔ کبھی کبھی ملنے کے لیے آنے والوں کی خبر سن کر شہادت کی انگلی اٹھا کر 'نہ' کا اشارہ کرتا تھا اور جگہ سے نہیں ہلتا تھا جیسے موت کا انتظار کر رہا ہو کہ اگر ایک لمحے کو بھی جگہ سے ہلا تو موت کا فرشتہ اگر آیا تو اُسے نہ پا کر واپس چلا جائے گا۔

رفیق نے، جس کے پرانے پیچ پرزوں کے ٹھیے[1] کو اب اس کا بوڑھا باپ سنبھال رہا تھا، دل کی گہرائی سے کہا تھا: "جتنی دیر ٹل جائے اچھا ہے۔ عبادت کر لیں۔"

---

[1] سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر دکانف

اُس شام اور اس سے پہلے کے دنوں میں تلمیذ کو کچھ ایسے مجرم بھی نظر آئے تھے جن کی گفتگو میں دو ایک پولیس والے بھی شامل رہتے تھے۔ یہ لوگ سب قیدیوں سے مختلف تھے۔ وہ اس امید میں تھے کہ دیکھیں کب نئی پارٹی کی حکومت بنتی ہے۔

انھیں قوی امید تھی جس حکومت نے انھیں قتل کے مقدمے میں پھانسا تھا ٹوٹ جائے گی۔ الیکشن ہوں یا فسادات، نئی حکومت بنے گی اور عام معافی دی جائے گی۔ جس طرح شہنشاہ دیا کرتے تھے۔ اپنے یا ملکہ کے صحت یاب ہونے پر، یا عید کا چاند نظر آنے پر۔ اس دور کے سیاسی لیڈر جب ان کے اختیار میں حکومت ہو اُن شہنشاہوں سے کم نہیں ہوتے ہیں۔ اِن کے بھی دربار لگتے ہیں جن میں پرجا کی شکایات کی درخواستیں لیتے ہیں اور دربار ختم ہونے پر انھیں سیکریٹری کے حوالے کر کے ہاتھی پر بیٹھ کر نہیں، لمبی لموزین میں بیٹھ کر عوام کو ہاتھ ہلاتے ہوئے وہاں سے چلے جاتے ہیں۔

جس وقت تلمیذ نیند میں ڈوبتا جا رہا تھا اُسے اپنی آواز سنائی دی، جیسے دور سے آ رہی ہو:

”یہ بھی شہنشاہوں سے کیا کم ہیں۔ حکومت ان کی آنے والی پشتوں میں چلتی ہے۔“

آنے والے جمعے کی نماز کے لیے جب مجرم مسجد لے جائے جا رہے تھے، کانسٹیبل ذاکر نے اس کے سیل کے پاس آ کر کہا: ”چلو نماز پڑھ لو۔“

تلمیذ نے کہا: ”یہ دھوکا ہے جو میں خود کو نہیں دینا چاہتا۔ جسے زندگی بھر نہیں مانا اُسے اب کیا مانوں — مایوسی کے دن آ جانے پر؟ میں کوئی سمندر میں پھنسا ہوا فرعون ہوں کہ ڈوبنے لگوں تو موسیٰ کے رب کو پکاروں کہ میں ایمان لایا، مجھے بچا۔ جیسے ابھی موسیٰ اور اس کے آدمیوں کو بچایا ہے۔“

”یہ واقعہ کب پڑھا تھا؟“

”پڑھا نہیں تھا، میری ماں بچپن میں قرآن کے قصے سُنایا کرتی تھیں۔“

”تندرست ہیں؟“

”اللہ کو پیاری ہوئیں۔“

اس شام دین دار کانسٹیبل، جسے تلمیذ اس کی داڑھی اور ماتھے پر سجدے کے نشان کی وجہ سے مولوی ذاکر کہنے لگا تھا، جب ڈیوٹی ختم ہوئی تھکا ہارا خاص طور سے اس کے سیل کے پاس آیا اور بولا: ”گھر سے مشکوٰۃ شریف منگوا لو۔ وہ پڑھا کرو پھر اپنا فرعون سے مقابلہ کرنا چھوڑ دو گے۔ تمھیں پتہ چلے گا پچھتانے اور

توبہ کرنے والے کے لیے اللہ نے کیا انعام رکھے ہیں۔ اُسے غلطی اور گناہ پر شرمندہ ہونے والے بندے بہت پسند ہیں۔‘‘

تلمیذ نے کہا: ’’گھر والے مجھے بھول گئے ہیں۔ ہیں ہی نہیں۔ آتے دیکھا ہے تم نے کسی کو؟ اور میں نے کب کہا میں فرعون ہوں۔ کب میں نے اپنے دشمنوں کے بیٹوں کو پیدا ہوتے ہی مروایا! میری بھی آن ہے۔ فرعون سے تو بہتر آدمی ہوں — ذاکر بھائی۔‘‘

اگلے دن دین دار کانسٹیبل نے اُسے مشکوٰۃ شریف لا کر دی۔ پہلی جلد۔

کچھ دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا، پہلی جلد، دوسری جلد، تیسری، چوتھی اور تلمیذ بغیر پڑھے دو، دو، تین تین دن کے وقفے سے لوٹاتا رہا کہ پڑھ لی۔

اُن دنوں طویل وقفے کے بعد جب خیالات نے پھر سے آنا شروع کیا تھا وہ خود سے متفق تھا نماز، روزہ، زکوٰۃ سب مرنے کے بعد کی زندگی کے لیے ہیں۔ اِس زندگی میں کام نہیں آتے ہیں۔

(پرانے تلمیذ نے ہنس کر کہا: ’یا لوگوں پر اپنے تقدس اور تقویٰ کا اثر بٹھانے کے لیے۔‘)

فوراً ہی اُسے خیال آیا یہ کیا میں سپاہی مولوی ذاکر کے لیے کہہ رہا ہوں؟ وہ مجھ پر کیوں اپنا اثر بٹھانے لگا: نیک آدمی ہے۔ دُکھا ہوا دل رکھتا ہے۔ بھانپ گیا ایسا آدمی ہوں جو سب کچھ لٹا کر پھانسی گھر میں آیا ہے، مذہب کو بھی ساتھ نہیں لایا کہ وہ سکون دے۔

’پھر کیا اپنے باپ کے لیے کہہ رہا ہوں۔ جو مجھے اپنی ماں کی موت کی وجہ سمجھتے تھے؟ نہیں یہ خیال ان کی ذات سے نہیں اُبھرا ہے۔ وہ نہ پابندی سے نماز پڑھتے تھے، نہ پورے روزے رکھتے تھے۔ پھر؟ تایا حضرت عزیز الرحمٰن علیہ رحمتہ کے لیے؟ خاندان والے انہیں پہنچا ہوا بزرگ سمجھتے تھے۔ خط لکھ کر پوچھتے تھے بینک میں روپیہ رکھنا جائز ہے؟ محلے کا قصائی سُنا ہے شراب پیتا ہے کیا اس کی دکان سے گوشت لیا جاسکتا ہے؟ دوسرے قصائی دور ہیں۔‘

’نہیں وہ لاکھ مجھ سے رکھائی سے پیش آتے ہوں لیکن میرے دل میں ان کے لیے ہمیشہ محبت رہی۔ تسنیم کے باپ تھے۔ اب بھی اگر ان کا فوٹو کہیں سامنے آ جائے جو انہوں نے ساری زندگی کھنچوایا ہی نہیں، حج کے پاسپورٹ کے لیے بھی نہیں، تو اس میں مجھے تسنیم کی آنکھیں نظر آ جائیں۔ باقی وہ اپنی ماں پر پڑی تھی۔‘

صرف دو ہستیاں ایسی تھیں جو اس کے تقدس اور تقویٰ کے تصور پر پوری اترتی تھیں — جلانے کی لکڑی کی طرح خشک بڑے بہنوئی اور ان کے بڑے بھائی حافظ مفتی صاحب۔ دونوں زندگی کی ڈگر پر ساری زندگی اس طرح اپنا بیلنس ٹھیک کر کر کے چلتے رہے جیسے ایک بال جیسی باریک رسی پر چل رہے ہوں جس کے نیچے دونوں طرف جہنم کی آگ دہک رہی تھی اور شاید نیک نیتی کی بنا پر چاہتے تھے دوسرے جنہیں وہ رسی اور جہنم کے شعلے نہ بھی نظر آتے ہوں ان ہی کی طرح چلیں۔

پہلی بار جیل میں خود کو پانے سے پہلے ہمیشہ یہی اس کا ایمان رہا تھا زندگی مختصر ہے، اسے کیوں عبادت میں ضائع کیا جائے۔ جیل میں آکر خیالات نے ایک نیا رخ اختیار کیا اور وہ وہی کرنے لگا جو مایوسی کا شکار قیدی کرتے تھے۔ وہاں سے نکل کر کچھ ہی دن بعد نماز اسے دوبھر لگنے لگی۔ اس کا دماغ اس نتیجے پر پہنچ کر ٹھیر گیا: ’جب تھک کر بیٹھ رہیں گے دن رات عبادت کیا کریں گے۔‘

اگر اس سے کہا جاتا: تم مذہب کو چھوڑ بیٹھے ہو۔ سوچ کر بتاؤ اس کا کیا تمھیں پسند نہیں آیا؟ تو وہ بات کو سمجھ کر کہتا: حقیقت میں میں مذہب کے بارے میں بہت کم جانتا تھا، لیکن مذہبی لوگوں کے بارے میں بہت کچھ۔ اب سمجھ میں آتا ہے جتنا جانتا تھا، غیر ضروری تھا اور اس کو بھی اس طرح چھوڑ بیٹھا جیسے کوئی بغیر کسی وجہ کے چائے میں دودھ ڈالنا بند کر دے اور کہے مجھے چائے اسی طرح پسند ہے۔

☆☆☆☆

احمد جاوید

جینی

(کارل مارکس اور جینی کی مشترکہ حیات)

لڈوگ صاحب کو جب اپنے تبادلے کے احکامات موصول ہوئے تو انہیں کوئی حیرت نہ ہوئی۔ یہ تو ہونا تھا۔ وہ علاقے کے لیے کوئی زیادہ سودمند آدمی نہیں تھے۔

یہ انیسویں صدی کا دوسرا عشرہ تھا۔ جرمنی پر شاہی حکومت مسلط تھی۔ صنعتوں کے آ جانے اور نپولین کے حملوں نے پورے یورپ میں اقتصادی نظام کو بگاڑ رکھا تھا۔ اسی لیے چاروں طرف بے چینی تھی اور شورشیں سر اٹھا رہی تھیں۔ حکومت کو صرف ایسی نوکرشاہی کی ضرورت تھی جو عوام کو سر نہ اُٹھانے دے۔ لڈوگ صاحب بادشاہ کی پریوی کونسل میں شامل تھے ان سے بھی یہی توقع تھی مگر وہ اپنی غریب پروری اور نرم مزاجی کے باعث بہت کم سرگرمی دکھاتے جو کسی صورت قابل قبول نہ تھی۔ ممکن تھا کہ انہیں معزول کر دیا جاتا۔۔۔ مگر وہ ایک عام اعلیٰ سرکاری اہل کار نہ تھے۔ اشرافیہ میں ان کے خاندان کو بڑا مرتبہ حاصل تھا۔ انکی والدہ مرحومہ وشارٹ سکاٹ لینڈ کے شاہی خانوادے آرگل سے تعلق رکھتی تھیں جبکہ والد نے یورپ کی گذشتہ جنگوں میں شاہی حکومت کے مشیر خاص کے طور پر بڑے کارنامے سرانجام دیئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ معزول تو انہیں کسی نے نہ کیا البتہ ایک شہر سے دوسرے میں بھیج دیا گیا۔

لڈوگ کو اس پہ اعتراض تھا نہ پریشانی بلکہ ایک حد تک اطمینان تھا۔ وہ علم و ادب کے رسیا تھے اور فراغت کے پل اپنی سٹڈی میں گذارتے تھے۔ مگر یہاں کام کا دباؤ اس قدر تھا اور حاسدوں کی مخالفت بھی شدید تھی کہ انہیں مطالعے کا بہت کم وقت ملتا۔ اس تبادلے پر وہ سوچتے تھے کہ شاید نئی جگہ ان کے مشاغل کے لیے موزوں ہو۔۔۔ اور یہ بھی امکان تھا کہ کام کا دباؤ بھی نسبتاً کم ہو۔

لڈوگ صاحب کا تبادلہ سالویڈل Salvedl سے ٹرائر Trier ہوا۔ یہ دونوں شہر فرانس کی سرحد

پر واقع تھے اور فاصلہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ بس انہیں اک ذرا اپنی ننھی بیٹی جینی کی طرف سے فکرمندی ضروری تھی اُسے بھرا پرا گھر چھوڑ کے جانا تھا۔ معلوم نہیں نئی جگہ اُس کا دل لگے گا بھی یا نہیں۔

جینی والدین کی اکلوتی اولاد نہیں تھی مگر باپ کو ہی عزیز تھی۔ وہ اس کو دیکھ کر جیتا تھا اور اسی کا دم بھرتا تھا۔ اپنے مرتبے اور طبقاتی کردار کے خلاف وہ اسے کم سنی میں بھی کاندھے سے لگا کر گھمایا کرتے۔ گود میں بٹھایا کرتے۔۔۔ اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ابھی ناسمجھ ہے اُس سے ہر طرح کی باتیں کرتے اور رنگ رنگ کی کہانیاں سناتے۔۔۔ اس کا سبب جانے کیا تھا۔ شاید یہ ہو کہ وہ شکل وصورت اور روپ سروپ میں اپنی دادی کے مشابہہ تھی۔ وہی نرم وملائم جلد وہی خوبصورت نقش، وہی آنکھیں وہی بال۔۔۔ اور پھر جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی وہی شاہانہ شائستگی اور نرمی وحلاوت۔۔۔

لڈوگ نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی مرحومہ بیوی سے چار بچے تھے جبکہ موجودہ بیوی کیرولین سے بھی جینی کے علاوہ ایک چھوٹا بیٹا ایڈورڈ بھی تھا لیکن ان کا دھیان تو جینی کی طرف ہی رہتا۔ وہ بلاوجہ فکرمند نہیں تھے۔ سالویڈل میں رونق بھرا گھر تھا جہاں والدین کے علاوہ اسے سوتیلے بہن بھائیوں کا پیار بھی حاصل تھا۔ جنہیں اب پیچھے رہ جانا تھا اپنے عزیزوں کے پاس تاکہ ان کی تعلیم کا حرج نہ ہو مگر کیرولین کہتی اس میں فکرمندی کی کیا بات ہے ابھی بچی ہے نئے ہم جولی ملیں گے بہل جائے گی۔۔۔

ٹرائر میں بھی وہ سب کچھ تھا جو سالویڈل میں تھا۔ ایک بڑا گھر اور گھر کی دیکھ بھال کے لیے ملازمین۔۔۔ اور پھر وہ ہر طرح کی چہل پہل جو بڑے گھروں کی شناخت ہوتی ہے۔۔۔ البتہ جیسا کہ خدشہ تھا جینی کو بہت دیر تک کوئی ایسا ہم جولی میسر نہ آیا جو ہم مزاج بھی ہو۔

ٹرائر ایک چھوٹا سا شہر تھا مگر تفریح کی کوئی کمی نہ تھی۔ تھیٹر، اوپرا ہاؤس، سماجی سرگرمیوں کے کلب اس پر مستزاد اشرافیہ کا اپنا اسلوب حیات جو رونق کا دلدادہ۔۔۔ کسی نہ کسی گھر میں کوئی محفل، کوئی تقریب ہر شام کا معمول تھا مگر معلوم نہیں کیوں لڈوگ کو جینی کے چہرے پر وہ شادمانی دکھائی نہ دیتی تھی جو اس نے سالویڈل میں دیکھی تھی۔ پھر ایک روز ایک تقریب میں اس کی ملاقات شہر کے ایک معروف وکیل ہنرک مارکس سے ہوئی اور اس نے سکھ کا سانس لیا۔

ہنرک اگرچہ پیشے کے اعتبار سے وکیل تھا مگر اسے بھی لڈوگ کی طرح علم وادب سے گہری دلچسپی تھی۔ لڈوگ اگر انگریزی اور یونانی ادب کا دلدادہ تھا تو ہنرک کو فرانسیسی ادب سے عشق تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے میں ایسے محو ہوئے کہ گھنٹوں گذر گئے۔ جب رخصت کی گھڑی آئی تو

الوداعی مصافحہ کرتے لڈوگ نے ہنرک سے پوچھا۔۔۔

"ہنرک صاحب یہ بتایئے۔۔۔ کیا آپ کی کوئی بیٹی بھی ہے۔۔۔؟"

"جی ہاں۔۔۔!" ہنرک پہلے تو اس بے محل سوال پر حیران ہوا اور پھر اسی حیرت سے جواب دیا۔

"کیا عمر ہوگی اس کی۔۔۔؟"

"بڑی بیٹی کی عمر تو کوئی چار پانچ برس ہوگی۔۔۔" ہنرک نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"میری بھی ہے۔۔۔ اور اسی عمر میں ہے۔۔۔" لڈوگ نے مسکرا کر کہا۔ ہنرک اور بھی حیران ہوا مگر وضعداری سے کہا۔

"اچھا!۔۔۔ تو پھر کسی وقت بچوں کو ہمارے گھر لایئے نا۔۔۔!"

لڈوگ نے اس جواب کو غنیمت جانا اور اگلے روز ہی اپنے کنبے کے ہمراہ اس کے گھر جا پہنچا۔ ہنرک کی بیٹی صوفیا اگرچہ جینی سے ایک برس چھوٹی تھی مگر دونوں میں دیکھتے ہی دیکھتے یارانہ ہوگیا۔ لڈوگ نے بہت عرصے بعد اپنی بیٹی کے چہرے پر شادمانی دیکھی تو نہال ہوگیا۔ ہنرک کا گھر زیادہ دور نہیں تھا، جینی سارا دن جب تک کہ لڈوگ اپنے دفتر میں مصروف رہتا وہ صوفیہ کے ساتھ اس کے گھر میں کھیلتی رہتی۔۔۔ یا پھر وہ آنکلتی۔۔۔ جب ہم جولی ملنے کا مسئلہ حل ہوا تو اب اس کی تعلیم کی فکر لاحق ہوئی۔

شہر میں دو ایک اچھے سکول تھے ان میں سے ایک میں اس کی تعلیم کا بندوبست بھی کیا گیا مگر مشکل یہ تھی کہ یہ زمانہ لڑکیوں کی بہتر تعلیم کا نہیں تھا۔ اگر وہ سکولوں میں بھیجی بھی جاتیں تو مقصد انہیں ایک نام نہاد عمدہ خاتون بنانا ہوتا تھا۔ ایسی خاتون جو گھر گرہستی کو سنبھال سکے اور جس کی شخصیت سے اس کے خاندانی مرتبے کا اظہار ہو سکے مگر لڈوگ تو جینی کے لیے تعلیم کا ایک اور ہی تصور رکھتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی پیاری بیٹی دنیا کو اسی طرح دیکھے جس طرح وہ دیکھتا ہے۔ وہ اسے اپنا مطالعہ اپنا ذہن اور اپنی شخصیت تفویض کر دینا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے زیادہ دیر سکول نہیں بھیجا گیا بس والد کی لائبریری ہی اس کا سکول تھا۔ جہاں لڈوگ اس سے دنیا بھر کے موضوعات پہ گفتگو کرتا، ادب، تھیٹر، مذہب، سیاست، ثقافت۔۔۔ غرض کوئی ایسی بات نہ تھی جو اس سے پوشیدہ رہ گئی ہو۔ وہ بھی ایسی ذہین تھی کہ جوں جوں وقت گذرتا گیا وہ اس قابل ہوتی گئی کہ دنیا بھر کے مسائل پر سوال اٹھا سکے اور بحث میں الجھ سکے۔۔۔

لڈوگ کی سٹڈی میں وہ اکیلی نہیں تھی صوفیہ بھی کبھی کبھار آ بیٹھتی۔ پھر اس کی دوسری بہنیں بھی آنے لگیں۔ اور بھائی کارل بھی۔۔۔ مگر ہر ایک کا ذوق تو ایک جیسا نہیں ہوتا۔ عمر بڑھنے لگی تو صوفیا اور اس کی

بہنوں نے بیزار کن علمی مشغلہ ترک کیا اور دوسرے کاموں میں مشغول ہو گئیں۔ سوائے ان کے بھائی کارل کے۔

کارل اس وقت اپنی ماں کی گود میں ہمک رہا تھا جب وہ پہلی مرتبہ اپنے والدین کے ہمراہ صوفیہ کے گھر گئی تھی۔ وہ پانچویں سال میں تھی اور وہ محض ایک برس کا تھا مگر قدرت کے ساتھ ساتھ عمروں کا یہ تفاوت نظر انداز ہونے لگ گیا۔ وہ جینی کے بھائی ایڈورڈ کا ہم عمر تھا۔ قدرتی طور پر اس کی دوستی ایڈورڈ سے ہوئی مگر پھر کسی وجہ سے اسے لڈوگ صاحب کی محبت اور سٹڈی بھانے لگے۔ بہنیں تو اس کی اس سٹڈی سے الگ ہوئیں مگر وہ تو جیسے پیدا ہی اسی جگہ کے لیے ہوا تھا۔ لڈوگ صاحب خوش تھے کہ جینی کو صوفیہ جیسی ہم عمر نہ سہی کارل جیسا کم عمر ہی سہی کوئی ہم مکتب تو میسر آیا جو اس کے ہمراہ لہک لہک کر نظمیں پڑھ سکتا تھا، ڈرامے ازبر کر سکتا تھا اور علمی باتوں پر مباحثہ کر سکتا تھا۔۔۔ سہ پہر ہوئی تو وہ آنکلتا اور لائبریری میں داخل ہوتے ہی جینی کے ساتھ جڑ کر بیٹھ رہتا۔۔۔ اس طرح آنا اور اس طرح جینی کے ساتھ ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ رہنے میں عجیب کشش تھی۔۔۔ اور کشش تھی لڈوگ صاحب کی باتوں میں۔۔۔ اس نے کسی روز ناغہ نہیں کیا۔۔۔ اور نہ کبھی تاخیر سے پہنچا۔

وہ تینوں دیر تک پہلے لائبریری میں بیٹھتے۔۔۔ پھر شام کی سیر کے لیے نکلتے۔۔۔ لڈوگ کے ایک طرف جینی ہوتی اور دوسری طرف کارل۔۔۔ اور روزانہ کی علمی نوک جھونک۔۔۔ ازبر کیے ہوئے اشعار اور مکالموں کو سنانے میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی لگن۔۔۔ لڈوگ صاحب جینی کو دیکھتے اور خوشی سے پھولے نہ سماتے کہ وہ بالآخر ویسی ہو گئی تھی جیسی وہ چاہتے تھے۔ وہ سوچ سکتی تھی۔۔۔ بول سکتی تھی۔۔۔ مقابلہ کر سکتی تھی۔۔۔ یہ اور بات کہ آخر آخر خود ہار جاتی اپنے ہم مکتب کارل کو ہارنے نہ دیتی اور اسی پر لڈوگ کو تشویش تھی۔

یورپ میں جو طوفان اُمڈ رہے تھے انہوں نے فرانس کو اپنا مرکز بنا رکھا تھا۔ اندیشہ یہ تھا کہ جب یہ طوفان جرمنی میں داخل ہوں گے تو وہ ٹرائر ہی کے راستے سے ہوں گے جہاں لڈوگ صاحب منتظم تھے۔ یہ 1830ء کا سال تھا جب فرانس میں احتجاج کرتے مزدوروں پر پولیس اور فوج ٹوٹ پڑی اور لاشوں کے انبار لگا دیئے۔ لڈوگ صاحب کی گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ شام کی گفتگو شعر و ادب اور ڈرامے کے لیے مخصوص تھی۔۔۔ مگر وہ جینی کو سیاست سے بھی باخبر رکھنا چاہتے تھے لہٰذا حالات حاضرہ پر بھی گاہے بگاہے تبصرہ جاری رہتا۔ حالاں کہ سیاست اس کے طبقے میں شجر ممنوعہ تھی اس پر احتیاط سے گفتگو کرنا ہی لازم تھا کم از کم عورتوں

کے سامنے اس کا تذکرہ ان کی طبع نازک کے لیے گراں سمجھا جاتا تھا۔ اگر محفل میں سیاست زیرِ بحث ہوتی اور کوئی عورت آ نکلتی تو موضوع بدل جاتا۔۔۔ مگر لڈوگ صاحب تو ان دونوں کے آگے ہر خبر اور ہر واقعے کو زیرِ بحث لاتے۔۔۔ اور ان دنوں تو ان کا ذہن یورپ اور بالخصوص فرانس کی صورت حال ہی سے جڑا ہوا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جینی کو آنے والے دور کی مکمل آگاہی حاصل ہو۔۔۔ اس لیے کہ زمانہ بدل رہا تھا۔

”ہم ایک ایسے دور میں زندگی گذار رہے ہیں جب دو متحارب نظریات کے درمیان تصادم پیدا ہو گیا ہے۔۔۔ عوام کو اپنی حکمرانی چاہیے اور خواص کو اپنی۔۔۔“ یہ بھی ایک ایسی ہی شام تھی اور رہی ان دنوں کا موضوع۔۔۔

”۔۔۔ مگر یہ تصادم کیسے ختم ہو سکتا ہے۔۔۔؟“ کارل نے پوچھا۔

”غربت ختم کر کے۔۔۔ کیوں نہ پاپا۔۔۔“ جینی نے جواب دیا اور لڈوگ صاحب نے اسے تحسین سے دیکھا۔

”۔۔۔ مگر غربت کیسے ختم ہوگی۔۔۔ ہمارے علاقے میں بھی بہت غربت ہے۔ انگور کے کسانوں کی حالت تو بہت خراب ہے۔۔۔ کارل کا استفسار تھا۔ ٹرائر کا گردونواح انگور کی کاشت کے لیے مشہور تھا مگر کسانوں کی حالت بہت خراب تھی۔ ہر وقت خدشہ تھا کہ کہیں انتظامیہ سے تصادم نہ ہو جائے۔۔۔ کارل اور جینی اس سے بے خبر نہ تھے۔

”میں نے حکومت کو لکھا تھا کہ غربت بڑھ رہی ہے مگر انہوں نے میرے خط کا اُلٹا ہی مطلب لیا اور اسے میری غریب نوازی سمجھ کر میرے بارے میں پہلے سے بھی زیادہ مشکوک ہو گئے۔۔۔“ لڈوگ صاحب یہ کہہ کر ذرا سا ہنسے۔

”۔۔۔ تو حکومت نے آپ کو کوئی جواب نہیں دیا۔۔۔“

”نہیں جواب تو دیا۔۔۔ مگر اُلٹا مجھ سے ہی پوچھ لیا کہ اس غربت کا کیا حل ہے۔۔۔؟“

”۔۔۔ اور آپ نے کیا کہا۔۔۔“

لڈوگ صاحب سوچ میں پڑ گئے۔۔۔ بولے ”میرے لیے کوئی درست جواب دینا مشکل تھا بس یہی لکھا کہ غریبوں کے لیے کوئی خیراتی فنڈ مقرر کر دیا جائے۔۔۔“

”غربت کی وجہ آپ نے بیان نہیں کی پاپا“ ۔ جینی نے سوال کیا۔ مگر اس سے پہلے کہ لڈوگ کوئی جواب دیتا کارل نے تُرت کہا ”میرا خیال ہے کہ ہمارے علاقے میں کسانوں کی غربت کے ذمہ دار

،زمیندار اور تاجر ہیں۔۔۔'' لڈوگ صاحب ایک جھٹکے سے رک گئے اور حیرت سے اس لڑکے کو دیکھنے لگے جو ابھی محض بارہ برس کا تھا۔ اور پھر یہ بھی سوچا کہ کاش یہ بات جینی نے کہی ہوتی۔ سوچا تو جینی نے بھی یہی تھا مگر کارل کو اس کی چستی کام آئی۔ جینی نے کہا ''بات درست ہے۔۔۔ کارل ٹھیک کہتا ہے۔۔۔ میرے ذہن میں بھی یہی بات تھی۔۔۔''

کارل نے لڈوگ صاحب کو ہمیشہ حیران کیا وہ اس کم عمری میں بھی بلا کی ذہانت رکھتا تھا۔۔۔ مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ جینی اسے حیران کرنے کی صلاحیت نہ رکھتی ہو۔۔۔ دونوں کا مطالعہ ایک تھا۔ سوچ ایک تھی۔ اور ایک سا انداز تھا۔۔۔ مگر لڈوگ کو اک ذرا حسد لاحق تھا۔ معلوم نہیں وہ یہ کیوں چاہتا تھا کہ اسے ہی نہیں دنیا کو بھی صرف جینی حیران کرے۔۔۔ کبھی کبھی نہیں۔۔۔ ہمیشہ۔۔۔ وہ اسے بہت بلندی پر بہت ہی مختلف دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر وہ یہ بھول بیٹھے تھے کہ وہ مردوں کی دنیا تھی۔ جینی اب ایک نوجوان لڑکی تھی اور یہ انیسویں صدی کا یورپ تھا۔ آگے راستے بند تھے۔

لڈوگ نہیں جانتا تھا کہ آگے راستے بند ہیں مگر کیرولین تو جانتی تھی کہ جینی اب بچی نہیں رہی یہ اس کا سولہواں برس تھا۔ اسے اپنی بیٹی کے لیے لڈوگ کی سٹڈی اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ کہتی تھی ایک کم عمر لڑکے کے ساتھ شام کی سیر کا کچھ مطلب نہیں۔ اب اسے اپنے کسی ہم عمر بنانے کی ضرورت ہے۔

یہ وہ دن تھے کہ اشرافیہ میں نوجوان لڑکیوں کا محفلوں میں تنہا شریک ہونا کچھ عجیب سی بات تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ لڑکیاں شادی تک والدین کی نگرانی میں رہتی تھیں مگر یہ بھی ضروری تھا کہ رقص کی شام وہ تنہا نہ ہوں۔۔۔ کوئی ہمراہ ہو۔

جینی کی ماں بس ویسی ہی تھی جیسی ان دنوں بڑے گھر کی بیگمات ہوا کرتی تھیں۔ ایک ہنگامہ ہر وقت اسے بھی درکار تھا۔ وہ سکون کا ایک پل نہیں گذار سکتی تھی۔ کوئی دن ایسا نہیں تھا جب اس کے گھر کسی پارٹی کا اہتمام نہ ہو۔ کھانا بھی ہوتا اور پینا بھی۔۔۔ شاعر بھی آتے اور اداکار بھی۔۔۔ اور اگر گھر پر ایسا نہ ہوتا تو پھر فرصت کی کوئی ایسی شام نہ تھی جب کسی بنگلے پر یا کسی کلب میں رقص و موسیقی کا ہنگامہ بپا ہوا اور اس کی بگھی اس دروازے پر جا کر نہ رکی ہو۔۔۔

بڑے گھروں کی عورتوں کا اس کے سوا اور کوئی مصرف بھی نہ تھا کہ بھاری بھر کم لباس میں ملبوس اپنے کروفر کے ہمراہ دوسروں پر بازی لے جانے کی فکروں میں غلطاں رہتیں۔ کیرولین کو تو اپنے شوہر کے باعث اشرافیہ میں مرتبہ بھی حاصل تھا اور ہر طرح کی سہولت بھی۔۔۔ سو سب اس کے گرویدہ تھے۔ اس کا ہر

محفل میں ہونا لازم تھا۔ اور وہ ہمیشہ چاہتی کہ جہاں وہ جاتی جینی بھی اس کے ہمراہ ہوتی۔

لڑکیاں اپنی ماؤں کی تربیت کی شناخت ہوتی ہیں۔ جینی کے ساتھ کاملاً تو ایسا نہیں تھا مگر جیسا بھی تھا وہ اپنی ماں کے لیے عزت و شہرت کا باعث تھی۔ لڑکی جو آداب محفل سے بھی آگاہ ہو، رقص میں بھی تاک ہو۔۔۔ اور ایسی کشش بھی رکھتی ہو کہ مرد کسی بھی عمر میں بھی ہو اس کے لیے دروازہ کھولے، راستہ دے اور اپنی نشست پیش کرے۔ یورپ کے طبقہ امراء میں بس اور کیا درکار تھا۔

عیش و عشرت میں پلی جینی کو ظاہری حسن و جمال ہی کافی تھا مگر قدرت نے اور کیا تھا جو سے عطا نہیں کیا۔ اس نے آنکھ کھولی تو عیش و آرام دیکھا۔ ہاتھ باندھے خدام دیکھے، سفر کے لیے گھوڑے اور بگھیاں دیکھیں اور آرام کو نرم گدیلے۔۔۔ وہ ابھی کم سن تھی جب ماں نے خاص اس کی دلجوئی کے لیے اسی کی عمر کی ایک ملازمہ ہیلن بھی اسے دان کر دی۔ جب چاہتی آواز دے کر بلاتی۔ جو چاہتی حاضر ہوتا۔

جینی نے اگر ماں سے پیانو بجانا اور رقص کرنا سیکھا تو والد سے دنیا بھر کی تعلیم حاصل کی، تاریخ کا مطالعہ کیا۔ دنیا کس خلجان میں مبتلا ہے اس سے آگاہی حاصل کی۔ شیکسپیئر کے ڈرامے اور ہومر کے گیت ازبر کیے اور سب سے زیادہ یہ کہ آزاد ذہن سے سوچنا سیکھا۔ یہی سبب تھا کہ لوگ جہاں اس کے حسن سے مسحور ہوتے وہاں اس کے ذوق اور مطالعے سے بھی مرعوب ہوتے۔ شہر میں کوئی دوسرا اس جیسا نہیں تھا۔

جینی ہمیشہ سے سیکھنے کے عمل میں تھی۔ ناچنا بھی سیکھا، پیانو بجانا بھی اور محفلوں میں اپنی بذلہ سنجی سے دوسروں کو لبھانا بھی۔۔۔ مگر وہ اکثر باپ کے پہلو میں ہی دیکھی جاتی۔۔۔ ماں سے زیادہ قربت نہ تھی اور ایسا بچپن سے تھا۔

ایسا بچپن سے تھا مگر لڑکیوں کا بچپن ہوتا ہی کتنے دنوں کا ہے۔ ایک دن ایسا بھی آتا ہے جب وہ بچپن چھوڑ کر جوانی میں داخل ہو جاتی ہیں۔ درمیان میں اور کوئی عمر آتی ہی نہیں۔ اسکے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ایک دن سجنے اور اترانے کا موسم آ گیا۔ دل میں ایک اور طرح کی لہر اٹھی اور پورے وجود پر چھا گئی وہ دراز ہو کر جس چھب کی ہو گئی تھی اس کے سبب وہ جہاں ہوتی سب نگاہیں اسی پر مرکوز ہوتیں۔ کوئی رقص پارٹی ہو پکنک یا ڈنر ہر جگہ اس کی مانگ تھی وہ شمع محفل تھی اور پتنگوں کا وفور تھا۔ اس کی ماں اسے دیکھتی تو خوشی سے پھولے نہ سماتی مگر جینی کو خود یہ معلوم نہیں تھا کہ عمر کی کلی کھلنے سے اس کا وجود جو مہکا ہے تو اس کا مفہوم کیا ہے؟ کیرولین اسے کساتی "وقت آ گیا ہے کہ اپنے لیے کسی کو منتخب کر لو۔۔۔" مگر وہ کسے منتخب کرتی۔ کس کی بانہوں میں باہیں ڈالتی۔۔۔ کوئی نظر میں جچتا نہ تھا۔۔۔ مگر کتنے اور دن؟

شہر میں ایک نئی فوجی بٹالین متعین کر کے بھیجی گئی تھی۔ فوجی افسران روایت کے مطابق ایک شام لڈوگ صاحب کے سلام کو بھی حاضر ہوئے۔ ان افسران میں ایک لیفٹیننٹ پینے وز بھی تھا۔ یہ ایک خوبرو نوجوان تھا جس کی سرخ فوجی جیکٹ پر اس اوائل عمری میں بھی کئی تمغے سجے تھے۔ کھانے کی میز پر اس کی نگاہیں بار بار جینی کی طرف اٹھتی تھیں وہ بھی اس کے حسن سے مسحور ہوا تھا بس اب کلام کرنے کی حاجت تھی۔ کھانے کے بعد بڑے تو ایک طرف الگ سے بیٹھ کر اہم اور سنجیدہ موضوعات میں الجھ گئے مگر جینی کسی کی فرمائش پر پیانو پر آ بیٹھی اور پھر اس کی انگلیاں نرم رسیلی سریں بکھیرنے لگیں۔ پینے وز اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں کبھی اس کے چہرے کا احاطہ کرتیں اور کبھی اس کی مخروطی انگلیوں کا جو سروں پر رقص کر رہی تھیں۔۔۔ بس حیرت کا عالم تھا۔۔۔ اور یہ عالم اس وقت تک رہا جب تک کہ محفل برخاست نہیں ہوئی۔۔۔

اب پینے وز آگے بڑھا اور جانے سے پہلے جینی کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔۔۔

”میں نے آپ کے رقص کی بڑی تعریفیں سُنی ہیں کسی روز آپ کے ساتھ ناچنا چاہتا ہوں۔۔۔“

جینی نے سنا تو ذرا سا مسکرا کے رہ گئی۔ کیرولین بھی وہیں تھی، آگے بڑھی پینے وز کے بازو کو تھپتھپایا۔۔۔ اور خوش دلی سے بولی۔

”تم میری بیٹی کو جانتے نہیں ہو۔۔۔ کیا مقابلہ کر سکو گے؟۔۔۔“

”مادام۔۔۔ میں فوجی ہوں۔۔۔ میرا کام ہی مقابلہ کرنا ہے۔۔۔“

”بس تو پھر ٹھیک ہے۔۔۔ اب جشن بہاراں کو کتنے دن باقی ہیں۔۔۔“

یہ وسط گرما کے دن تھے اور جشن بہاراں کی تقریب تھی۔

انیسویں صدی کا اوائل تھا۔ تاریخ کروٹیں بدل رہی تھی۔ یورپ کے نقشے پر اچھوتے حادثات رونما ہو رہے تھے مگر جہاں بے فکری تھی وہاں بے خبری تھی۔۔۔ یہ بے خبری ہی تھی کہ اشرافیہ کو تقریبات کے لیے کوئی بہانہ بھی درکار نہیں ہوتا تھا۔ مگر موسم کا بدلنا تو ایک واقعہ تھا۔۔۔ ایک ایسا بڑا واقعہ جسے ایک بڑے جشن کی ضرورت تھی۔ اس تقریب کو بطور خاص رقص کی شام کا نام دیا گیا تھا۔ کئی ہفتوں سے لوگ پھولوں کے کھلنے کے منتظر تھے اور کتنے دنوں سے قدموں میں رقص کروٹیں لے رہا تھا۔ جینی ابھی اپنی سترھویں سالگرہ منائے جانے کے سحر سے فارغ نہ ہوئی تھی کہ رقص کی شام آ گئی۔ تقریب کا اہتمام کاسینو کلب کے وسیع و عریض ہال روم میں تھا جس کے چوبی فرش پر رقص کے پھول کھلنا تھے۔

مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شام ہی سے شروع ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شہر کے متمول لوگوں کا میلہ سا لگ گیا۔ سرکاری افسران، اعلیٰ منصب دار، قانون دان، اعلیٰ فوجی افسران۔۔۔ غرض کوئی ایسا نہ تھا جسے کسی اور مصروفیت نے روکا ہو۔۔۔ کافوری شمعیں اور زرق برق بھڑکیلے ملبوسات، خوشبوؤں سے مہکتی فضا اور آرکسٹرا کی نرم و گداز دھنیں۔۔۔ سب کو اپنی اپنی پسند کی صحبت بھی میسر تھی اور گفتگو بھی۔۔۔ شیشے سے شیشہ ٹکرا رہا تھا اور ہنسی کھنکتی تھی۔ جس کے پاس اختیار تھا اور علاقے کی ذمہ داری تھی وہ ایک طرف سگار کا دھواں اڑاتے صوفوں میں دھنسے یورپ میں اٹھنے والے طوفان پر قابو پانے کی تدبیروں کے مباحث میں الجھے تھے۔ عورتیں اپنی ظاہری نمود و نمائش اور کروفر کے تفاخر میں مبتلا ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی گفتگو میں مبتلا تھیں۔ جب کہ نوجوانوں کے جذبے خوبصورت جسموں کے طواف سے فارغ نہیں تھے ان کے ہاتھ کسی کمر کے گرد ہالہ بنانے کو بیتاب تھے۔ بس رقص کے آغاز کا انتظار تھا۔۔۔ رقص تو یورپ میں کھانے کا حصہ تھا اس کے لیے تو کسی اہتمام کی ضرورت نہ تھی مگر آج کی شام اسی نام سے موسوم اور پچگراتے کی رات تھی۔

آرکسٹرا شام سے دھنیں بکھیر رہا تھا۔ میزیں سجی تھیں اور کہیں درمیان میں رقص کا میدان تھا۔ جوڑے اٹھتے، کچھ دیر مٹکتے اور پھر جا کر اپنی نشست پر بیٹھ رہتے۔ پھر کسی وقت سب کھڑے ہوئے دو قطاریں آمنے سامنے وجود میں آئیں۔ اب ہمراہی بدل بدل کر ناچنے کا عمل شروع ہوا۔۔۔ یہ سلسلہ بھی بہت دیر نہ رہا۔ دھن بدلی اور اب نوجوانوں کو اپنی توانائیاں دکھانے کا موقع حاصل ہوا۔ جس میں جتنی ہمت تھی وہ اتنی دیر ناچا پھر الگ ہو کر تماشا دیکھنے لگا آخر آخر جینی ہی اپنے فیانسے کے ہمراہ باقی رہ گئی۔۔۔ ایسا مقابلہ کبھی کبھی ظہور پذیر ہوتا تھا۔ سو آج ہو گیا۔۔۔

رقص کرنا کسے نہیں آتا مگر جسم مٹکانے اور نرت بھاؤ بتانے میں بہت فرق ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں مگن تھے۔ دونوں کو اپنی اپنی مہارت اور استعداد پر ناز تھا۔ آرکسٹرا اسپانوی، اطالوی اور جرمن دھنوں کو بدل رہا تھا اور ردھم میں تیزی لا رہا تھا مگر دونوں میں سے کوئی ایک بھی شکست ماننے کو تیار نہیں تھا۔ عجب تماشا تھا سب دائرہ در دائرہ اکٹھے کھڑے تالیاں بجاتے دونوں کو اکسا رہے تھے۔ وہ مسلسل ایک دوسرے کے گرد چکر لگا رہے تھے اور بھاؤ بتا رہے تھے۔ رات بھیگ رہی تھی اور وقت تیزی سے سفر کر رہا تھا۔ تھکے ماندے سازندے مسلسل اس سوچ میں تھے کہ معلوم نہیں یہ سلسلہ کب تھمے گا۔ تھمنا تو تھا مگر آثار نہیں تھے۔۔۔ آثار نہیں تھے مگر پھر اچانک تھم گیا۔ شاید پینے وز کو یقین آ گیا کہ جینی کیوں محفلوں میں ملکہ رقص کے نام سے مشہور ہے۔۔۔ وہ پہلے رُکا۔۔۔ رکا اور پھر گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ

گیا۔۔۔ دونوں ہاتھ کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائیں جینی کی طرف سر اٹھا کر دیکھا جو خود بھی رکی کھڑی اُسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔۔۔ وہ لجاجت سے ملتجی تھا۔

”جینی۔۔۔ ڈارلنگ میں ہمیشہ تمہارے ہمراہ رقص کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ صرف تمہارے ہمراہ۔۔۔ مجھے عمر بھر کی رفاقت میں لے لو۔۔۔“

جینی کی آنکھوں میں حیرت آ کر ٹھہر گئی۔ وہ جھجکی کھڑی اُسے کچھ دیر دیکھتی رہی پھر اُسے لگا جیسے وہ بہت بلندی پر ہے اور نیچے اس کی تلوار کی نوک پر کوئی کھڑا اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے۔ تفاخر کی ایک تیز لہر اس کے وجود میں پھیل گئی اس نے مڑ کر دائرہ در دائرہ کھڑے ہجوم کو دیکھا جو گنگ کھڑا اس کے لب کھلنے کا منتظر تھا۔۔۔ معلوم نہیں کیا ہونے والا تھا مگر اُسے ہجوم سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ اپنی ماں کا چہرہ تلاش کر رہی تھی جو بالآخر دکھائی دے گیا۔ کیرولین نے بھی سب دیکھا اور سب سنا جب جینی کی نگاہوں نے سوال کیا تو اس نے بڑے خفیف انداز سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جینی نے گردن موڑی مگر جھک کر پینے وز کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کی نگاہیں کہیں بلندی پر تھیں۔ کوئی سرور سا تھا۔ کچھ نشہ سا تھا۔ اپنا آپ اچھا لگ رہا تھا۔۔۔ پھر کسی وقت اسکے لب کھلے اور دائرہ در دائرہ تماشا کرنے والوں نے تالیاں پیٹیں اور نعرے لگائے۔۔۔ جشن بہاراں کی تقریب تمام ہوئی۔۔۔ گھوڑے بگھیاں مہمانوں کو لے کر رخصت ہوئیں۔۔۔ اب اگلے دن کے طلوع ہونے کا انتظار تھا جب شہر میں نئی خبر کو پر لگنا تھے۔

جینی کی منگنی نے سب کو ششدر کیا۔۔۔ ایک ہی بات سب لبوں پر تھی۔۔۔ ”ایسی عجلت بھی کیا تھی۔۔۔ بس ایک رات۔۔۔ ایک رقص !!“۔ مگر کیرولین کہتی لوگوں کا کیا ہے۔۔۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔۔۔

وہ ہنگاموں کی دلدادہ بس اس بات پر نازاں تھی کہ شہر کے سب سے سجیلے نوجوان نے اس کی بیٹی کو انتخاب کیا تھا۔ لڈوگ کو البتہ چپ سی لگ گئی۔۔۔ اس نے جینی کو آزاد ذہن سے سوچنا سکھایا تھا۔۔۔ لیکن اب وہ خیال کرتا تھا کہ اس نے سوچا بھی تو کیا سوچا۔۔۔ شاید یہ عجلت کم عمری کا شاخسانہ تھی۔ البتہ اپنے اندر وہ دکھی بہت تھا۔۔۔ کیوں نہ ہوتا؟۔۔۔ جب سے جینی نے جنم لیا تھا وہ اسی کے دھیان میں رہا تھا۔ جب تک گھر پہ ہوتا وہ اس کے ہمراہ ہوتی۔۔۔ جب نہ ہوتا تو وہ اس کے خیال میں ہوتی۔۔۔

جینی کی منگنی کے بعد بھی اگرچہ لڈوگ کے معمول میں کمی نہیں آئی تھی اور نہ ہی کارل کا معمول بدلا تھا۔ وہ اب بھی دونوں سہ پہر کے بعد لائبریری میں جا بیٹھتے۔ شام ہوتی تو سیر کو نکل کھڑے ہوتے مگر اب

جینی نہیں تھی تو گفتگو بھی نہیں تھی۔ بس چپ چاپ جانا اور چپ چاپ لوٹ آنا۔۔۔ آج بھی ایسا ہی تھا۔ وہ معمول کی سیر پر تھے۔ نہ کارل کے پاس پوچھنے کو کچھ تھا اور نہ لڈوگ کے پاس بتانے کو کچھ۔۔۔ بس وہ دونوں چپ چاپ ہی چلے جا رہے تھے کسی سوچ میں گم۔۔۔ کہ اچانک لڈوگ کسی مقام پر رکا اور پھر کارل کی طرف دیکھے بغیر کہا ''چلو جینی واپس چلتے ہیں۔۔۔'' جینی تو ہمراہ نہیں تھی پھر لڈوگ نے ایسا کیوں کہا؟ شاید اس لیے کہ جینی تو ہمراہ نہیں تھی مگر یہ جملہ تو ہمراہ تھا۔۔۔

کارل کی عمر ابھی تیرہ برس تھی وہ ان باتوں کو ابھی نہیں سمجھتا تھا۔ مطالعہ وسیع ہو گیا تھا، علمی باتوں کی سمجھ بوجھ پیدا ہو گئی تھی مگر ابھی اپنے جذبوں کی کچھ خبر نہیں تھی۔ جب اپنی خبر نہیں تھی تو لڈوگ کی کیسے ہوتی؟ وہ اس گھر میں کمسنی سے آ رہا تھا مگر کھیلنے کودنے اور گھومنے پھرنے میں اسے کہیں یہ خیال ہی نہیں آیا کہ جینی اس سے بڑی ہے۔ نہ صرف بڑی ہے بلکہ الگ سے کوئی شے ہے۔ لیکن جب سے جینی نے اپنا معمول بدلا تھا اور ادھر کا رخ کرنا بند کیا تھا تو ایک گمنام سی بے چینی وجود کا حصہ بن گئی تھی۔ اب وہ جب بھی کبھی اسے اپنی ماں کے ہمراہ بن سنور کر کسی تقریب میں جانے کے لیے گھر سے نکلتا دیکھتا۔۔۔ یہ کسی کلب میں چینے وز کے ساتھ رقص کرتے پاتا یا گھر کے لاؤنج میں وہ بیٹھی اس کے روبرو پیانو بجا رہی ہوتی تو کوئی پراسرار مخلوق لگتی۔۔۔ پریوں کی طرح۔۔۔ تتلیوں کی طرح۔۔۔ آسمان پر اڑتے پھرتے بادلوں کی طرح۔۔۔ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔۔۔ اور پہلے ایسا بھی نہیں تھا کہ اسے کبھی اپنی عمر پر افسوس ہوا ہو۔۔۔ اب اسے اپنے چھوٹے ہونے کا شدید احساس تھا۔۔۔ جینی بہت بلند ہو گئی تھی۔۔۔ یہ عجب مخمصہ تھا۔۔۔ یہی سبب تھا کہ ان دنوں جب سیر سے لوٹتا تو چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا جاتا۔۔۔ سکول کی کتابیں اور کاپیاں نکالتا۔۔۔

اور پھر بے خیالی میں ایک ہی نام

جگہ جگہ لکھتا چلا جاتا۔۔۔

جینی۔۔۔ جینی۔۔۔ جینی۔۔۔ اور بس آج بھی ایسا ہی تھا۔۔۔

ایسے ہی دن تھے۔۔۔ مگر صرف کارل کے لیے نہیں جینی کے لیے بھی ایسے ہی دن تھے۔۔۔ وہ چند ماہ ضرور سرشاری پھرتی رہی تھی۔ فتح مندی کا نشہ تھا جو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔۔۔ مگر پھر ایک دن ایسا آیا جب بہار کے رنگ اترنے لگے۔۔۔ وجود سے لپٹی مہک ہوا ہونے لگی۔۔۔ سہ پہر ہوتی تو اسے باپ کی سٹڈی میں جانے اور کارل کے ساتھ جڑ کر بیٹھنے کی عادت پھر سے اکسانے لگتی۔۔۔ مگر کیا کرتی۔۔۔ ایک اور طرح کا معمول ترتیب پا گیا تھا۔۔۔ چینے وز ہر وقت اس کے گرد و نواح میں موجود رہتا۔ وہ جب اس کے

ساتھ باہر کہیں سبزہ زار میں بیٹھی ہوتی اور کارل لڈوگ کے ہمراہ سیر پر ہوتا تو اسے اک ذرا محرومی کا احساس ہوتا۔ سوچتی اسے وہاں ہونا چاہیے ان دونوں کے ساتھ۔۔۔ ان باتوں میں ہونا چاہیے جو روح میں بالیدگی پیدا کرتی تھیں۔ مگر اب وہ دور ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی کارل سے سامنا ہوتا تو اسے لگتا جیسے اس کی آنکھیں اس سے کوئی گلہ کر رہی ہیں۔۔۔ وہ بچپن سے ایک ساتھ رہے تھے۔ برسوں سے روزانہ کا ساتھ تھا۔۔۔ جواب جاتا رہا تھا۔ اور یہ جو نیا ساتھ تھا۔۔۔ بے رنگ، بے بو، بے ذائقہ۔

جینی خوش بخت تھی کہ بہت کم عمری میں ہی علوم و فنون کے حصول پر دوسروں پر سبقت لے گئی تھی۔ اس نے سب کچھ جان لیا تھا۔ بس اُسے منگنی کا مفہوم معلوم نہیں تھا۔ اس نے شہر کی لڑکیوں کو اپنے فیانسے کے ہمراہ بانہوں میں بانہیں ڈالے محفلوں میں آتے دیکھا تھا اس لیے عمر کی ابتدا پر ایسی ہی ایک خواہش اس کے اندر بھی پیدا ہوئی۔۔۔ جو فطری تھی مگر چند ماہ میں ہی اس کی طبیعت اس تعلق پر اوب گئی۔۔۔ زندگی دیکھتے ہی دیکھتے بے مزہ ہو گئی۔۔۔

یورپ ابھی ویسا نہیں تھا جیسا اب ہو گیا ہے۔ بڑے گھروں میں تہذیب کا ایک کڑا اور یا رہتا۔ لڑکی اپنے منگیتر سے بھی تنہائی میں نہیں مل سکتی تھی۔ جینی کا بھی پینے وز سے بس ایک ایسا ہی رکھ رکھاؤ کا رشتہ تھا۔ کہیں کسی تقریب میں رقص کر لیا۔۔۔ گھر کے باہر سبزہ زار پر ٹہل لیا۔۔۔ یا پھر لاؤنج میں پیانو پر گیت گا لیا۔۔۔ خیر اس میں کوئی قباحت نہیں تھی اصل مسئلہ یہ تھا کہ دونوں میں رقص و موسیقی سے دلچسپی کے سوا اور کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ ایک باذوق پڑھی لکھی لڑکی کے لیے شاید اتنا کافی نہ تھا یہی وجہ تھی کہ یہ تعلق رفتہ رفتہ بوجھ بننے لگا۔ وہ چاہتی تھی کہ پینے وز اس کے ساتھ شعر و ادب پر بات کرے جس کی وہ عادی تھی۔۔۔ یا سیاست پر بحث مباحثہ ہو۔ یورپ ان دنوں نت نئی تبدیلیوں کی زد میں تھا۔ فرانس سے تشویشناک خبریں آ رہی تھیں وہ ان پر بھی بات کرنا چاہتی تھی۔ اور اپنے شہر کے کسانوں کی حالت زار کو بھی موضوع بنانا چاہتی تھی۔۔۔ اگر یہ نہیں تو نہ سہی شیکسپیئر، ہومر، گوئٹے ہی کو موضوع بنا لیا جاتا۔ باپ نے اسے اسی طرح کا ذہن دیا تھا مگر پینے وز اس طرح کی باتوں کو تضیع اوقات قرار دے کر رد کر دیتا۔ اسے تخیلاتی باتوں سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ بڑا فوجی تھا ناک کی سیدھ میں چلنے والا۔۔۔ بس اتنا جانتا تھا کہ کوئی بھی حالات ہوں اسے اپنے افسران بالا کا حکم بجا لانا ہے۔ جینی ان باتوں سے نالاں تھی۔ مگر اس اذیت سے چھٹکارا پانے کی کوئی راہ بھی سجھائی نہ دیتی تھی۔ کیا کرتی اس سے تعلق توڑ کر لوگوں کی ہنسی کا سامان بھی نہیں بننا چاہتی تھی۔۔۔ لیکن آخر کتنے دن؟۔۔۔ کتنے اور دن بیزاری میں گذر سکتے تھے۔۔۔ کتنے اور دن چخ چخ ہو سکتی تھی۔۔۔ مزاجوں کا

اختلاف رائے کا اختلاف بن جاتا ہے اور وہ پچھلے کئی مہینوں سے بس اسی مرض میں مبتلا تھے۔ ہر بات پر اختلاف کرتے اور ہر بات پر الجھتے۔ بس طنزیہ جملوں کا تبادلہ تھا۔ جب بحث الجھتی تو پینے وز دلیل کی بجائے فوجی انا کے پیچھے پناہ لیتا اور اسے ایک ایسی معصوم لڑکی قرار دیتا جو دنیا کے سنجیدہ معاملات کو شعر و ادب اور فلسفے کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

“تم فلسفے سے اتنا بدکتے کیوں ہو۔۔۔؟ مئی کی خوشگوار شام گھر سے باہر سبزہ زار پر چہل قدمی کرتے وہ پھر الجھ پڑے تھے۔

“میں ایک فوجی ہوں۔۔۔ ایک عملی آدمی ہوں۔۔۔ فلسفہ تو بے عملی کا نام ہے۔۔۔”

“یہ بات تم نے کہاں سے سیکھی کہ فلسفہ بے عملی کا نام ہے؟۔۔۔” جینی تن گئی۔

“ہم فوج میں فلسفیوں کو مجذوب اور بے عمل ہی سمجھتے ہیں۔۔۔ اور حکمرانی فلسفیوں کا کام نہیں”۔ پینے وز نے مسکراتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

“تمہیں شاید معلوم نہیں کہ افلاطون نے کہا تھا کہ عقل مند حکمران وہ ہوتا ہے جو فلسفی بھی ہو۔۔۔”

“یہ بات افلاطون نے کہی تھی الیگزنڈر دی گریٹ یا سیزر نے نہیں۔۔۔” پینے وز نے مضحکہ اڑایا۔

“کیوں بھولتے ہو۔۔۔ یہ حکمران بھی تو فلسفیوں کے پروردہ تھے۔۔۔” جینی ہار ماننے کو تیار نہیں تھی۔

“مس جینی چھوڑو اس بحث کو۔۔۔ یہ سب پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔۔۔ دو سال پہلے کی بات یاد کرو اگر فرانس کی حکومت فلسفی ہوتی تو باغی چند دن میں اس کا قلع قمع کر دیتے۔۔۔” اب پینے وز سنجیدہ تھا۔

اس کا اشارہ اس بغاوت کی طرف تھا جسے کچلنے کے لیے پولیس اور فوج نے بے تحاشا گولیاں چلائیں اور لاشوں کے انبار لگا دیے۔ جینی اس واقعے سے بے خبر نہیں تھی مگر پینے وز کے تجزیے نے اسے ششدر کر دیا۔ وہ وحشت میں آ کر بولی۔

“مسٹر پینے وز۔۔۔ فرانس کی حکومت اب بھی محفوظ نہیں ہے۔ جو کمزوروں کو کچل کر جشن مناتے ہیں ان کے آنے والے دن خوشگوار نہیں ہوتے۔ دیکھ لو فرانس کی اس بغاوت نے جرمنی میں بھی جذبات کو

بھڑکا دیا ہے۔ تمہارے اس شہر میں بھی چنگاریاں اٹھنے لگی ہیں۔۔۔“

جرمنی ہی کیا فرانس کے ہنگاموں نے پورے یورپ میں بغاوت کا دروازہ کھول دیا تھا۔ ٹرائر میں بھی روشن خیالی کی ایک لہر بعض مقامات پر شدت سے ہلکورے لے رہی تھی۔ ایک مقام تو کاسینو کلب تھا جہاں ہنرک اور لڈوگ جیسے دانشور طبقہ خاص میں ہوتے ہوئے بھی حکومت سے مختلف سوچ رکھتے تھے اور دوسرا جمنازیم سکول جہاں کارل اور ایڈورڈ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس ادارے کے طلباء حکومت کے خلاف جلسہ جلوس بھی کرتے، پمفلٹ بھی نکالتے۔۔۔اس لیے تصادم کا ایک خوف یہاں بھی اُڑتا پھرتا تھا اور جینی کا اشارہ اسی طرف تھا مگر چینے وز کی سوچ اور طرح کی تھی۔

”اگر جرمنی میں بھی کسی نے سر اٹھایا تو اُسے بھی یہاں فوج کچل ڈالے گی۔۔۔“

”کیوں۔۔۔؟“

”باغیوں کا یہی علاج ہوتا ہے۔۔۔“

”لیفٹیننٹ صاحب کوئی بغاوت پہ کیوں اُترتا ہے اس کی وجہ سمجھنا چاہیے۔ گولی نہیں چلانا چاہیے“۔

”وجہ سمجھنا فوجیوں کا کام نہیں ہوتا۔۔۔ہمارا کام صرف افسران بالا کا حکم بجا لانا ہوتا ہے۔۔۔“

”اچھا تو کیا اگر تمہیں نہتے لوگوں پر گولی چلانے کے لیے کہا جائے تو تم گولی چلا دو گے۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔“

”سوال نہیں کرو گے؟“

”نہیں۔۔۔“

”کیوں؟؟۔۔۔کیا تمہارا ضمیر تمہیں ملامت نہیں کریگا۔۔۔؟“

”فوجی نظم و ضبط ان ضمیر جیسی بے کار باتوں کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ ہمیں حکم کی تعمیل کرنا ہوتی ہے۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ نشانے پر کون ہے۔۔۔اور میں بھی اسی کا قائل ہوں۔۔۔“

جینی چلتے چلتے یکلخت رک گئی۔ کچھ دیر اُسے دیکھا پھر اپنی انگلی میں پڑی وہ انگوٹھی اتاری جو چینے وز نے رقص کی رات اُسے پہنائی تھی اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے کیا اور انگوٹھی اس پر رکھ دی۔ چینے وز نے جب حیرت سے اسے دیکھا تو وہ مسکرائی اور بڑے مضبوط لہجے میں بولی:۔

"میرے والد نے مجھے سکھایا ہے کہ دنیا کے ہر قانون سے بالا انسان کا اپنا ضمیر ہوتا ہے۔۔۔ آخری فیصلہ اسی کا ہونا چاہیے"۔

یہ کہا اور اپنے گھر کا رُخ کر لیا پھر پلٹ کر اُسے نہیں دیکھا۔۔۔ چینے وز نے اسے جاتے دیکھا۔۔۔ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا، پھر دونوں بوٹوں کی ایڑیاں آپس میں ٹکرائیں احترام سے اس کی پشت کی طرف سر جھکایا اور پلٹ کر اپنے کیمپ کی طرف ہو لیا۔

☆☆☆☆

آمنہ مفتی

باوَ اسرار!

مکان میں اور احاطے کے باہر، کھیتوں میں اور کھیتوں سے پرے دور دور تک کہرام مچ گیا۔ کھیتوں میں دور دور تک کوکیں گونجنے لگیں۔ ہو، ہو، ہلا، ہلا، سایوں میں سوئے ہوئے کتے گھبرا گھبرا کے بھونکنے لگے۔ ٹیوب ویلوں پہ نہاتے مرد، آدھے ننگے، ادھ ڈھکے گیلے پیروں میں مٹی کچاچاتے، میاں اللہ یار کے گھر کی طرف دوڑے۔ جن لوگوں کو اسرار کی آمد کی خبر نہیں ملی تھی انہیں بھی علم ہو گیا کہ اسرار کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔

نیم اندھیرے کمرے میں شاماں نے جب اپنے دیور کو زہر کے اثر سے بے ہوش پڑے پایا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ اپنی ساری ذہانت اور ساری جرأت بھول گئی اور دروازے میں کھڑے ہو کے دونوں ہاتھوں سے کلیجہ پیٹنے اور بین کرنے لگی۔

سب سے پہلے میاں اللہ یار جائے حادثہ پر پہنچے، شاماں راستہ روکے بغیر دوپٹے کے کھڑی

دوہتڑوں سے اپنا کلیجہ کوٹ رہی تھی۔ سامنے پلنگ پہ اسرار بے ہوش پڑا تھا اور میاں اللہ یار کو لگا، شاماں وہ ناگن ہے جو مکان کی بنیادوں میں کئی سو سال سے رہ رہی ہے اور آج پھر اس کے لاڈلے کو ڈس کے یہاں کھڑی جھوم رہی ہے۔

”ہٹ جا، راستہ چھوڑ جا، پیاز کا عرق نکال کے لا۔“ انہوں نے ڈرتے ڈرتے اس کے کندھے کو چھوا۔ شاماں تڑپ کے بھنڈار کی طرف دوڑی۔

میاں اللہ یار آگے بڑھے، اسرار کے گال تھپتھپائے، گھبرا کے جسم ٹٹولا مگر ہاتھ پاؤں صاف تھے، سانپ نے کہاں کاٹا تھا۔۔۔؟

ذرا ہی دیر میں کمرہ لوگوں سے بھر گیا، سب اونچی آوازوں میں بول رہے تھے، سانپ کو ڈھونڈھ رہے تھے، سانپ کے کاٹے کا نشان تلاش کر رہے تھے۔ بینا بھیڑ کو چیرتا ہوا اندر آیا۔

”اوہو ہو، کیا کر رہے ہو سارے؟ مر جائے گا یہ ہسپتال لے کے چلو سارے، چلو۔۔۔“

اجتماعی پاگل پن کا شکار سب لوگ جیسے ہوش میں آ گئے۔ اسرار کو تو تھمبو کر کے باہر لایا گیا۔ شاماں تانبے کے لمبے گلاس میں پیاز کا عرق نکال کے لائی تھی۔ جب تک امین سے چھوٹا محسن گاڑی سٹارٹ کرتا، چار ایک جی داروں نے کسی نہ کسی طرح سارا عرق بے ہوش اسرار کے حلق میں اتار دیا۔

گھبراہٹ کے مارے محسن سے کلچ چھوٹا جا رہا تھا اور پچھلی سیٹ پہ بینے کی گود میں رکھے اسرار کے چہرے کا رنگ جامنی پڑتا جا رہا تھا۔

ڈسٹرکٹ ہسپتال کے برآمدے میں نیم گنجے ڈاکٹر صاحب دھوتی پہ بنیان پہنے ایک جھلنگا سی کھاٹ پہ آرام فرما رہے تھے۔ ان کا سرکاری کوارٹر پچھلے ساون میں ڈھے گیا تھا اور اب ان کے بیوی بچے ہسپتال کے جنرل وارڈ میں رہتے تھے۔ نرسیں ان کی بیوی کے ساتھ مل کر کدو اور کریلے چھیلتیں اور سویٹروں میں نمونے ڈالا کرتی تھیں۔ قسمت کا مارا مریض جو یہاں آتا، اسے آپریشن تھیٹر میں لٹا کے معائنہ کیا جاتا۔ مریض بیچارہ اپنے سر سے چند فٹ کے فاصلے پر لگے عجیب ہیئت کے بلبوں اور دیگر آلات سے اتنا دہشت زدہ ہوتا، جیسے بڑے بڑے سیاستدان اور صحافی شاہی قلعے کے ٹارچر سیل کو دیکھ کر ہوتے ہیں۔ فورا ہی بیماری سے مکر جاتا اور ڈاکٹر کی ایک ہی دوا سے بھلا چنگا ہونے کی نوید سنا کے آئندہ اس مذبح خانے میں جانے سے توبہ پکڑتا۔ شنید تھا کہ ڈاکٹر صاحب، ہسپتال کے چوہڑوں کے ساتھ مل کے پوسٹ مارٹم بھی یہیں کیا کرتے تھے۔ کیونکہ پوسٹ مارٹم کے لیے مخصوص کمرے میں ان کی بکریاں بندھا کرتی تھیں۔

اسرار کو آپریشن تھیٹر کے پھوسڑے نکلے سٹریچر پہ لٹایا گیا تو ڈاکٹر صاحب بھی ایک لمحے کو

سناٹے میں آ گئے۔ اتنے حسین اتنے جوان آدمی کے پاس آتے موت کو ذرا حیا نہ آئی؟

اسرار اگر مرا نہیں تھا تو زندہ بھی نہیں تھا اور نہ ہی اس کے زندہ بچنے کی کوئی امید نظر آ رہی تھی۔ اسٹیتھوسکوپ پہ مدھم پڑتی، ڈوبتی دھڑکنیں ایسے سنائی دے رہی تھیں جیسے کسی بند کمرے سے گاہے گاہے ابھرتی کلاک کی مدھم ٹک ٹک۔ مگر اس آواز میں کلاک کا ردھم مفقود تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے مایوسی سے کانوں سے سٹیتھوسکوپ الگ کیا اور بڑی دلسوزی سے محسن کے کندھے پر ہاتھ رکھا، محسن اشارہ سمجھ کے بھاں بھاں رونے لگا۔ امین ذرا دیر تو بھونچکا سا کھڑا رہا پھر ایک دم آگے بڑھا اور اسرار کے لحظہ لحظہ بے جان ہوتے وجود کو بازوؤں میں بھر کے باہر بھاگا۔

”چھنٹے! اوئے محسن جلدی چل جلدی، بھوریوں والے کلوں کی طرف جلدی چل۔“

محسن اپنا رونا دھونا موقوف کر کے مینے کی پیچھے دوڑا۔

بھوریوں والے کلوں کی داستان بھی عجیب ہے۔ میاں اللہ یار کا ڈیرہ، بلکہ ایک وہ ڈیرہ ہی کیا؟ سارا پنجاب دریاؤں کا میدان ہے۔ دریاؤں کی چھینکی ہوئی ریت، ٹوبے، ٹیلے، ٹیکریاں، ڈھکیاں، ہر ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ تو یہ بھوریاں بھی دریائے بیاس کی پرانی گزرگاہ پہ ایک، دو سے ڈھائی ایکڑ چوڑا اور تقریباً اٹھارہ سے انیس کلومیٹر لمبا ریتلا ٹکڑا تھا۔ ان بھوریوں میں ایک خاص بات یہ تھی کہ بلندی سے دیکھنے پر یہ ریتلا سلسلہ ایک عظیم الجثہ ناگ دکھائی دیتا تھا جو کسی مستی میں لہرایا ہوا پڑا ہو۔

خود کانے مینے نے ماسٹر صاحب کے لڑکے کے ساتھ گوگل ارتھ پہ اس جناتی ناگ کو دیکھا تو جانے کس خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور جسم کے سارے مساموں سے پسینہ پانی کی طرح بہنے لگا تھا۔

بہر طور بھوریوں والی زمین سالہا سال سے غیر آباد پڑی تھی اس ریتلے سانپ کا آخری سرا سرحد کے پار ستلج سے جا ملتا تھا۔ ساری زمین خودرو کانٹے دار جھاڑیوں اور کشیدہ قامت درختوں سے پٹی پڑی تھی۔ ریت میں پناہ لینے والی مخلوقات اور ان کے شکاری جانور از قسم نیولے، باگڑ بلے، سور، گیدڑ اور خال خال بھیڑیے، جھاؤ چوہے وغیرہ یہاں بکثرت پائے جاتے تھے۔

ایک زمانے میں جب میاں اللہ یار کے ڈیرے میں شاماں اور فضل بی بی دونوں موجود تھیں تو جانے شاماں پہ رعب ڈالنے کے لیے یا فضل بی بی کے ساتھ ہونے کی خوشی اور جوش میں وہ ہر وقت کسی نہ کسی جھگڑے، فساد یا مقدمہ بازی میں ملوث ہونے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ان ہی دنوں اسرار پیدا ہوا تھا، اور ان کے دل میں ان بھوریوں کو کاشت کرنے کا نادر خیال آیا تھا۔ اور خیالوں کا تو یہ ہے کہ میاں اللہ یار

جیسے آدمی کے دل میں ہوں تو فوراً حقیقت میں بدلنے کو بے چین ہو جاتے ہیں۔ اب دن رات میاں اللہ یار کے تصورات میں ایک ریتلے جسم والا ناگ لہرایا پڑا رہتا، جس کے چمکتے ہوئے بدن پہ بڑے روسی ٹریکٹر اپنے آہنی ہل کھبوئے گھیں گھیں کرتے ادھر سے ادھر پھرتے، ریت کی ٹرالیاں بھر بھر کے بیچی جاتیں اور پھر اس ناگ کی ریتلی کینچلی کے نیچے سے اس کا جسم نمودار ہوتا۔ سوندھا خوشبودار، جس پہ کوڑتومے، جنگلی کیکروں، اکانہہ اور آک کے پودوں کی جگہ امریکن نرمے اور ہالینڈ کی مکئی کے کھیت اگ رہے ہوتے اور ان کھیتوں میں وہ ایک مطلق العنان بادشاہ کی سی بے نیازی سے پھرتے۔

علاقے کے لوگوں نے اس زمین کے بارے میں عجیب وغریب روایات گھڑ لی تھیں اور سینہ بسینہ چلتی چلتی جب یہ میاں اللہ یار کے کانوں تک پہنچیں تو انہوں نے جملہ راویان کی اگلی پچھلی سات نسلوں کے بارے میں نہایت نادر افکار کا اظہار کیا اور ان کی ماں بہنوں کے ساتھ اپنے خفیہ تعلقات کے مختلف پہلوؤں پہ جی بھر کے روشنی ڈالی۔ اس رجز خوانی سے فراغت پاتے ہی انہوں نے پٹواری کو بلوایا اور اس زمین کی ملکیت کے بارے میں پوچھا۔ وہ لگا آئیں بائیں شائیں کرنے۔ جیسے جانتا تو سب کچھ ہو مگر بتانا کچھ بھی نہ چاہتا ہو، کبھی کہتا یہ دریا کی گزرگاہ ہے، سرکاری زمین ہے۔ کبھی کہتا ہندوستان بھاگ جانے والے چودھری مول چند کی زمین ہے جو امروہہ کے ایک آبادکار کے کلیم کے جواب میں دی گئی، آبادکار ایک دفعہ آیا، ریت اٹھا کر سونگھی، مسلم لیگ، نہرو، کانگریس اور قائداعظم کی شان میں نازیبا کلمات کہتا ہوا ایسا گیا کہ آج تک نہ پلٹا۔

”تو گویا لاوارث ہوئی ؟“ میاں اللہ یار نے اعلان کیا۔ تس پہ اس مردک نے ایک پلٹا اور کھایا اور اپنی کرنجی آنکھوں کو سانپ کے سے زیرے بنا کر بولا کہ سن ساٹھ کے معاہدے کے مطابق دریاؤں کی گزرگاہیں کبھی آباد نہیں کی جاسکتیں۔

میاں اللہ یار کو پٹواری پہ بڑا غصہ آیا۔ جی تو چاہتا تھا کہ پاؤں سے دیسی جوتا اتار کے ٹانٹ پہ اتنی جوتیاں لگوائی جائیں کہ سب کھتونیاں، کھیوٹ نمبر گڈمڈ ہو جائیں۔ لیکن سمجھدار تھے غصہ ضبط کر گئے۔ شام ہونے سے پہلے مینے کو ساتھ لیا اور اپنی جیپ لے کر بھوریوں کے معائنے کو چل دیئے۔

بھوریوں نے بہت سے لوگوں کے رقبوں کو دو دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ میاں اللہ یار کے ۱۶۶ ایکڑ بھوریوں کے اس طرف تھے اور ۱۴۴ اس طرف درمیان میں کم وبیش چھ ایکڑ کا ریتلا ٹکڑا اگر کسی طرح قابل کاشت بنا لیا جاتا تو یہ ایک خوبصورت ترین قطعہ اراضی بن سکتا تھا۔

مینے کے ساتھ پہلے ایکڑ سے گزرتے ہوئے انہیں اپنی اور اپنے پرکھوں کی کم عقلی پہ بہت رونا

آیا۔ کیا تھا اگر اس ریتلی زمین کو پہلے ہی قابل کاشت بنا لیا جاتا؟ اور اپنے اس پچھتاوے کا اظہار انہوں نے بیٹے سے بھی کر دیا۔ مینا خاموش رہا اور اپنے لال نری کے جوتے کو دیکھنے لگا جس پر ریت کے باریک باریک ذرے چڑھتی دھوپ کی ٹھنڈی روشنی میں کبھی کبھی چمک سے جاتے تھے۔

”اگر ایسا ہے کہ آپ کے اور میرے بڑوں نے بھی ایسا نہیں کیا تو پھر اباجی اس میں کوئی بڑی حکمت ہی ہو گی، ہمیں کیا ضرورت ہے وہ کام کرنے کی جو پہلے کسی نے نہ کیا ہو“۔ گو بیٹے سے اسی قسم کے جواب کی توقع کی جا سکتی تھی لیکن ایک ادھیڑ عمر زمیندار جس کے سات بیٹے بھی ہوں اور سب سے آخری برخوردار کے عقیقے کو ابھی ایک ہفتہ ہی گزرا ہو، اس قسم کے جوابات کو خاطر میں نہیں لاتے۔ میاں اللہ یار کو بھی اپنے جوان بیٹے کے منہ سے اس قسم کا ٹھنڈا اور بزرگانہ جملہ سن کے بہت مایوسی ہوئی، انہوں نے لاپروائی سے ہاتھ چلایا۔

”اونئیں نئیں، ایسی کوئی جادوئی بات نہیں جو تو مجھے یوں چبا چبا کے بتا رہا ہے۔ بات ساری اتنی ہے کہ اس وقت ٹریکٹر نہیں تھے، اور ٹریکٹر جب تک نہیں آئے تھے زمیندار ٹنڈا تھا، کتنی جوڑیاں لگاتا ان ٹبوں کو سیدھا کرنے کے لیے؟ اور ٹوبے دیکھے ہیں؟ میرے، میرے جتنے تو گہرے ہیں۔ اتنی ریت کون کھینچتا؟ ورنہ عقل کی بات تو یہی ہے کہ بھئی پاگلو زمین دو حصے کر رکھی ہے، کیوں؟“

مینا خاموش رہا اور میاں اللہ یار کو اس سے اسی قسم کی نفرت محسوس ہونے لگی جو شاماں اور اسے اکٹھا دیکھ کر ہوتی تھی۔ ٹھٹھا اڑانے والے انداز میں کنکھیوں سے اس کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر بولے ”تو نہ ڈر کاکا! تجھے تو کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ یہ ساری محنت میں کروں گا۔ مجھے معلوم ہے میرے بیٹے اپنی بیویوں کی عقلوں سے سوچتے ہیں، اور عورت کی تو ذات ہی گندی ہے“۔ یہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا سی گئی اور منہ میں جیسے کوئی کرکرا سا ذائقہ آ گیا ہو۔ انہوں نے نفرت سے ایک طرف تھوکا۔ کوڑتومبے کی بیلوں میں کچھ سن سے ہوا جیسے سارا بہ چشم زدن میں ہل کے واپس آ گیا ہو لیکن ہوا کیا تھا دونوں میں سے کوئی نہ سمجھ سکا۔

”کچھ ہوا ہے، ہے ناں ابا جی؟“۔ بیٹے نے ذرا سہمے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”سور کی ماں کا۔۔۔“ انہوں نے حقارت سے ایک موٹی سی گالی بکی اور ریت میں پیر کھبوتے اونچے نیچے ٹبوں کو پھلانگتے بیٹے سے آگے آگے تیزی سے چلنے لگے۔ مینا ان کا ساتھ دینے کے لیے چل تو رہا تھا لیکن ہر قدم پہ رک کے پیچھے ضرور دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دور اور چلنے کے بعد میاں اللہ یار ذرا تھک سے گئے سانس تیز چلنے لگا اور شلوار کے پائنچوں کے اندر پسینے کی ننھی ننھی دھاریں چل پڑیں۔ میاں اللہ یار چاہتے تھے کہ کسی کیکر یا جنڈ کے نیچے رک

کے ذرا سستا لیں لیکن ابھی ابھی مینے کے سامنے اپنی برتری کا جو زبانی دعوی وہ کر چکے تھے اس کے بعد یہ فرمائش بجائے خود ایک ہتک تھی، چنانچہ خاموشی سے چلتے رہے۔ مینا ان کے پیچھے ایک سدھے ہوئے جانور کی طرح پیروں پہ پیر رکھتا چلا آ رہا تھا۔ بھوریاں تھیں کہ کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہی تھیں ایک کے بعد ایک ٹیلہ، چھوٹے چھوٹے پوکھر جن میں گئی برسات کا پانی ابھی تک کھڑا تھا اور اس پانی میں خدا جانے کہاں سے عجیب و غریب مچھلیاں آ جاتی تھیں اور ان کو کھانے کے لیے نیل کنٹھ اور بگلے۔ مینا چلتے چلتے انھیں ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”ڈڈووں کے بچے ہیں۔ دور سے دیکھو تو لگتا ہے مچھلیاں ہیں۔“ مینا خاموش رہا حالانکہ اسے ان ٹوبوں میں ایسی ایسی حسین مچھلی نظر آ رہی تھی کہ دنیا کی خوبصورت ترین کورل فش بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی مینا سوچتا تھا کہ کیا جو چیز ایک آدمی کو جیسی نظر آتی ہے دوسرے کو بھی ایسی ہی نظر آتی ہو گی؟ کونا جیبی کی سبز آنکھوں سے کیا اسے ہر طرف ہریالی نظر آتی ہو گی؟ اور حد تو یہ ہے کہ شادی کے بعد اس نے شاماں سے پہلا سوال بھی یہ ہی کیا تھا کہ اتنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے کیا چیزیں بڑی نظر آتی ہیں؟ شاماں ایک لمحے کو تو چکرائی تھی پھر اس کی بند آنکھ پہ انگلی رکھ کے بولی تھی۔ ”اگر تجھے اس آنکھ کے نہ ہونے پر بھی مجھ میں وہ بات نظر آ گئی جو تیرے ابے کو آدھے سفید سر کے ساتھ نظر آئی تو پھر نظر کیا ہوتی؟“

مینا لاکھ سیانا سہی لیکن آدھی رات کو بکائن کے پھولوں کی نشہ آور خوشبو کے جلوں میں کی جانے والی اتنی گہری باتیں ابھی اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں، سو آج بھی چپ چاپ چلتا رہا۔ ایک ذرا گہرے ٹوبے پہ تو اس نے ایک ایسی مچھلی بھی دیکھی جس کی مونچھیں تھیں اور ایک آنکھ پہ مینے کی آنکھ کی طرح سفیدی سی چڑھی ہوئی تھی اور یہ مچھلی ٹوبے کی کسی گہرائی سے لمحہ بھر کو نکلی تھی اور باہر بیٹھے نیل کنٹھ کو دیکھ کر غڑاپ سے واپس چلی گئی تھی۔ پانی کا چھپاکا یقیناً میاں اللہ یار نے بھی سنا تھا کیونکہ تھکے ہوئے گھوڑے کی چال چلتے چلتے اس نے ایک ہنکارہ سا بھرا تھا اور تضحیک آمیز انداز میں بڑبڑایا ”ہنہہ! ڈڈووں کے بچے“۔

مینا چپ رہا تھا۔ چلتے چلتے اب وہ ایسی جگہ آ پہنچے تھے جہاں بھوریاں اپنی سب سے زیادہ چوڑائی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ کھیتوں کا جو حاشیہ ابھی تک انھیں ساتھ ساتھ نظر آ رہا تھا اب غائب ہو چکا تھا۔ دونوں طرف دور دور تک ریت تھی اور عجیب قسم کے نباتات۔ جو اصل میں تھے تو وہی جو ایسی زمینوں میں ہوتے ہیں لیکن شاید بہت عرصے سے یہاں کسی انسان نے قدم نہیں رکھا تھا (کیوں نہیں رکھا تھا یہ بات مینے کے لیے بھی اتنی ہی محیر العقول تھی جتنی آپ کے اور میرے لیے)۔ اس لیے یہ پیڑ پودے اپنی اقلیم میں ایستادہ قلعوں اور محلات کی طرح پرشکوہ نظر آ رہے تھے۔

اکانہہ کے درخت اتنے گھنے اور ان کے تنے اتنے سیدھے تھے کہ دور سے چیڑ کے جھنڈ معلوم ہوتے تھے، مصیبت یہ تھی کہ میبے نے کبھی چیڑ کے درخت اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے تھے ورنہ اس کے دل پہ اس قدر دہشت طاری نہ ہوتی۔ ٹاہلیوں کے درخت اتنے بڑھ گئے تھے کہ ان کی چوٹیاں کہیں بادلوں میں چھپی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ گویا دل بہت دور تھا اور ان میں سمٹا پہلی تاریخوں کا چاند دن میں بھی دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ دب کی جھاڑیاں اور ان میں کھلے دب کے وہ روپہلی پھول جن سے لوگ پھول جھاڑوئیں بناتے ہیں، ون کی جھاڑیوں کے غیر مختتم سلسلے اور ریت پہ اس وقت کہیں سایوں میں سستاتے جانوروں کے پیروں کے نشان اور ان نشانوں کو کاٹتی، رینگنے والے، جانوروں کے جسموں کی رگڑ سے بنی جھریاں اور لکیریں۔ یہ سب اتنا حیرت انگیز اور اجنبی تھا کہ میبے کے سر میں سے پسینہ بہہ نکلا۔

”کیا خیال ہے ابا جی، بہت سیر ہو گئی واپس نہ چلیں؟“۔ میبے نے آنکھوں میں ٹپکتے پسینے کو کندھے پہ رکھے انگوچھے سے پونچھا۔ لیکن مثل مشہور ہے کہ آنے والا آتا اپنی مرضی سے ہے لیکن جاتا گھر والوں کی مرضی سے ہے اور ابھی گھر والوں کی مرضی نہیں تھی۔

اسے دب کی جھاڑیوں میں بیٹھے پہلے میبے نے دیکھا یا میاں اللہ یار نے، دونوں نہیں بتا سکتے تھے۔ لیکن وہ وہاں تھا شاید بہت پہلے سے یا شاید ان کی باتوں کی آواز سن کر اپنی کمین گاہ سے نکلا تھا۔ کالا سیاہ جسم اور باہر کو نکلی خمدار کچلیاں، جن میں سے داہنی کچلی کا سرا ٹوٹا ہوا تھا۔ جانے اسے میاں اللہ یار کے پسینے سے اٹھتی بارود کی بو بری لگی تھی یا وہ اپنے گھر کے اتنے قریب ان دو اجنبی انسانوں کو دیکھ کر اتنا برافروختہ ہوا تھا کہ اس کے پورے جسم پر بال تیروں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے اور اس سے پہلے کہ میاں اللہ یار یا میبا اس کے عزائم کا کچھ اندازہ لگا سکتے، جنگلی سؤر نے سر نیچے جھکایا، اپنا گلے کھروں سے مٹی پیچھے کو اچھالی اور چشمِ زدن میں میاں اللہ یار کے پہلو کو چیرتا ہوا دب کے جھنڈ میں جا گھسا، اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر دوسرا حملہ کرتا، جیسے کسی غیبی ہاتھ نے میاں اللہ یار اور بت بنے میبے کو جنڈ کے جھنڈ میں گھسیٹ لیا۔ سور اپنی جھونک میں آگے نکل گیا۔

اب یہ بتانا کہ میاں اللہ یار کے پہلو سے خون کی تلملیاں جاری ہو گئیں اور میبے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے وغیرہ تو یہ فضول کی تفصیلات ہوں گی جن میں جائے بغیر میں آپ کو بتا دوں کہ ان کو بچانے والا، ان کے زخم پہ کس کے ہاتھ رکھے رکھے انھیں اپنی کٹیا میں لے گیا۔ جانے وہ کٹیا تھی بھی یا میبے کو وہم ہی ہوا تھا؟ جنڈ کے پستہ قامت درختوں کا ایک مختصر سا جھنڈ جو شاید دو سے تین کنال کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس جھاڑ کو غالباً قدرت کے ہاتھ نے اس صفائی سے ایسی شکل دے دی تھی کہ اس جھنڈ کے اندر ہی اندر میبے کے گھر کی طرح ایک خوب کشادہ انسانی رہائشگاہ سی بن گئی تھی۔ جس میں کمروں سے ملحقہ بیت الخلا تو

نہیں تھے البتہ ایک دوسرے کو علیحدہ کرتی ہوئی شاخوں کی دیواریں سی بن گئی تھیں اور ہر خانہ ایک الگ کمرہ سا بن گیا تھا۔ ان کمروں کے درمیان راہداریاں، صحنچیاں اور ایک ننھا سا برساتی پانی کا تالاب بھی تھا۔ اس تالاب میں شاید مینے کا وہم تھا یا واقعی دریائی جھینگوں کا ایک جھلر تیرتا پھر رہا تھا اور خدا جانے اروی یا سنگھاڑے کے ہرے ہرے پتوں نے تالاب کو آدھا چھپا رکھا تھا۔ جنڈ کی کسی کسی جھاڑی کے ساتھ ککروندے اور ون ایسے الجھ کر اگے تھے کہ ان کمروں، صحنچیوں اور راہداریوں میں ککروندے، ون اور لسوڑے کے پھل قمقموں کی طرح جگہ جگہ چمک رہے تھے۔

مینا اپنی اکلوتی آنکھ کھولے اس جہان حیرت کو تک رہا تھا اور اس کے دل میں بجا طور پر یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ دونوں آنکھیں رکھنے والوں کو یہ سب کچھ کس قدر خوش نما محسوس ہوتا ہوگا؟ اس دوران دو ایک بار میاں اللہ یار کے کراہنے کی ہلکی سی آواز بھی آئی لیکن مینا اس جادو گھر کو دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ اس نے اس آواز پر کان نہ دھرے۔ چونکا وہ اس وقت جب اسے یہاں گھومتے گھماتے بڑی دیر ہو گئی اور میاں اللہ یار نظر نہ آئے۔

”کوئی ہے؟ ادھر کوئی ہے؟‘ وہ پکارتا ہوا صحنچی تک گیا تو اس نے دیکھا کہ میاں اللہ یار ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور ان کے قریب ایک کنالی میں گھاس پھونس کو آگ لگائے ایک عجیب وضع کا آدمی بیٹھا ہے۔ کالا سیاہ، بالائی جسم برہنہ اور اتنا سوکھا سڑا کہ ایک ایک پسلی بآسانی گن لی جائے، ستر پوشی کو ایک معمولی سی چادر باندھی ہوئی تھی۔ کان میں مندری تھی جس سے مینا فوراً تاڑ گیا کہ ہو نہ ہو یہ جوگی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے چہرے کے رونگٹے، گھبرائی ہوئی بلی کی دم کی طرح کھڑے ہو گئے اور اس کو راستے میں ٹیلے پہ ہونے والی پر اسرار نقل و حرکت کی وجہ سمجھ آ گئی۔ تو وہ سانپ تھے۔ سینکڑوں یا پھر ہزاروں۔

جوگی نے نظر اٹھا کر مینے کو دیکھا اور پھر ناگواری سے بڑبڑایا، ”ایک ہی تھی، ابا جب ہندوستان گیا تھا تو لایا تھا، اور تم لوگوں کو چین نہیں ہے؟ کیا مصیبت تھی یہاں آنے کی؟“ مینے کو جوگی کی بات بالکل سمجھ نہ آئی۔ چپ چاپ کھڑا رہا۔ جوگی بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور جانے کہاں سے سندوری رنگ کا ایک لمبا سا ریشمی کپڑا لے آیا۔ اور اس سے پہلے کہ مینا اس کپڑے کے بارے میں کچھ اندازہ لگاتا، جوگی نے کپڑا آگ میں جھونک دیا، اپلوں کی آگ پہ اصلی ریشم لمحوں میں راکھ ہو گیا۔ جوگی نے (یا جو بھی وہ تھا) تاسف سے سر ہلایا۔

”جل گیا ناں؟“

میاں اللہ یار ہولے سے کراہا تو میٹے کو جیسے اچانک ہوش آ گیا۔ لپک کے باپ کے قریب پہنچا۔

"ابا جی! ابا جی!"،

میاں اللہ یار نے بمشکل آنکھیں کھول کے لڑکے کو دیکھا۔

"میری نظر ہی نہیں پڑی، اپنی ماں کے بھائی نے چیر کے رکھ دیا۔"

"چپ کرو، چپ کرو، خون رک گیا ہے، لو۔۔۔ اب صبح تک ٹھیک ہو جائے گا، ایسے عورتوں کی طرح نہ کراہو۔" جوگی تالاب میں ہاتھ دھوتے ہوئے بولا۔

میٹے نے دیکھا کہ، میاں اللہ یار کے پہلو میں لگے قریباً آدھا بالشت کے زخم سے خون رسنا بالکل بند ہو چکا تھا۔ جوگی نے ریشم کی راکھ زخم پہ چھڑک دی تھی۔ اور بھی کئی مرہم اور لیپ لگائے تھے۔ کیونکہ تالاب میں سے اٹھتی کھڑے پانی اور گلتے ہوئے پتوں کی بو کے ساتھ، کافور، نیم تل اور ہلدی کی تیز خوشبو بھی پھیلی ہوئی تھی۔

'یہاں پہلے اتنے برے (سور) نہیں رہتے تھے، جب سے لوگوں نے کماد لگانی شروع کی ہے بے شمار ہو گئے ہیں۔" جوگی جیسے اپنے آپ سے بولا۔

"اور سانپ؟" میٹے کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

جوگی نے نظر اٹھا کے میٹے کو دیکھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی، جیسے دو انگارے سلگ رہے ہوں۔ بلکہ نہیں انگارے نہیں۔ یہ آگ نہیں تھی یہ تو سلگن تھی۔ دھیمی دھیمی جیسے اپلوں پہ راکھ کی ہلکی سی تہہ اور اس کے نیچے دہکتے کوئلے، اوہو! پھر وہی کوئلے۔ ارے نہیں بھائی کوئلے نہیں۔ وہ آنکھیں تو ایسے سلگ رہی تھیں جیسے دو مدھم آب دیتے یاقوت جو اپنے اندر دبی ابدی آگ سے روشن ہوں۔ میٹا مزید سہم گیا۔

"سانپ؟"۔ جوگی جب بولا تو اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ "سانپ یہاں تو نہیں رہتے۔ وہ تو میاں اللہ یار کے مکان کی بنیادوں میں رہتے ہیں۔ صدیوں پرانی بانی ہے۔ میرے دادے کو اس کے دادے نے بتایا تھا، اور اسے اس کے دادے نے۔ اور یہ بانی ایک بہت بڑے خزانے پہ ہے۔ اتنے بڑے خزانے پہ کہ میاں اللہ یار کو خبر مل جائے تو پاگل ہی ہو جائے۔"

میٹے نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس کی نظر باپ پر پڑی، آنکھوں آنکھوں میں میاں اللہ یار نے لڑکے کو چپ رہنے کا حکم دیا۔ جوگی نے دھوتی سمیٹی اور تالاب کے کنارے اکڑوں بیٹھ گیا۔

"میرا دادا بتایا کرتا تھا کہ اس بانی میں ایک ناگن بھی رہتی ہے جس کی عمر کئی سو سال ہے اور جب اس کا دل چاہتا ہے وہ بھیس بدل کے انسان کی جون میں آ جاتی ہے۔ اس جون میں وہ امیر کبیر لوگوں سے شادی کرتی ہے ان کی دولت سمیٹتی ہے اور یہ سب لے کہ پھر واپس ناگن کی جون میں اپنی بانی میں چلی جاتی ہے، جاتے جاتے وہ اس گھر کے ایک فرد کی جان لے لیتی ہے اور یہی اس کی لمبی عمر کا راز ہے"۔

جوگی خاموش ہوا تو جنڈ کی اس کٹیا میں زرا دیر کو خاموشی چھا گئی۔ اتنی خاموشی کی تالاب میں تیرتے گھانگھوں (دریائی جھینگے) کے زیرِ آب تیرنے سے ابھرنے والی نہایت لطیف آواز بھی سنی جا سکتی تھی، جیسے تتلی کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ۔

"جھوٹ، بالکل جھوٹ لوگ بڑی ماں کے اپنی بھائی ہوتے ہیں"۔ میاں اللہ یار ہنسے۔ "عورت تو ہوتی ہی ناگن ہے اسے کیا ضرورت ہے ناگن بن کے گندے سے بل میں رہنے کی دادا جھوٹ بولتا تھا۔" جوگی کا رنگ اگر اتنا کالا نہ ہوتا اور کٹیا میں اندھیرا کا سا سماں نہ ہوتا تو یقیناً اس وقت اس کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا ہوتا۔ میں نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

"نہیں ابا جی! ایسا ہوتا ہے، میں نے خود سنا ہے۔ اس دن ماسٹر صاحب اخبار سے پڑھ کے سنا رہے تھے کہ ہندوستان میں ایک جگہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں ایک عورت اکثر ویران سڑکوں پہ آدمیوں کو ملتی ہے اور پھر وہ مردہ پائے جاتے ہیں۔ جسم پہ سانپ کے کاٹے کا نشان ہوتا ہے۔"

"اوئے ایسے بے غیرت آدمی جو عورت کو دیکھ کے پاگل ہو جائیں انھیں تو سانپ کاٹنا ہی چاہیے۔ پر ہمارے خاندان میں آج تک کوئی آدمی سانپ کے کاٹے سے نہیں مرا اس لیے یہ جھوٹ ہے۔" تھوڑی دیر پہلے ہائے ہائے کرتا ہوا میاں اللہ یار بات کے جوش میں اٹھ کے بیٹھ گیا۔

"تم میاں اللہ یار کے کیا لگتے ہو؟" جوگی نے اپنی چمکیلی آنکھیں اللہ یار کی آنکھوں میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"میں اللہ یار ہوں۔" وہ جب بولا تو اسی لمحے پچھی کے کونے والی شاخوں میں بڑے زور کی کھڑ بڑ ہوئی اور ایک ممولا عجیب طرح سے شور مچاتا ہوا باہر اڑا، پچھی کا آدھا سا چکر کاٹا اور کھلے میں پرواز کر گیا۔

جوگی یہ بات سن کر ہنس پڑا، اور بڑی دیر ہنستا رہا۔ میاں اللہ یار اسے دیکھتا رہا، جب وہ خاموش ہوا تو اس نے پوچھا۔

"تم ہنسے کیوں؟"

"یا تو تم اللہ یار نہیں ہو، اور یا جھوٹ بول رہے ہو۔ اور چونکہ میاں اللہ یار جھوٹ نہیں بولتا اس

لیے تم اللہ یار نہیں ہو۔"

"چل نہیں ہو اللہ یار، پھر؟" بیٹے نے حیرت سے باپ کو دیکھا۔ وہ اس طرح اس جوگی کے منہ کیوں لگ رہا تھا، حالانکہ ابھی کچھ دیر پہلے اسی جوگی کی وجہ سے وہ یقینی موت سے بال بال بچا تھا۔

"ہاں نہیں ہوں اللہ یار، تو بتا۔ کیا کرے گا؟"

جوگی نے کچھ دیر ٹکٹکی باندھ کر اپنی چمکیلی آنکھوں سے میاں اللہ یار کو دیکھا اور پھر خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میاں اللہ یار بھی پھرتی سے اٹھا۔ بیٹا ڈرا کہ اس کے پہلو کا زخم نہ کھل جائے، لیکن اللہ یار تو ایسے اٹھ کر کھڑا ہو گیا جیسے اسے کبھی کچھ نہ ہوا ہو اور سؤر کی کچلی کسی اور کو لگی ہو، وہ ویسا ہی جوان ہو جیسا جنت بی بی سے شادی کے وقت تھا اور چھلانگ مار کے دوڑتے ہوئے گھوڑے کی کمر پہ سوار ہو جایا کرتا تھا۔

"نہیں ہوں اللہ یار، بتا کیا کرے گا؟" اللہ یار پنجوں پہ تن کے غرایا۔

جوگی کے چہرے پہ تمسخر سا آ گیا۔ ایک طرف تھوک کے لاپروائی سے تالاب میں ہاتھ دھونے لگا۔

"میں نے کیا کرنا؟ کرے گا تو کرنے والا لیکن میاں اللہ یار؟ ہاں تو اگر اللہ یار ہے تو پھر جو اللہ یار میرا جاننے والا تھا وہ کوئی اور تھا"

اللہ یار کو ایسے کھڑا دیکھ کے بیٹے کے دل میں جوگی کے لیے ایک عجیب سی محبت اور عقیدت پیدا ہو گئی۔

☆☆☆☆

الطاف فاطمہ

مسز پن ہیروز اسکول

وہ ہوا یوں تھا کہ اس کالونی کے رہنے والے دوسرے لوگوں کی طرح اس کے علم میں یہ بات نہ تھی

کہ شہر کی اس سب سے پرانی اور وسیع و عریض خوبصورت کالونی کے کسی بلاک میں مسز پن ہیروز اسکول کے نام سے کوئی اسکول بڑی خاموشی اور استقلال سے قائم اور جاری ہے۔ وجہ لاعلمی یہ تھی کہ اس کالونی میں نہ صرف ایک اعلیٰ درجے کا پبلک ہائی اسکول اور ایک انگریز خاتون کا انگلش ہائی اسکول موجود تھے بلکہ اس کے بعض بلاکوں میں اچھے خاصے کونونٹ ناموں والے اسکول بھی کھلتے جا رہے تھے۔۔۔ اس لیے اس قدرے دور افتادہ کم آبادی والے مختصر سے بلاک میں ایک چھوٹے سے گم نام اور Prep اسکول کے بارے میں کسی کو جاننے یا معلوم کرنے کی کیا ضرورت تھی جب کہ اس کی بانی خاتون نے خود بھی اس کی مشہوری کی کوشش نہ کی تھی۔

اب قصہ یہ ہے کہ اس کو بھی اب سے پہلے یہ کچھ جاننے کی ضرورت یوں نہ پیش آئی کہ اس کا بڑا گیارہ سالہ بچہ تو شہر کے سب سے نامی گرامی اسکول میں دو تین سال پہلے سے داخل تھا۔ اور دونوں لڑکیاں جیزز اینڈ میری کانونٹ کی چھوٹی کلاسوں میں زیر تعلیم تھیں۔ رہ گیا چھوٹا لڑکا اس کے داخلے کی درخواست کا فارم ایک داخل کر دیا گیا تھا کہ داخل کی مناسب عمر تک انتظار کرنا پڑے گا اور اس مناسب عمر تک پہنچنے میں ابھی ڈیڑھ سال سے بھی اوپر چند ماہ انتظار کرنا تھا۔ اتنی دیر یہ گھر پر رہ کر ٹسٹ کے لیے بھی تیار ہو جائے گا سو اب کسی دوسرے عارضی اسکول اور داخلے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔

مگر وہ بچہ تھا کہ ایک طوفان اس نے ماں کے سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ وہ اس طرح کہ جب صبح صبح وہ اپنے بھائی کو اسکول یونیفارم کے کوٹ اور خوبصورت زریں کلاہ پر مور کے پروں جیسے رنگ کی پگڑی کا خوشنما طرہ سجائے گاڑی میں بیٹھتے اور اسکول جاتے دیکھتا تو ایک طوفان کھڑا کر دیتا۔ رونے کے ساتھ ساتھ بڑبڑ کرتا ماں کو طعنے دیتا۔ بھیا صاحب تو ان کے شہزادے ہیں۔ روز پگڑی سجا کر گاڑی میں اسکول جائیں گے اور میں تو ایسے ہی گھر میں پڑا پڑا بڑا ہو جاؤں گا۔ بالکل جاہل جٹ رہ جاؤں گا۔ بڑا ہو کر کہیں ہیرا لگ جاؤں گا۔ ماں سمجھاتی ”کیوں جاہل جٹ رہ جاؤ گے روز تو میں پڑھاتی ہوں۔ تمہاری گورنس تمہاری کوچنگ کرتی ہیں“۔

اب قصہ یہ تھا کہ وہ گورنس جس نے اُسے بچپن سے پالا تھا وہی تو اسے چپکے چپکے اکساتی رہتی تھیں۔ اور کہتی تھیں مونی مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ بھیا صاحب تو ان کا بگ بوائے (بڑا بیٹا) ہے اس کو تو بڑے اسکول میں پڑھوا رہے ہیں اور تم کو تو کسی معمولی اسکول میں داخل کر دیں گے۔ ویسے آج کل حالات بھی ٹھیک نہیں جا رہے ہیں۔۔۔ حالات کا تو یہ تھا کہ واقعی دگرگوں ہی تھے۔ یہ سن ساٹھ کی دہائی کے آخری

سالوں کا زمانہ تھا۔ مشرقی پاکستان میں ملازمت یا بزنس کرنے والوں کو مستقبل میں آنے والے دنوں کے بارے میں کوئی خوش آیند امید اور توقعات نظر نہ آ رہی تھیں۔ ان حالات کے پیش نظر کئی لوگوں نے اپنے خاندانوں کا مستقر بھی تبدیل کر دیا تھا کام کے حوالے سے اس کو سمیٹنا بھی آسان نہ تھا۔ اُس کے ابا کو بھی زیادہ تر ادھر ہی رہنا پڑتا تھا اس آنا جانا ہی لگا رہتا۔ سو اب اُس کی ساری بحث و تکرار کا نشانہ اماں ہی تھیں۔ اور وہ واقعی اس سلسلے میں فکر مند بھی ہو جاتی تھی کہ انتظار کا تو ایک لمحہ بھی بھاری اور ختم نہ ہونے والا ہوتا ہے۔ کہاں ایک سال اور چھ ماہ سے بھی دو چار ماہ اوپر کے انتظار کی کوفت اور الجھن اس کی نفسیات پر بھی اثر انداز ہو سکتی تھی۔ پھر ایک دن اتفاقاً ہی اس مسئلہ کا ایک حل نکل آیا وہ ہوا یوں کہ اس روز بیٹھے بیٹھے یوٹیلیٹی اسٹور سے کچھ سامان لینے جانے لگیں تو نونی کو بھی ساتھ لے لیا۔ اسٹور کے گیٹ کے سامنے گاڑی سے اتر کر چابی لگا کر گاڑی کو لاک کر رہی تھیں کہ پیچھے سے آواز آئی ”ارے لڑکی کہاں غائب رہتی ہو“۔

پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو ہمیشہ کی طرح ہنستی مسکراتی تر و تازہ ہشاش بشاش صورت بٹو باجی اپنی گاڑی کو لاک کرتے کرتے سوال کر رہی تھیں۔ وہی پرانا ٹھسہ ڈھاکے کی قیمتی خوش رنگ ساڑھی اور بڑا سا جوڑا، کلے میں مہکتے پان کی گلوری دبی ہوئی۔

جلدی سے آگے بڑھی ”آداب بٹو باجی۔ اللہ کتنے بعد نظر آئی ہیں اور ہم سے پوچھ رہی ہیں کہاں غائب رہتی ہو“۔

”ہاں ہم تو کچھ دن کے لیے ڈھاکے گئے ہوئے تھے پھر ہمارے میاں کو وہاں کافی رکنا پڑ گیا۔ اچھا بتاؤ تم کیسی ہو، اور یہ شیطان بھی ساتھ ہے آج یہ اسکول کیوں نہیں گئے“۔

اشارے سے ان کو خاموش کر کے ایک طرف ہو کر کہا۔ ”اللہ ان کے سامنے اسکول کا نام نہ لیں یہ تو آج کل ان کا ویک پوائنٹ ہے“۔

بٹو باجی ایک ہمدرد و غمگسار خاتون گھبرا کر بولیں۔

”کیوں خدا خیر کرے کیا بات ہے؟“

تو مونی کو گاڑی میں بیٹھا چھوڑ کر بظاہر تو ایک مچھلی بیچنے والے کی طرف مڑ کر مخاطب تھیں لیکن روئے کلام بٹو باجی ہی کی جانب تھا۔ جلدی جلدی نونی کے داخلے سے پیدا ہونے والے مسئلے اور اپنی مشکل سے آگاہ کیا۔ اور وہ تھیں کہ اپنی مخصوص مادرانہ شفقت سے بھرپور آواز اور خوبصورت سرمگیں آنکھوں کی نرم نرم مسکراہٹ سے بولیں تم لڑکیاں بھی عجیب ہو ذرا سی بات کو مسئلہ بنا لیتی ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی پریشانی کی بات

ہے۔ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ اچھا تم اندر چلو۔ ابھی ہم بتاتے ہیں۔ یہ کہتے انہوں نے اپنا بیگ کندھے سے لٹکایا اور اسٹور میں داخل ہو گئیں۔ نونی کو گاڑی سے اتار کر وہ بھی اسٹور کے ایک گوشے کی طرف جا کر گھوم پھر کر ایک پہیوں والی شاپنگ باسکٹ نکال کر گھریلو اشیائے ضرورت کے پیکٹ، بنڈل اور بوتلیں، ڈبے چن چن کر ڈھونڈھ کر باسکٹ میں ڈالتے ڈالتے نونی کے داخلے کا مسئلہ ہی ذہن سے نکل گیا۔ اور نونی کو بھی ایک موٹی سی چاکلیٹ بار چوستے ہوئے ایک کونے میں منہ تھوتھائے کھڑا اُبڑ بڑ کر رہا تھا۔ ''ان کا خیال ہے کہ میں یہی چوکو بار چوس چوس کر بڑا ہو جاؤں اور سارے بچے تو اس وقت اسکول میں مزے کر رہے ہوں گے۔ اپنی خانہ داری کی اشیائے ضرورت کی خریداری میں ان دونوں ہی کے ذہن سے اس کا مسئلہ محو ہو چکا تھا پر اسی آن ہٹو باجی کسی بیحد ضروری پیکٹ کی تلاش کرتے کرتے اس کے قریب سے گذریں تو ان کے کان میں اس کا گلہ پڑا۔ اس کے قریب ہو کر بولیں ''اسکول میں بچے مزا نہیں کیا کرتے! بچو اسکول جاؤ گے تو پتہ لگ جائے گا'' ۔ چٹاخ سے جواب دیا۔ ''اچھا تو آپ کو کیا ہوتا ہے اگر مجھے پتہ لگ جائے گا۔ اب میں ساری زندگی لولی پاپ اور چوکو بار چوس کر تو گذار نہیں سکتا''۔ ہنسی سے بے تاب ہوتی ہوئی وہ اس کی ماں کے قریب گئیں۔ ''بھئی یہ تمہارا بیٹا بھی عجب چیز ہے۔ دنیا بھر کے بچے تو اسکول جانے سے دم چراتے ہیں اور ان کو ابھی سے اپنے مستقبل کی اتنی فکر ہے۔ اچھا پلوا یک پرچہ پر اسی کالونی کے ایک قدرے کم آباد اور کم حیثیت بلاک کا نمبر اور اس میں واقع ایک مختصر سے اور تقریباً بے نام سے اسکول اور اس کوٹھی کا نمبر لکھ کر اس کی ماں کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ ایک طرح کا Prep اسکول ہی سمجھو۔ ارے بھئی کیا کریں ہم تم جیسے لوگ تو ان دنوں خانہ بدوش ہی لوگ ہیں۔ ایک پیر ڈھاکہ دوسرا لاہور۔ ہم نے اپنی گڑیا (بیٹی) کو فی الحال اسی اسکول میں بٹھال دیا ہے (بٹھا) اطمینان رکھو اچھا اسکول ہے۔

''ہائے اللہ ہٹو باجی آپ کتنی اچھی ہیں۔ ہماری ایک بڑی مشکل حل کر دی آپ نے اس لڑکے نے تو میری جان عذاب میں کی ہوئی ہے اصل میں ان کی ممی انکو اور بھڑکاتی رہتی ہیں''۔ وہ مارے شکر گزاری کے گھگیانے لگی تھیں۔ پھر دونوں نے اپنی اپنی خریداری مکمل کی اور اسٹور سے نکل کر اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔

اگلا دن نونو کی زندگی کا معرکتہ الآراء دن تھا۔ صبح اٹھ کر ناشتہ کے وقت جب اماں نے اس کو خبر سنائی کہ آج جلدی جلدی ناشتہ کر کے تیار ہو جاؤ۔ آج تم کو ایک اسکول میں داخل کروانے لے جاؤں گی۔ تو پہلے تو ایک گھنٹہ اس نے اس ہی میں گذار دیا۔ ''ہوگا کوئی پھٹیچر سا اسکول، بالکل سڑیل سا''۔ بھئی تم کو اسکول

جانے سے مطلب ہے۔ یا پھٹیچر اور شاندار سے پڑھنا ہے۔ تو بیٹھو پھر ایک سال میرا دماغ نہ چاٹنا۔ اور سن لو آج میں تم کو وہاں لے ضرور جاؤں گی۔ مرضی آئے تو داخلہ لے لینا نہ پسند آئے تو صبر سے بیٹھنا"۔ اوپر سے تو وہ اپنی خوشی کا اظہار کر رہا تھا مگر اندر سے اکسائٹڈ بھی بہت تھا۔ چلو صبح وہ بھی تیار ہو کر اسکول جائے گا۔۔۔ ایک بات یہ بھی ہے اکیلے گھر میں پھر پھر کر اکتا بھی تو گیا تھا۔

مسز لوئیس نے اس کو نہلا دھلا کر سجا بنا کر ایسا تیار کر دیا کہ ابھی سے اسکول بوائے لگنے لگا تھا۔۔۔ چلتے وقت انہوں نے بیگم کی نظر بچا کر دو روپے مٹھی میں دبا کر چپکے سے کہا یہ تمہاری Tuck کے لیے ہے۔ اسکول کی کینٹین سے اپنی مرضی سے خریدنا۔

اس وسیع و عریض کالونی میں کسی بلاک کی تلاش بھی اتنی آسان نہ تھی پر بٹو باجی نے پتا اتنا شفاف اور ایک نقشہ سا بنا کر دے دیا تھا کہ اس کی اماں کو وہ بلاک اور اس میں واقع اسکول تلاش کرنے میں ذرا دقت نہیں ہوئی۔ اور ایک دو تین Lanes سے چکر کاٹ کر پہلے ہی لین کے وسط میں ان کی گاڑی ایک مختصر سے سادہ گیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔ وہ چوبی گیٹ بھی کھلا ہی ہوا تھا۔ سامنے پورچ کی نیم قوسی پیشانی پر یا ننھا سا بورڈ آویزاں تھا جس پر جلی حروف کی خطاطی میں تحریر تھا مسز پنھاروز اسکول نظر پڑتے ہی ایک ذرا سا دھچکا سا لگا آہ یہ انگلش خطاطی Italics کی مشق کی کوشش میں ہم نے کتنی رائٹنگ کاپیاں بھریں اور کتنے ہی حروف کی خطاطی تو کسی طرح قابو ہی نہ آتی تھی لکھتے لکھتے وہ جی نب جس پر انگریزی موٹا سا GB نب لکھا ہوتا تھا اور یہ G ہمارے قابو میں بالکل ہی نہ آتا تھا اور چھوٹے ایف کی تو بات ہی نہ کریں ایک دم مری ہوئی مکھی کی شکل بن جاتی تھی پھر کتنی جھڑکیاں پڑتی تھیں اب تو وہ بھی سہانی یادیں بن کر آتی ہیں ذہن میں۔ گوشہ چشم میں کچھ نمی سی محسوس ہوئی۔ چونک کر بچے کا ہاتھ پکڑا۔ پورچ کی جانب بڑھیں تو اندر ایک پرانے فرسودہ بلکہ قدیم ماڈل کی کھٹارہ سی گاڑی کھڑی نظر آئی۔ جانے کون سا ماڈل رہا ہوگا۔ ہڈسن، فورڈ بھئی ہمیں تو ایک ہی ذرا کم قدیم ماڈل یاد ہے مورس۔ آہاں مورس ہی لگ رہی ہے۔ لگ کیا رہی ہے ہے مورس اور یہ پورچ اب کہاں نئے بنگلوں اور کوٹھیوں میں نظر آتے ہیں ٹھنڈی سی سرد آہ کو باہر نکلنے سے روکا۔ دو قدمچے چڑھ کر برآمدے میں داخل ہوئیں۔ برامدے کے دروں میں بڑے بڑے گملوں میں پورچوی کا کے نیلے پیلے اودے اور سرخ رنگوں کے پھول بڑے تر و تازہ اور بشاش کروٹن کی نایاب اقسام کے پودے گویا استقبال کو موجود۔ ایک بار پھر اپنے وہاں والے گھر کے دروں میں سجے کروٹن کے بھرے بھرے لہلہاتے پودوں کی یاد کو ابھرنے سے پہلے قابو کیا۔ صدر دروازے پر دبی دبی دستک دی۔ تو Yes come in کی آواز پر گیلری

میں داخل ہوئیں وہی خنک اور نیم تاریک گیلری اور اس کی وہی بڑے انگریزوں کے گھروں والی مخصوص بھبک کہ جس کے متعلق یہ فیصلہ نہ کیا جاسکے کہ یہ بد بو ہے یا کوئی خوشگوار سی مہک۔ گیلری سے ملحق ایک مختصر ہال نما کمرہ جس دس بارہ ڈیسکوں کے ساتھ ڈبل سیٹ بنچوں پر گیارہ سے تیرہ اور ایک دو پر چودہ سال تک کی عمروں کے لڑکے لڑکیاں بیٹھے کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ اسی ہال نما کمرے کے کونے میں چوبی پارٹیشن کے پیچھے پرنسپل کے آفس کی ننھی سی تختی لگی تھی۔

اب وہ گھبرایا اور جھنجلا کر بولا ”یہ آپ مجھے کہاں گھسیڑ لائی ہیں۔ کہہ رہی تھیں اسکول لے جارہی ہوں“۔

لڑکا تجتی تھا اس لیے جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ اشارے سے چپ رہنے کو کہا۔ ایک بار پھر اندر آنے کی اجازت طلب کی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر داخل ہوئیں۔

پرانی وضع کی مضبوط آفس ٹیبل کے سامنے سفید بالوں والی جو خاتون بیٹھی تھیں ان کی شفاف آنکھوں اور پورے وجود پر عجیب سی مادرانہ شفقت طاری تھی۔ آفس کے ضروری سامان کے درمیان نازک سے چینی کے گلدان میں گلاب کی دو نازک نازک سی کلیوں کے درمیان ایک پورا کھلا ہوا گلاب مسکراتا نظر آرہا تھا۔

”کیا میں مسز پنہارو سے مل سکتی ہوں“

”میں مسز پنہارو ہوں“ مختصر جواب میں بھی اسی مادرانہ شفقت کی کھنک تھی۔

وہ ایک طرف کونے میں ان پر نظریں جمائے کھڑا خاصا متاثر نظر آرہا تھا۔۔۔ دھیمی دھیمی آواز میں ماں نے اس کا مسئلہ بیان کر کے کہا ”صرف ایک سال اور چھ ماہ کی بات ہے مجھے امید ہے کہ آپ کے اسکول میں اتنے عرصے پڑھنے کے بعد یہ وہاں کا ٹیسٹ بڑی اچھی طرح پاس کر لے گا“۔

ہاں امید تو یہی ہے تمہارا بچہ خاصا منفرد معلوم ہوتا ہے۔ اچھا میں اس کا ٹیسٹ لے کر بتاتی ہوں کہ یہ کس گریڈ میں چل سکے گا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ کچھ دیر اس کا ٹیسٹ لینے اور باتیں کرنے کے بعد وہ اسے واپس لے کر آئیں اور اس کی ماں سے کہنے لگیں ”یہ پریپ تو کیا کنڈرگارڈن سے بھی آگے کی کلاس میں خوب اچھی طرح چل سکے گا۔ میں اس کو کلاس ون میں داخل کرسکتی ہوں“۔

اپنی نشست پر بیٹھ کر اپنی میز کی دراز سے ایک مختصر سا داخلہ فارم نکال کر دیا۔ ایک بہت چھوٹی سی نوٹ بک کے سائز کی چھپی ہوئی کتاب اسکول کی فیس داخلہ اور مختلف گریڈز کی فیس کے علاوہ گرما اور سرما

کی اوقات تعلیم اور چھٹی کے اوقات درج تھے۔ واجبی سی فیس داخلہ اور اسکول فیس اور بس۔ داخلہ ہو گیا۔

اگلے ہی روز سے وہ باقاعدہ اسکول جانے لگا۔ فی الحال وہ اپنے حسب عادت اسکول کے بارے کوئی رائے دینے کے موڈ میں اس لیے نہ تھا کہ اول تو وہ حیران تھا کہ جس کلاس کا داخلہ لینے وہ گیا تھا اس سے دو کلاس آگے غیر متوقع طور پر کرلیا گیا۔ اس کے علاوہ ابھی وہ اسکول کے ماحول اور کوائف کا پوری طرح جائزہ نہ لے سکا تھا۔ وہ جس کلاس میں لیا گیا تھا اس میں دو تین ہولڑکیاں اور چارلڑکے اور تھے جو کنڈرگارٹن اور پہلی کلاس کے اسٹینڈرڈ سے کہیں زیادہ قابلیت اور ذہانت کے اعتبار سے آگے تھے۔ سو اس طرح وہ جس کلاس میں بٹھایا گیا تھا وہ ایک مستطیل کمرے کے انتہا گوشے میں سات آٹھ کرسیوں اور ڈیسک پر مشتمل تھی جن کی سامنے والی دیوار پر بلیک بورڈ نصب تھا۔ جس طرف بچوں کی پشت ہوتی تھی وہ کمرے کا دوسرا انتہائی گوشہ تھا جس کے ساتھ پرانے وکٹورین طرز کی گول ڈائنگ ٹیبل اور اسی کے ساتھ کی چار کرسیاں پڑی تھیں۔ چوتھی کسی پر گڑیا کی طرح سجی بنی چالیس پینتالیس سال کی درمیانی عمر ایک خاتون بیٹھی ہوتی تھیں ان کے کندھے سکڑے ہوئے ایسے نظر آتے تھے جیسے وہ کسی سے بے حد ناراض ہوں اور کندھوں کے اس انداز سے وہ اپنی ناراضگی کا اظہار کررہی ہوں۔ چہرے کے نقوش اچھے خاصے متناسب ہوں گے کبھی مگر اس کا کیا کیا جائے ان کا بائیں جانب کا چہرہ لقوے سے ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ بچوں کا خیال یہ تھا کہ وہ پوز مارتی ہیں۔ ہم کو ڈرانے کے لیے۔ باریک ہونٹ وہ سختی سے بھینچے رکھتی تھیں۔ اور اکثر ٹیڑھی ٹیڑھی نظروں سے بچوں کو دیکھنے لگتی تھیں۔ وہ ہمیشہ صاف ستھری اسکرٹ اور خوش رنگ اونی لوئیں سیٹ پہنے نظر آتی تھیں۔ گلے میں آرٹی فیشل بڑے بڑے موتیوں کا ہار۔ کلائی پر ننھی سی رسٹ واچ اور کانوں میں ویسے ہی موتیوں کے ٹاپس ہوتے تھے۔ پہلے دن جب مسز پنہارو نونی کو اس کمرے میں بٹھانے لائیں تو اس خاتون پر نظر پڑتے ہی اس نے بدک کر پوچھا "میڈم کیا ہم ان سے پڑھیں گے"۔ وہ بڑی معترض نظروں سے ان کی طرف دیکھے جارہا تھا۔ وہ نرمی سے ہنسیں۔ اوہ نو ڈیئر شی از نوٹ یور ٹیچر۔ شی از مس پنہارو۔ شی از مائی سسٹر ان لا۔۔۔ (تمہیں یہ تمہاری ٹیچر نہیں ہیں، یہ مس پنہارو میری نند ہیں) پھر انہوں نے بچوں سے کہا آؤ میں ان سے تمہارا تعارف کرواؤں۔۔۔ یہ پہلی بار تھی کہ ان بچوں سے ان کا تعارف کروانا پڑا صرف اس نئے بچے کے تجسس کی وجہ سے۔ وہ ایک ایک بچے کو بلا کر اس کا نام بتا کر ان سے ہاتھ ملانے کو کہتیں مگر وہ ہاتھ کی مٹھی سی بنا کر پیچھے کرلیتیں۔۔۔ پھر انہوں نے ایک طرف کھڑی آیا سے کہا۔ "گلیڈس مس صاحب کو بلاؤ"۔ ایک دبلی پتلی سی اسمارٹ سی نوعمر لڑکی آئی۔ یہ تمہارا نیا شاگرد ہے اور نونی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر باہر چلی گئیں۔ تو یہ

تھا نونو کا پہلا دن۔۔۔ ان بچوں کی چھٹی گیارہ بجے ہوتی تھی۔ اس کی اماں اس کو پورے گیارہ بجے لینے آئیں تو ڈری ہوئی تھیں کہ گاڑی میں بیٹھتے ہی اعتراض شروع کر دے گا یہ کوئی اسکول ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن خلاف معمول اس قسم کی کوئی بات اس نے نہ کی۔ نہ ان کے کسی سوال کا جواب دیا۔۔۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسکول پر کچھ زیادہ اعتراض نہیں ہے۔ اور یوں اس کی باقاعدہ اسکولنگ شروع ہو گئی۔

ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ والی جس کرسی پر مس پنہارو ڈٹ کر بیٹھی ہوتی تھیں اس کا سامنے والے رخ کا طویل دریچہ مختصر سے لیکن بہت خوشنما باغ کی جانب کھلتا تھا اور دریچے کے ساتھ والی کیاری میں بہت اعلیٰ قسم کے ولایتی گلاب کھلتے تھے۔ اور دریچہ کھلنے پر زرد سرخ سیاہ اور سفید گلابوں کی بھینی مہک پورے کمرے میں پھیل جاتی تھی۔

اکثر چھٹی کے اوقات میں بچے دریچے کے قریب کھڑے ہو کر ان کا نظارا کرتے۔ نونی ایک تیز نظر بچہ تھا اس نے بہت جلد یہ بات نوٹ کر لی کہ مس پنہارو کبھی آنکھ اٹھا کر بھی ان گلابوں کی طرف نہ دیکھتی تھیں۔ اب اس کو خلاء کا نام تو آتا نہ تھا۔ یوں کہتا تھا کہ بس نہ جانے کیا اور کس طرف کو ٹکٹکی باندھے گھورتی رہتی ہیں۔

دس بجے کے قریب ایک بوڑھی آیا ایک پیالے میں گرم گرم سوپ لے کر آتی اور ان کے گلے میں ایک صاف ستھرا نیپکن باندھ کر چمچے سے ان کو سوپ پلاتی کبھی کبھی تو وہ سکون سے سوپ پی لیا کرتیں اور کبھی آیا کا ہاتھ بار بار جھٹک دیتی۔ ایک آدھ بار کو ہاتھ مار سوپ کا پیالہ ہی الٹ دیتیں۔۔۔ جس دن وہ سوپ گرا دیتیں تو آیا جا کر میڈم کو بولتی میڈم صاحب، پہنارو مس صاب ضد کرتا۔ سوپ کا پیالہ الٹ دیا۔۔۔ نونی کی نظر پڑتی تو وہ چپکے چپکے اپنے ساتھ والے بچوں سے کہتا۔ "دیکھو کتنی بدتمیز ہیں۔ اب یہ اتنی بچہ تو نہیں ہیں کہ۔۔۔" آیا کے ساتھ مسز پنہارو کو آتے دیکھ کر وہ خاموش ہو کر اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ مگر کن انکھیوں سے اسی طرف دیکھتا رہتا اور اپنے ساتھ والے لڑکے شیر عالم کو چپکے چپکے بتاتا رہتا جیسے کمنٹری کر رہا ہو۔۔۔ "اب مسز پنہارو ان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی ہیں۔۔۔ آیا نے سوپ کا دوسرا پیالہ مسز پنہارو کے ہاتھ میں پکڑا دیا ہے۔۔۔ اب وہ ان کے گلے سے نیپکین باندھ رہی ہیں۔۔۔ اب انہوں نے بڑے پیار سے ان کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا ہے۔۔۔ چمچوں چمچوں ان کو سوپ پلا رہی ہیں۔۔۔ بولتے بولتے جوش میں آ کر خاصی بلند آواز میں بول پڑا۔۔۔ دیکھا۔۔۔ دیکھا ہیں کتنی چالاک اب دیکھو کیسے آرام سے بیٹھی سوپ پی رہی ہیں۔۔۔" شیر عالم نے کہنی مار کر اس کو خاموش کر دیا ہے مگر اس کی نگاہیں مستقل ان ہی کی طرف لگی رہیں۔ وہ سوپ پی چکیں تو ایک

چھوٹے سے گیلے تولیے سے بڑی نرمی سے ان کا منہ صاف کیا۔ برش سے ان کے بال سنوارے۔ ایک ننھی سی بٹن گلاب کی کلی کارڈیگن کی کالر کے ساتھ پن کر دی۔ ان کے سر پر پیار کیا اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔

نونی نے یہ بات فوراً نوٹ کی کہ مس پنہارو اس وقت بہت پر سکون نظر آ رہی تھیں۔ اور چہرے کی کرختگی میں بھی کمی آ گئی تھی۔ موسم بدل رہا تھا۔ جاڑے کی ہواؤں کی تندی اور یخ بستگی میں خاصی کمی آ گئی تھی۔ صبح دم چڑھتے سورج کی پہلی پہلی کرنوں کی نرم نرم حدت بھلی لگنے لگی تھی۔ یہ سن ساٹھ کی آخری دہائی کے ماہ سال تھے۔ انہی دنوں اس کے آبا نے ڈھاکے سے فون کیا تھا وہ باریسال سے چند دن کے لیے ڈھاکہ آئے تھے۔ آواز میں افسردگی اور پسپائی تھی۔ وہ اس کی امی سے کہہ رہے تھے۔ یار تم ٹھیک ہی کہتی تھیں۔۔۔ کہ بچوں کے مستقبل کی سوچو۔ اور ہمارا وہ انجینیئر منیر الاسلام جو اس پراجیکٹ پر میرے ساتھ ہے یہی کہتا ہے۔ بھائی ٹھیک ہی کہتا تھا۔ یہ اگرتلہ خالی خولی افواہ نہیں نہ ہی یہ حکومت کا چلایا ہوا اسٹنٹ ہے۔ وہ بھی سچ کہتا ہے تم بھی سچ کہتی تھیں۔ اچھا ہی کیا جو بچوں کے داخلے وہاں کروا دیئے۔ اور ہاں نونی بدمعاش (وہ اس کے نام کے ساتھ یہی لاحقہ لگاتے تھے) کا کیا حال ہے داخلہ ہوا۔۔۔ چلو ٹھیک ہے فی الحال وہاں دل لگا رہے گا۔ اور ہاں پہلے تم جاب کرنے کہتی تھیں میں منع کر دیتا تھا۔ ٹھیک ہے تم جاب کر لو تو بہتر ہے۔ آگے نہ جانے کیا ہو۔ ویسے وہاں تمہارے اکاؤنٹس میں پیسے جمع کرواتا رہوں گا۔ اچھا اللہ حافظ ہو ہم سب کا۔ یہ کہتے کہتے فون بند کر دیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئیں۔۔۔ واقعی اللہ ہی حافظ ہے۔ آنے والے وقت کے قدموں کی آہٹ میں بڑی دھمک ہے۔ مجھے تو صاف صاف سنائی دیتی ہے۔۔۔ شکر ہے کہ اب ان کو عقل آئی ہے کہ مجھے جاب کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ سچ ہے آنے والے سمے کے تیور خود ہی عقل دے دیتے ہیں۔۔۔

انہوں نے جاب کر لی۔ ایک پرائیویٹ کالج میں۔۔۔ ابھی نیشنلائزیشن اور پرائیوٹائزیشن کا چکر نہیں چلا تھا اور بہت سے تعلیم یافتہ بے روزگار ضرورت مندوں کا برا بھلا سہارا بن جاتا تھا۔ جاب سے پہلے ہی تین دن پہلے انہوں نے نونی کو مطلع کر دیا تھا کہ اب میں تم کو گیارہ بجے لینے نہیں آ سکوں گی۔۔۔ میں نے جوب کر لی ہے اور تم کو اب ایک بجے تک میرا انتظار کرنا پڑے گا۔

ٹھیک ہے میڈم میں ایک بجے تک اسکول میں آپ کا انتظار کر لوں گا۔ مس پنہارو کے پاس بیٹھ کر۔۔۔ وہ مسکرایا۔ ”نونی تم بور نہیں ہو گے ان کے ساتھ بیٹھ کر؟۔۔۔ تم ہی تو کہتے ہو وہ بہت کریکی۔۔۔ اور بد دماغ خاتون ہیں“۔

نہیں نہیں۔۔ شی از اے ویری انٹرسٹنگ کیریکٹر (She is a very interesting character) وہ ہنس پڑیں اور تم۔۔۔ تم بھی تو اپنی عمر سے زیادہ بڑی باتیں کرتے ہو۔۔۔ انہوں نے اس کے سر پر پیار کیا اور ماں بیٹے کے درمیان معاہدہ ہو گیا۔

موسم کوئی بھی ہوتا مسز پنہارو کا اسکول بارہ بجے کے بعد بند ہو جاتا۔ وہ بچوں کو زیادہ دیر تک اسکول کے قواعد وضوابط کے پنجرے میں قید رکھنے کی قائل نہیں تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ بڑھتی ہوئی بلوغت کی عمر میں پہلے پہلے قدم رکھنے والے بچوں کی تربیت میں صرف تھکے درماندہ اور اپنی الجھنوں میں مبتلا، اجرتی استادوں کے علاوہ گھر اور خاندان کا زیادہ حصہ ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ کھلے میدانوں اور سرسبز پارکوں کی ایک اپنی تربیت اور فلسفہ ہوتا ہے جو وہ از خود اپنے شعور اور ذاتی صوابدیدی تجربے سے حاصل کرتا ہے۔ اسکول تو اس کے مدرکھات اور فلسفہ حیات کو بیدار کرنے کا فرض ادا کرتا ہے جو اس کے درسی نصاب کی تعلیم کے دوران اس کے اندر زندگی اور پائندگی عطا کرتا ہے۔۔۔ بہرحال یہ ان کی اپنی سوچ تھی۔ اور وہ ایک بوڑھی خاتون تھیں جو اپنی سوچ پر سختی سے عمل پیرا تھیں۔

اسکول میں بارہ بجے کے بعد تک صرف وہی بچے باقی رہ جاتے تھے جن کی مائیں کسی اسکول کالج یا دفتر میں ملازمت کر رہی ہوتی تھیں۔ اور اپنا پنے اوقات پر آ کر بچوں کو لے جاتیں۔ ان میں سے کئی خواتین جن کے شوہر کسی نہ کسی ملازمت فوجی یا کسی دوسری کاروباری مجبوری کے تحت مشرقی پاکستان میں اپنی اپنی حد تک خدمات انجام دے رہے تھے۔ سونی کو بھی گیارہ بجے کی پڑھائی سے فارغ ہونے کے بعد ایک بجے تک اسکول میں رکنا پڑتا تھا۔ دوسرے بچے تو زیادہ تر پچھلے کمپاؤنڈ میں کھیل کود کر وقت گزاری کرتے لیکن نونی اور شیر عالم اپنا وقت مسز پنہارو کی حرکات وسکنات پر کڑی نظر رکھنے اور پھر ان پر تبصرے کرنے میں گذارتے رہے۔

بارہ بجے کے قریب آیا ڈائننگ ٹیبل پر لنچ سرو کرتی۔ ڈائننگ ٹیبل پر مسز پنہارو کے ہاتھ کی کروشیا سے بنائی میز کی خوبصورت کور پر ٹیبل میٹس لگاتی اور بہت پرانے ٹریڈ مارک والے ڈنر سیٹ کی دو پلیٹیں چھری چمچوں جیسے لوازمات سے آراستہ کرتی تھی۔ پھر پیتل کی ایک چھوٹی سے ڈنر گونگ گھنٹی بجا کر اطلاع دیتی۔ تو اس کی تیسری آواز پر مسز پنہارو پچھلے دروازے سے داخل ہوتیں۔ اسکول والا لباس تبدیل کر کے گھر کے سادہ نرم مزم لباس میں نہائی دھوئی وہ داخل ہوتیں اور ٹیبل کے ہیڈ پر مس پنہارو کے ساتھ بیٹھ جاتیں تو آیا لنچ سرو کرتی۔ وہ بڑی توجہ اور نرمی سے اس مجسمے جیسی خاتون کی پلیٹ میں ایک ایک چیز

ڈالتیں۔۔۔لنچ کی اس تمام تفصیل کے بارے میں ایک دن شیر عالم نے ان سے پوچھا۔ اب صرف ایک بوڑھی خاتون ہیں اور ایک ہیا سٹیچولائیک اینگری اولڈ وومن۔ آپ کھانے کا اہتمام کیوں کرتی ہیں۔ آپ کو تو ایک ایک برگر بھی کافی ہوتا ہے۔۔۔شیر عالم کے اس سوال پر وہ مسکرائی تھیں۔ انہوں نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔۔۔اوہ یوٹو اوورکلیور بوائز {oh you two overclever boys) ”میری بات سنو یہ زندگی جو ہمیں ہمارے خدا کی طرف سے ایک بہت خوبصورت تحفہ ہے ایک بہت قیمتی انعام ہے۔ یہ بڑی احتیاط سے برتنے اور عزت کرنے کے قابل ہے اور ہم اس کی عزت اور قدر زیادہ سے خوبصورت اور سلیقے سے گذار کر ہی کر سکتے ہیں۔۔۔میرے بچو زندگی صرف برگر کھا کر گذارنے کا نام نہیں ہے“۔

مسز پنہارو کے اسکول کی ہفتہ اتوار کو چھٹی ہوتی تھی پیر کے روز اس کو تیز زکام اور حرارت ہو گئی تھی وہ دو دن اسکول نہیں جا سکا تھا۔ اور بدھ کے روز وہ اسکول گیا اور پڑھائی سے فارغ ہو کر جب ان کی جانب متوجہ ہوا تو ان کو نہایت برافروختگی کے عالم میں کسی وجہ سے بہت کبیدہ اور ٹھس نظر آ رہی تھیں۔ اس نے ان کو سمجھانے کی کوشش بھی کی ان ہی کی طرح منہ کا ٹیڑھا پوز بنا کر سمجھانا چاہا کہ اس طرح نہیں بلکہ اس طرح منہ کا پوز ٹھیک رہتا ہے تو وہ اور بھی زیادہ پتھر کی جیسی ہو گئیں۔ حسب معمول آیا نے لنچ سرو کیا۔ اور مسز پنہارو نے ان کے قریب بیٹھ کر ان کی پلیٹ میں کھانا ڈالا تو انہوں نے ایک دفعہ ہی ہاتھ مار کر سوپ کا پیالہ اور پلیٹ میز کے نیچے گرا دی۔

نونی اور شیر عالم جو اپنی سیٹ پر بیٹھے ایک طرف لوڈو کھیل رہے تھے۔ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ مسز پنہارو ہمیشہ کی طرح پرسکون تھیں۔

”آج کیا بات بن گیا آیا؟“

”میڈم آج پنہارو بابا ہم کو بولا دال چاول بناؤ۔ ہم نے بھول کر پلاؤ بنا دیا۔ پھر یہ تو آج صبوں (صبح) سے ناراض بیٹھا ہے“۔

”کوئی بات نہیں آج اس کے بلیک موڈ کا دن ہے۔ تم ایسا کرو ابھی تم اس کے لیے دال چاول بناؤ اور ہماری پلیٹ ہمارے بیڈ روم میں پہنچاؤ۔

یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکلنے لگیں تو نونی ان کا راستہ روک کر کھڑا تھا۔ ”میڈم مے آئی سے سم ورڈز ٹو یو“ (میڈم میں آپ سے کچھ کہہ سکتا ہوں)۔

"وائی نوٹ (کیوں نہیں) ضرور۔۔۔ آؤ ہم چل کر آفس میں بات کرتے ہیں۔۔۔" آفس میں اس نے پہلی بات تو یہ کہی "آئی ایم سوری ٹو سے میڈم یو آر سپوئلنگ ہر۔ (معاف کیجئے گا آپ انہیں بگاڑ رہی ہیں۔

نو ڈیئر آئی ایم نوٹ اسپوائلنگ ہر۔ (نہیں ڈیئر میں اس کو بگاڑ نہیں رہی) بٹ ٹو ڈے شی واز رُوڈ ٹو یو اینڈ مس بیہیوڈ (مگر آج انہوں نے آپ سے بدتمیزی کی ہے) ۔۔۔ وہ بہت رُوڈ اور ضدی خاتون ہیں۔ انہوں نے بہت نرمی سے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ آؤ بچے اس طرف بیٹھ کر بات کرو۔ دیکھو وہ نہ بدتمیز ہیں اور نہ ضدی ہے مگر وہ بہت بیمار اور غم زدہ خاتون ہیں۔

"مگر پھر بھی وہ بچہ تو نہیں بڑی عورت ہیں میرا تو خیال ہے وہ اپنی آیا کو اور آپ کو بہت تنگ کرتی ہیں۔ آفٹر آل شی از گرون اپ اولڈ لیڈی" ۔ وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔

بات یہ ہے نونی کہ وہ تھوڑی سی مینٹلی ڈسٹربڈ ہیں۔

"اگر وہ مینٹلی ڈسٹربڈ ہیں تو وائی ڈونٹ یو پٹ ہر ان مینٹل اسائلم۔۔۔ یو آر ٹو اولڈ ٹو لک آفٹر اے سٹبرن لیڈی" اب وہ اتنی پاگل بھی نہیں ہیں اور تم کو نہیں معلوم کہ پاگل خانے جا کر ایسے لوگ جو پوری طرح پاگل نہیں ہوتے وہ کتنے پریشان اور دکھی ہوتے ہیں ہم کو وہ اپنے دل کی بات اور احساس بتا تو نہیں سکتے مگر اندر سے اور زیادہ دکھی ہو کر اور بھی پاگل ہو جاتے ہیں۔

اچھا تو ایک ترکیب اور ہو سکتی ہے۔۔۔ اصل میں وہ مسز پنہارو کے لیے بہت فکر مند تھا کہ وہ اتنی بوڑھی ہیں جبکہ میس پنہاروان کے مقابلے میں کافی جوان نظر آتی ہیں۔۔۔ اس کی اِس مسئلہ پر اتنی زیادہ دلچسپی پر وہ مسکرائیں۔۔۔ "ہاں تو وہ کیا ترکیب ہو سکتی ہے تمہارے خیال میں" ۔ وہ یہ کہ اب ان کو اولڈ ہاؤس میں داخل کروا دیں۔ انہوں نے چونک کر اس کی جانب یوں دیکھا تھا جیسے یہ انہیں بری لگی ہو۔ اولڈ ہاؤس۔۔۔ اوہ نو۔۔۔ ہوریبل پلیس (خوفناک جگہ) وہاں کے رہنے والے دیکھنے میں تو زندہ ہوتے ہیں۔ مگر وہ جذباتی اور نفسیاتی طور پر مر چکے ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہاں کام کرنے والے لوگ بھی اور سوشل ورکر قسم کے انسانی ہمدردی کے خیال سے آنے والے لوگ اپنی باتوں اور اپنی رحم بھری نگاہوں سے یہی احساس دلاتے ہیں کہ تم قابل رحم زندہ لاشیں ہو اور تم کو ہمدردی اور رحم کے علاوہ کچھ نہیں چاہیے۔ جب اچھے خاصے چلنے پھرنے کے لائق بوڑھوں کے ساتھ یہ رویہ ہوتا ہے تو اس جیسی معذور عورت کا کیا حال ہوگا۔ اف خدایا میں سوچ بھی نہیں سکتی اور نونی بچے میری بات یاد رکھنا ہر شخص کو اپنی صلیب خود اٹھانا چاہیے میرا مطلب اپنی ذمہ داری خود اٹھانا

چاہیے۔ وہ میری ذمہ داری ہے۔ وہ میرے مرحوم شوہر کی بہن ہے۔ دیکھو یہ گھر اور اس میں موجود سارا فرنیچر اس کے بھائی کے پیسے سے خریدا گیا ہے۔ وہ اس گھر کا ایک فرد ہے جو کبھی یہاں چلتی پھرتی خوش رہتی تھی۔ تم نے اس کمرے میں جو بڑا سا پیانو دیکھا ہے یہ اس کی اپنی کمائی کے پیسے سے خریدا گیا تھا۔ یہ پیانو بڑی پیاری دھنیں بجاتی تھی۔ اب کبھی کبھی میں اس کی خواہش پر اس کے لیے بجاتی ہوں تو اس کی آنکھوں سے آنسو پھسل پھسل کر اس کے چہرے کو بھگو دیتے ہیں۔ تم سوچو کو میں کس طرح اس بچاری کو زندہ لاشوں کے گورستان میں چھوڑ آؤں۔

دیوار پر لگے قدیم کلاک نے ایک بجا دیا تھا۔ سامنے والے دروازے سے اس کی اماں آتی نظر آئیں۔ مسز پنہارو کے آفس میں نونی کو اور ان کو اتنی سنجیدگی سے بیٹھا دیکھ کر وہیں سے بول پڑیں پھر کوئی مسئلہ و کوئی شرارت! مسز پنہارو میں شرمندہ ہوں میرا بیٹا آپ کو اپنے سوالوں اور مسئلوں سے پریشان کرتا رہتا ہے۔

نہیں نہیں! ایسا بالکل نہیں ہے۔ تمہارا بیٹا بہت ذہین اور ہمدرد ہے ہم آج ایک اہم انسانی مسئلہ پر سنجیدہ بات کر رہے تھے۔

ریئلی۔ ماں کی آنکھیں فخریہ جگ مگ کرنے لگیں۔

بعض وقت کچھ لوگوں کو یا سب ہی لوگوں کو ایسا لگتا ہے جیسے زندگی کی کتاب کے ورق تیزی سے الٹے جا رہے ہیں جیسے کوئی پڑھنے والا بغیر پڑھے ہی صفحے پلٹے جا رہا ہے ہر منظر اور موقع اتنی تیزی سے سامنے آتا اور گذر جاتا ہے جیسے کوئی ٹیلی وژن کے کسی چینل کو بھی اسکرین پر ٹھہرا کر اور جم کے دیکھنے نہیں دے رہا ہے۔ ایسے میں وہ افسردگی سے ڈوبی ہوئی آواز میں کہہ اٹھتی تھیں۔ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں۔ سو ایسے ہی مارچ کے نرم نرم دنوں کا آغاز تھا۔ ان کے گھر کے اندرونی حصے میں کھڑے بادام اور آلو چے کے پیڑوں پر شگوفے آ رہے تھے۔ انار کے نازک اندام پودے پر اس کی زندگی کی پہلی پہلی بہار سرخ اور شاداب کلیوں کے ساتھ اتری تھی۔

یہ اس کی پہلی پہلی بہار ہے۔ اور آج ہمارے نونی کی زندگی کی پہلی پہلی اور دیرینہ آرزو کی تکمیل کا دن ہے۔ صبح کی ڈاک سے نونی کے داخلہ ٹیسٹ کی تاریخ اور وقت کی اطلاع ملی تھی۔ اور وہی خط لے کر وہ اب اسکول کی طرف اس کو خبر دینے اور مسز پنہارو کو کل کی غیر حاضری کی درخواست دینے جا رہی تھیں۔

”تو کل تم ٹیسٹ دینے جاؤ گے۔ مجھے امید ہے بہت اچھا کرو گے“ ---اور جب وہ اپنی اماں کے ساتھ آفس سے باہر نکل رہا تھا۔ تو انہوں نے آگے بڑھ کر کہا۔ بیٹ آف لک مائی سن۔ ہوپ یو ول ڈو ویری ویل۔ انہوں نے اس کے سر پر پیار کیا۔ گوڈ بلس یو۔ پھر وہ مڑیں اور اپنی آفس ٹیبل پر جا کر بیٹھ گئیں۔ ان کے سامنے گلدان میں ایک شاداب اور سرخ گلاب مسکرا رہا تھا۔ ان کی کرسی کے عقب والے دریچے کے ساتھ پھیلی ہوئی انگور کی بیل میں چھپی ایک بلبل پورے جوش اور خروش سے چہچہا رہی تھی۔

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے اسکول کے گیٹ کی طرف دیکھا۔

وہ سٹیچو کی طرح ڈائننگ چیئر پر بیٹھی منہ ٹیڑھا کیے خلاء میں دیکھ رہی ہوں گی سامنے والے گلابوں پر نظر ڈالے بغیر وہ کب تک یوں ہی بیٹھی رہا کریں گی؟ ہمیشہ یا پھر---یا پھر---

نونی تمہاری اتنی بڑی خواہش پوری ہوئی ہے۔ تم تو خوش ہو نا؟

”ٹھیک ہے“۔ بڑی بردباری سے کہا۔ آواز میں قدرے فکرمندی تھی۔

کیوں کیا بات ہے؟ تم کچھ زیادہ خوش نہیں لگ رہے ہو---

نہیں ٹھیک ہے میں سوچ رہا تھا ابھی اس اسکول میں کچھ دن اور بھی پڑھائی ہو سکتی ہے۔ اگر میں نے ٹیسٹ پاس نہ کیا تو پھر مجھے کسی دوسرے اسکول میں نہ ڈالدیجئے گا۔ یہی ٹھیک رہے گا۔

جواب دیے بغیر وہ سوچتی رہیں عجیب ہی ہے یہ کہ---نونی نئے سیشن کے شروع ہونے تک تو تم کو اسی اسکول میں پڑھنا ہے۔ انہوں نے اس کو تسلی دی تھی۔ اور جب وہ اس کی ٹیسٹ رپورٹ لینے گئیں تو حیران رہ گئیں۔

”نہیں ایسے کیسے ہو سکتا ہے“۔

”ہو بھی سکتا ہے کبھی کبھی ایسا ہی ہوتا ہے“۔

”مگر یہ ایک بچے پر زیادہ بوجھ ڈالنا ہوگا“۔

بوجھ نہیں یہ انصاف ہوگا میڈم ہم نے اس روز اس کے دو ٹیسٹ لیے تھے۔ جب ہی یہ آپ کے پاس دیر سے نکل کر آیا تھا“۔

مگر یہ اپنے اسٹنڈرڈ سے دو کلاس آگے کیسے چل سکے گا اور پھر اگر نہ چل سکا تو پھر یہ اس کی نفسیات اور ذہن پر برا اثر ڈالے گا“۔

”آپ مطمئن رہیں ایسا نہ ہوگا“۔

اگلے تین ماہ تک اسی مسز پنہارو اسکول میں جانا تھا۔ اور جب وہ اس کی رپورٹ لے کر حیران پریشان سی مسز پنہارو کے پاس گئیں تو حیران ہونے کی بجائے ان کا چہرہ خوشی دمک رہا تھا۔ مجھے یہی امید تھی نونی سے۔ سو پھر اگلے چند ماہ کے بعد جس روز وہ اس کو مسز پنہارو سے خدا حافظ کہنے لے جا رہی تھیں تو راستے میں اس نے آہستہ سے کہا بیکری تک چلیں گی؟ کیوں؟ “ان کو ایک کیک نہ دیدیں”۔ بیکری سے ایک ذرا فاصلے پر بڑے پھول والے کی دکان تھی۔ لیونڈر کے پھولوں کا ایک نازک سا گلدستہ لینے کے بعد اس نے پھر فرمائش کی “ایک ذرا دیر کو گفٹ شاپ کی دکان پر رک جائیں”۔ دکان میں وہ خود اتر کر گیا۔ ایک خوبصورت سا گفٹ پیک کیا ہوا ایک چھوٹا ڈبہ پکڑے ہوئے واپس آیا۔

“یہ کیا ہے نونو؟”

بند پیکٹ ان کے کان سے لگا کر ہلایا۔ اندر سے بڑی اداس اور دلنواز ٹیونز کے بجنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

مسز پنہارو سے خدا حافظ کہنے کے بعد مس پنہارو کے پاس جا کر وہ ڈبہ ان کے ہاتھ کے قریب کیا۔ “یہ آپ کے لیے ہے” اور خدا حافظ۔

ٹیڑھے منہ سے مسکرانے کی کوشش کے علاوہ منجمد آنکھوں میں نرمی سی لہرائی تھی۔

نادیدہ ہاتھ وقت کی کتاب کے ورق تیزی سے پلٹ رہا تھا۔ افراد کے گھروں کے چینل اس تیزی سے بدلتے جا رہے تھے کہ کوئی منظر ٹھہرتا ہی نہیں تھا۔ یہ لوح محفوظ پر لکھنے جانے والے نوشتوں کی تحریریں رقم کرنے والے اتنی عجلت میں کیوں ہیں۔ وہ جو نونی کی ماں تھی ذہنی طور پر نونی سے کسی طرح کم نہ تھی دل و دماغ سوالوں سے معمور، لب پر مہر خامشی، اور آنے والی سر واردات کا صبر و تحمل سے استقبال کرنا۔ شوہر کا فون بھی کم کم آتا تھا۔ ایک بار انہوں نے فون پر کہا تھا “یہاں جو کچھ ہو رہا ہے مجھے احساس ہے وہاں پر بہت سے خاندانوں اور گھروں پر وہاں بھی اثر انداز ہو رہا ہے۔ مجھے یقین ہے تم گھبرانے والی اور ہتھیار ڈالنے والی خاتون نہیں ہو اور مجھے بچوں کے حال اور مستقبل کے بارے میں کوئی فکر اور تردد نہیں۔ اس لیے کہ مجھے معلوم ہے کہ راہ حیات کے کٹھن راہوں کے مسافر میرے بچے ایک ایسی مستحکم اور مضبوط بوگی کے سوار ہیں جو ہر مسافر کو اس کی منزل تک پہنچا کر دم لے گی۔ یہ فون انہوں نے کسی نامعلوم مقام سے کیا تھا۔ اور یہ وسط مارچ 1971ء کی کوئی تاریخ تھی۔

ان کا آخری فون جیسور سے آیا تھا۔ اور انہوں نے سب بچوں کو باری باری فون پر بلا کر بات کی

تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ خبریں کبھی ہمیں خوشی دیتی ہیں تو کوئی بری خبر بھی ہوتی ہے اور اس کو سننے کے لیے صبر اور حوصلہ سے کام لینا ضروری ہوتا۔

اس سے آگے کی تفصیلات جاننے کے لیے نونی کی ڈائری سے لیے ہوئے چند اقتباسات۔۔۔

آج وہی مارچ کی وسطی تاریخیں ہیں لیکن کیلنڈر پر 1987ء ہے۔ یعنی اس 71ء کے مارچ سے آج تک کل سولہ سال کا عرصہ گذر چکا ہے اس عرصے میں کیا کچھ گذر گیا۔ اب ان رنج وراحت کے شب وروز کے بیان کی تفصیل کیا ضروری ہے۔ میں اب صرف اتنا ہی کہوں گا ہمارے باپ نے ایک مرتبہ فون پر کہا تھا کہ تمہاری ماں ایک ایسی مضبوط اور مستحکم بوگی ہے جو اپنے سواروں کو ایک ایک کی منزل پر پہنچا کر ہی دم لے گی۔ گھبرانا نہیں۔۔۔ ہم کیا گھبراتے، ہم جس بوگی کے سوار تھے وہ اتنی مستعد اور دھن کی پکی تھی کہ خود دم لیا نہ ہمیں دم لینے دیا۔ بس ناک کی سیدھ میں چلتی چلی گئی۔ ہم میں سے ہر ایک کو باری باری منزل تک پہنچا کر ہی دم لیا۔۔۔ اپیا اپنے انجینئر شوہر کے ساتھ جوہانسبرگ میں ہیں۔ بھیا فزکس میں ماسٹر کی ڈگری لے کر کوریا کے کسی پروجیکٹ پر کام کرنے کے ساتھ ساتھ کورین لڑکی اپنی رفیق حیات بنا چکے ہیں۔ اپیا نے ہالینڈ میں اپنے ساتھی نفسیاتی ڈاکٹر سے شادی کرلی ہے جن تعلق بنگلہ دیش سے ہجرت کرنے والے خاندان سے ہے وہ سب وہیں جا بسے ہیں۔

میرا یہ ہے کہ اپنی بوگی کو خالی ڈھنڈھار چھوڑ کر جانے کے حق میں نہیں تھا۔ مگر ہماری اس بوگی کی ول پاور (قوت ارادی) کے سامنے کسی کی چل تھوڑی سکتی ہے۔ یہ ان کی اٹل قوت ادادی ہی تو تھی کہ مجھے گریجویشن کے فوراً بعد ٹوفل کا امتحان دینا پڑا اور اعلیٰ درجے میں پاس کرنے کے نتیجے میں آج میں بوسٹن کی اعلیٰ درجے کی یونیورسٹی میں موجود ہوں۔ وہ مجھے میری فلائٹ پر رخصت کرنے آئی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش، ہنستی مسکراتی کیا مجال جو اپنے بالکل تنہا رہ جانے کا ملال ہو نہ گھبراہٹ۔ البتہ جب میں چیکنگ کے لیے اندر جا رہا تو مجھے ان کی آنکھوں میں احساس تنہائی کے ملال اور افسردگی کی دبی دبی سے ایک آہٹ محسوس ہوئی تھی۔ البتہ میں اپنی سیٹ پر بیٹھ کر بہت رویا۔ اور میرا ہم نشین مسافر مجھے حیرت سے دیکھتا رہا تھا۔

وہی مارچ کے وسط کی کوئی سی تاریخ ہے وہی پہلی والی۔ اور سنہ اتنا بدلا ہوا کہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ زندگی کے سفر میں کتنے سنہ بدلتے چلے گئے اور ہمیں احساس بھی نہ ہوا۔ اور مجھے یہاں آئے ہوئے بھی دو سال ہو گئے۔ میں نے یہاں قانون کے ایم فل کا انتخاب کیا ہے۔ کیوں۔۔۔ یہ تو مجھے خود نہیں معلوم۔ اب

جا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ ہمارے پاس بہت سی باتوں کا جواب نہیں ہوتا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ میں نے قانون کا کیوں انتخاب کیا۔ میں تو شروع سے ہی پروفیسر بننے کا خواب دیکھا کرتا۔ خیر لاء پروفیسر بھی بن سکتا ہوں۔

اتنی مصروفیت ہے کہ بعض وقت دن اور تاریخ کا خیال ہی نہیں۔

خیر دن تاریخیں اور سنہ اتنے اہم بھی نہیں ہوتے جتنے ہمارے ذاتی تجربات اور یادیں ہوتی ہیں۔

آج جب لنچ کرنے کے ارادے سے ایک بالکل ہی چھوٹے سے خوبصورت ریستوران میں داخل ہوا تو کاؤنٹر پر جو ایک بوڑھی خاتون بیٹھی تھیں۔۔۔ میں بالکل بھول گیا کہ میں کہاں ہوں اور ایک اجنبی خاتون سے اتنی اپنائیت سے سوال کر رہا ہوں کہ آپ یہاں کہاں' اور جب وہ چونک کر حیرت سے مجھے دیکھنے لگیں تو اتنا شرمندہ اور پشیمان ہوا کہ کیا بتاؤں۔۔۔۔ ویسے یہاں آ کر اس اتنے بڑے کیمپس میں مجھے کبھی کبھی ان کاوران کے اسکول کا خیال آتا ہے۔۔۔ آج میں نے اماں کو لکھا ہے کہ کبھی کبھی ان کے ہو آیا کریں۔ اماں کے علاوہ میں نے شیر عالم کو بھی لکھا ہے۔۔۔ اماں کے علاوہ میں شیر عالم کے علاوہ کسی اور کو خط نہیں لکھتا۔ پاکستان میں وہی تو ایک ہے جسے کہا جا سکتا ہے کہ دوست تو وہی ہوتا ہے جو ہمارے برے وقتوں میں بھی دوست رہتا ہے۔

اگست کی شاید دس تاریخ ہے صبح تو دیکھی تھی پر اب اس وقت ٹھیک سے یاد نہیں۔۔۔ ہاں البتہ سنہ 1995 ہے۔ اور مجھے خوب یاد ہے۔ ہاں تو یہ اگست کا مہینہ ہے۔ ہمارے پاکستان میں ان دنوں اسکولوں کالجوں کے داخلوں کا موسم ہوتا ہے بڑی افراتفری پڑی ہوتی تھی والدین کو تو وختہ ہی پڑ جاتا ہے۔ ہر طرف سفارشیں اور تعلقات ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ اسکولوں کالجوں کے گیٹوں اور آفسوں کے دروازوں میلوں پر ہونے والے جمگھٹوں کا سا سماں ہوتا ہے۔ ہاں اسی مہینے کی کسی تاریخ کو تو اماں میرا داخلہ کروانے مسز پنہارو کے اسکول لے کر گئیں تھیں اور وہاں کتنی آسانی سے داخلہ ہو گیا تھا۔ شیر عالم بھی اسی دن داخل ہوا تھا۔ میرے بعد دوسرا داخلہ اسی کا تھا۔ ہاں! خوب یاد آیا کل مجھے شیر عالم کا بھی خط ملا تھا۔ خط کیا ہے ایک دکھڑا ہے۔ ایک نہ ختم ہونے والی داستان۔۔۔ بات یہ ہے شیر عالم نے تو سینئر کیمبرج کے بعد ہتھیار ڈال دیئے تھے کہ سنہ 71ء کے بعد جو نیشنلائزیشن شروع ہوا تو ایسا چکر چلا کہ عام گھرانوں کے تو بچوں کا پاس ہونا اور داخلہ ایک ایسا المناک حادثہ ہفت خواں بنا کہ جس کے تمام مرحلے طے کرنا ایک شریف مڈل کلاس گھرانے کے والدین کے بس کی بات نہیں۔ ایک مرحلہ، ایک سوال ہو تو بندہ کچھ نہ کچھ تو طے کر ہی لیتا، پر وہاں تو ایک مرحلہ ووٹ کس کو دیا تھا۔ پارٹی کے کس اہم ممبر کی سفارش ہے۔ پھر رشوت کی رقوم کے

معاملات گیٹ پر کھڑے چوکیدار کی بخشش کے نام پر آگے قاصد پھر ہیڈ کلرک۔ وہاں سے نبٹ کر پرنسپل آفس کے باہر کھڑے ٹاؤٹوں سے نپٹنا۔۔۔ تنگ آ کر ایک کالج گیٹ سے باہر نکل کر اس کے اباجی اس پر چیخ پڑے۔ الو کے پٹھے تجھے ضرور ہی کیمبرج پاس کرنا تھا اب یہ ڈکیت لوگ تیرے رزلٹ سے سمجھتے ہیں تو کسی وڈیرے، نواب زادے کا پتر ہے۔ بھرے گا ان کی جیبیں۔ چل اب جو تیری اوقات ہے وہیں چل ایک گھٹیا سے گمنام کالج میں داخلہ لے کر شیر عالم نے کسی طرح ایف اے پاس کر لیا تو اباجی نے اعلان کر دیا ”بس کر جا“۔۔۔ انہوں نے کسی پارٹی ممبر اسمبلی کے مالی اور پھر بیگم کی فرمائش سے واپڈا کے جونیئر کلرکوں میں بھرتی کروا دیا۔۔۔ اور شیر عالم کو پکڑ کر ایک ایسے ہی کسی گھٹیا سے کالج سے مرکھپ کے بی ایس سی کرنے والی کسی بھانجی بھتیجی سے اس کا نکاح پڑھوا دیا یہ کہہ کر کہ اپنی اوقات میں رہ۔ اور شیر عالم نے اپنی اوقات میں رہ کر دو بیٹے بھی کھڑے کر لیے۔۔۔ اس دوران ڈی نیشنلائزیشن اور پھر پرائیوٹائزیشن کا دور چل پڑا نتیجہ یہ کہ اب دونوں ماں باپ کی تنخواہیں مل کر بھی ایک لڑکے کی نرسری اور پریپ کی دوسرے لڑکے کی فیس داخلہ پوری نہیں پڑتی۔ دونوں دن بھر کی جوب کے بعد راتوں کو ٹیوشنیں پڑھا رہے ہیں۔ فرصت کے اوقات میں اگر یک وقت اکٹھا بیٹھ جائیں تو معر کے رن پڑنا شروع ہو جاتے ہیں لڑکے گھبرا کر رونا شروع کر دیتے ہیں۔۔۔ اب تو بتا نونی یار میں مسز پنہارو کے اسکول والے دنوں کو کیوں نہ یاد کروں۔ خط کی آخری سطروں میں لکھا تھا۔ یار نونی مس پنہارو فوت ہو گئی۔ ڈائننگ ٹیبل والی کرسی اب بھی گلابوں کے سامنے والے دریچے کے رُخ پر رکھی ہے۔۔۔ مس پنہارو کے بغیر۔ مسز پنہارو کو بہت غم ہے۔ انہوں نے اپنا اسکول ختم کر دیا ہے۔ مگر اسکول کے نام والی تختی ابھی گیراج کی پیشانی پر سجی ہے۔

نونی کے روزنامچے کا آخری اندراج

آج میں کوئی دن کوئی تاریخ یا سنہ درج کرنے کے موڈ میں نہیں۔

بات یہ ہے اب ہمارے دن تاریخ اور سنہ بدل ہی نہیں رہے۔ سب ایک سے مر تاریخ وہی حالات اپنی جگہ پر ایک ہی چینل ٹھہر کر رہ گیا ہے جس پر کبھی کبھی No Signal لکھا نظر آئے۔

ہاں آج کلاس سے واپسی پر اماں کا خط ملا ہے۔ سارا خط ہی مسز پنہارو کے ذکر سے بھرا ہوا ہے۔ میں ایسٹر سنڈے سے پہلے ان سے ملنے گئی۔ ان کے لیے کسٹرڈ، سوپ بنا کر لے گئی تھی۔ تمہارا بھیجا ہوا کارڈ دیکھ کر بہت خوش تھیں تمہیں دعائیں دیتی رہیں۔ وہ اب بالکل اکیلی ہیں۔ کہہ رہی تھیں اب اس گھر میں صرف تین بوڑھے لوگ رہ رہے ہیں۔ میں، بوڑھی آیا اور بوڑھا مالی۔۔۔ پھر خود ہی ہنس پڑیں ”یہ گھر جو پہلے

نوعمر اور نوخیز بچوں کا اسکول تھا۔ اب اولڈ ہاؤس بن چکا ہے”---اس روز وہ بہت باتیں کرنے کے موڈ میں تھیں---میں نے یہ اسکول پنہارو کے مرنے کے کئی سال بعد قائم کیا تھا۔ جب مس پنہارو میرا مطلب ہے میری نند ڈیزی ایسی بیماری میں مبتلا ہوئی---میں نے اپنی ملازمت اسی لیے چھوڑ دی کہ اس کو ہر وقت نگہداشت کی ضرورت ہے اگر میں گھر سے غائب رہی تو آیا اس کی کمپنی دے سکتی ہے نہ مناسب دیکھ بھال---تو خیر اس کے بعد اب میرے اندر اسکول چلانے کی ہمت نہیں رہی ہے---وہ تھوڑی سی نم دیدہ ہو کر خلاء میں گھورتی رہی تھیں۔ لوگ نہیں معلوم کیوں دوسروں کے جذبات کو سمجھتے نہیں اس علاقے کے اور بعض بعض دفعہ کچھ باہر کے لوگ بار بار مجھ سے پوچھتے ہیں میڈم آپ “ہوم” کب واپس جا رہی ہیں؟ لو بھلا ان کی عقل ماری گئی ہے---میں یہاں بچی سے جوان ہو کر بوڑھی ہوتی بیٹھی ہوں۔ یہ لوگ میرے ہیں، یہ زمین یہ گھر میرا ہے۔ وہ جگہ میرے لیے اجنبی ہو گی وہ آب و ہوا، وہاں کا دانہ پانی مجھے کب راس آئے گا---میں جانتی ہوں یہ کیوں کہہ رہے ہیں۔ آپ یہ گھر بیچ کر کسی اچھے ہوسٹل میں رہ سکتی ہیں۔ یہ جو ہمارے گھر کے ساتھ پچھلی طرف بڑا شاندار اسکول کسی کانونٹ کے نام پر تعمیر ہو رہا ہے اس کو توسیع دینے کے لیے یہ جگہ درکار ہے---اور اب تو مجھے دھمکیاں بھی مل رہی ہیں----کئی بار مالی کی زبانی پیغام مل چکا ہے کہ جلدی جلدی گھر بیچ دو۔ تمہاری جان کو خطرہ ہے۔ خیر میں مقابلہ کروں گی۔

پھر اس کے چند ہفتے کے بعد ان کے لیے ان کا پسندیدہ قورمہ لے کر گئی تو دیکھا وہ گھر مسمار کیا جا رہا ہے۔ بل ڈوزر چل رہے۔ اسکول کی اٹالین سکرپٹ والی تختی نیچے گری پڑی ہے۔ گیراج کی پیشانی پر ایک بینر لگا ہے۔

یہ بنگلہ برائے فروخت۔ خرید و فروخت کے لیے اولڈ ہاؤس گڑھی شاہو کی انتظامیہ سے رجوع کیجئے۔

فون نمبر----------

ای میل نمبر--------

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مسز پنہارو لاشوں کے گورستان میں رہنے جا چکی ہیں۔ مالی نے بتایا کہ میم صاحب اس گھر سے صرف ایک چیز لے کر گیا ہے اور وہ پنہارو بابا کا پیانو۔

☆☆☆☆

رشید امجد

خواب کے پیچھے پیچھے

دروازے تو کئی تھے، ایک گھر کا دروازہ تھا جس سے کئی بار گزرنا ہوتا، ایک دفتر کا دروازہ تھا جس میں سے صبح جا کر شام کو واپس آنا ہوتا۔ اور بھی کئی دروازے تھے لیکن ان سب سے دور بہت دور سرمئی دھند میں لپٹا ایک الگ ہی دروازہ تھا جس کے بارے میں مرشد نے بتایا تھا کہ اس میں داخل تو ہوا جا سکتا ہے لیکن باہر نہیں نکلا جا سکتا۔ اُسے اس دروازے میں داخل ہونے کا بڑا تجسس تھا لیکن خوف بھی اگر ایک بار اندر چلا گیا تو واپسی ممکن نہ ہوگی۔

اسی ہماہمی اور چمکتی آنکھیں مارتی زندگی کو چھوڑنا اتنا آسان نہیں تھا۔ رشتے تھے، دوست تھے اور یہ شہر اور اس کی ساری اچھائیاں برائیاں، جن کے درمیان وہ پلا بڑھا تھا اس کی نس نس میں رچی بسی تھیں۔ انھیں چھوڑنا آسان نہیں تھا۔ لیکن ایک تجسس تھا کہ اس دروازے کے دوسری طرف کیا ہے ---؟ یہ دروازہ جس سے گزرا تو جا سکتا تھا لیکن واپسی نہیں تھی۔

مرشد نے کہا تھا ---"اس طرف کبھی نہ جانا"۔

مرشد کی بات سن کر بچپن میں پڑھی اس شہزادے کی کہانی یاد آ گئی جسے کہا گیا تھا کہ جنگل میں شکار کھیلتے تین اطراف تو چلے جانا لیکن چوتھی طرف نہ جانا۔ شہزادے کا تجسس اسے چوتھی طرف لے گیا۔ مشکلات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کہانی کار ایک ایک مشکل کو حل کرتا گیا اور شہزادہ شہزادی تک پہنچ گیا۔

”لیکن یہ تو کہانی کار کی مرضی اور کمال ہے“۔ وہ سوچتا۔۔۔۔”ورنہ اتنی مشکلوں سے گذر جانا آسان تو نہیں“۔

لیکن دل میں گدگدی سی ہوتی، ان دیکھے کو جاننے اور دیکھنے کی خواہش لذت بھرے نیم گرم لمس کی صورت پورے وجود میں پھیل جاتی۔

”وہ بھی کیا منظر ہوگا؟“ وہ سوچتا۔

پھر خیال آتا۔۔۔ان دیکھے کو دیکھنے کا ظرف بھی تو ہونا چاہیے۔۔۔۔”وہ میرے پاس کہاں“۔ میں تو سرمئی دھند میں لپٹے اس دروازے کا تصور ہی کر سکتا ہوں، وہاں پہنچ بھی گیا تو اندر جانے کا حوصلہ کہاں۔

اس کے لیے تو یہی سامنے کے دروازے تھے جن سے وہ ہر روز گزرتا تھا۔ ایک دروازے کے اندر محبت کرنے والی بیوی اور کلکاریاں مارتے بچے تھے، دوسرے دروازے کے اندر اس کی میز اور کرسی تھی۔ تنخواہ کے علاوہ بھی ہر روز ہی کسی نہ کسی فائل کو ادھر ادھر کرنے کا کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا۔

اس کے دوست اکثر کہتے۔۔۔۔”اتنی اچھی ملازمت تو کسی کسی کو ہی ملتی ہے“۔

وہ خود بھی جانتا تھا کہ گھر کی اکثر خوشیاں اسی وجہ سے تھیں۔ پرانے گھر کو بیچ کر نیا گھر بنا لیا تھا۔ گاڑی آ گئی تھی۔ بچے اچھے سکولوں میں پڑھ رہے تھے۔ سارے رشتے دار خوش تھے کہ وہ اکثر ان کی دعوتیں کرتا رہتا۔ دوست بھی ہمدرد سمجھتے کہ جس کو جب ضرورت ہوتی وہ فوراً مدد کو پہنچتا۔ تو پھر اور کیا چاہیے۔ بظاہر خوش تھا۔ لیکن بظاہر ہی۔۔۔۔اندر ہی اندر کوئی شے کلبلاتی رہتی۔۔۔۔اس دروازے کے دوسری طرف کیا ہے؟

کبھی کبھی سوچتا۔۔۔”میں ٹھنڈے دودھ کو پھونکیں مار رہا ہوں“۔

بظاہر دیکھنے میں تو اسے اور کیا چاہیے تھا۔ بہت بے چین ہوتا تو بیوی چڑ جاتی۔ کہتی ”اور کیا چاہیے تمھیں“ بُرا محاورہ ہے لیکن صحیح ہے، تمھیں کھیر نہیں پچتی“۔

’’شاید واقعی‘‘۔ وہ سوچتا۔۔۔ ’’کھیر کھا کھا کر منہ اتنا میٹھا ہو گیا ہے کہ کسی تلخ کڑوی شے کا مزہ چکھنا چاہتا ہوں‘‘۔

پھر دھیان سرمئی دھند میں لپٹے دروازے کی طرف چلا جاتا۔

’’اس کے دوسری طرف کیا ہے؟‘‘

مرشد ہنستا۔۔۔ ’’اگر تم جان بھی گئے تو اسے بچانے کا تمھیں ظرف ہی نہیں‘‘۔

’’شاید تم ٹھیک کہتے ہو‘‘۔ اس کی آواز مرجھا جاتی۔

بہت دیر چُپ رہنے کے بعد وہ پوچھتا۔۔۔ ’’یہ ظرف کیسے پیدا ہوتا ہے؟‘‘

مرشد سنجیدہ ہو جاتا۔۔۔ ’’ظرف تو اندر ہی ہوتا ہے‘‘۔

اسے اپنے آپ سے گھِن آنے لگتی۔۔۔ ’’میرا ظرف کیا ہے؟ سارا دن میز کی درازیں بھرتے جانا اور چھٹی کے وقت حساب کر کے اپنے افسر کو اس کا حصہ دینا اور۔۔۔‘‘

وہ جھنجلا جاتا۔۔۔ ’’کام تو میں یہ کرتا ہوں اور تمنا ہے سرمئی دروازے سے اندر جانے کی‘‘۔

مرشد تسلی دیتا۔۔۔ ’’چلو تمنا تو ہے نا، دوسروں میں تو یہ بھی نہیں‘‘۔

’’ایسی تمنا کا کیا فائدہ؟‘‘ وہ افسردگی سے کہتا۔ ’’دوسرے ہی اچھے ہیں رَسے پر ڈول تو نہیں رہے‘‘۔

ساری زندگی انہی دروازوں سے آتے جاتے گزرے گی اور وہ دروازہ ایک خواب ہی رہے گا۔ بچپن کی پڑھی کہانیوں میں خواب میں بشارتیں ملتی تھیں، اب کیوں نہیں ملتیں۔ خواب، خواب نہیں رہے یا بشارتیں ختم ہو گئی ہیں۔ مرشد تو ہے لیکن وہ سچ دکھانے کی بجائے اس کا تمسخر اڑاتا ہے۔ بیوی کہتی ہے۔۔۔ ’’کھیر نہیں پچتی‘‘۔

کھیر کیوں نہیں پچتی، بچے اسے بہت اچھا باپ سمجھتے ہیں۔ رشتے دار، دوست، ملنے جلنے والے سب اس کی تعریف کرتے ہیں۔ کہتے ہیں وہ مشکل میں کام آنے والا شخص ہے۔ دوسروں کا بڑا خیال رکھتا ہے۔

لیکن وہ خود۔۔۔ خود اپنے بارے میں اس کی رائے ذرا اچھی نہیں۔ میں اچھا بنا ہوا ہوں۔ میرے اندر کوئی اچھائی ہوتی تو وجود کے کسی کونے میں تو کوئی دیا ٹمٹماتا، میرے اندر تو گھپ اندھیرا ہے اور اب تو یوں لگتا ہے اسی اندھیرے میں چمگادڑیں اڑ رہی ہیں۔ ان کی بُو اور پھڑپھڑاہٹ سے ہر وقت یوں لگتا

بے اُبکائی آ رہی ہے۔

ڈاکٹر کہتا ہے---”تم بالکل ٹھیک ہو“۔

”نہیں میں ٹھیک نہیں ہوں“۔

”کیا محسوس ہوتا ہے؟“

”میرے اندر گھپ اندھیرا ہو گیا ہے اور چمگادڑیں اُڑ رہی ہیں۔ ان کی بُو---“

ڈاکٹر اس کی بیوی کو ایک طرف لے جاتے ہوئے کہتا ہے---”بہتر ہے کسی اچھے ماہر نفسیات کو دکھالیں۔ میں آپ کو ایک دو نام بتاتا ہوں“۔

بیوی جواب تک اس کی باتوں کو مذاق میں ٹالتی رہی تھی روہانسی ہو جاتی ہے۔

”واقعی میں نے تو ان کے چہرے کے پیلے پن پر غور ہی نہیں کیا، یہ تو برسوں کے مریض لگ رہے ہیں“۔

بیوی ماہر نفسیات سے فون پر وقت لے رہی تھی۔ اُس نے مرشد سے کہا---”مجھے کسی ماہر نفسیات کی ضرورت نہیں، بس مجھے سرمئی دھند میں لپٹے اُس دروازے تک لے جاؤ“۔

مرشد چپ رہا۔

وہ بولتا گیا---”میں اس کے اندر جانا چاہتا ہوں۔ بھلے سے میں اس کے اسرار نہ سمجھ پاؤں۔ لیکن میں وہاں جانا چاہتا ہوں“۔

ماہر نفسیات نے اس سے کئی سوال پوچھے۔ روزمرہ کی تفصیل جانی پھر اس کی بیوی سے کہا---
”تشویش کی کوئی بات نہیں، ذہن پر ذرا بوجھ ہے۔ یہ صرف سکون دینے کی دوا ہے“۔

دوا سے رات کا وظیفہ تو ختم ہو گیا۔ ایسی گہری نیند آئی کہ صبح جگانا پڑتا۔ اس گہری نیند میں خواب بھی عکس کی طرح ہو گئے۔ کچھ جھلملاتا رہتا لیکن صاف نظر نہ آتا۔ بچوں کو سکول چھوڑ کر دفتر میں آتے ہی فائلوں کو پھیلانے کا عمل شروع ہو جاتا۔

چند دن تو یہ سلسلہ چلتا رہا، پھر اندر کے سناٹوں میں پروں کی پھڑپھڑاہٹ نے اس کے منہ کے ذائقے کڑوے کرائے۔

ماہر نفسیات نے اس کی بیوی سے کہا---”زیادہ سے زیادہ سکون کی ضرورت ہے، ڈرائیور رکھ

لیں اور گاڑی میں ان کی پسند کی کیسٹیں بھی“۔

گھر سے نکلتے ہی ڈرائیور اس کی پسند کی کیسٹ لگا دیتا، اسے ستار بہت پسند تھا۔ ستار کی ابھرتی ڈوبتی سُریں سکون سا دیتیں۔ پھر دفتر کی وہی روز کی مصروفیت۔

کچھ دن اور کام چل گیا۔

ماہر نفسیات کے کہنے پر بیوی نے شام کو پارک لے جانا شروع کر دیا، کہا ”بچوں کو کچھ تفریح بھی کرانا چاہیے۔ سب اکٹھے جائیں گے تو بچے خوش ہوں گے“۔

پارک کی سبز کھلی فضا میں دو چار لمبی سانسوں سے اندر کے گھپ اندھیرے میں چند لمحوں کے لیے دراڑیں سی پڑ جاتیں۔ بھاگتے بچے، سیر کرتے لوگ، بچپن میں اس کے والد بھی اسے اپنے ساتھ سیر کرانے لے جاتے تھے۔ اپنے چھوٹے سے سیٹ اپ میں وہ بڑے مطمئن تھے۔ دوسروں کے کام آنا، اس نے انہی سے سیکھا تھا۔ سکول کا کام کروانے کے بعد وہ اسے اپنے پہلو میں لٹا لیتے اور شہزادے کی کہانی سناتے۔ جب کہانی کا یہ حصہ آتا کہ شہزادہ منع کرنے کے باوجود چوتھی اُور چلا گیا تو وہ پوچھتا۔۔۔ ”شہزادے کے پاس جب سب کچھ تھا تو وہ منع کرنے کے باوجود چوتھی اُور کیوں گیا؟“

والد کچھ دیر چپ رہتے پھر کہتے ”یہی چیز تو آدمی کو دوسری مخلوقات سے جدا کرتی ہے، آدمی کے اندر جو تجسس ہے وہ دوسروں میں نہیں“۔

یہ تجسس ہمیشہ اس کے اندر موجود رہا۔۔۔ موجود سے آگے کیا ہے؟ مرشد اسے ہونے کا احساس کہتا، وہ پوچھتا۔۔۔ ”تو کیا دوسرے موجود نہیں“۔

مرشد جواب دیتا۔۔۔ ”موجود ہونا اور بات ہے، موجودگی کا احساس ہونا الگ بات ہے“۔

”تو مجھے یہ احساس ہے“۔ سرشاری سی محسوس ہوتی۔

لیکن اب لگ رہا تھا کہ وہ موجود نہیں، مادی طور پر تو ہے لیکن نہیں ہے اور اس کے لیے سرمئی دھند میں لپٹے اُس دروازے کے اندر جانا ضروری ہے۔

اُس صبح بچوں کو چھوڑ کر جب وہ دفتر جانے کے لیے مڑے تو اس نے ڈرائیور سے کہا۔۔۔ ”گاڑی سائیڈ پر کرلو“۔

اترتے ہوئے اس نے ڈرائیور سے کہا۔۔۔ ”بیگم صاحبہ سے کہنا، ”میں چوتھی اُور جا رہا ہوں“۔

ڈرائیور کو کچھ سمجھ نہ آیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا بھیڑ میں گم ہو گیا۔

برسوں بیت گئے، بچے جوان ہو گئے۔ سفید بالوں بیوی کسی کو بتا رہی تھی۔۔۔ ”برسوں گذر گئے کوئی خبر نہیں، معلوم نہیں زندہ بھی ہیں یا۔۔۔“

آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی!

☆☆☆☆

آغا گل

مس کنڈکٹ

باس نے محاورے کا ہی ستیاناس مار دیا تھا۔ وہ گرجتا بھی تھا اور برستا بھی۔ منحنی سا پستہ قد سانولی رنگت کا انسان تھا۔ اس کی صورت سوکھے ہوئے چھوارے سی تھی۔ مگر بیس گریڈ سے چہرہ گلستان رہتا۔ آنکھوں میں خشونت اور چہرے پہ ہمہ وقت مارشل لاء طاری رہتا۔ کسی جرنیل کی بھٹکی ہوئی آتما اس کے دل میں اتر آئی تھی۔ خاران میں بارش اور باس کے چہرے پہ مسکراہٹ محال تھی۔ کبھی مجبوراً ہنسنا پڑتا نوکری بنانے کو تو اس کی ہنسی سانپ کی پھنکار سے مشابہہ ہوتی۔ وہ آئے دن ہم کو ریکارڈ خراب کرنے کی تڑیاں لگایا کرتا۔ ڈی او لیٹر بھی تواتر سے بھجوایا کرتا جس میں یہی دھمکیاں تحریری صورت میں ہوا کرتیں۔ میرے پاس اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ من کو ماروں، انا کو قتل کر دوں۔ جذبات کو کوڑے ماروں اور باس کی خوشنودی کے نت نئے حربے استعمال کروں۔ اپنی تعریف پہ وہ سپاٹ رہتا آنکھیں ویسی ہی بے رحم! آواز سے ہی لگتا کہ

باس ہنس رہا ہے۔ ورنہ نمرود جیسا چہرہ خشک رہتا۔

میں اپنا دردِ دل اصغر سے ہی بیان کیا کرتا۔ اس کے افسر کی بیوی ان کے پنڈ کے نائی کی دختر نیک اختر تھی۔ جبکہ اختر آرائیں قوم سے تھا اور اس کی بیوی جٹ قوم سے تھی۔ ان کی طبیعت نے گوارہ نہ کیا اور اصغر اکیلا ہی پیشوائی کے لیے ائیر پورٹ گیا۔ یوں تو اس کے ساتھ افسروں اور یونین کا لاؤ لشکر تھا۔ ڈنڈوں والے جھنڈے اور پھولوں کے ہار تھے۔ مگر افسر کے وہیں تیور بدل گئے۔ طوطا چشمی سے بولا "آپ کی بیگم نہیں آئیں؟" اصغر نے بہتیرے بہانے بنائے مگر بات نہ بنی۔ سہ پہر میں بھی وہ اکیلا ہی ریسٹ ہاؤس میں صاحب کی اردل میں بیٹھنے کے لیے گیا تو اس مس کنڈکٹ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ افسر کی بیگم ہاتھ نچا کر بولی "آپ ہمارے گاؤں کے ہیں۔ مگر پہچانتے ہی نہیں۔ ایسی رعونت اچھی نہیں ہے۔ کہیں فرعون والا حشر نہ ہو۔" اصغر کو نزدوان مل چکا تھا۔ اس کا جی حدود وزیاں سے گزر چکا تھا۔ وہ سر جھکائے کوسنے سنتا رہا۔ صاحب بہادر شاید اسے مزار شریف میں ہی پھینک دیتے مگر اختیار کے مطابق آخری حد کوئٹہ تھی۔ جسے سول سروس میں کالا پانی کا نام دیا جاتا ہے، لاہور سے یک لخت کوئٹہ کی افسری تو جیسے کوئی بی ایم ڈبلیو کار سے اتر کر گیس سے چلنے والے چنگ چی رکشے میں آن بیٹھے۔ اس کی دونوں بیٹیوں کا کہہ سُن کر کانونیٹ سکول میں داخلہ بھی دلوا دیا۔ باس نے ظلِ الٰہی کی منشا پر اسے دو کمروں کے کوارٹر میں ٹھہرایا۔ اس کی چھٹی بھی بند کر دی۔ گاڑی بھی نہ دی۔ وہ جوگر پہن کر دو اڑھائی کلومیٹر پیدل بھی دفتر آیا جایا کرتا۔ قریب سے اس کے ماتحت کھانستی ہوئی گاڑیوں میں گزر جاتے۔ وہ بھی ڈرتے تھے کہ باس کا قہر ان پر نازل نہ ہو۔ اصغر اس کے باوجود بلند حوصلہ رہتا۔ باس کی حرکتوں پر کڑھنے یا جلنے کی بجائے مسکراتا رہا۔ دن رات وہ فتح خان بندیال سیکرٹری مواصلات کے لیے کوئی تگڑی سی سفارش تلاش کرنے میں لگا رہتا کیونکہ حاتم طائی کی مانند وہی اصغر کو اس حمام بادگر سے نجات دلا سکتے تھے۔ افسروں کا مؤقف یہ تھا کہ اصغر جیسے باغیوں کو ابتدا میں بھی سزا نہ دی گئی تو عزتِ افسران جاتی رہے گی۔ باقی افسر بھی ایسے ہی لچھن اختیار کر لیں گے۔ ان کا بس چلتا تو اصغر کے منہ پر توبڑا چڑھا دیتے۔ کوڑے مارتے، کھال کھنچوا دیتے۔

ایسا ہی حشر میرا بھی ہوا۔ ایک سہانی صبح مجھے کراچی ٹرانسفر کا آرڈر ملا۔ میرے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ اس پدی مار تنخواہ میں بہ مشکل گزارہ ہوتا۔ میری سرکاری ملی بچوں کو سکول لاتی لے جاتی۔ بیٹا محمد طاہر بہت چھوٹا سا تھا۔ ہمارا خاندان دو حصوں میں بٹ جاتا۔ نارنگ مقامی اسکول میں پرنسپل تھی۔ وہ ملازمت نہ چھوڑ سکتی۔ غرض یہ کہ میں سر تھام کر رہ گیا۔ فوراً ایک عدد کڑک چائے کا آرڈر دیا اور گتھیاں سلجھانے لگا کہ ایک ہی برس میں تبدیلی کیسے ہو گئی؟ تین برس سے پہلے ٹرانسفر ہوا نہیں کرتی اتنے میں حکم آیا

کہ باس نے یاد فرمایا ہے۔ باس نے نہایت ہی دل سوزی سے میری دکھ بھری داستاں سنی۔ ہمدردی کا اظہار بھی کیا مجھے باس کے بارے میں رائے بدلنا پڑی۔ وہ تو نہایت ہمدرد اور سبکتگین کی ہرنی کی مانند رقیق القلب تھا۔ اس کے کہنے پہ میں نے جھٹ درخواست داخل دفتر کی کہ تین ماہ کے لیے میری تبدیلی کے احکامات کو روکا جائے۔ باس نے وعدہ کیا کہ وہ تین ماہ دلوا دے گا۔

دفتر پہنچا تو تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ اگلے روز فون بھی آنے لگے میرا کلاس فیلو خیر جان بلوچ سابق گوریلہ لیڈر ہزار گنجی سے نال ہوتا ہوا خضدار پہنچا جہاں فون دستیاب تھا۔ اس نے فون پہ تائید کی کہ ٹرانسفر آرڈر نہ مانوں۔ بلکہ اس کا انتظار کروں۔ وہ قصر سلطانی کے گنبد پہ بسیرا کرنے لگا تھا۔ سرکار دربار میں اس کی شنوائی تھی۔ بندوق کی بجائے وہ پلاٹ وغیرہ الاٹ کرنے کی درخواست لیے پھرتا، اس لیے حکومت کا منظورِ نظر تھا۔

”تم کیا سرمچاروں کے ہمراہ میرے دفتر کی چھت پر مورچہ بندی کر رہے ہو؟ یار تم آرڈر کینسل کراؤ جنرل رحیم الدین کے در پہ حاضری دو کہ گورنر بھی ہیں۔“

سردار رسول بخش زرکزئی چیف آف جھالاوان کو کسی نے زہری کھٹ میں یہ خبر جا سنائی۔ وہ لاؤ لشکر سمیت روانہ ہوا۔ چلتے ہوئے مجھے فون کیا۔ ”دیکھا تم نے! بلوچستان کا پہلا افسر اور وہی نکالا جا رہا ہے۔ نہیں چاہیں ہمیں امپورٹیڈ افسر! ہم حق مانگتے ہیں۔ یہی ہماری جنگ ہے۔ تم نہ جانا۔ میں دیکھتا ہوں کون تمھیں لے جانے کی ہمت کرتا ہے“۔

مجھے چونکہ تین ماہ قیام کی نوید مل چکی تھی۔ میرے حوصلے قدرے بلند ہوئے تھے اور حس مزاح بھی لوٹ آئی تھی۔ ”مجھے کہار ڈولی میں تو نہیں لینے آئیں گے۔ ایک کاغذ کا ٹکڑا آئے گا کہ تم نے مس کنڈکٹ کیا ہے۔ تنخواہ بند اور شوکاز کا جواب دو۔ پہ ٹرانسفر آرڈر ہی کینسل کرایا جائے“۔ قاضی اقبال ڈائریکٹر کالجز میرے دیرینہ کرم فرما تھے۔ ان کا در کھٹکھٹایا۔ ان کے بھائی خورشید احمد ہمارے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ انہوں نے طلسم ہوش ربا سا انکشاف کیا۔ بتلایا کہ یہ تو نیا افسر ہے۔ میں اسے اتنا جانتا بھی نہیں۔ اس کا باس دن رات دباؤ ڈالتا کہ اسے بلوچستان نکالا دو۔ میں اس کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ خیر! چلا جائے۔ جلد ہی واپس لے آؤں گا۔ نیا افسر ہے بتلا دینا کہ ٹرانسفر آرڈر نہ ماننا گراس مس کنڈکٹ ہے۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ باس یوں تو چھوٹا ہے مگر ہے بڑا ہی زہریلا۔ محض غراتا ہی نہیں کاٹ بھی کھاتا ہے۔ شاید یہی سبب ہے پوری قوم لٹھ لے کر بیوروکریسی کے پیچھے پڑی ہے۔ مگر فرعون کے سنپولیے ان کے ہاتھ نہیں آتے۔ سردار رسول بخش کا ارادہ تھا

کہ باس کو دفتر سے اٹھا کر درہ مولہ پہنچا دیا جائے وہاں مال داری کا کام اس کے سپرد کیا جائے لیکن میں نے ٹرانسفر آرڈر منسوخ کرانے پہ زور دیا کہ باس بھیڑ بکریوں پہ بھی ظلم کرے گا۔ کچھ دے دلا کر بھیڑیے سردار کا ریوڑ باس سے لے کر چلتے بنیں گے۔ سردار کو اس کی سرکوبی کے لیے دوبارہ نکلنا ہوگا۔

اگلی ہی سہ پہر جھالاوانی لشکر میرے گھر آ پہنچا۔ وہیں سے شہزادہ محی الدین وزیر مواصلات کو فون کیا۔ سردار بار بار غصہ کا اظہار کرتا کہ ”نا ملکی“ کو تبدیل کیوں کیا گیا ہے۔ شہزادہ محی الدین نے توجہ سے مسئلہ سنا اور حیرت کا اظہار بھی کیا کیونکہ باس نے اسے بتلایا تھا کہ یہ نیا افسر کراچی جانے کا خواہاں ہے۔ بڑے شہر میں نوکری کرنا اتنے جونیئر افسر کی تبدیلی وزیر کے مرتبہ تک نہ پہنچ پاتی۔ اس نے وعدہ بھی کیا کہ کل ہی آرڈر منسوخ ہو جائے گا۔ اس گفتگو کے بعد سردار رسول بخش کا اشتعال کچھ کم ہوا۔ اور وہ اطمینان سے سلمانی چائے پینے لگا۔ اس کے مسلح محافظ بھی پر سکون ہو گئے۔

باس نہایت چکنا گھڑا ثابت ہوا۔ وزیر سے جھاڑ سننے کے بعد نہایت کروفر سے منسوخ شدہ مراسلہ لے کر میرے دفتر جلوہ افروز ہوا۔ اس نے یہ مژدہ جاں فزا سنایا کہ ذاتی کوشش سے تین ماہ کی مہلت کی بجائے آرڈر بھی کینسل کروا دیا ہے۔ اسے تو کسی سیاسی جماعت کا سربراہ ہونا چاہیے۔ مگر صد افسوس قدر گوہر شاہ بداند یا بداند جوہری۔ باس نے مجھ سے چائے پی کیونکہ اپنی فتح مندی پہ وہ کھلا جا رہا تھا۔ میری چائے پی کر وہ Departing Kiss کی مانند دھمکی میرے منہ پہ مارتا گیا۔

”بھئی سالانہ رپورٹ تو ہم ہی لکھیں گے۔ یہ وزیر اور سیکریٹری کا تو کام نہیں۔ یک در گیر محکم گیر“۔

باس سفید ریش کو بھی تم جبکہ خود کو ہم کہا کرتا۔ خیر ہم کے جاتے ہی مجھے تشویش لاحق ہوئی کہ آدمی خطرناک ہے۔ مزید خوشامد کی ضرورت ہے۔ میں نے چند خوشامدی افسروں کو فون کیا کہ اپنی پہلی ہی فرصت میں مجھے خوشامد کے نئے گر سکھائے جائیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔ وہ یہ بھی بتا گیا تھا کہ دریا میں رہنا اور باس سے بیر۔ اس مُنحنی سے مگر مچھ کا کاٹا پانی نہ مانگتا۔ اس کا تریاق کوئی وزیر یا سردار نہ ہوتا۔

بھٹو نے سرکاری ملازمین کے ڈیڑھ سو اسکیل کم کر کے بائیس کر دیئے تھے ورنہ تو اس دوڑ میں پتلون لنگوٹی بن جاتی۔ اس کیلوں کی دوڑ میں باس ماتحتوں پہ دولتیاں بھی جھاڑے جاتے ہوں تو بائیس سکیل تک پہنچنا خیال خام کے سوا کچھ نہ تھا۔

کہتے ہیں مصیبت اکیلی نہیں آتی۔ افغانستان میں امریکہ روس کے خلاف کود پڑا تھا۔ اسے کولڈ وار اچھی نہ لگی پاکستان کے ذریعے اس نے پروکسی وار شروع کرا دی۔ ذوالفقار علی بھٹو کا بے دردی سے قانونی قتل {Legal Assassination) کر کے فوج کو اقتدار سونپ دیا۔ جس نے پاکستانی قوم کو

ایک Mass Hysteria میں مبتلا کر کے مذہب کے نام پر طویل جنگ میں دھکیل دیا۔ حالانکہ یہ کیموزم اور کیپٹل ازم کی جنگ تھی۔ سرکاری افسروں کو محاذ جنگ پہ تو نہ دھکیلا گیا۔ کیونکہ مشہور تھا کہ سول افسروں نے یہ احتجاج کیا کہ وہ جنگ میں دو شرائط پہ شریک ہوں گے، اول وہ کھردری فوجی وردی اور گینڈے کی کھال کے لمبے بوٹ نہیں پہنیں گے۔ انھیں ریشمی شلوار قمیص اور میانوالی کے سنہری کھسے پہننے کی اجازت دی جائے۔ چونکہ نفری کی سخت ضرورت تھی۔ جسٹس منیر کے نظریہ ضرورت کے تحت یہ ناگوار شرط مان لی گئی۔ دوسری شرط پوچھی گئی تو انہوں نے کہا کہ چونکہ انھیں جنگ کا تجربہ نہیں۔ وہ محض محلاتی سازشیں ہی جانتے ہیں۔ جنگ ان کے علاقے میں ہو تو انھیں Furlough پر بھجوا دیا جائے۔ ان حالات کے تحت انھیں محاذ پہ نہ بلایا گیا اور نہ ہی لازمی لام بندی کی گئی۔ البتہ ان کی سالانہ رپورٹ میں آٹھ صفحے کے نئے سوالات ڈال دیے کہ اس کا عقیدہ کیسا ہے۔ مضبوط۔ کمزور یا ڈھیلا۔ عقیدوں کی دنیا میں رہتا ہے یا ان سے الگ تھلگ دھونی رماتا ہے۔ میرے عقیدوں کے بارے میں کراماً کاتبین کی بجائے باس کو رپورٹنگ کرنا تھی۔ اور یہی بات تشویشناک تھی۔ باس تو ایک کروٹ نہ بیٹھتا۔ ترقی کیا وہ کہیں ایسی سالانہ رپورٹ نہ لکھ مارتا کہ میرا دوزخیوں میں نام لکھا جاتا۔ ان دنوں خواب بھی خوفناک خوفناک آنے لگے۔ دفتر میں محنت کی بجائے عقیدے کی مضبوطی اور باس کی زیادہ سے زیادہ خوشامد پر زور دیتا۔ افسوس ہمارے حکیم حکماء اتنے کشتے اور مردانہ طاقت کی گولیاں بنا گئے کسی کو عقیدے کی معجون مسک کا خیال نہ آیا۔ ورنہ وہی روز چاٹ لیا کرتا۔ نماز کی ٹوپی اور تسبیح تو بلیک میں خرید لی کیونکہ سرکاری ملازمین ان پہ ٹوٹ پڑے تھے۔ اور تو میں کچھ چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ داڑھی بڑھانے کا متعدد بار سوچا۔

ان ہی اذیت ناک دنوں میں اس مردِ بداخلاق نے اداس بلبل اصغر کو اور مجھے بلوا بھیجا۔ اس کی بریفنگ کا لب لباب یہ تھا کہ کل ہی اسلام آباد سے ایک میڈم آ رہی ہیں۔ یوں تو وہ کسی شادی میں شرکت کے لیے آ رہی ہیں۔ مگر اخراجات کے لیے سرکاری دورہ بنایا ہے۔ اگلے روز وہ میرے دفتر کا معائنہ کریں گی۔ ہم دونوں ایئر پورٹ پہ استقبال کرتے ہوئے انھیں مطلوبہ پتہ پر پہنچا آئیں گے اور جب میڈم میرے دفتر کا معائنہ کریں تو میں بہترین معائنہ رپورٹ (Visit Remarks) حاصل کروں جس پہ میری ترقی کا دارومدار ہوگا۔

اس کے بعد اداس بلبل اصغر میڈم کی اردل میں رہے گا مگر چونچ بند رکھے گا۔ ہاں اگر باس کا ذکر ہو تو وہ انوری کی مانند قصائد کے دریا بہا دے۔ میں نے سارے ہڈحرام کام پہ لگا دیے۔ دفتر کو صاف ستھرا کیا۔ یوں بھی دو ایک روز میں یوم آزادی تھا۔ جھنڈیاں اور سجاوٹ والی روشنیاں لگوا دیں۔ کوئٹہ چونکہ نیم

صحرائی شہر ہے۔ جونہی ہوا کے جھونکے آتے وہ کاغذوں میں پروئی ہوئی جھنڈیاں پروائی میں تالیاں بجانے لگتیں۔ مترنم ہو جاتیں۔ بڑا لطف آتا۔ ایک ساز سا بجنے لگتا۔ فضاء میں موسیقی پھیل جاتی۔

اس روز فلائٹ لیٹ تھی۔ ہم دفتری ماحول سے نکل کر ایک ریستوران میں جا بیٹھے۔ اداس بلبل اصغر اپنی ٹرانسفر کا رونا رونے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ بندیال پنجاب کے زرک زئی ہیں۔ جوں ہی فتح خان بندیال تک اس کی فریاد پہنچی اس کے ساتھ انصاف ہوگا۔ وہ اکثر اپنے وطن گجرات کو یاد کر کے آہیں بھرا کرتا۔ مگر اسے یہ بھی یقین تھا کہ وقت ہے گزر ہی جائے گا۔ شاید اس کے ایمان کا امتحان ہے یا کسی نا کردہ گناہ کی سزا کہ کوئٹہ میں رہنے پر مجبور ہے۔ وہ اکثر حضرت یونسؑ کو یاد کرتا جنہیں مچھلی نے نگل لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کوئٹہ ایک بڑا مگر مچھ ہے یا نانا کوبڑا ہے جو حکم الٰہی سے اسے پنجاب میں اگل دے گا۔ ابھی ہم باس کو ادھیڑ ہی رہے تھے کہ فون آیا جہاز لینڈ کر چکا ہے۔ پروٹوکول افسر کو جھاڑا کہ نالائق یہ کیا کیا۔ وہ چلاتا رہا ہے کہ اسے انکوائری نے ایسا ہی بتلایا تھا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ جہاز پہلے آ گیا۔

ہم نے لاکھ گاڑی دوڑائی مگر ایئر پورٹ سے میڈم جا چکی تھی۔ اب باس کے ہاتھوں بچنا مشکل تھا۔ بڑی مشکل سے اسٹاف کار کے ڈرائیور کو پکڑا اور اس کے ذریعے میڈم کے ہاں پہنچے۔ وہ ایک سنجیدہ سی پروقار خاتون تھی۔ اس کی دکھی دکھی آنکھیں مدر ٹریسا جیسی تھیں۔ اس نے نہ صرف ہمیں حوصلہ دلایا بلکہ وعدہ بھی کیا کہ اس کی بھنک باس کے کان میں نہیں پڑنے کی۔

اگلے روز میرا دفتر بیوٹی پارلر سے نکلی ہوئی دلہن کی مانند سجا ہوا تھا۔ ہم نے میڈم کا صدر دروازے پہ استقبال کیا۔ تالیوں اور زندہ باد کے نعرے میں یونین اسے میرے دفتر تک لائی۔ اس نے ریکارڈ دیکھا کچھ سوالات کیے۔ میری بدحواسی سے وہ بہت محظوظ ہوئی۔

”تمہاری بزدلی مجھے پسند آئی۔ یہی سول سروس میں ترقی کا زینہ ہے۔ نوکری کے بارے میں شیخ سعدی نے چھ ماہ میں حکایات سعدی لکھی تھی جو چھ سو برس سے سرکاری ملازمین پڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اس پر سختی سے کاربند بھی ہیں“۔

پھر اس نے ایک مبالغہ آمیز تعریفی معائنہ رپورٹ تیار کروائی۔ اس پہ دستخط ثبت کیے اور ایک کاپی مجھے دے دی۔ میرا سیروں خون بڑھ گیا۔ میں ایک عالم فاضل افسر قرار دیا گیا تھا۔ ”ویسے تم باس سے اتنا ڈرتے کیوں ہو؟ اس کی رپورٹ کے خلاف تم اپیل بھی کر سکتے ہو۔ اصغر بھی چند ماہ میں چلا جائے گا۔ تمہارے باس کے خلاف مردم آزاری کی کافی شکایتیں ہمارے پاس آ رہی ہیں۔ شاید اسے فیلڈ سے ہٹا ہی لیا جائے“۔

میڈم کی شخصیت کا پُراثر پہلو اس کے چہرے کا سکون تھا۔ وہ بہت ہی شفیق اور مہربان افسر تھی۔ چائے کے بعد اسے دفتر کا معائنہ کرایا۔ ہم لان میں پہنچے تو اچانک ہوا کا جھکڑ آیا جس سے اوپر بندی جھنڈیاں پھڑ پھڑانے لگیں۔ میڈم نے سر اٹھا کے جونہی اوپر دیکھا اسے سکتہ سا ہوگیا۔ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ کچھ دیر مبہوت سی کھڑی رہی۔ اسے گاڑی میں بیٹھ کے گھر جانا تھا مگر وہ الٹے قدموں واپس لوٹی۔ اور دھم سے کرسی پہ جا گری۔ ہتھیلیوں سے اس نے ماتھا سنبھالا۔ کہنیاں میز پہ ٹکائیں اور بے آواز آنسو بہانے لگی۔ اس بدلتی ہوئی صورتحال سے گھبرا کر میں باہر نکل آیا۔ ڈر تھا کہ کہیں وہ رپورٹ واپس نہ مانگ لے۔ اور میرے دفتر کی کس بات نے اچانک اس کا مزاج بدل دیا یہ بھی ایک پریشان کن سوال تھا۔ باس، اسٹاف اور یونین سے چھپانا بھی ضروری تھا۔ باہر میں نے یہ تاثر دیا کہ میڈم ذاتی فون کر رہی ہے۔ پھر ہزاروں سال بیت گئے۔ ایک ایک پل قیامت تھا تا آنکہ خود اس نے مجھے بلوا بھیجا۔

ادھر یہ عالم کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ مجھے پھنکارتا ہوا باس، کراچی، تبدیلی اور ترقی رکنے کے وسوسے مارے جا رہے تھے۔ اس کی آنکھیں چلتن پہ پھیلی وقت مغرب کی سرخی کی طرح تھیں۔ یوں لگتا تھا دریائے ٹیچی اس کی آنکھوں سے گزر چکا ہے۔ میری اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر وہ خود ہی بول پڑی جیسے خود کلامی ہو ”اس کا تعلق تم سے نہیں ہے تم بے فکر رہو۔ میں اسلام آباد جا کر بھی تمہاری تعریفیں کروں گی۔ میں جشن آزادی اور یہ جھنڈیاں دیکھتی ہوں تو Obsessed ہو جاتی ہوں۔ پانچ نوکوں والے تارے میں ایک مظلوم لڑکی اور ایک بے کس ماں دکھائی دیتی ہے۔ پتلا سا ہلال منہ کھولے اس بے سہارا تارے کو سموچا نگل جانا چاہتا ہے۔ جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے“۔

میں نے ادب سے پانی پیش کیا۔ شاید ٹھنڈے پانی سے گرم آنسوؤں کی حدت ختم ہو جائے۔ ”وہ لڑکی کون تھی؟“

میڈم نے گلاس ہونٹوں سے لگایا اور پھر بولی۔ ”وہ ایک مظلوم لڑکی تھی۔ تقسیم کے وقت جانے کیا ہوا کہ صدیوں ساتھ رہنے والے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ جالندھر شہر میں قتل و غارت کے دوران اس لڑکی کے ماں باپ مارے گئے۔ دونوں بھائی جان بچا کر باہر بھاگے۔ بڑے کے پاس ریوالور بھی تھا مگر بلوائیوں پر گولی چلانے کی ہمت نہ ہوئی۔ مکان میں لوٹ مار جاری تھی۔ بلوائیوں نے ان کی چھوٹی بہن کو دبوچ لیا۔ وہ چیخی چلائی پھڑ پھڑاتی رہی۔ بھائیوں نے پلٹ کر دیکھا تو مگر رکے نہیں۔ حتیٰ کہ بہن نے فریاد کی کہ بھیا مجھ پر گولی چلاؤ۔ مگر انہوں نے گولی نہ چلائی۔ وہ کسی طور لاہور جا پہنچے۔ یہاں کاروبار جما لیا۔ متروکہ جائیداد بھی حاصل کر لی۔ دونوں بھائیوں نے خاصہ مال کمایا۔ شادیاں بھی کر لیں۔ ماں باپ کو بے گور و کفن

اور بہن کو بلوائیوں کے ہاتھوں میں چھوڑ آئے تھے۔ مگر ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ان کی بہن اس قدر بدقسمت تھی کہ زندہ رہی۔ اور جب اغواء شدہ عورتوں کو واپس لوٹانے کا عمل شروع ہوا تو ہندو اور مسلمان عورتوں کو حکومتی نگرانی میں ان کے ملکوں میں لواحقین کے حوالے کیا جانے لگا۔ بھائیوں نے پہلے تو بہن کو پہچاننے سے ہی انکار کر دیا۔ مگر سرکار کے دباؤ کے سبب بہن کو قبول کرتے ہی بن پڑی۔ ورنہ زیادہ بدنامی کا اندیشہ تھا۔ انہوں نے اپنی بہن سے باوضو حلف لیا کہ کسی کو نہیں بتلائے گی کہ وہ ان کی بہن ہے۔ بلکہ یوں کہے گی کہ ان کے وفادار ملازم کی بیٹی ہے جو فسادات میں مارا گیا تھا۔ بہن کو سرونٹ کوارٹر میں رکھا۔ اسے گھر میں داخل ہونے یا بھائیوں سے بات چیت کی اجازت نہ تھی۔ بھائیوں نے اس کے دکھ بھی نہ سنے۔ اسے دلاسہ بھی نہ دیا"۔

فرطِ غم سے میڈم نے گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ "بھائیوں نے چاہا کہ کوئی شخص کوئی خوانچہ فروش ہی اس سے شادی کر لے۔ مگر اس لٹی پٹی تشدد کا نشانہ بننے والی لڑکی کا سن کر بھی ناک منہ چڑھاتے۔ وہ لڑکی اپنے ہی گھر میں اذیت ناک زندگی گزار رہی تھی۔ آخر کار اس کے بھائیوں نے ایک بوڑھے شخص سے شادی کروا کے بہن کو یوں رخصت کیا کہ پھر کبھی اس کی صورت نہ دیکھی۔ برسوں بعد اس کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ جسے ماں نے یوں دودھ پلایا کہ اس دودھ میں بھی نمکین آنسو شامل رہے۔ وہ اپنی بیٹی سے ہی لپٹ لپٹ کے روتی رہتی۔ کیونکہ اس کا شوہر بھی بیماری کے ایک حملے میں چل بسا تھا۔ وہ لوگوں کے گھروں میں ملازمت کرنے لگی۔ راتوں میں اس کی کوشش ہوتی کہ اس کی سسکیاں نکلنے نہ پائیں۔ ورنہ مالک خفا ہوتے کہ کیا مفت میں ان کے ہاں بین کر کے نحوست پھیلائے جا رہی ہے۔ بعض خاندانوں میں اس کا نام ہی Weeping Mulberry رکھا گیا۔ آہیں، کراہیں، بین اور کہرنے روکنے کے لیے وہ منہ میں دوپٹہ دے لیا کرتی۔ اس کی بیٹی بھی ماں کو اپنے آنسوؤں کے سوا کچھ نہ دے پاتی۔ اس نے بھی ماں کی طرح بے آواز رونا سیکھ لیا۔ اور جب کبھی مالکان کہیں باہر گئے ہوتے تو خالی گھر میں ماں بیٹی بلک بلک کر روتیں۔ اور بے حال ہو جایا کرتیں۔ ہوا یوں کہ شورش کاشمیری جیل سے چھوٹ کر آیا تو ماں بیٹی کو حوصلہ دیا۔ ان کی ڈھارس بندھائی۔ وہ خود بھی ایک انقلابی انسان تھا۔ اس نے بیٹی کو تلقین کی کہ وہ چندری کے پرچم بنا لے۔ شورش انکی مالی اور اخلاقی امداد بھی کرنے لگا۔ اسی حوصلہ افزائی کے باعث اس کی بیٹی کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے کی بجائے الٹی سمت مڑ گئے اور وہ زندگی بھر نمکین آنسوؤں کی تپش دل پہ محسوس کرتی رہی"۔

میں نے میڈم کو دوبارہ پانی پیش کیا۔ جو پانی وہ پیتی اس کی آنکھوں سے بہہ نکلتا۔ اور جھنڈیاں بدستور پھڑپھڑائے جا رہی تھیں۔ میں ہواؤں کو نہیں روک سکتا تھا جو دشت کی جانب سے زڑخو اور کرانی کی

جانب سے شہر پر حملہ آور ہوتی جاتیں تھیں۔ ہوائیں اتنڑ کر رہی تھیں چاپ کر رہی تھیں۔ ان جھنڈیوں کو دور اُڑا لے جانا چاہتیں تھیں جیسے جلتے صحراؤں میں کروی۔ ہیر اور جوران کے پرزوں کی راہ دیکھ رہے ہوں۔ اتنی بہت سی جھنڈیاں میں اتروا بھی نہیں سکتا تھا ورنہ وہیں مجھے دبوچ لیا جاتا۔ یا شاید ہزاروں لاکھوں ہندو، سکھ اور مسلمان عورتوں کی بھٹکتی روحیں ان جھنڈیوں میں بول رہی تھیں۔ لیکن ان سب نے تو بے آواز رونا سیکھ لیا تھا۔ بھلا ان کی آواز کیسی۔ شاید یہ جھنڈیاں آزادی کے ترانے گا رہی تھیں۔ انجانی زبانوں میں جسے صرف صحرا ہی جانتے ہیں۔ مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ میرے پاس خاموشی کے علاوہ چارہ نہ تھا۔

میڈم نے خود کو سنبھالا۔ آنسو پونچھ لیے۔ اس کے چہرے پہ لاگشت اتر آیا تھا۔ اس نے بیگ سے دھوپ کا چشمہ نکال کر آنکھوں پہ لگا لیا۔ گزرے طوفان کے اثرات چشمے نے چھپا لے۔ شاید وہ کسی اور دنیا میں جا چکی تھی۔ ”اپنی بیٹی کو اس نے وصیت کی تھی دفن کرنے سے پہلے اس کا دل نکال لے۔ اس دل کے ساتھ دفن نہ کرے۔ مگر بیٹی کے لیے ماں کی آخری خواہش پوری کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ اسے اسی دل کے ہمراہ ہی سپرد خاک کرنا پڑا“۔ وہ اٹھی تو مجھے روکنے کا بھی یارا نہ ہوا۔ اور جب وہ گاڑی میں بیٹھی تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ ایک اعلیٰ افسر سے ذاتی سوالات کرنا مس کنڈکٹ تھا۔ مگر میں جرأت کر ہی بیٹھا۔

”آپ کو اس عورت سے اس قدر ہمدردی کیوں ہے، کیا آپ اسے جانتی ہیں؟“

وہ چونک سی اٹھی۔ تذبذب کے عالم میں رہی پھر دھیرے سے یوں بولی کہ ڈرائیور سن نہ پائے۔

”ہاں! جانتی ہوں۔ وہ میری ماں تھی“۔

☆☆☆☆

علی تنہا

چہرہ اور چہرے

نچی ہوئی بھنوؤں میں، آنکھیں چڑھی ہوئی، گویا چوکور ہڈیالے چہرے پر کسی اور کی ہوں۔ یہ کون ہے جو آئے دن گردن پر دوسرا چہرہ رکھ دیتا ہے۔ کیونکہ اتنی تنی ہوئی نظروں سے اس کا سامنا نہیں ہوا۔

پہلے تو اس کے مہر لگے ہوئے اور بازی جیتنے کے قریب داؤ کو پلٹا گیا اور اب حال یہ ہے کہ وہ اپنے چہرے کو جیسے ہی دیکھتا ہے ایک اور فریب کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔

جادو کا یہ آئینہ یہاں بیڈ روم میں کون لگا گیا ہے؟ جس نے بھی یہ دشمنی کی، قاضی ہاشم کی نسلوں تک کے چہرے بگاڑ کے رکھ دیئے۔ بھلا ہو اس کی سوچ کا جو جادو، ٹونے سے اس طرح بھاگتی ہے جیسے غلیل سے کوا۔ خواہ کچھ ہو رہے اُسے یقین ہی نہیں کہ کوئی منتر پھونکا گیا ہے۔ حالانکہ اُس کی بیوی چھپے، چھپائے ہزار پیروں کے در پر سر پھوڑتی رہی ہے۔

”یہ ڈھکوسلے ہیں، اللہ کی بندی ان سے بچو، کیوں ماری ماری ان ٹھگوں کے پاس جاتی ہو، توبہ کرو بار بار توبہ کرو“۔

قاضی ہاشم کا بس چلے تو ان فراڈیئے پیروں کا دھڑن تختہ کر ڈالے۔ کیسے کیسے سادہ لوح لوگوں کو انہوں نے تباہ و برباد کر ڈالا ہے۔

ایک پیر ہی نہیں، دوسروں کا بھی جواب نہیں۔ پندرہ برسوں کے طویل بار جیت کے حصص کے کاروبار میں وہ جان گیا ہے کہ انسان سے بڑا افریبی دوسرا کوئی نہیں۔ رہا، ابلیس تو وہ اس کا مرید ٹھہرا۔ بے چارہ، آدمی کے آگے ہاتھ جوڑ جوڑ کے کھڑا رہتا ہے بلکہ حیران کہ کس صفائی سے اس کا کرنے والا حرام پائی کا کام لمحوں میں پرکر گزرتا ہے۔

قاضی ہاشم کو اس سوچ نے اب تک پاگل ہونے سے بچایا ہے ورنہ جس تیزی اور تواتر سے اُسے گھاٹے پر گھاٹے کا منحوس چہرہ دیکھنا پڑا ہے کوئی اور ہوتا تو اب تک سودائی ہو کر جنگل کی راہ لے چکا ہوتا۔

طوطے کی طرح ٹراتی پتلی آواز کی وجہ سے وہ ایک اور ذبدھے میں پڑ رہتا ہے۔ کوئی ایک عذاب ہو تو وہ جان چھڑائے۔ اُسے شاید یہ ہوکا ہے کہ ہو نہ ہو یہ آئینہ ہے ہی منحوس یا اس آئینے میں کوئی بدروح چھپی ہے۔

”کیوں بیگم، یہ جو شیشہ ہے، کیا یہ منتر پڑھ کے نہیں لگایا گیا؟“

قاضی ہاشم کے بار بار اصرار پر اب تک بے چاری نے کوئی چار مہنگے آئینے بدل ڈالے ہیں۔ باوجود اس کے جو آئینہ آیا ہے ایک نئی بلا لے آیا ہے۔ اس کی بیوی نے بیزار کہا، بس اب آئینے لگانا چھوڑ دیتے ہیں، تمہیں وہم جو ہے“۔

وہ طوطے کی طرح ناک میں بولتا ہوا، آگ بگولا ہو جاتا ہے۔ ”خبردار کیا تم میرا چہرہ مجھ سے چھیننا چاہتی ہو، ظالم عورت تم بھی بگڑا ہوا شیشہ ہو، ہر بار نئے روپ میں ہر بار۔۔۔“

جس دن وہ آئینہ نہ دیکھے اُسے شک گزرتا ہے کہ اپنا اصل چہرہ گھر چھوڑ آیا ہے۔ گھر سے باہر دفتر میں یا جہاں بھی آئینے میں اپنی شکل دیکھتا ہے کوئی نہ کوئی چہرے کا زاویہ بدلا ہوا ملے گا۔ اِس واسطے حیلے بہانے سے

دوبارہ گھر آن کے اطمینان کرے گا کہ اس کا اوپر کا ہونٹ لمبا تو نہیں ہو گیا۔ یا گال پر جھری تو نہیں آ گئی۔

منگل کے دن، صبح سویرے، بالکنی میں کھڑے وہ پولو گراؤنڈ میں دوڑتے سفید براق گھوڑے پر، امام دین کو گرتے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ یہ بُرا سگون صبح دم کہاں سے اس نے دیکھ لیا۔ دوڑتا ہوا کمرے میں آئینے کے روبرو کھڑا ہوا کہ اس کی بیوی نے فراک درست کرتے ہنس کے کہا۔

”تم تو ان واہموں کے خلاف ہو، اور روز شکل تمھیں اپنی بدلی نظر آتی ہے۔ کوئی سنے تو کہے گا، اس کی مت ماری گئی ہے“۔

وہ جواب دینے کو پلٹا مگر اس دوران میں موبائل کی گھنٹی بار بار بجنے لگی۔ موبائل، میز سے اٹھا کر اس نے ہیلو کی۔

”ہاں، ہاشم بول رہا ہوں، نصیر خان، سناؤ کیا سچویشن جا رہی ہے؟“

وہ سنتے سنتے اچھل پڑا۔

”کیا کہا، دو سو فی صد ریٹ بڑھ گیا؟ چ، تو اس طرح میرا منافع ٹو ہنڈرڈ کے حساب سے، لو، زندہ باد نصیر خان تم نے تو مردے میں جان ڈال دی! واہ واہ“۔ مارے خوشی کے اس نے اپنی بیوی کی کمر پہ تابڑ توڑ مکے برسائے۔

”سنتی ہو، دو سو فی صد، سارے دلدر، دُور ہو گئے بیگم“۔

دونوں اس نادیدہ مسرت پر رو پڑے۔ معلوم پڑا مدتوں کے بعد ان کے سر کے چوکھٹے میں شادی کے اولین دنوں کے دمکتے ہوئے رنگ روپ نے انھیں جوان کر ڈالا ہے۔

ٹھیک پندرہ برس کی کشٹ بھری زندگی میں پہلی مرتبہ قسمت نے بند دروازے کھول کر امارت کے راستے دکھا دیے۔

”دیکھا شگفتہ بیگم، اللہ پر بھروسہ ہو تو کیسے ممکن کو ناممکن اور ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے“۔

وہ مٹکتی ہوئی، جوڑے میں گلاب کا تازہ پھول لگا کر باہر نکل گئی۔ اس کے حریف، جو قاضی ہاشم کے ہر بارے ہوئے داؤ پر پھولے نہیں سماتے تھے اب منہ چھپائے پھرتے ہیں۔

نواب صادق خاں، جو حصص کے کاروبار میں اُجڑنے کے بعد ہر بار قاضی ہاشم کو طعنے دیتا رہا ہے۔ اللہ کی شان، دن پھرے ہیں تو ناچار قاضی ہاشم کی شوگر ملز میں ٹائیں ٹائیں کرتا جوتیاں چٹخا رہا ہے۔

اب کے قاضی ہاشم کے پھرتیلے جسم میں موٹاپے نے اس کی کایا کلپ کر دی ہے اور تو اور طوطے والی ناک تک موٹی ہو چلی ہے یا ہو سکتا ہے آئینہ اسے دھوکہ دے رہا ہے۔ چوکور ہڈیالے چہرے پہ

گوشت چڑھنے کے بعد نین نقش تو بدل گئے ہیں۔ قدرت خدا کی وہ جو داؤ لگاتا ہے جیت بن کے لوٹتا ہے۔ اس کے کتنے ہی پرانے دوستوں کا یقین ہے یہ سب کچھ اس کی بیوی شفقت کے تعویذ گنڈوں کا کرشمہ ہے۔ ورنہ پہلے کیا تھا گھاٹے کی ضربوں نے بے چارے کا روپ رنگ ہی بگاڑ دیا تھا۔ باپ کی دی ہوئی شوگر ملز نہ ہوتی تو حصص کے بزنس میں اب تک کنگال ہو چکا ہوتا۔

ایک بار تو، بار میں بیٹھے سیٹھ کرم الٰہی نے طنز کیا کہ قاضی بدبخت کے چہرے پر خسارے کی ضرب یوں جھانکتی ہے جس طرح پنجرے میں بند طوطا چوری کھانے سے اس لیے ڈر رہا ہو کہ سامنے دیوار پر بیٹھی بلی اسے اچک لینے کے لیے بےتابی سے جھپٹنے والی ہو۔

پچھلے سال اپنی چوتھی شوگر مل کے افتتاح کے بعد جو باتیں قاضی ہاشم کے کان میں پڑیں وہ چاپلوسوں سے سچ مچ گھبرا کے رہ گیا۔ کیونکہ شامیانے تلے بیٹھے لوگوں نے اسے پہلے آسمان سے ایک ہی جست میں ساتویں آسمان پر جا پہنچایا تا کہ وہ عمر بھر کے لیے نیچے اترنا ہی بھول جائے۔ جلسے کے ختم ہونے پر کھانے پر ٹوٹتے لوگوں کو دیکھ کر قاضی ہاشم کو وہ طوطا یاد آیا جو تین دن تک بھوکا رہنے کے بعد پھڑ پھڑاتا ہوا چوری ملنے پر دیوانہ وار ادھر اُدھر دیکھتا ہوتا کہ چوری والی کٹوری اس سے چھین نہ لی جائے۔

اگر یہ چوری والی کٹوری اس سے چھین لی جائے تو کیا ہوگا بھلا۔ اس کو اپنے سیاہ دنوں کے پہاڑ یاد آ گئے۔ اور اپنی چھوٹی سی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پرانے دکھ کو بھلانے کی خاطر ہجوم سے باہر نکل گیا۔ گاڑی میں جاتے ہوئے بار بار موٹی پیٹوں والے بھوکے، گاڑیوں پر اسے سلام کرتے نظر آتے رہے۔ راجا شفقت نے اس کی گاڑی دور سے آتے دیکھ کر اپنی پٹارہ، صابن دانی سی گاڑی روک کر طوطے کی طرح ٹائیں ٹائیں کرنا شروع کیا۔ یہی راجہ شفقت تھا جو اس کا مذاق اڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا اور اسے حصص کے کاروبار سے باز رہنے کے ہزاروں گر بتاتا۔ مگر اب جو بخت نے پلٹا کھایا ہے تو وہ بھول گیا کہ وہ یہی شخص ہے جسے اس نے کہا تھا، تمہاری شوگر ملز کی تمام چینی زہر بن کر گھاٹے کے دریا میں گھل جائے گی۔ باز آ جاؤ اور ترس کھاؤ اپنی بیگم پر جو مارے مارے ہر درگاہ پر منتیں مانتی پھرتی ہے۔

اور قاضی ہاشم بھی سوچتے سوچتے گہری سوچ کے دریا میں جا پڑتا۔

”تو کیا، سچ مچ، یہ دریا میری چینی تک بہالے جائے گا؟ اگر ایسا ہوا تو؟ کیا گھاٹے کا دریا کبھی نہیں اترے گا؟ چڑھا ہوا دریا، اترے گا نہیں؟“

مدتوں اس غم میں وہ گھلتا رہا ہے۔

راجا شفقت کے جانے کے بعد اس نے قہقہہ لگایا۔

“میں جس دریا میں غوطے کھاتا رہا اب وہی دریا میری سیرابی کر رہا ہے۔ واہ میرے مالک واہ”۔

سیرابی کی ان لہروں میں، چاروں بیٹوں کے ساتھ وہ مڑ کے دیکھتا ہے تو اُسے دشمنوں اور بدخواہوں میں ایک بھی نظر نہیں آتا۔ بلکہ اپنے آپ کو کھوجتا ہے تو اپنے آپ کو بھی نہیں پاتا۔ آخر لیکن اسے اپنے آپ سے ملنے کا موقع مل ہی گیا۔ اور بڑی بہن کے بے آسرا ہو کے مرنے پر اندازہ ہوا کہ یہ کاروبار جو نئی بلندیوں کو چھو رہا ہے تو چھوئے چھوئے، اگر اس کا ہاتھ چھوڑ گیا تو وہ کس تحت الثریٰ میں جا گرے گا؟

“کیا یہ مایا، سب دھوکہ ہے، سچ مچ سراب ہے؟”

ہر چند قاضی ہاشم زندگی بھر مذہبی آدمی نہیں رہا۔ مگر اس کے اندر یہ کتنے چہرے قاضی ہاشم کے چھپے بیٹھے ہیں؟ جو بار بار اُسے ڈراتے ہیں۔

اُس کا باپ سیدھا سادھا کاروباری آدمی تھا۔ محدود آمدن کے باوجود اس نے قاضی ہاشم اور چھوٹے بیٹے قاضی واحد کو بہترین تعلیم دلوائی۔ اُسے البتہ ہاشم سے عمر بھر گلہ رہا کہ وہ خدا سے ہمیشہ دور بھاگتا ہے اور سجدے کو بھاری پتھر سمجھ کر ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ مگر وہ ہمیشہ سنی ان سنی کر دیتا۔ اور اپنے کاروبار میں ایسا ڈوبا کہ رہی سہی کسر بھی نکل گئی۔

ارادے کا ایسا پکا کہ مجال ہے اپنی ڈگر سے بار بار مار کھانے کے باوجود پیچھے ہٹا ہو۔ شروع میں کاروبار کے دریا میں غوطے کھائے ہر طرف سے آواز آئی۔

“طوطے میاں، ناک کٹوا آئے، انترے کا مزا آیا؟”

کم بخت طوطے والی ناک نہ ہوئی مصیبت ہو گئی۔ جو بد قماش ملتا یہی بکواس کرتا۔

کئی بار، اُس کے بیٹے قاضی حاتم نے کہا۔

“بابا، میں تو کہتا ہوں پلاسٹک سرجری اس ناک کی کروا لیتے ہیں۔ بہت تنگ کرتی ہے آپ کو”۔

وہ زور زور سے ہنستے دہرا ہو جاتا۔

“ہاں یہی ایک ٹونہ باقی ہے۔ ارے کمینے باپ کی ناک کٹوانا چاہتا ہے؟ ماں سے پوچھ اس ناک کی برکتیں”۔

قاضی ہاشم نے اگرچہ پلاسٹک سرجری نہ کروائی مگر اس پر راجا شفقت کے پیٹ میں مروڑ پڑتے رہے کہ وہ کون سا کرتب کیا جائے کہ ہاشم دوبارہ گڑھے میں جا گرے۔ حسد کے دریا کی کوئی حد ہوتی ہے؟ راجا شفقت نے بہت دنوں کے بعد شیطان کے ملنے پر ایک دم چھلانگ لگائی۔ استاد ابلیس نے اس کے

منہ پر تھوک کے گویا سب گُر بتا دیئے۔

آخر راجا شفقت مزدور یونین سے مل کر قاضی ہاشم کی نئی شوگر مل میں تالہ بند ہڑتال کرانے میں کامیاب ہو لیا۔

قاضی ہاشم کے تو ہوش اڑنچھو ہو گئے۔ بلکہ ناک کٹنے کو آ گئی۔

اب جو نئے عذاب کا دریا چڑھا ہے تو اس کی چینی کا ہر دانہ گھلنے لگا۔ اسے چینی کے ہر طرف بکھرے دریا میں تیرتے مزدوری مزدور نظر آتے رہے۔ وہ جس کو ہاتھ بڑھا کر پکڑنا چاہتا ہے الٹا وہ قاضی ہاشم کے ہاتھ کو پکڑے ڈبونے کے درپے ہے۔ وہ چینی کے سفید اور جان لیوا غوطوں میں مرنے کے قریب آن لگا ہے۔

چاروں کھونٹ، احتجاج کی لہریں ہیں، نعرے اور توڑ پھوڑ ہے۔ اس نے ان خونخوار لہروں سے نکلنے کا جو جتن کیا ہے، نامرادی لوٹا ہے۔ اس کے باوجود وہ ہمت نہیں ہارا اور بیوی بچوں کے کوسنوں سے بددل نہیں ہوا۔ بلکہ قسمت کے لکھے کو بکواس سمجھ کے ایک طرف پھینک دیا ہے۔

جب وہ گھاٹے کی آگ میں بار بار جا پڑتا رہا تو اس مقسوم نے کون سا تیر مار لیا۔ آخر کو بیوی کے چالیس تولہ سونا تک داؤ پر لگا دیئے۔ خدا کی شان کے داؤ ایسا نشانے پر جا لگا کہ سارے دلدر دور ہو گئے۔

''تو کیا وہ بخت کے جاگنے یا سو جانے پر یقین کرلے؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں''۔ مزدور یونین کے طوطوں نے اس کی شوگر ملز کا ایک ایک پھل پکا اور کچا تک چبا ڈالا تھا اور وہ ہاتھ ملتا رہ گیا۔ ہاتھ اس قدر ملا کہ اس کی لکیریں تک مٹنے کو آ گئیں۔ مگر وہ لکیروں کے پھیر میں نہیں پڑا، یہی بات راجا شفقت پر تازیانے کی طرح پڑتی رہی۔

''یہ ظالم قاضی ہاشم کس چکی کا پسا ہوا آٹا کھاتا ہے۔۔ یہ ہے کس مٹی سے بنا ہوا؟''

راجا شفقت نے کام کا ہر پتہ بڑی استادی سے چھپا کر رکھا۔ مگر ہوا کیا کہ مزدور لیڈروں سے بات کرتے کرتے یکا یک ترپ کا پتہ، اس کے ہاتھ آ لیا اور راجا شفقت کا خون خشک ہو گیا۔ اس کے فرشتوں کے علم میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وقت بدلے تو کیا کیا نہ ہونے والے کام ٹھکانے پر آن لگتے ہیں۔

اب جب چینی کی ریت سونے میں ڈھلی ہے تو راجا شفقت دھڑام سے زمین پر آن رہا۔ ریت سونے میں اس طرح ڈھلنے لگی کہ اس کے ذرات نے قاضی ہاشم کو بھی نابینا کرنا شروع کیا۔ وہ اُڑتے ذرات کو مٹھی بھر بھر جسم کے ہر حصے سے ہٹاتا ہے لیکن ذرات ہیں کہ نس نس میں اترتے ہیں۔ گویا طوطا اتنی چوری کھا گیا ہے کہ سدھ ہی بسر گئی۔ بیٹھے بیٹھے، پر پھڑ پھڑاتا ہے اور جگ بیت گئے ہیں یہ کیا دن آن لگے ہیں؟

باہر جہاں تک نظر جاتی ہے سونے کی طرح سورج کی کرنیں ہی کرنیں ہیں ۔ قاضی ہاشم ہے کہ ان میں پرو دیا گیا ہے ایک کرن جسم سے ہٹاتا ہے تو بیس کرنیں اور لپٹ کر رہ جاتی ہیں ۔

ہوتے ہوتے وہ سونے کی پگھلتی کرنوں میں پگھل رہا ہے ۔ دور دور تک پانی یا ہوا کا نشان تک نہیں کہ کرنوں کو لے اُڑیں ۔

”تو کیا وہ پگھلنے کو پیدا ہوا تھا؟“

وہ اپنے آپ کو جتنا تسلی دیتا ہے، سنبھالتا ہے اور بکھر رہا ہے ۔ اس کی بدھی میں یہ بات کس نے ڈالی کہ وہ ہے ہی اس جال میں پھنسنے کے لیے ۔ جس قدر ہاتھ پاؤں مارے گا اور الجھتا رہ جائے گا ۔

”یہ جال پھینکنے والا کون ہے؟ تو کیا یہ کھیل، یہ دھندا کرنے والا کوئی دوسرا ہے؟“

قاضی ہاشم مایوس ہو کے آخر کار اِس جال میں چلنا شروع ہوتا ہے ۔ مگر جتنا چلتا ہے، پھنستا جاتا ہے ۔ وہ کب تک اس گورکھ دھندا سے ہاتھا پائی کرتا رہے گا؟

اس کا چہرہ تک تو گردن پر سے بدلا گیا ہے؟ جب یہ ہو رہا تھا تو اس نے کیا کر لیا تھا؟ وہ اپنا اصل چہرہ اب کس آئینے میں ڈھونڈنے جائے ۔ قاضی ہاشم اپنے چہرے کو دیکھنے کے لیے آئینے کی سمت چلنا چاہتا ہے تا کہ نچی ہوئی بھوؤں والی آنکھوں اور چوکور ہڈیالے چہرے کو دیکھ سکے ۔

مگر دیوار میں اگلا، آئینہ رہا ہو تو کچھ دیکھ پائے ۔

اُس نے آئینہ نہ پا کر خدا کا ہزار شکر ادا کیا ۔ کیونکہ آئینہ اگر آج مل جاتا تو کیا خبر وہ کس چہرے کو اپنی گردن پر لٹکتا ہوا دیکھتا ۔

☆☆☆☆

اخلاق احمد

بنجر، بے رنگ زندگی والا

یہ کہانی میں بہت جلدی میں لکھ رہا ہوں ۔

اور اگر آپ نے یہ پوچھنے کی کوشش کی کہ اس جلدی کی وجہ کیا ہے، تو میں آپ کا سر توڑ دوں گا۔ مجھے ایسے پڑھنے والے زہر لگتے ہیں جو ہر چیز کی وجہ جاننا چاہتے ہیں۔ ہر کردار، ہر واقعے، ہر صورتحال کے پس منظر میں چھپی باتوں کا راز پانا چاہتے ہیں۔ لطف اٹھانے کے بجائے جستجو کے کرب میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں۔

آدمی زندگی میں کئی کام بلاسبب کرتا ہے۔ کبھی کسی نہایت فضول لطیفے پر ہنس ہنس کر پاگل ہو جاتا ہے۔ کبھی صبح سے شام تک اداسی کے حصار میں رہتا ہے۔ کبھی اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ ایک شائستہ محفل میں بدتہذیبی کا ایسا مظاہرہ کرے کہ سب لوگ مُڑ مُڑ کر اسے دیکھنے لگیں۔ لیکن دوسری طرف کچھ لوگ، بلکہ یوں کہہ لیجئے کہ احمق لوگ، بلاسبب کیے جانے والے ہر کام کو شعور اور لاشعور اور تحت الشعور کی نیلی، پیلی، سبز عینکوں سے پرکھنے میں لگ جاتے ہیں۔ میری گستاخی کو نظر انداز کر دیجئے گا، مگر آپ بھی مجھے ایسے ہی لگتے ہیں۔ کیونکہ آپ کے دل میں اب تک وہی پھانس چبھی نظر آ رہی ہے کہ آخر میں یہ کہانی جلدی میں کیوں لکھ رہا ہوں۔

چلیے، میں اس پھانس کو سبب کی چمٹی سے نکال دیتا ہوں تاکہ آپ کو قرار آ جائے اور میں بھی سکون سے کہانی بیان کر سکوں اور وہ جو سر توڑ دینے والی بات ہے، وہ بھی حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔ بات یہ ہے کہ میں اس روایتی کہانی سے تنگ آ چکا ہوں۔ فارمولا افسانہ نگاری۔ بلکہ افسانہ بازی۔ تکنیک اور اسلوب اور بیانیہ اور جادو نگاری۔ یعنی کیا بکواس ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ بس، بیٹھوں اور سوچے سمجھے بغیر ایک کہانی بیان کرنا شروع کر دوں۔ انجام کی فکر کیے بغیر لکھتا جاؤں، لکھتا جاؤں۔ کسی عبدالقیوم یا محمد شفیق یا شمیم الدین کی داستان، جس کا ہر کردار آزاد ہو اور طاقتور ہو اور کسی سرکش گھوڑے کی طرح خود میرے قابو میں بھی نہ آتا ہو۔ کوئی ایک کردار تو ایسا ہو کہ پوری کہانی کی بساط الٹ دے، سب کچھ ملیامیٹ کر دے۔

اب اگر آپ کی تشفی ہو گئی ہو، وہ پھانس نکل گئی ہو اور آپ کو تھوڑا بہت قرار آ گیا ہو تو میں کسی عبدالقیوم کی، یا کسی محمد شفیق کی کہانی بیان کروں۔

میرا خیال ہے کہ محمد شفیق بہتر رہے گا۔

محمد شفیق کی زندگی میں محبت اس وقت آئی جب اسے السر ہو چکا تھا اور اس کی پندرہ سالہ بیٹی کو محلے کے نوجوان غور سے دیکھنے لگے تھے اور ایک ہی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں مسلسل بیس سال کاپی رائٹنگ کرتے کرتے اس کا دماغ بنجر اور بے خیال ہو چکا تھا اور اس کی بیوی سرکاری اسکول میں لڑکیوں کو

پڑھاتے پڑھاتے اور برانکائل استھما سے لڑتے لڑتے بیزار ہو چکی تھی اور وہ خود کو اڑتالیس سال کی عمر میں ستر سال کا بوڑھا سمجھنے لگا تھا۔

اس وقت تک محمد شفیق کا خیال تھا کہ وہ نوعمری سے پختہ عمری تک متعدد کامیاب محبتیں کر چکا ہے۔ ان کامیاب محبتوں کے نتیجے میں، جو محمد شفیق کے خیال میں کامیاب بھی تھیں اور محبتیں بھی تھیں، وہ زندگی بھر سرشار اور مطمئن اور مسرور رہا تھا۔ اسے ان نظموں اور غزلوں کے کچھ مصرعے بھی اب تک یاد تھے جو ابتدائی محبتوں کے دوران یا ان کے ختم ہو جانے کے بعد اس نے کہی تھیں اور جن کی وجہ سے اس کو محدود ذہانت والے دوستوں کے ایک حلقے میں بڑا جینوئن تخلیق کار وغیرہ سمجھا جاتا تھا۔

وہ اگرچہ ایک سپاٹ زندگی بسر کر رہا تھا مگر اس خوش گمانی میں تھا کہ یہ ایک بھرپور زندگی ہے۔ لہٰذا وہ ہفتے میں ایک دو بار دوستوں کے ساتھ شام کا وقت ایک کافی ہاؤس میں گزارتا تھا جہاں سب مل کر غیبت کرتے تھے اور چائے کے ساتھ قیمے کے سموسے منگواتے تھے اور آرٹ مووِیز اور دولتمند لوگوں کی داشتاؤں اور کامیاب نظر آنے والی اپنی اپنی کامیابیوں کی باتیں کرتے تھے۔ گھر پر وہ اپنے بچوں کو ذرا فاصلے پر رکھتا تھا اور بیوی کے استھما کے سلسلے میں ایک منافقانہ فکرمندی ہمیشہ ظاہر کرتا تھا اور جب اس کی بیوی کا وہ دورہ ختم ہو جاتا تھا جس میں سانس دھونکنی کی طرح چلتا ہے اور وہ اپنی خرخراہٹ سمیت سو جاتی تھی تو وہ گداز بدنوں والی عورتوں کے بارے میں فینٹاسائز کرتا تھا۔

یہ وہ وقت تھا، جب محبت اس کی زندگی میں آئی۔

محمد شفیق اس دن ایک ڈائجسٹ کے ایڈیٹر کے پاس گیا تھا جہاں وہ فاضل وقت میں لکھی جانے والی کہانیاں اکثر لے کر جاتا تھا۔ ڈائجسٹ میں نہایت رذیل کہانیاں چھپتی تھیں اور محمد شفیق کو وہ کہانیاں لکھتے وقت بہت ذہنی تکلیف ہوتی تھی مگر مہینے میں اضافی دس پندرہ ہزار روپے مل جاتے تھے تو ساری تکلیف ختم ہو جاتی تھی کیونکہ یہی وہ رقم تھی جو وہ اپنی ذات پر یا اپنے شوق پر خرچ کر سکتا تھا۔ تو اس دن وہ بڑی بے فکری کے ساتھ، جس میں آدمی کا دل چاہتا ہے کہ وہ ہنسے یا سیٹی بجائے، ایڈیٹر کے کمرے میں داخل ہوا اور داخل ہوتے ہی ٹھٹک گیا۔

ایڈیٹر حسب معمول بیک وقت کسی کہانی کا تعارفی نوٹ لکھ رہا تھا اور چپراسی کو بلانے کے لیے گھنٹیاں بجا رہا تھا اور ٹیلیفون کے ریسیور کو کندھے اور گردن کے درمیان پھنسائے کسی کی باتیں غور سے سنتے ہوئے سر ہلا رہا تھا۔ اور اس کے سامنے، کچھ فاصلے پر رکھے صوفے پر شہناز بیٹھی تھی۔

مگر پتہ تو اسے بعد میں چلا کہ وہ شہناز تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت ٹھٹکنے کے ایک لمحے میں اس نے دیکھ لیا تھا کہ کمرے میں ایک عورت بھی ہے جس نے گلابی کپڑے پہن رکھے ہیں اور چادر جیسے دوپٹے سے خود کو ڈھانپ رکھا ہے اور اونچی ایڑی والے سیاہ سینڈل پہن رکھے ہیں۔ اس ایک لمحے میں اس نے یہ سب دیکھ لیا اور خود پر وہ بے نیازی طاری کر لی جو دراصل صرف بے حد پرکشش مردوں پر، کھائے کھیلے مردوں پر سجتی ہے۔

ایڈیٹر نے اسے دیکھا تو بائیں ہاتھ سے، جس سے وہ چپراسی کو بلانے کے لیے گھنٹی بجا رہا تھا، اس سے ہاتھ ملایا اور اسے اشارے سے بیٹھنے کو کہا اور پھر ریسیور سے آنے والی آواز پر سر ہلانے لگا۔

وہ بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ غلط زاویہ پر رکھی کرسی پر بیٹھ گیا ہے کیونکہ عورت اب اس کے پیچھے تھی۔ برسوں کی جبلت اسے عورت کو ایک نظر دوبارہ دیکھنے پر مجبور کر رہی تھی مگر گردن موڑ کر دیکھنا مردانہ شائستگی کے خلاف تھا۔ وہ کچھ دیر میز پر رکھے ایک رسالے کی ورق گردانی کرتا رہا اور ایڈیٹر کے کندھوں اور گردن کے درمیان پھنسے ہوئے ریسیور کے جھولتے ہوئے تار کو دیکھتا رہا۔

پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی بے تکلفی اور بے نیازی کے ساتھ، جیسے یہ اس کا اپنا دفتر ہو، وہ ایڈیٹر کی میز کے گرد گھوم کر پیچھے نصب دیوار گیر شیلف میں بے ترتیبی سے رکھی کتابوں کو دیکھنے لگا۔ اس نے ایک دو کتابیں نکالیں، انھیں یونہی کھول کر دیکھا اور پھر واپس رکھ دیا۔ پھر وہ واپس مڑا، یوں جیسے اپنی کرسی کی طرف واپس جانا چاہتا ہو، اور منصوبے کے عین مطابق اس نے عورت پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔

عورت ٹک ٹک اسی کو دیکھ رہی تھی...!

ایک لمحے... بلکہ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں اس نے عورت پر سے نظر ہٹالی اور یہ بھی دیکھ لیا کہ عورت نے بھی اسی تیزی سے، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ تیزی سے نظریں جھکا لی ہیں۔

محمد شفیق دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھا تو کچھ شرمندہ سا تھا۔

اسی وقت ایڈیٹر کا ٹیلیفون ختم ہو گیا اور ایک چپراسی بھی لاپرواہی سے دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ ایڈیٹر نے اس سے سب کے لیے چائے لانے کو کہا۔ چپراسی اسی لاپرواہی سے دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

”یار...“ ایڈیٹر نے اپنے بکھرے بالوں کو سنوارنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”تم عجیب گھاسلیٹ آدمی ہو۔ کوئی حساب کتاب نہیں رکھتے کہ مہینے میں کتنے صفحے چھپے اور کتنی ادائیگی ہوئی۔ اکاؤنٹس والے ناراض ہو رہے تھے۔ پانچ مہینے کے ساڑھے پانچ ہزار روپے اضافی بنے ہیں۔ جاتے ہوئے چیک

لے جانا۔ کم از کم صفحے تو گن لیا کرو پرچے میں۔"

اضافی ادائیگی کا ذکر سن کر محمد شفیق کا دل خوشی سے بھر گیا۔ مگر وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ پیسے اس کا مسئلہ نہیں ہیں۔ لہٰذا اس نے کہا۔ "اگر سارا حساب کتاب ہم مصنفین کرنے لگیں تو تمہارا اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ تو بھوکا مر جائے گا۔"

ایڈیٹر ہنسا۔ محمد شفیق کو یوں لگا جیسے اس کے پیچھے بیٹھی عورت بھی مسکرائی ہے۔

"معاف کرنا یار..." ایڈیٹر نے کہا.. "تمہارا تعارف نہیں کرایا۔ بھئی یہ ہیں محمد شفیق صاحب۔ ہمارے یہاں باقاعدگی سے لکھتے ہیں۔ شاعر بھی ہیں۔ اور سینئر کاپی رائٹر ہیں یونیورسل ایڈورٹائزنگ میں۔ اور یہ مسز شہناز حسین ہیں۔ بہت اچھی علامتی افسانہ نگار ہیں۔ ایک ناول بھی لکھ رہی ہیں اور ٹی وی پر ان کا ایک سیریل بھی شروع ہونے والا ہے۔ اہم ترین بات یہ کہ ہماری بھابی ہیں۔ اپنا عارف نہیں ہے جدّہ والا...؟ اس کی مسز ہیں..."

اب محمد شفیق کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ جدّہ والا عارف کون ہے مگر اس نے کرسی کھسکا کر زاویہ درست کیا اور شہناز کی طرف دیکھ کر مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ سر کے اشارے سے سلام کیا۔

اس ملاقات کی تفصیلات محمد شفیق کو چند دن بعد یاد نہیں رہیں۔ مثلاً اسے یہ یاد نہیں رہا کہ اس دفتر میں کچھ دیر تک بیٹھے رہنے کے دوران جو گفتگو ہوتی رہی تھی، وہ کس موضوع پر تھی۔ اور یہ بھی کہ واپسی پر اس نے جو شہناز کو اپنی گاڑی میں گھر تک چھوڑنے کی حامی بھری تھی، وہ ایڈیٹر کے کہنے پر بھری تھی یا خود شہناز نے اس سے درخواست کی تھی۔ اسے ٹھیک طرح سے یاد نہیں تھا کہ وہ اور شہناز راستے بھر کیا باتیں کرتے گئے تھے۔ البتہ اسے یہ ضرور یاد تھا کہ ان کی گفتگو بے حد رسمی اور پر تکلف اور جبری شائستگی سے بھرپور تھی جس کا مقصد وقت گزارنا تھا جس میں دو اجنبی لوگوں کو تھوڑی دیر کے لیے ساتھ بیٹھنا پڑتا ہے۔ شہناز نے اپنے گھر کے سامنے اتر کر شاید اس کا شکریہ ادا کیا تھا اور اسے چائے کی دعوت دی تھی جسے اس نے ایٹی کیٹس سے آشنا، مہذب اور تعلیم یافتہ مرد کے طور پر شائستگی سے ٹال دیا تھا۔

ایک نارمل اور اچھے اور مصروف انسان کی طرح محمد شفیق بہت جلد اس ملاقات کو بھول گیا۔ وہ زندگی کی مصروفیتوں اور پریشانیوں میں پھنس گیا جہاں آپ کو منافقت سے کام لینا پڑتا ہے اور جھوٹ بولنا پڑتا ہے اور وہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے جو آپ کے لیے ناپسندیدہ ہوتا ہے مگر ناگزیر ہوتا ہے۔ وقت، بعض اوقات سوچنے کا موقع بھی نہیں دیتا۔ یہ جانچنے کی مہلت بھی نہیں دیتا کہ یہ جو ہر وقت چیف ایگزیکٹو کی ناراضی

کا خوف ہے اور بیوی کو ہر وقت مطمئن رکھنے کی جد و جہد ہے اور رشتے داروں کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہو جانے کا سلسلہ ہے اور جمعہ کے روز اخبارات میں نئی نوکریوں کے اشتہارات غور سے پڑھنے کا معمول ہے، اس سے ہٹ کر بھی زندگی کچھ مانگتی ہے ۔ لہٰذا ایک روز محمد شفیق ہکا بکا رہ گیا ۔

وہ شام ڈھلے اپنے کام سے فارغ ہونے ہی والا تھا کہ انٹر کام کی گھنٹی بجی اور استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی نے اسے بتایا کہ کوئی مسز شہناز عارف اس سے ملنے آئی ہیں ۔ وہ آئی تو فرش پر اونچی ہیل کے بجنے کی آواز اور نرم خوشبو کے جھونکے کے ساتھ ہال نما کمرے میں موجود چار پانچ مردوں نے سر اٹھا کر دیکھا ۔ محمد شفیق کو سخت غصہ آیا ۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ ایسی دلکش چال والی عورت دفتر میں کسی اور سے ملنے آتی تو وہ خود بھی اسی طرح نظر اٹھا کر اسے دیکھتا ۔

”السلام علیکم ۔ ۔ “ شہناز نے اس کے مقابل بیٹھ کر کہا ۔ ”میں سارے راستے خدا سے دعا کرتی آئی ہوں کہ آپ دفتر میں ہی موجود ہوں اور مجھے پہچان بھی لیں ۔ “

”حسین خواتین کی دعائیں عام طور پر بے اثر نہیں رہتیں ۔ “ محمد شفیق نے کہا ۔ ”میں دفتر میں بھی ہوں اور میں نے آپ کو پہچان بھی لیا ہے اور مجھے آپ سے مل کر خوشی بھی ہوئی ہے ۔ “

شہناز نے ایک کھنکتا قہقہہ لگایا ۔

دفتر کی پژمردہ، اداس فضا میں وہ قہقہہ یوں گونجتا گیا جیسے سخت حبس اور گرمی میں کہیں سے خنک ہوا کا کوئی جھونکا آئے اور روح تک اترتا جائے ۔ دفتر والوں نے چونک کر اسے دیکھا، اپنی ٹائیاں درست کیں، لاشعوری طور پر انگلیوں سے بال سنوارے اور ایک دوسرے سے کوئی غیر اہم دفتری بات کرنے لگے ۔

مگر شہناز نے کچھ نہیں دیکھا ۔ وہ صرف محمد شفیق کو دیکھ رہی تھی اور اسی سے بات کر رہی تھی ۔ اس نے کہا ۔ ”آپ تو باتیں کرنے کے بہت ماہر لگتے ہیں ۔ خطرناک نشانی ہے ۔ “

محمد شفیق نے کہا ۔ ”معاف کیجئے گا ۔ میں شاید ذرا زیادہ ۔ ۔ “

”نہیں، نہیں ۔ “ شہناز نے ہاتھ ہلا کر اس کی بات کاٹ دی ۔ ”مجھے تو بہت اچھا لگا ۔ بہت دنوں بعد میں یوں بے ساختہ ہنسی ہوں ۔ بلکہ شاید بہت مہینوں بعد ۔ ۔ “ وہ بولتے بولتے رک گئی ۔ اس کی آنکھوں میں اور اس کے چہرے پر اداسی کسی سائے کی طرح چھا گئی تھی ۔ پھر اس نے جیسے اپنی ساری قوت صرف کر کے خود پر قابو پایا اور مسکرا کر بولی ۔ ”بہر حال ۔ ۔ ۔ میں آپ کے پاس ایک کام سے آئی تھی ۔ میرا ٹی وی سیریل

اگلی سہ ماہی سے شروع ہو رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اس کا اسکرپٹ ایک نظر دیکھ لیں۔ دیکھ کیا لیں، اس پر نظر ثانی کر دیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ۔۔۔"

"ایک منٹ خاتون۔" محمد شفیق نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "میں پہلے وضاحت کر دوں کہ۔۔۔"

"میرا نام خاتون نہیں، شہناز ہے۔"

"او کے۔ شہناز صاحبہ۔ میں نے زندگی میں کبھی کوئی ٹیلیویژن اسکرپٹ نہیں لکھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ٹیلیویژن اسکرپٹ ہوتا کیا ہے۔۔۔"

"آپ کے خیال میں کیا ٹیلیویژن اسکرپٹ کے سینگ نکلے ہوئے ہوتے ہیں۔؟ بھئی، سیدھا سادہ ڈرامہ ہوتا ہے۔ اور ب اتی دا دے، یہ کام دیکھے بغیر کام سے انکار کرنے کی عادت کہاں سے سیکھی آپ نے؟"

محمد شفیق لاجواب ہو گیا۔

یا شاید اس کو لگا کہ وہ لاجواب ہو گیا ہے۔ یا شاید اس کا دل چاہا کہ وہ لاجواب ہو جائے، لاجواب نظر آئے۔

اس وقت تک محمد شفیق ایک لاعلم آدمی تھا۔ اس شخص کی طرح، جو فٹ پاتھ پر بے فکری سے چل رہا ہوتا ہے اور اس بات سے لاعلم ہوتا ہے کہ تین منٹ دس سیکنڈ بعد ایک دیوہیکل ٹرک ڈرائیور کے قابو سے باہر ہو جائے گا اور اسے کچلتا ہوا گزر جائے گا۔ اس لڑکی کی طرح، جو موٹر سائیکل پر اپنے محبوب کے ساتھ جا رہی ہوتی ہے اور کھلی آنکھوں سے سپنے دیکھنے کے دوران لاعلم ہوتی ہے کہ آگے سڑک پر ایک کار ترچھی کھڑی ہوتی ہے جس میں اس کے تین جوان بھائی چھرے لیے بیٹھے ہیں۔ اس عورت کی طرح جو اپنے شوہر کے پسندیدہ کباب تل رہی ہوتی ہے اور اس بات سے یکسر لاعلم ہوتی ہے کہ ابھی کچھ ہی دیر میں اس کا شوہر آئے گا اور پرانے محبت ناموں کی ایک گڈی اس کے سامنے پھینک کر ماں بہن کی گالیاں دینے کے بعد طلاق دے دے گا۔

تو محمد شفیق بھی اسی طرح ایک لاعلم آدمی تھا۔

اسی لاعلمی کے دوران اس نے اگلے سات دنوں میں شہناز کے ٹی وی سیریل کا اسکرپٹ پڑھا اور اس کی اصلاح کی۔ ایک بار اس نے فون پر شہناز سے بات کی۔ ایک بار شہناز خود دفتر آئی۔ دو مرتبہ وہ ایک بڑے ہوٹل کی کافی شاپ میں بیٹھے اور دیر تک بحث کرتے رہے۔ بعض سین زائد تھے۔ بعض ڈائیلاگ لمبے

تھے۔ چھوٹے دورانئے کی سیریل کے حساب سے اسٹاک کیریکٹرز زیادہ تھے۔ مگر محمد شفیق کو بہت حیرت ہوئی کہ شہناز نے اس کے سب اعتراضات خوش دلی سے قبول کیے اور بعض کا نہایت معقول جواب دیا۔

آٹھویں دن جب شہناز نے کام مکمل ہو جانے پر اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کو اگلے روز شام کی چائے اپنے گھر پلانے کی پیشکش کی تو محمد شفیق پہلے ہی بہت خوش تھا۔ اسی صبح اسے چیف کاپی رائٹر سے ترقی دے کر، کری ایٹو ڈائریکٹر بنایا گیا تھا۔ ترقی کا مطلب تھا، تنخواہ میں بیس ہزار روپے اضافہ، پرانی کار کے بجائے نئی کار، سولیٹر مفت پٹرول، ہال کی جگہ خوبصورت کمرہ۔ چھوٹی چھوٹی مراعات بعض اوقات بے حد کمینگی آمیز خوشیاں بخشتی ہیں۔ اور بے حد حسد آمیز اطمینان۔ خوش دلی کی اسی کیفیت میں اس نے شہناز کے گھر چائے کی دعوت قبول کرلی۔

مگر اگلے روز جب وہ کام سے فارغ ہونے ہی والا تھا، عین اسی وقت ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا مالک کسی بلائے نا کہانی کی طرح نازل ہو گیا۔ وہ کرسی گھسیٹ کر محمد شفیق کے سامنے بیٹھ گیا اور ایجنسی کے نئے کری ایٹو ڈائریکٹر سے مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں اور کاپی رائٹنگ کے جدید مغربی تصورات کے بارے میں اور اپنی ایجنسی کو پاکستان کی سب سے بڑی ایجنسی بنانے کے بارے میں اتنی دیر تک گفتگو کرتا رہا کہ باہر رات کا اندھیرا اچھیل گیا اور دفتر کا چوکیدار عشا کی نماز پڑھ کر واپس آ گیا۔ سوا نو بجے وہ دفتر سے باہر نکلا تو شہناز کے گھر نہ جانے کے خیال سے شرمندہ اور پریشان تھا۔ مگر کچھ ہی دیر میں، ایک مشینی شہر میں رہنے سے حاصل ہونے والی صلاحیت کی مدد سے، اس نے اس شرمندگی کو دل سے نکال پھینکا اور اطمینان سے گھر چلا گیا۔

دو دن بعد اسے ڈاک کے ذریعے ایک لفافہ موصول ہوا۔ ایک سادہ کاغذ پر، سرخ روشنائی سے لکھا ہوا تھا۔

’’تیرے آنے کا انتظار رہا...!‘‘

شام تک وہ اس کاغذ پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔

محمد شفیق نہیں جانتا تھا کہ ایک مصرع اسے زندگی کے اڑتالیسویں سال میں ایک نئے سفر پر روانہ کر دے گا۔ ملاقاتوں کے کسی خواب جیسے سفر پر، جہاں سب کچھ خود بخود ہوتا جاتا ہے، سرشاری کا بادل صبح شام برستا رہتا ہے، دل خوشی کی انجانی تال پر نئے سرے سے دھڑکنا شروع کرتا ہے اور ایک بگولہ... جذبوں کا ایک ناچتا، دائرے بناتا، طوفانی رفتار سے گھماتا بگولہ نہ جانے کن سرزمینوں کی سیر کراتا، اوپر ہی اوپر اڑاتا جاتا

ہے۔

محمد شفیق، شہناز کو یوں پڑھتا گیا جیسے وہ کسی دلچسپ کتاب کو پڑھتا تھا۔ صفحہ صفحہ، سطر سطر۔ شہناز چینی کھانے شوق سے کھاتی تھی۔ رات بارہ بجے سے ڈھائی بجے تک اپنے ناول پر کام کرتی تھی۔ غصّے میں اس کی ستواں ناک سرخ ہو جاتی تھی۔ وہ شوخ رنگ کے ملبوسات پہنتی تھی جو دہلی کالونی میں رہنے والی ایک بے نام ڈریس ڈیزائنر تیار کرتی تھی۔ وہ اپنے اکاؤنٹنٹ شوہر عارف سے، جو جدّہ کی کسی گمنام فرم میں ساڑھے چھ ہزار ریال کی تنخواہ پر کام کرتا تھا، بیزار ہو چکی تھی اور چند ماہ میں اسے خلع کا نوٹس بھجوانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

محمد شفیق ہر گفتگو سے، چھوٹی چھوٹی باتوں سے، جوابوں سے، سوالوں سے، تبصروں سے، شہناز کے بارے میں جانتا گیا۔ اس کی پسند ناپسند سے، عادتوں سے، پسندیدہ موضوعات سے، اس کے ملیح چہرے پر مسکراہٹ لانے کے حربوں سے، ہر چیز سے واقف ہوتا گیا۔ وہ زندگی کے اگلے برسوں میں آزاد رہنا چاہتی تھی۔ یا کسی ایسے وسیع القلب مرد کے ہمراہ جو تخلیقی صلاحیت رکھتا ہو۔ زندگی کو سمجھتا ہو۔ خود اس کو سمجھتا ہو۔

”کیا میرا اتنا بھی حق نہیں ہے۔“ وہ اپنی کاجل بھری آنکھیں محمد شفیق پر مرکوز کر کے کہتی تھی اور محمد شفیق صرف سر ہلا پاتا تھا۔

محمد شفیق کے شب و روز بدل گئے تھے۔ شہناز کا ٹی وی سیریل بہت کامیاب نہیں رہا۔ پھر بھی ان کی روزانہ ملاقاتیں جاری رہیں۔ ایک روز اس کی بیٹی نے کہا۔ ”بابا، آپ نے تو ہمارے ساتھ رات کا کھانا کھانا چھوڑ ہی دیا ہے۔“

محمد شفیق جوتے اتارتے اتارتے رک گیا۔ کسی جرم کے احساس نے اسے لمحہ بھر کو لاجواب کر دیا۔

جواب اس کی بیوی نے دیا۔ ”بابا کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں گڑیا۔ وہ تمہارے لیے دن رات کام کرتے ہیں۔ اب تم بڑی ہو گئی ہو، تمہیں یہ بات سمجھنی چاہیے۔“

مگر کمرے میں، لائٹ بجھانے اور محمد شفیق کی طرف کروٹ لینے کے بعد اس نے کہا۔ ”کہہ تو وہ ٹھیک رہی تھی۔ ایسی بھی کیا مصروفیت ہو گئی ہے کہ ہر روز کھانا کھا کر آتے ہیں۔“

محمد شفیق چند لمحے خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مجھے ہوٹل کا کھانا برا لگتا ہے۔ مجبوری میں کھاتا ہوں۔ ڈاکٹر کہہ چکا ہے کہ معدہ خالی نہیں رہنا چاہیے۔“

وہ سو گئی۔

مگر محمد شفیق جاگتا رہا۔

ایک سپاٹ، بے رنگ زندگی گزارنے والا محمد شفیق، جس کی جھولی میں آسمان سے ایک خزانہ آ گرا تھا، اپنے اندر ایک بے کلی، ایک اضطراب، ایک خوف کو پھیلتا محسوس کرتا تھا۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ یہ جو اس کے گرد سیاروں کی طرح گردش کرتے لوگ ہیں اور آس پاس پھیلی زندگی ہے، یہ سب کچھ ایک خواہش، ایک اشارے سے اس طرح ختم نہیں ہو سکتا جیسے وہ کمپیوٹر اسکرین سے اشتہاری سلوگنز اور جنگلز اور مغربی اشتہارات سے چرائی ہوئی کاپی کے لفظوں کو منتخب کر کے ڈیلیٹ کر دیتا ہے۔

ہر سمجھدار آدمی کی طرح اسے بیوی سے زیادہ معاشرے کا خوف تھا۔ بیوی کو اس نے ہمیشہ اتنی ہی اہمیت دی تھی جتنی وہ اپنی نئی قمیضوں کو یا شارجہ میں رہنے والے اپنے خوشحال بڑے بھائی کو یا بڑھتی ہوئی مہنگائی کو دیتا تھا۔ یعنی وہ اسے اہم ضرور سمجھتا تھا مگر اس قدر اہم بھی نہیں کہ اس پر زندگی کا دارومدار ہو۔ یوں بھی اس کی بیوی ایک دھیمی، ٹھنڈی، بھڑک اٹھنے کی صلاحیت سے محروم عورت تھی جو برسوں سے میٹرک کی لڑکیوں کو پڑھاتے پڑھاتے ایک نرم خو استانی بن چکی تھی۔ جواب دینے کی صلاحیت سے مالامال، مگر سوال کرنے کی قوت سے محروم۔

چار پانچ دن بعد محمد شفیق، شہناز سے گفتگو کرتے کرتے کسی بہانے سے اسی موضوع پر آ گیا۔

رشتے، بیوی بچے، ذمہ داریاں، کشمکش، مشکل فیصلے، سماجی اور نفسیاتی الجھاوے۔ براہ راست اپنے معاملے پر بات کرنے کے بجائے وہ گھما پھرا کر ایک پورے معاشرے کی بات کر رہا تھا۔

اپنی پسندیدہ مراکشی چائے کا ایک گھونٹ بھر کر، جس کی کڑواہٹ کم کرنے کے لیے کم از کم ایک چمچہ شہد ڈالا جاتا تھا، شہناز نے اس سڑک کی جانب نگاہ کی جو آگے ساحل کی طرف جاتی تھی اور کہا۔ ”پتا نہیں۔ میں تو ان چیزوں کو جذبات کی عینک سے نہیں دیکھتی۔ جذبات کی عینک سے دیکھو تو باقی دنیا اہم ہو جاتی ہے۔ آدمی خود اہم نہیں رہتا۔ میرے لیے سب سے زیادہ اہمیت خود میری ہے۔ میری زندگی، میری خوشی کی ہے۔ اور یہ زندگی بس ایک بار ملتی ہے۔ ایک بار۔ چاہے اپنی مرضی سے جیو، چاہے دوسروں کی مرضی سے پوری عمر گزار دو۔“

محمد شفیق نے اپنی زندگی پر نگاہ کی اور سر ہلایا۔

”اور یہ معاشرہ کیا ہوتا ہے۔؟“ شہناز نے کہا۔ ”رشتے کیا ہوتے ہیں۔؟ ہر چیز آدمی کی اپنی

ذات سے بندھی ہے۔ آدمی کے بغیر یہ رشتے، یہ دوستیاں، یہ معاشرہ، سب صفر ہیں۔ جو لوگ ہزاروں میل دور جا کر بس جاتے ہیں وہ کیا اپنا معاشرہ ساتھ اٹھا کر لے جاتے ہیں۔؟ ایک بم دھماکے میں جس آدمی کا پورا خاندان فنا ہو جاتا ہے وہ کیا باقی زندگی کسی معاشرے یا رشتے کے بغیر گزارتا ہے۔؟ سب باتیں ہم نے خود بنائی ہیں۔ ساری اصطلاحات ہم نے خود تخلیق کی ہیں اور پھر ان کی پوجا شروع کر دی ہے۔"

محمد شفیق کو شبہ ہوا کہ وہ اپنے زیرِ تکمیل ناول کی لائنیں بول رہی ہے۔ مگر بس، ایک نامکمل سا شبہ۔

"اکتالیس برس کی ہو چکی ہوں میں۔" شہناز کی نظریں نیچے، ساحل کی طرف جانے والی سڑک پر جمی تھیں جہاں گزرنے والی گاڑیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ "اور اب سمجھ میں آئی ہے یہ بات، کہ اپنی مرضی کی خوشیاں حاصل کرنے کے لیے، اپنی مرضی کی زندگی پانے کے لیے خود قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ ورنہ پنجر، بے رنگ زندگی کسی بھیانک خواب کی طرح چلتی رہتی ہے۔"

اس رات محمد شفیق کو سونے کے لیے نیند کی گولی کی مدد لینی پڑی جو اس کی بیوی کی دراز میں ہمیشہ ہوتی تھی۔

دفتر میں اگلا دن بھی ایسے ہی گزرا۔ اور اس سے اگلا دن بھی۔ ایک مسلسل بے کلی، ایک ختم نہ ہونے والا اضطراب۔ محمد شفیق کا دل کسی چیز میں نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے رف ٹف شوز کے ٹی وی کمرشل کی کاپی پانچ بار لکھنے کی کوشش کی اور ہر بار اسے پھاڑ کر پھینک دیا۔ ایک بار تو اس کا دل چاہا کہ جوتوں کے اس اشتہار کو یوں لکھے کہ ساری دنیا حیران رہ جائے۔ رف ٹف شوز پہنئے۔ خود قدم اٹھائیے۔ ورنہ پنجر، بے رنگ زندگی کسی بھیانک خواب کی طرح چلتی رہے گی۔

تیسرے دن اسے اچانک خضدار جانا پڑا۔ کراچی سے چار سو کلو میٹر دور۔ کسی کلائنٹ کی فرمائش تھی کہ اس کے پروڈکشن پلانٹ کا بروشر شائع کیا جائے جس کے ذریعے ثابت ہو جائے کہ ایسا معیاری پروڈکشن پلانٹ نہ کبھی پہلے بنا تھا اور نہ آئندہ بن سکے گا۔

آر سی ڈی شاہراہ پر سات آٹھ گھنٹے کے سفر کے دوران محمد شفیق کے اعصاب پر یہ خوف مسلسل سوار رہا کہ کسی بھی جگہ ان کی گاڑی روک لی جائے گی اور انہیں اغوا کر لیا جائے گا۔ اس کے ساتھ سفر کرنے والے کلائنٹ سروس ایگزیکٹو اور فوٹو گرافر بھی راستے بھر خاموش رہے۔ حالات نے سب کو ایک جیسا بزدل بنا دیا تھا۔

خضدار میں انہیں ایک دن کے بجائے دو دن رکنا پڑا۔ فیکٹری شہر کے مضافات میں تھی جہاں

موبائل فون کے سگنل نہیں پہنچ پاتے تھے، اردگرد سناٹا تھا اور شام ڈھلتے ہی ایک ایسی ہولناک تنہائی آسمان سے اترتی تھی کہ ذرا سے کھٹکے پر بھی دل لرز جاتا تھا۔

تیسری صبح تھکن اور نامکمل نیند سے بے حال محمد شفیق کو گاڑی نے اس کے گھر کے دروازے پر اتارا تو اس کے بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور اس کے دل میں ایک گہری نیند کی خواہش کے سوا کچھ نہ تھا۔

وہ اندر گھسا تو اس کی بیوی سامنے لاؤنج میں کھڑی تھی۔

”ارے...!“ محمد شفیق نے حیرت سے کہا... ”تم اسکول نہیں گئیں۔“

”نہیں...“ اس کی بیوی نے تلخی سے کہا۔

ایک گھاگ شوہر کی طرح محمد شفیق نے اپنی بیوی کے لہجے میں چھپے غصّے کو دیکھ لیا اور اندازہ لگا لیا کہ وہ اس کی دو دن کے بجائے تین دن بعد آمد پر ناراض ہے۔ محمد شفیق کو تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی۔ زندگی بھر اس نے اپنی بیوی کو کچھ نادیدہ حدود کا پابند رکھا تھا۔ وہ روٹھ سکتی تھی مگر اسے منانا ضروری نہیں تھا۔ اپنی اور گھر کی تمام ضروریات کے لیے پیسے لے سکتی تھی مگر بینک اکاؤنٹ کی تفصیل سے واقف ہونا ضروری نہیں تھا۔ اختلاف کر سکتی تھی مگر ہنگامہ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اپنے شوہر کی قوت برداشت کی نظر نہ آنے والی لکیر کو پار کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

لیکن اس روز اس کی بیوی کے تیور بدلے ہوئے نظر آتے تھے۔

محمد شفیق کو احساس ہونے لگا کہ معاملہ سنگین ہے۔ اس نے اپنے چہرے پر وہی سنجیدگی طاری کر لی جو اس بات کا اشارہ ہوتی تھی کہ اس وقت وہ کوئی فضول بات سننا نہیں چاہتا۔

اس کی بیوی نے کہا... ”یہ شہناز کون ہے۔؟“

ذہنی طور پر منتشر اور تھکن سے چور محمد شفیق کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ”شہناز...!“ اس نے کہا... ”کون شہناز؟“

”یہ بھی تمھیں میں بتاؤں کہ کون شہناز...؟“ اس کی بیوی نے زہریلے لہجے میں کہا۔

محمد شفیق کے تمام اعصاب جیسے کسی جھٹکے سے بیدار ہو گئے۔ بدن میں لہو کے ساتھ ایڈرینالین دوڑنے لگی اور وہ ایک ہوشیار، چوکنے جانور کی طرح ایک خوفناک حملے کا دفاع کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ زندگی بھر اسے احترام سے ’آپ‘ کہہ کر مخاطب کرنے والی بیوی بغاوت پر آمادہ نظر آتی تھی۔

”اگر تم مسز شہناز عارف کی بات کر رہی ہو۔“ محمد شفیق نے اپنی آواز دھیمی مگر مضبوط رکھی۔ ”تو وہ

ایک رائٹر ہیں۔ ٹی وی ڈرامے لکھتی ہیں۔ ناول نگار ہیں۔ مگر یہ کون سا طریقہ ہے شوہر سے بات...''

''بھاڑ میں گیا طریقہ...'' اس کی بیوی نے کہا۔ ''اور اس کے ساتھ شوہر بھی۔ یہ بتاؤ کہ تم اس سے شادی کرنے کا پروگرام بنا رہے ہو...؟''

''کیا مطلب ہے اس بات کا۔؟'' محمد شفیق نے اپنی آواز ذرا سی بلند کی۔ بس، ذرا سی بلند۔ ٹی وی اشتہارات کے وائس اوور کی ریکارڈنگ کرانے والے فنکاروں سے اس نے یہ گُر سیکھا تھا۔ آواز کی پچ بہت بلند نہ ہو اور کھرج ذرا سی بڑھا دی جائے تو تاثر گہرا ہو جاتا ہے۔

اس کی بیوی نے ایک گہری سانس لی، یوں جیسے اچانک پھٹ پڑنے کی خواہش پر قابو پا رہی ہو۔ پھر اس نے کہا۔ ''وہ یہاں آئی تھی۔ تمہاری مسز شہناز عارف۔''

محمد شفیق آواز کے زیر و بم کو استعمال کرنے کا سارا کھیل پل بھر کو بھول گیا۔ ''یہاں آئی تھی...!'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''مگر کیوں...؟'' ہزاروں ممکنہ مناظر، خدشات بن کر اس کی نظروں کے سامنے گزرنے لگے۔

اس کی بیوی نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔ ''کیونکہ تمہارا موبائل فون بند تھا۔ وہ تمہارے لیے پریشان تھی۔ وہ تمہیں فون کر رہی تھی۔ پھر اس نے دفتر سے گھر کا نمبر لیا اور مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا کہ وہ شہر سے باہر ہیں۔ مگر وہ سوال پر سوال کرتی رہی۔ پھر ڈھونڈتی ڈھونڈتی وہ گھر آ پہنچی۔'' محمد شفیق نے دیکھا، اس کی بیوی بار بار مٹھیاں بھینچ رہی تھی، کھول رہی تھی۔ ''جو کچھ اس نے یہاں کہا اس کے بعد میں نے اس کے ساتھ وہی کیا، جس کی وہ مستحق تھی۔''

''کیا کیا تم نے...؟'' محمد شفیق نے غصّے سے کہا۔ ''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے...؟''

''شادی تم کرنا چاہتے ہو، اور دماغ میرا خراب ہے۔؟'' اس کی بیوی نے چلّا کر کہا۔ ''تم مجھے جانتے نہیں ہو محمد شفیق۔ کیونکہ تم نے مجھے جاننے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ میں وہ بھی ہوں جو تمہیں نظر آتی ہوں۔ اور وہ بھی، جو نظر نہیں آتی۔ سمجھ رہے ہو۔؟ میں وہ ہوں، جس نے تمہارا یہ گھر بنایا ہے۔ جس نے تمہیں آٹے، دال، سبزی سے گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد رکھا ہے۔ میں نے تمہیں گرم روٹی کھلائی ہے اور تنگی میں گزارا کیا ہے اور تمہاری شوہرانہ رعونت کو ہمیشہ پیار سے تھپکی دی ہے۔''

محمد شفیق کے کانوں کی لویں سرخ ہو چکی تھی۔ یہ عورت، یہ معمولی استانی، نویں دسویں کی لڑکیوں کو میر اور داغ اور علامہ اقبال کے شعروں کی انٹ شنٹ تشریح ڈکٹیٹ کرانے والی، ہر صبح چائے میں پاپے ڈبو

کر کھانے والی عام سی عورت اس پر حاوی آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے مسلسل 'تم' کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔

”بند کرو یہ بکواس۔“ محمد شفیق نے گرج کر کہا۔

اس کی بیوی کے لیے جیسے اس کی گرجدار آواز کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ اس نے محمد شفیق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”تم پچیس برس کے نہیں ہو محمد شفیق، پچاس برس کے ہونے والے ہو۔ دو دو بچوں کی مائیں تمھیں انکل کہنے لگی ہیں۔ پچھلی بار تمہارا شوگر لیول بہت بلند تھا اور کولیسٹرول بالکل سرحد پر تھا۔ تمہارے بال ڈائی کیے ہوئے ہیں مگر سامنے سے تم گنجے ہو چکے ہو۔ اور اپنا پیٹ دیکھا ہے تم نے۔؟ تمہارا خیال ہے کہ کوئی عورت تمہاری وجاہت سے اتنی متاثر ہو سکتی ہے کہ تم سے شادی کرنے کے لیے مچل جائے۔ تم سٹھیا گئے ہو۔ بڑھاپے میں نوجوانی کا کھیل کھیلنے کے شوق نے تمھیں اتنا اندھا کر دیا ہے کہ تم یہ بھی نہیں دیکھ سکتے کہ وہ عورت اپنے شوہر سے جان چھڑانے کے لیے تمھیں وقتی طور پر استعمال کر رہی ہے۔ تم ایک عارضی بندوبست ہو۔ ایک عبوری انتظام۔“

محمد شفیق نے اپنے چہرے پر غصّے کے تاثرات برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی۔ مگر اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا ہو۔ جیسے وہ کسی ویرانے میں بے بس پڑا ہوا ہو اور اس کے سینے پر سوار اس کی بیوی تیز دھار والے خنجر سے اس پر پے در پے وار کرتی جا رہی ہو۔ غیر اہم دکھائی دینے والی بیوی۔ دھیمی، بے آواز بیوی۔

محمد شفیق کے دل پر پہلی بار خوف کسی سیاہ بادل کی طرح چھانے لگا۔

اس نے اپنے جسم و جاں کی پوری قوت استعمال کر کے بلند آواز میں کہا۔ ”تم پاگل ہو گئی ہو۔ مجھے اتنا غصّہ نہ دلاؤ کہ میں کوئی قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاؤں۔“

”تم قدم اٹھاؤ گے...؟“ وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی میں وحشت بھری تھی۔ ”تم نہیں جانتے کہ جس دن میں نے کوئی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا، اس دن کیا ہوگا۔ تم اس عمر میں سارے دفتر کے سامنے اپنی بیوی کا ہنگامہ برداشت نہیں کر سکتے۔ قانونی نوٹسوں کا سامنا نہیں کر سکتے ہو جو خلع کے لیے اور نان نفقے کے لیے تمہارے نام آئیں اور جن کی ایک ایک کاپی تمہارے ہر جاننے والے کو ملے۔ میں تمھیں برباد کر سکتی ہوں محمد شفیق، کیونکہ اس جنگ میں ہر شخص میرے ساتھ کھڑا ہوگا، اس احمق باپ کے ساتھ نہیں جو اپنی جوان ہوتی بیٹی کا رشتہ ڈھونڈنے کے بجائے خود شادی کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہو۔ اور تم کچھ نہیں کر سکو گے۔ تم ایک بزدل،

کم ہمت آدمی ہو۔ بے سروپا خواب دیکھنے والے۔ بے روزگار ہونے کے خوف سے ایک ہی نوکری سے چمٹے رہنے والے۔ تخلیقی صلاحیتوں سے مالامال ہونے کی خوش فہمی میں مبتلا۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ تم کچھ نہیں ہو۔ میں اپنی بیٹی کے ساتھ تمہارے بغیر آرام سے زندگی گزار سکتی ہوں، مگر تم... تم اس اچھی بھلی زندگی کے بغیر صرف ایک صفر رہ جاؤ گے۔ بے حیثیت، غیر اہم، زیرو۔‘‘

محمد شفیق کا رنگ زرد پڑ چکا تھا اور اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور اس کے پورے بدن میں وہ کمزوری پھیلتی جاتی تھی جو کسی صورت نہ ٹل سکنے والی موت کو ایک لمحے کی دوری پر دیکھ کر سارے بدن کو مفلوج کر دیتی ہے۔

وہ کچھ کہے بغیر مڑا اور اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔

اپنے بستر پر چت لیٹے لیٹے وہ کچھ دیر تک تصور کرتا رہا کہ وہ کسی پر سکون جھیل کی سطح پر ایک چھوٹی سی کشتی میں لیٹا ہوا ہے اور وہ کشتی ہلکی لہروں کی بدولت دھیرے دھیرے ڈول رہی ہے۔

پھر نہ جانے کب وہ سو گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو دوپہر ہو چکی تھی۔ وہ کچھ دیر آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ باہر سے اس کی بیٹی کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اسکول سے آ چکی تھی اور شاید اپنی ماں کو جوشیلے انداز میں کوئی واقعہ سنا رہی تھی۔

محمد شفیق نہا دھو کر باہر نکلا۔

اس کی بیٹی نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ’’بابا۔ مڈ ٹرم میں دوسری پوزیشن آئی ہے میری۔‘‘

’’ویری گڈ...‘‘ محمد شفیق نے مسکرا کر اس کا ماتھا چوما۔

باورچی خانے سے اس کی بیوی کی آواز آئی۔ ’’کھانا لگاؤ میز پر۔ لیکن پہلے میز صاف کرنا۔‘‘

جتنی دیر میں کھانے کے برتن آئے، کھانا آیا، اس کی بیٹی اور پھر بیوی آئی، اتنی دیر محمد شفیق دائیں طرف کی کھڑکی سے نظر آنے والے جامن کے درخت کو دیکھتا رہا، جس کی بڑی بڑی ٹہنیاں اکثر اپنے ہی وزن سے ٹوٹ جاتی تھیں۔

اس کی بیٹی نے کہا۔ ’’اوہو۔ آج تو بابا کے لیے اروی گوشت بنا ہے۔!‘‘

’’آرام سے کھانے دیا کرو بابا کو...‘‘ اس کی بیوی نے دھیمی آواز میں کہا۔ ’’تین دن پتا نہیں کیا کیا کھاتے رہے ہیں۔‘‘

محمد شفیق نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ ہمیشہ جیسی ہی تھی۔ پر سکون، مدہم، نرم خو۔

”کھانا تو خیر مل جاتا تھا۔“ محمد شفیق نے کہا۔ ”فیکٹری میں ہی پکتا تھا وہاں۔ لیکن مرچیں بہت ہوتی تھیں سر کھانے میں۔“

”ایسا کھانا کھانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔“ اس کی بیوی نے سر جھکائے آہستہ سے کہا۔

”تو کیا کرتا۔؟“ محمد شفیق نے کہا۔ ”تین دن فاقہ تو نہیں کر سکتا تھا۔“

”بابا کو دکھائی رپورٹ کارڈ۔؟“ اس کی بیوی نے بیٹی سے کہا۔

”ابھی کھانے کے بعد دکھاتی ہوں۔“ بیٹی مسکرائی۔ ”انعام دینا پڑے گا بابا کو۔“

محمد شفیق اطمینان سے کھانا کھاتا رہا۔

زیب اذکار حسین

اللہ دے، نہ بندہ لے

دل نے تو جیسے نہ بولنے کی قسم بھلا دی تھی۔ جو اثراتِ آزار منہ کی بندش کا سبب بنے تھے، وہی زبان کی کھینچا تانی کا تبسم آ ٹھہرے۔ یہ ”آ ٹھہرنا“ بھی ایک رعایا کے لیے ایک رعایت بن گیا۔ اب راوی کا حال بھی ضرور جانیے۔

نئی دنیا کے پاؤں پرانے
کیا کیا کہہ گئے لوگ سیانے---
کہنا لازم---لوگ نہ مانیں---
دنیا نئی، گھاؤ پرانے
نوسربازوں کی جے جے کار
کوئی کہے مائی باپ، کوئی کہے سرکار---

جان مصیبت میں آ گئی تھی---یوں منمناتی پھر رہی تھی جیسے پھرکی پھر دیکھی جائے--- موت کے منہ میں، یا موت کے کنوئیں منہ میں چکر کھاتی برسوں پرانی موٹر سائیکل۔ دماغ کی

بات بھی آئی گئی ہوگئی تھی۔۔۔ یہ "آئی گئی ہوگئی" کی گردان گردابِ گردن ہو چلی۔۔۔ اب یہ گردن ناپنے لگی تھی۔ تیسرے درجے کے اول اول طور اطوار اتنے عامیانہ نہیں تھے، جتنے بہیمانہ، آخر آخر کو ظاہر ہوئے۔۔۔ ظاہر پر بھروسہ تبھی کرو جب باطن کی جانچ پر قدرت ہو۔۔۔ یوں نہ ہو کہ "حل شدہ پرچہ جات" بھی "باقی آئندہ" کی بشارت کے ساتھ بس میں ہو دیں۔۔۔ یہ تسلی بھی کرو کہ بس میں کھانے پینے کی اشیا کے ساتھ "پینے کھانے" کے لوازمات بھی ہیں۔۔۔ یا انھیں عاری از سواری تصور کیا جا رہا ہے۔

اور دیکھیے اس پر، اس لامحالہ انتظام کے نگران، گویا کھجور کی کھال میں لپٹا بال۔۔۔ لیجیے مزے مروّت کے!!

"بن" بیٹھے ڈور
عادت سے مجبور۔۔۔ صحراؤں کے بیچ
جنگل کے اطراف، بوند بھر کا دریا
ایک کوڑی کا کہسار
جنگلوں کے حضور
کہلائے بے قصور۔۔۔

رہ گئی بات گٹھلیوں کی۔۔۔ غُرغوں کی۔۔۔ اُن کا حشر بھی دیکھتے جاؤ۔۔۔ یہاں پر بات آتی ہے غائب دماغ کی، اور اس کے کارخانوں کی۔۔۔ زیور بنا دی گئیں، غائب دماغ کارخانوں کا۔

اب چال یہ تھی کہ حال تو وہی ہوا اور ہال (Hall) وہ نہ ہو۔۔۔ جو عام طور پر ہوتا ہے۔۔۔ اب کارخانہ داروں کے تہہ خانوں کے وارے نیارے ہو گئے تھے۔

پیستے جائیے اور موتی چور کے لڈو تیار کرتے جائیے۔ ذائقہ تو وہ کہ زبان تالو سے جا لگے۔

بیچاری بندیاں۔۔۔ تالہ بندیاں۔۔۔ وہی باندیاں اور چھانٹیاں۔۔۔ اور عقل مارے بندے۔۔۔ لگے بندھے دھندے۔۔۔ رہ گئی بات تیسری جنس کی تو ان کا وصف تو پہلے ہی آہ اور کراہ سے بندھا تھا۔۔۔ اب کوئی نئی بات تو ہونے سے رہی تھی۔ لہٰذا تالا بندیاں، چھانٹیاں اور۔۔۔

ایک ہی مرض کے تین نسخے بن کر بکھر گئے تھے۔

یہ تو یہ۔۔۔ وہ بھی وہ ہو چلے۔

اللہ دے نہ بندہ لے۔۔۔ دنیا بھر کا تو مت کہیے، ایک دنیا کا کہہ لیجیے۔ ایک ہی شور سنائی پڑتا تھا۔

”آج کل ان کے گلے آرہے ہیں۔ ان آنکھوں کو اُبکائیاں آرہی ہیں“۔

دوسرے لفظوں میں، تیسرے درجے میں، چوتھی جماعت میں۔۔۔ ایک ہی بات کو مات ہو گئی تھی۔۔۔ اس اٹھک بیٹھک نے محاورے کی ہیئت ہی بگاڑ دی تھی۔ اب وہ ”ے“ (ح) کی حمایت سے ہی محروم ہو گئے تھے۔ یعنی وہ ماورے بنے پھرتے تھے۔۔۔ اور فٹ پاتھ کے بجائے فٹ پہری پر آمدورفت کا امتزاج مزاج لیے پھرتے تھے۔۔

گردن شکنی کیا ہے، گردن گزیدگی سے آگے کا عمل۔ یہ عمل تیسری دنیا کی شکوہ آلود آہٹوں کا بیان۔۔۔ اور جانچ پڑتال کیجیے تو نہ پہلی دنیا موجود اور نہ تیسری دنیا کا کہیں وجود۔۔

رہا دوسری کا ذکر۔۔۔ تو وہ بالکل بے سُود۔

قرض یافتہ اور ترقی پذیر کہہ کر دل کی بھڑاس بُجھائیے۔۔۔ منہ سے آگ نکالیے۔

گویا یہ بھی ایک فن ہے۔۔۔ نہ چین میں چین۔۔ نہ روس میں راحت۔۔۔ امریکہ جانے میں کیا ہے قباحت؟ وہی ایک جملہ۔ من جملہ ممالک میں مروج ہو چکا تھا دکھاوے کو۔۔۔ ”ہم کسی طالع آزما کو ملک کی تقدیر کے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں دیں گے“۔

محاورہ جان سے گیا، جگ ہنسائی مفت میں راس آئی۔۔۔ سبق سیکھا جاپان نے، نہ کھانے والے رہ گئے آن بان میں۔

آنکھوں کے آگے اندراج شدہ جوابات رقص کرتے رہتے۔۔۔ تاروں کی دنیا معدوم ہو کر رہ گئی تھی۔

ستاروں نے یوں سر نکالا۔

کہو وہ جو کرنے کے قابل ہو۔

جھاڑ پھونک کا زمانہ، پھونک جھاڑ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے مچلنے کے دن لد گئے تھے۔ رات کی رونق خالہ جی کے گھر منتقل ہو گئی تھی۔۔۔ خالہ جان، ماموں، ممانی کو منانے میں سرگرم تھے۔ رہی بات سرگرمی کے سَر کی تو وہ چچیرے بھائیوں کے ہاں بیوگی کے دن گذار رہی تھی۔۔۔ اس بار بے چاری آن بان، ان رقاصوں کے دم خم سے قائم تھی جنہیں رقص سے کچھ علاقہ نہ تھا۔

تھال بھر کے آوازے ۔۔۔ دو کوڑی کی کرختگی ۔۔۔ علاقائی موسیقی کی موت واقع ہو چکی تھی۔ غیر ملکی نشریاتی ادارے ان رازوں کے امین بنے پھرتے تھے جن کے پھٹے پُرانے پردے اپنی دال ہی کھو چکے تھے۔ وادین کی بحث ہی بیکار سی لگتی تھی۔ بین الاقوامی قوی نامانوسیت کی دلدل میں جا کر بچاؤ بچاؤ کی آوازیں لگا رہے تھے۔

ایک اعتبار سے یہ کہنے میں کچھ مضائقہ نہیں ہے کہ بین الاقوامی دھنیں اپنی موت آپ مرنے پر بضد تھیں۔۔۔ ان کی زندگی چند نام نہاد حدود و قیود کا ورد کرنے سے مشروط تھی۔ وہ اپنی طبیعت کی تلملاہٹ اور مزاج کی مروت کے ہاتھوں بےزاری سے رنگے راگ الاپ رہی تھیں، پہ دُھنیں کب تھیں؟ سر دھنتی آگ کی اُڑانیں تھیں۔ انھیں ریاستی حد بندیوں کو محض خود پر طاری کرتے نشے کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ چند ایک، ایک چند کی صورت میں گویا ڈھلے دھلائے، ڈھلے ڈھلائے قواعد و ضوابط کے ہاتھوں ہلکان ہوئے جا رہے تھے۔

اب سحر زدہ پُتلیوں کے روبرو وہ رقاص کود پھاند رہے تھے جو توازن کے نام پر توانائی کو تہہِ تیغ کرنے کے درپے تھے۔

عقلِ سلیم اپنی جگہ اعمالِ سلیم بھی اپنی کل رکھتے ہیں۔ وہ جب لوٹتے ہیں تو اپنے پیاروں کو بھی لُوٹتے ہیں، تا کہ ان کی حکمرانی میں کوئی مزاحم نہ ہو سکے۔۔۔

اگر اپنی کلی زندوں کو مُردہ اور مردوں کو زندہ دکھانے کا فن بن جائے گی تو پرزہ بھی اپنے پرائے کا فرق کہاں ملحوظِ خاطر رکھے گا۔۔۔

تہہ خانہ دل میں؟ وہاں تو پہلے ہی ہتھیلی کی تنگی ہے۔ بھیڑ کا خوف، نہ ہرن سے ہمدردی۔ پھر کاہے کی بھلامانسی ۔۔۔ بے چارے مانس ٹھہرے بے بانس ۔۔۔ دو ٹانگوں کے محتاج ۔۔۔ جس کے چار ہاتھ اُسی کا راج ۔۔۔ باقیوں کا کیا ہے کام کاج؟ ۔۔۔ مگر کب تک؟؟

اب چار ہاتھ بھی راج پاٹ کے شور و غوغا میں دب کر رہ گئے تھے۔ وہ ہاتھ جو نشہ، فسق و فجور میں بولائے بولائے پھرتے تھے، ٹانگوں پر اکتفا کرنے لگے تھے۔ اور ٹانگوں کا کیا ہے، چار و ناچار دو ہی بن کر رہتی ہیں ۔۔۔ زیادہ کچھ کہو تو ہاتھوں کی مذمت پر اتر آتی ہیں ۔۔۔ اور یہ مذمت دیکھیے کب تک گوارا ہے۔ اب تو یہی کھا جا ہے ۔۔۔ اب تو یہی چارہ ہے ۔۔۔

☆☆☆☆

خالد فتح محمد

اور طرح کی جنگ

جانے ایسی کیا کشش تھی کہ وہ اِس جگہ کو دیکھتے ہی رُک گئے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے! وہ کئی گھروں پر مشتمل ایک کنبہ تھا اور ہر گھر ایک عارضی جھونپڑی، دو گدھوں، ایک گدھا گاڑی، ایک کتے اور چند مرغیوں پر مشتمل تھا۔ وہاں آنے سے پہلے چلتے رہنا ہی اُن کی زندگی تھی؛ اور سفر میں ایسا لطف کہ کسی جگہ پر دو راتوں سے زیادہ قیام اُنھیں بے چین، چڑچڑا اور جھگڑالو بنا دیتا۔ اُن کی نظر میں شدت، حافظے میں گہرائی اور لہجے میں مٹھاس تھی۔ اُن کے پاس علاقوں کی کہانیاں، رواج، گیت اور راز تھے اور وہ زندگی کے وسیع تجربے کی دولت اپنے بے سروسامانی کے چھکڑے پر لادے پھر رہے تھے۔

میرے خیال میں نسلوں کی صحرا نوردی شاید اِسی جگہ کی تلاش میں تھی اور جوں ہی کسی کی دوررس نظر نے اِس علاقے کو دیکھا تو تلاش ختم ہو گئی اور زندگی کے سفر نے ایک نئی منزل کی طرف اپنا رُخ کر لیا۔۔۔۔۔ وہ وہیں ٹھہر گئے! اُنھیں لگا کہ وہ کبھی سفر میں تھے ہی نہیں۔۔۔۔۔ ایک طویل خواب تھا جس میں خواب اندر خواب تھے اور اِس بھول بھلیاں میں ایسے گم کہ رُکنے کے بعد ہی اُس میں سے نکلے۔ جب وہ بھول بھلیاں میں سے نکلے تو اُنھیں تھکاوٹ کا احساس تھا اور کئی مہینے وہ سکتے کی حالت میں پڑے اپنے ارد

گرد کو دیکھتے رہے۔ ایک طرف ریل کی پٹری تھی اور دوسری طرف، اُس کے متوازی چلتے ہوئے سڑک اور کچھ فاصلے پر دونوں کو کاٹتے ہوئے گزرتی نہر۔ ریل کی پٹری کے پار لہلہاتے ہوئے کھیت اور سڑک کے دوسری طرف نیم دلدلی سا علاقہ تھا جہاں صبح سے شام تک مویشی پھرتے۔

اِس جگہ پر بستے ہوئے اُن کی نسلیں گزر چکی تھیں۔ وہ جس زمین پر عارضی طور پر مستقل رہ رہے تھے، اُن کی ملکیت نہیں تھی۔ اُن کے کہیں ووٹ نہیں بنے تھے، کسی انتخابی حلقے میں اُن کا شمار نہیں تھا، اُن کے پاس شناختی کارڈ نہیں تھے، اُن کی کوئی سیاسی وابستگی نہیں تھی، وہ جغرافیائی حدود کے اندر رہتے ہوئے کسی بھی خطے یا ملک کے شہری نہیں تھے-----اُنھیں آج بھی خانہ بدوش کہا جاتا!

وہ جب یہاں آئے تھے تو ریل گاڑی کی گونج، دھمک، ٹھک ٹھک، ہورن، ہوا کا دباؤ، ڈبوں کا غیر محفوظ طریقے سے محفوظ ہونا اور بغیر اُترے چلے ہی جانا ایک معما تھا۔ اُن کی بستی کے پاس پٹری ایک لمبا سا خم ڈال کر سیدھی ہوتی تھی اور دور سے ریل گاڑی ایک سانپ سے مشابہ تھی۔ اُس خم پر چلتی ریل گاڑی اتنا دور نظر آتی کہ جیسے ایک کھلونا ہو اور خم کے ختم ہوتے ہی لگتا کہ وہ بستی پر چڑھ دوڑے گی-----لیکن وہ ٹھک ٹھک کرتی آگے ہی بڑھتے چلی جاتی۔

سڑک مرے ہوئے سانپ کی طرح سیدھے لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کے اندر اُسی وقت حرکت آتی جب بس، ٹرک، کار یا تانگہ گزرتا۔ پھر تانگے گزرنے بند ہو گئے۔ بسوں، ٹرکوں اور کاروں کی تعداد میں اتنا اضافہ ہوتا رہا کہ سڑک کی بار بار مرمت کرنا پڑتی اور گاہے بہ گاہے اُسے چوڑا بھی کیا جاتا۔

نہر کا پانی ریل کی پٹری اور سڑک کے پلوں کے نیچے سے چھوٹی چھوٹی لہروں کے ترنم کے ساتھ اک بے نیازی سے گزرتا رہتا۔ سردیوں میں جب اِس کا پانی سالانہ بندی کے باعث بند ہو جاتا تو بستی کے نوجوان اور بچے کھیلنے کے لیے اندر اُتر آتے اور جب تک پانی کی چھوٹی چھوٹی چھپڑیاں رہتیں، اُن میں سے ریتا مچھلی پکڑتے رہتے۔

یہ لوگ سارا سال بے روزگار رہتے۔ ریل کی پٹری کی مرمت اور دیکھ بھال کے لیے محکمے کے اپنے آدمی تھے جو بارہ مہینے کچھ نہ کچھ کرتے رہتے، خصوصاً اُن دنوں میں جب افسر ٹھیلے پر معائنے کے لیے نکلا ہو۔ اِسی طرح نہر پر، بیلدار کسّیاں اور ٹوکریاں اپنے بائیسکلوں کے پیچھے باندھے، گشت کیا کرتے۔ سڑک پر جب مرمت کا کام ہو رہا ہوتا تو ٹھیکے دار کے اپنے مزدور ہوتے اور جب بستی کے لوگ اُسے اپنی افرادی قوت کا بتاتے تو وہ اُنھیں اپنی عورتیں کام پر بھیجنے کو کہتا۔ اُن کی عورتیں اپنے مردوں سے زیادہ جفاکش اور محنتی تھیں لیکن بستی کے بوڑھوں کو ٹھیکے دار کی نیت پر شک تھا اِس لیے اُنھیں بستی کے اندر ہی رکھتے اور وہ بستی

میں سے ہی اپنا رزق نکالنے میں لگی رہتیں۔ ریلوے کی پٹڑی کے پار جب گندم اور دھان پکتا تو اُنھیں وہاں بھی مزدوری نہ ملتی۔ زمین دار اپنے کمّوں کو ہی کام پر لگاتے اور صرف اُن لوگوں کو مالی فائدہ پہنچانے کے اقدام کرتے جن سے اُنھیں ووٹ ملنے کی اُمید ہو۔

اِن حالات میں بھی وہ زندہ تھے!

پولیس ہمیشہ اُنھیں مشکوک افراد کی فہرست پر رکھتی!

پولیس نے ہمیں بتایا ہوا تھا کہ اردگرد کہیں بھی واردات ہوئی ہو اور مجرموں کا سراغ نہ ملے تو تفتیش کے تمام اصول اُن کی طرف اشارہ کریں گے۔ پھر پولیس کی بھاری نفری بستی پر چھاپہ مارتی۔ یہ چھاپہ عموماً سورج غروب ہونے کے فوراً بعد یا طلوع ہونے سے پہلے مارا جاتا۔ ویسے تو یہ بے کار لوگ سارا دن چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بیٹھے بارہ ٹانی، تاش یا چوسر کھیلتے اور عورتیں کسی نہ کسی مسئلے پر آپس میں جھگڑتی رہتیں، لیکن بستی والوں کو کسی نہ کسی طرح چھاپے کی خبر ہو جاتی۔۔۔ یہ آج تک کوئی نہیں جان سکا تھا کہ کیسے؟ چھاپے کی اطلاع ملتے ہی بستی چوکنا ہو جاتی۔ جوان مرد غائب ہو جاتے، صرف بوڑھے بستی میں موجود رہتے اور عورتیں ڈنڈے پکڑ کر پولیس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتیں۔ چھاپہ پڑنے کے چند منٹ کے اندر اندر وہاں ایک مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا ہو جاتی۔ پولیس والے عورتوں کو پکڑ کر اُن کے ساتھ گتھم گتھا ہونے کی کوشش میں ہوتے، جوان عورتیں اُنھیں پیچھے بھگا کر نہر کی طرف لے جاتیں اور پکی عمر والی گھروں کا دفاع کرتیں۔ گھنٹے بھر کی اِس آنکھ مچولی کے بعد سپاہی اپنے بازوؤں پر دانتوں کے نشان اور چہروں پر ناخنوں کے زخم چھپاتے، تھانے دار پھولے ہوئے پیٹوں کی مجبوری کی وجہ سے بے بس، بستی کے وسط میں، اِس کھیل سے لاتعلق سے ہو کر بیٹھے بوڑھوں کے ساتھ رابطہ کرتے تو اس وقت عورتیں ایک جعلی اور مصنوعی غصے سے بھری، پولیس والوں پر حملہ کرنے کی مکارانہ کوشش کرنے لگتیں اور بوڑھے آدمی اُن سے بھی زیادہ مکاری کے ساتھ اُنھیں فحش گالیاں دیتے اور پولیس کو خوش آمدید کرتے۔ پھر مذاکرات کا ایک طویل سلسلہ چل نکلتا: وہ تو مجبور اور بے بس سے لوگ ہیں، واردات تو ایسے لوگ کرتے ہیں جن کی پشت پناہی بڑے لوگ کرتے ہیں، اُن کا تو پولیس کے علاوہ کوئی اورسائی باپ ہے ہی نہیں؛ پولیس اگر نہ ہو تو اُنھیں وہاں بیٹھنے کون دے۔۔۔؟ وہ تو ہمیشہ سے پولیس کے خادم ہیں، جب کسی قسم کی اطلاع کی ضرورت پڑے وہ حاضر ہوتے ہیں، افسر تو بس ایسے ہی ہیں صرف ایس ایچ او ہی بادشاہ ہوتا ہے اور وہ اُس کی رعایا۔۔۔ محض اتفاق تھا کہ جب واردات ہو رہی تھی تو اُن کا آدمی وہاں موجود تھا، اُس کا وارداتیوں کے ساتھ کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا۔۔۔ ہاں واردات ایک چودھری کے آدمیوں نے کی ہے۔۔۔ ”نہیں جی! ہمارا کیا ہے؟ ہم تو ٹھیری

واس ہیں اپنا سامان لے یہاں سے کہیں اور نکل جائیں گے۔ ہمارا تو نہ گھر ہے اور نہ کوئی وطن۔ پرانے وقتوں میں ہم سانپ ہوا کرتے تھے، سو سال کے بعد ہم انسان بن گئے، سانپ کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ چلو، چلو! کھولو اپنا اپنے جانور اور یہاں سے نکلنے کی تیاری شروع کرو۔"

بستی میں ایک دم ہلچل مچ جاتی۔ عورتیں اور بچے مجنونانہ سی کیفیت میں جھونپڑیوں کے اندر اور باہر جانے لگتے۔ سامان اُٹھایا جانے لگتا، مرغیاں شور کرنے لگتیں اور بد دعاؤں کی لہر پولیس والے پر چڑھی جا رہی ہوتی۔ پولیس والوں کو پہلے برہمی، پھر دل چسپی کا احساس ہوتا اور تب اُس وقت کی کیفیت میں اُن کے دل پسیجنے لگتے۔۔۔۔۔ یہ ایسا ناٹک تھا جو تجربہ کار کلاکاروں کی پیش کش تھی!

پولیس والوں کے دل تو پسیج رہے تھے لیکن انھیں ملزم کی بھی ضرورت تھی۔ پولیس ملزموں کو پکڑے یا نہ پکڑے انھیں مکمل جان کاری چاہیے ہوتی ہے۔ بستی والے آدمی کی شناخت اتنی اہم نہیں رہ جاتی۔ پولیس جانتی تھی کہ دوسرے مجرم کہیں روپوش ہو چکے ہوں گے؛ انھیں اُن کے نام چاہئیں جو مل جائیں گے۔

بستی والے زمین کے سہارے پر زندہ تھے اور اب وہ اُن پر تنگ ہو رہی تھی۔ وہ جس معاشرتی عمل کو غیر اہم سمجھتے تھے، وہی اُن کا احتساب کر رہا تھا۔ وہ وہاں رہتے ہوئے کسی گاؤں کا حصہ تو نہیں تھے لیکن اُن کے جعلی شناختی کارڈ کسی نے بنوائے تھے جو پولیس کے علم میں تھا اور الیکشنوں پر اُمیدواروں کے پاس انھیں بیچ دیا جاتا۔ اُس خرید و فروخت میں وہ ایک جنس تھے۔

ہم گھنٹوں اپنے دفتر میں اِس مسئلہ پر تبادلۂ خیال کرتے رہتے۔ فیصلہ کیا گیا کہ ٹپری واسیوں کا پراجیکٹ خواتین کارکنوں کے سپرد کر دیا جائے اور وہ بستی کے بوڑھوں کے ساتھ رابطہ کریں تاکہ لوگوں کی بھلائی کے اقدام کے بارے میں سوچا جا سکے۔ اُن خواتین کارکنوں کے ساتھ میں نے بھی جانے کا فیصلہ کیا۔

اپنے کام کی نوعیت کی وجہ سے ہمیں پولیس کے ساتھ کافی قریبی رابطہ رکھنا پڑتا ہے۔ ہمیں بستی کے وسینکوں کے متعلق اطلاعات کی ضرورت ہوتی جو پولیس ہی مہیا کر سکتی تھی۔ پولیس نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ ہم وہاں پرائیویٹ سیکیورٹی گارڈ لے کر جایا کریں۔۔۔ اپنے کام کی نوعیت کی وجہ سے ہم نے یہ مناسب نہیں سمجھا۔ جب ہم پہلی مرتبہ بستی میں گئیں تو ہمیں کسی قسم کی پذیرائی نہیں ملی۔ انھوں نے رابطے کی ہماری ہر کوشش کا سرد مہری سے جواب دیا، اُن کے بدن کی زبان میں جارحیت تھی اور ہمیں بتایا بھی یہی گیا تھا۔ ہم مایوس نہیں ہوئے؛ متواتر رابطہ قائم رکھنا ہمارے عمل کا حصہ تھا۔ سوائے بچوں کے کسی کو ہمارے ساتھ کوئی دل چسپی نہیں تھی اور اِس کی وجہ غالباً ہمارے لباس تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ہمارے قریب تو آنے لگے لیکن ہم سے بدکتے بھی تھے۔ انھیں

شاید کسی پر اعتماد نہیں تھا۔ ان کا زندگی کرنا بظاہر سادہ لیکن بے انتہا پیچیدگیاں لیے ہوئے تھا۔ وہ یہاں رہتے ہوئے بھی کسی گھنے جنگل میں گم تھے جہاں سے باہر آنے میں انھیں کوئی دل چسپی نہیں تھی یا شاید انھیں اپنے آپ پر اعتماد نہیں تھا اور اپنی کم اعتمادی کو ہی برتری بنا کر الگ تھلگ سی زندگی گزار رہے تھے اور یا پھر اتنا پیچھے رہ گئے تھے انھیں آگے جانا ایک خطرہ لگ رہا تھا اور مستقل قیام نے ان کی خطروں سے نمٹنے کی جبلت کو کہیں ختم تو نہیں کر دیا تھا؟

ایک مرتبہ ہم نے بچوں کے لیے سیب، کیلے اور خربوزے خریدے اور کسی قدر جھجکتے ہوئے بستی کے وسط میں پھلوں کا چھوٹا سا سٹال لگا لیا۔ بچے ارد گرد اکٹھے ہو گئے اور عورتیں جھونپڑیوں کے سامنے بیٹھی حیرت سے ہمیں اور پھلوں کو دیکھے جا رہی تھیں جب کہ مرد دو تین جگہوں پر بیٹھے اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ ہم نے پھلوں کا سٹال لبنیٰ کے حوالے کر کے مردوں کی اس ٹولی کے پاس جانے کا فیصلہ جس میں صرف بوڑھے تھے۔ سب کی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی اور گھنی، سیاہ رنگی ہوئی مونچھیں نیچے کو جھکی ہوئی تھیں، انھوں نے سروں پر میلے صافوں کی پگڑیاں سی بنا کر باندھ رکھی تھیں۔

سب سے عمر رسیدہ شخص نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا جو باقی لوگوں کو پسند نہیں آیا۔ ان میں سے ایک ’جتھے ویکھی رن۔۔۔ بڑبڑاتے ہوئے اٹھا اور باقی بھی اس کے پیچھے چلے گئے۔

”بزرگ کہاں کے رہنے والے تھے؟“ اس نے ہمارے بیٹھنے کے بعد دونوں کو مخاطب کیا۔

”بٹالہ!“ میں نے کہا۔

”پتا نہیں۔“ للی نے جواب دیا۔

اسی وقت ایک شور ہوا، جیسے مرغیوں کے ڈربے میں بلا گھس آیا ہو۔ بچوں نے پھل کے سٹال پر حملہ کر دیا تھا اور لبنیٰ بھاگ کر ہمارے پاس آ گئی۔

بوڑھا دل چسپ سی ہنسی ہنسا۔

”خبیث ہیں سب، خبیث!“

”بٹالہ کہا تھا؟“

میں نے کسی قدر گھبراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔

”ڈیرہ بابا نانک کا نام سنا ہے؟“

”جی!“ میں نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

”پیجو چک جہاں کا گنگوڈا کو تھا، ڈیرہ بابا نانک، دربار صاحب کرتارپور، بھڑی شاہ رحمٰن، خانقاہ

ڈوگراں والا اور جنڈیالہ شیر خان ۔۔۔۔‘‘

بوڑھا کسی ریوری میں گم تھا۔ ’’ہم چلتے تھے، جہاں بھی جاتے، کتے بھونکتے اور حیران بچے ہمارا استقبال کرتے۔

پھگوں کے سٹال پر شور ختم ہو چکا تھا!

ہمیں اب پھگوں میں دل چسپی بھی نہیں رہی تھی۔

بوڑھے کی آواز گہری، لہجہ میٹھا اور باتیں اجنبی سی تھیں۔

’’تم نے بچے دیکھے! انھیں صرف اتنا پتا تھا کہ اِنھیں کھاتے ہیں اور حملہ آور ہو گئے۔ ہم بھوکے ہوا کرتے تھے اور ہماری خوراک ہمارے پیروں کے نیچے تھی۔ جتنا چلتے اتنا ہی کھانے کو ملتا۔۔۔ لیکن آخر کب تک؟ جب یہاں آباد ہوئے تھے تو میں بھی بچہ تھا۔‘‘ بوڑھا خاموش ہو گیا۔

بچے اب ہمارے اردگرد جمع ہو گئے تھے، ان کی آنکھوں میں جارحیت، محرومی اور اشتیاق تھا۔ مجھے اپنے جسم میں کپکپی سی محسوس ہوئی۔۔۔ مجھے احساس ہوا کہ ہمیں سیکیورٹی گارڈ کے ساتھ آنا چاہیے تھا۔

’’کہا جاتا ہے کہ تم لوگ بنیادی طور پر جرائم پیشہ ہو۔‘‘ میں نے قدرے معصومیت سے پوچھا۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ اُن لوگوں کو براہِ راست سوال کیے جانا پسند نہیں تھا۔

’’بالکل نہیں۔ ہمیں مزدوری نہیں ملتی اور سب کی طرح ہمارے ساتھ بھی پیٹ لگے ہوئے ہیں۔ اُنھیں بھرنے کے لیے جرم ہی ہمارا واحد ساتھی ہے۔‘‘ بوڑھا ہنسنے لگا۔ مجھے اس کی ہنسی چھاتی کے کسی خلا میں سے آتے ہوئے محسوس ہوئی، یا زندگی سے الگ سی لگی۔

’’جس زمین پر تم آباد ہو یہ سرکاری رقبہ ہے۔ ہم اِسے تم لوگوں کو الاٹ کرانے کی کوشش کریں؟‘‘ لٰلی نے پوچھا۔

’’نہیں!‘‘ بوڑھے کی دھیمی آواز میں سے پھوٹتی ہوئی شدت نے ہمیں ڈرا دیا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ سماجی بھلائی کے شوق میں، یہاں آتے وقت، ہم نے بنیادی اصولوں کی پاسداری کرنے کو اہمیت نہیں دی۔

’’نہیں !‘‘ بوڑھے نے دہرایا، ’’ہم اور ۔۔۔۔‘‘ اُس نے آسمان، زمین اور خلا کو دور تک دیکھا، ’’تم میں یہی فرق ہے۔ جیسے تم نے کہا کہ ہم جرائم پیشہ ہیں، درست، ہم جرائم پیشہ ہیں! اِس کے ساتھ ساتھ ہمیں زر اور زمین کا لالچ نہیں۔‘‘ بوڑھے کے لہجے میں سے شدت جاتی رہی تھی لیکن ایک کھچاؤ محسوس کیا جا سکتا تھا۔

‘‘اگر سرکار نے یہ جگہ خالی کرالی تو۔۔۔۔۔’’لبنیٰ کے سوال نے بوڑھے کو اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

‘‘ہمیں یہاں رہتے ہوئے ایک لمبا عرصہ ہو گیا ہے۔’’بوڑھے کی آواز تھوڑی سی بلند ہو گئی تھی اور ساتھ ہی بچے بھی ذرا سا آگے کو کھسک آئے تھے۔ مجھے وہ ان بھیڑیوں کی طرح لگے جو اپنے شکار پر آخری حملہ کرنے کے لیے، آہستہ آہستہ، اس کے گرد گھیرا تنگ کرتے آتے ہیں۔‘‘اور میری اِس بات کو ذہن میں رکھ کر ہماری بستی پر ایک نظر ڈالو۔’’ہم نے بستی کو غور سے دیکھا!

بوڑھے نے ہماری خاموشی کو اجتماعی لاعلمی سمجھتے ہوئے، جو درست بھی تھی، بات جاری رکھی،‘‘یہاں تمھیں کہیں بھی گارے، اینٹ یا لکڑی کا مستقل قسم کا استعمال نظر نہیں آئے گا۔ ہم ہر وقت جانے کے لیے تیار رہتے ہیں، صرف مرغیوں کو پکڑنے میں وقت لگے گا۔ وہ ذرا آزاد ہو گئی ہیں۔’’اس کی ہنسی دل چسپ اور طنز میں ڈوبی ہوئی تھی۔‘‘اِس عرصے میں یہاں ایک شہر آباد ہو جانا چاہیے تھا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ یہاں ہم تقریباً اتنے ہی لوگ ہیں جتنے آکر آباد ہوئے تھے۔’’بوڑھے نے بچوں کے ہجوم کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں دھندسی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ اور بچے ایک ہی فریکوئنسی پر ہیں؛ وہ آپس میں باتیں کر رہے ہیں، یہ بھی لگا کہ وہ انھیں کسی بات سے منع کر رہا ہے اور یہ بھی محسوس ہوا کہ وہ انھیں اُکسا رہا ہے یا انھیں ڈرا رہا ہے، شاید وہ انھیں کوئی پیغام بھی دے رہا تھا جسے وہ سمجھ رہے تھے۔ عجیب قسم کی مضحک حالت تھی۔ مجھے خوف آنا شروع ہو گیا تھا اور میں نے سوچا کہ ملاقات ختم کر دی جائے۔

‘‘یہ بچے نظر آرہے ہیں؟ اِن کے جوان ہو جانے کے بعد یہاں رہنے کی جگہ نہیں رہے گی۔ اِس سے پہلے اِسی طرح بچوں کے پُور تھے۔ جب ایک پُور جوان ہو جاتا ہے تو ہم چپکے سے اُنھیں خدا کے سپرد کر دیتے ہیں۔ وہ ہمارے چھوڑے ہوئے نشانوں پر چل کر کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ تم یہ سمجھو کہ یہاں خانہ بدوشوں کی پنیری تیار ہوتی ہے۔ یہاں سے چلے جانے کے بعد، سالہا سال چلنے کے بعد، وہ تھک کر کسی نہر کے کنارے آباد ہو جاتے ہوں گے۔ نہر کے اندر پانی ہے اور پانی زندگی ہے۔’’بوڑھے کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اُسے شاید وہ پنیری یاد آرہی تھی جو اب تک پورا پودا بن چکی تھی اور یقیناً ملاقات پر وہ ایک دوسرے کو پہچان بھی نہیں پائیں گے۔

میں نے اپنے اردگرد کھڑے، گھیرا تنگ کرتے ہوئے بچوں کے متعلق پوچھنے کا سوچا کہ وہ ان کو سکول کیوں نہیں بھیجتے؟ اور اگر بستی والے چاہیں تو ہم ان کی ابتدائی تعلیم کا وہیں بندوبست کر سکتے ہیں۔ لیکن میرے سوال پوچھنے سے پہلے ہی للّی نے اپنا سوال داغ دیا:

“لیکن بابا جی! ہمارا تو پانی بند کیا جا رہا ہے۔ اگر نہریں خشک ہو گئیں تو ان کے کناروں پہ کیا کرو گے؟”

کوئی اشارہ مقرر تھا یا اتفاق، ایک دم شور اٹھا؛ جیسے مرغیوں کے ڈربے میں پھر سے بلا گھس آیا ہو۔ بچے ہم پہ چڑھ دوڑے تھے۔ مجھے اپنا بیگ کسی کے ہاتھ میں، سینڈل کسی دوسرے کے ہاتھ میں، دوپٹے پہ کوئی اور ہاتھ اور گلے میں سونے کی زنجیر پہ انگلیاں محسوس ہوئیں، اپنے دفاع کے لیے میری نظر بوڑھے کی طرف اٹھی، وہ حقے کا کش لگا رہا تھا۔

☆☆☆☆

محمد امین الدین

چار کا ٹولہ

ان چاروں کا سورج اس وقت طلوع ہوا جب حقیقی سورج غروب کی جانب گامزن تھا۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ دن بھر مختلف دفتروں میں اپنے سے بڑے افسران کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ شکر والی چائے پیتے ہوئے نمک حلالی کی قسمیں کھاتے ہوئے اپنے عہدوں کے گریڈ میں قانونی یا غیر قانونی اضافوں کی منت سماجت کرتے اور اکثر کامیاب ہوتے۔

ان کی عدم حاضری میں سائلین کو اکثر ایک جواب دیا جاتا کہ صاحب میٹنگ میں گئے ہیں۔ ملاقات کے طالب اکثر مایوس لوٹ جاتے۔ انھیں معلوم ہی نہیں تھا کہ دیر سے آنے اور دیر تک بیٹھنے کی ترکیب قانون سے ہٹ کر کام نبٹانے کے لیے بہت ہی آزمودہ ہے۔ ویسے بھی سیارہ آفتاب کی بے مول روشنی کو بازاروں، ہوٹلوں اور شاپنگ سینٹروں سے لے کر سرکاری دفاتر تک پوری قوم ہی ضائع کرنے کے مرض میں مبتلا ہے۔

آج بھی وہ چاروں اپنی قیمتی گاڑیوں میں آئے اور اپنا پنے کمروں میں چلے گئے۔ مجید اسلم نے چائے پی، اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک دو ٹیلی فون کیے۔ اسی اثناء میں چار بج گئے۔ چند ساعتوں میں عمارت خالی ہونے لگی۔ تب وہ فائلوں کی جانب متوجہ ہوئے۔ پی اے ان کے حکم کا منتظر تھا۔ وہ فائلوں اور

دفتری معاملات گوش گزار کرنے لگا۔ مجید اسلم ایک کان سے سنتے اور دوسرے سے اُڑا دیتے۔ پی اے کو صاحب کی مصروفیات کا علم تھا۔ اسے معلوم تھا کہ صاحب کی گاڑی صبح بچوں کو اسکول چھوڑنے اور دوپہر میں واپس لینے جاتی ہے۔ گھر میں نئے ماڈل کی گاڑیوں کی موجودگی کے باوجود بیگم صاحبہ کا حکم تھا کہ گرین نمبر پلیٹ والی سرکاری گاڑی میں بچوں کو اسکول بھیجا اور لیا جائے۔ اس سے دوسرے لوگوں پر رعب پڑتا ہے۔ گرین نمبر پلیٹ والی گاڑی کا رعب انہوں نے اپنے والد کے گھر میں ہی دیکھ لیا تھا جہاں وہ ہمیشہ سرکاری گاڑیوں میں سفر کیا کرتیں تھیں۔

مجید اسلم اہلیت نہ رکھنے کے باوجود اعلیٰ عہدوں پر اپنے سسر کی وجہ سے تھا۔ یوں بھی اس کی قسمت بہت اچھی تھی۔ سی گریڈ میں ایف سی پاس کرنے کے بعد دیہی علاقے کے ڈومیسائل کی سہولت سے بنا کسی روک ٹوک میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ محنت و جانفشانی کے بغیر اس نے میڈیکل پاس کر لیا اور ڈاکٹر بن گیا۔ چاچا کے سماجی اور سیاسی تعلقات کی وجہ سے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز بیوروکریٹ کی بیٹی سے شادی ہوگئی۔ شادی کے فوراً بعد سسر نے اسے سترہ گریڈ کی نوکری دلوا دی اور پہلی پوسٹنگ ہی ایک بڑے ادارے میں ہوگئی۔ ہم مشرب چیئرمین سے اس کی خوب بن رہی تھی۔ چند ہی برسوں میں اسے اٹھارہ گریڈ مل گیا۔ میڈیکل کی تعلیم دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ اس پر خوش بھی تھا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اس کی میڈیکل کی ڈگری محض ایک کاغذ کا ٹکڑا ہے۔ وہ تو کسی مریض کو بخار کی دوا بھی تجویز کرنے کا اہل نہیں تھا۔ اگر کوئی دوست ازراہِ مذاق پوچھ بیٹھتا تو وہ بھی ہنس کر جواب دیتا کہ بابا میں لوگوں کی جانوں سے نہ کھیل کر کم از کم قوم پر احسان ہی کر رہا ہوں۔

عمارت کے اسی فلور کی راہداری کا چوتھا کمرہ جواد احمد کا ہے، جو کہ دو سال پہلے ہی اس محکمے سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ ادارے کے چیئرمین سے وابستگی، کچھ روح کی گہرائیوں تک اترا ہوا خوشامدی مزاج اور بڑے افسران کے ہر حکم کو بجا لانے کے لیے ہر وقت تیار رہنا ان کے بہت کام آ رہا تھا۔ جب سابقہ افسر فنانس کا ٹرانسفر ہوا تو ان کی جگہ حکومت نے دوسرے افسر کی تعیناتی کی جگہ جواد احمد کو ایک درجہ اوپر افسر فنانس کا چارج دے دیا۔ ہوا یوں کہ تین سال پہلے چیئرمین نے اپنے چیمبر میں جواد احمد کو بلوایا اور ان سے چند سوال کیے۔

”اگر تمھیں افسر فنانس بنا دیں تو کیسا رہے گا؟“

یہ سن کر جواد احمد کی باچھیں کھل اٹھیں۔

”سر میں آپ کی ساری زندگی خدمت کروں گا۔“ اس نے انتہائی چاپلوسی سے کہا۔

”مجھے تمہاری ساری زندگی کی خدمت نہیں چاہیے۔ بس جب تک میں چیئرمین ہوں، تب تک میرے مفاد کے لیے کام کرو گے تو ابھی آدھے گھنٹے میں تمہارا آرڈر یہاں موجود ہوگا۔“

”سر جو آپ حکم کریں گے میں حاضر ہوں۔ بلکہ آپ کہیں گے تو چیک بک آپ کی اپنی دراز میں ہوگی۔“

”آڈٹ سے کیسے نبٹو گے؟“ چیئرمین نے پوچھا۔

”سر جی! میمن صاحب نے آڈٹ کا ہوّا کھڑا کیا ہوا تھا۔ ورنہ تو بہت سارے راستے ہیں کہ آڈٹ کو پتا بھی نہ چلے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ چیئرمین نے کریدا۔

”سر آپ خدمت کا موقع تو دیں۔ آپ میرے ڈپارٹمنٹ سے صرف دو بندوں کا ٹرانسفر کہیں اور کر دیں۔ ایک وہ جو کیش بک لکھتا ہے اور دوسرا وہ جو چیک بناتا ہے۔ یہ دونوں کام میں خود سنبھال لوں گا۔“

”تمہارا دماغ بہت تیز چلتا ہے۔“ چیئرمین نے تعریفی نظروں سے دیکھا اور مزید کہا۔ ”تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ آدھے گھنٹے بعد تم افسر فنانس کی سیٹ پر بیٹھنے والے ہو۔“

۲۹ ویں منٹ میں بذریعہ فیکس جواد احمد کا آرڈر موصول ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے وہی کیا جو چیئرمین نے چاہا۔ چند مخصوص منظورنظر ٹھیکے داروں کی مسلسل ادائیگیاں اور دیگر کی سائٹ چیکنگ کے بہانے ادائیگیاں رکنے لگیں۔ حکومت کے نوٹیفیکیشن کے باوجود خفیہ اکاؤنٹ کھولا گیا، جہاں سارے فنڈ ٹرانسفر کر دیئے جاتے۔ دن بھر جواد احمد اپنی سیٹ سے غائب رہتا۔ لوگ اس کے کمرے کے باہر سارا سارا دن انتظار کرتے اور تھک ہار کر چلے جاتے۔ تب وہ اچانک نمودار ہو جاتا اور پھر رات کو چیئرمین کے کمرے میں بیٹھ کر ان کے حکم کے مطابق چیک بنائے جاتے۔

اس سارے کھیل کو ابھی ایک سال ہی ہوا تھا کہ جواد احمد نے چیئرمین سے تنہائی میں کہا۔

”سر اس سال کے مئی میں میرا ریٹائرمنٹ ہے۔“

”کیا مطلب؟ ابھی تم کیسے ریٹائر ہو سکتے ہو؟“

”سر وہ... مرحوم والد صاحب نے میری ڈیٹ آف برتھ غلط لکھوا دی تھی میں تو ابھی پچپن سال کا ہی ہوں۔“

”تم نوکری میں کب آئے؟“

”سر چالیس سال ہو گئے، سرکار کی خدمت کرتے ہوئے۔“

”اس کا مطلب پندرہ برس کی عمر ہی میں تم سرکاری ملازم ہو گئے تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں تمہارے والد نے تمہیں بیس برس کا ظاہر کر کے تمہاری عمر کا فائدہ دلوا دیا تھا۔“

”وہ تو صحیح ہے سر، لیکن ابھی میرے بازوؤں میں طاقت ہے۔ اگر دو سال کی ایکسٹینشن مل جائے...“ جواد احمد نے بے شرمی سے کہا۔

”وہ تو تمہیں دلوانی ہی پڑے گی۔ ابھی ہمارے بہت سارے کام جو باقی ہیں۔ اگر حکومت کی طرف سے کوئی فل فلیج افسر آ گیا تو ہمارا سارا کام رک جائے گا۔“

دونوں نے شاطرانہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ کیوں کہ دونوں مفادات کے ایک ہی رتھ پر چل رہے تھے۔ دونوں میں سے ایک بھی گرتا تو دوسرا خود بخود گر جاتا۔ لہٰذا جواد احمد دو سال سے ایکسٹینشن پر اپنے اور چیئرمین کے مفادات کو پورا کر رہے تھے۔

اوپری منزل کی طرف جاتی ہوئی سیڑھیوں کے برابر والے کمرے میں داخل ہو کر نوجوان نے ہاتھ میں تھامی ہوئی فہرست افسر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”محبوب بھائی! ان سب لڑکوں کے اپائنٹمنٹ لیٹر ابھی جاری کر دو۔“

”دو سو آدمی؟ محبوب خان نے فہرست کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اتنی پوسٹیں خالی کہاں ہیں۔ بہ مشکل پچاس ساٹھ ہوں گی۔“

”محبوب بھائی! ڈیڑھ سو محکمہ صحت میں بھی تو ہیں۔“

”لیکن پالیسی کے مطابق تو ان پر صرف غیر مسلموں کا حق ہے۔“ افسر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”تو پھر ہمارے بندے کہاں جائیں گے؟“

”کیا تمہارے بندے سڑکوں گلیوں کی صفائی کریں گے؟“

”کیا آپ ہمارے بندوں سے یہ کام لیں گے؟ ان کی ڈیوٹیاں ہم نے پہلے سے لگا رکھی ہیں۔ آپ صرف لیٹر ٹائپ کرواؤ اور تنخواہ کمپیوٹر میں فیڈ کرواؤ۔ بس...“ نوجوان حتمی انداز میں جواب دیتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

افسر نے بے بسی سے کاغذوں کو دیکھا اور پھر کمرے میں پہلے سے موجود دوسرے شخص کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

”یار مرزا...! ہماری حدود میں پانچ بڑی مارکیٹیں ہیں۔ اور ہر مارکیٹ میں دکانوں کی تعداد

ہزاروں میں ہوگی۔ لوگوں نے گھروں میں چھوٹے چھوٹے کارخانے لگا رکھے ہیں۔ سینکڑوں بنکوں اور دفاتر کے باہر بڑے بڑے جنریٹر نصب ہیں، اور پورے سال ٹیکس کی مد میں چند لاکھ روپے ہی جمع ہوتے ہیں۔ یار میں آپ کی ٹیم سے بہت مایوس ہوں۔“

محبوب صاحب! بڑے صاحب کا حکم ہے کہ سارے دکان دار ہمارے سپورٹر ہیں۔ تم انھیں پریشان نہیں کروگے۔ آپ بڑے صاحب سے خود بات کریں۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔“

پھر وہ چند لمحے کے توقف کے بعد بولا۔ ”ویسے محبوب صاحب! جنریٹر تو آپ کے شادی ہال کے باہر بھی لگا ہوا ہے۔ اور گذشتہ تین سالوں میں وہاں سے بھی کوئی ٹیکس جمع نہیں ہوا۔“

”اچھا تو تم مجھے گھیر رہے ہو؟“ محبوب خان نے مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے کہا۔

”چلیں چھوڑیں۔ میرے پیٹرول کی پرچیاں تو دے دیں۔“

تمھیں پیٹرول کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارا بھی تو ذاتی سی این جی اسٹیشن چل رہا ہے۔ گیس چوری کر کے خوب کما رہے ہو۔“ محبوب خان نے ترکی بترکی جواب دیا۔

”بچوں کی دال روٹی چل رہی ہے۔ ہر دوسرے دن بورڈ لگانا پڑتا ہے کہ آج سی این جی بند ہے۔ سپلائی ڈپارٹمنٹ سے سیٹنگ نہ ہو تو سمجھو دھندہ ہی چوپٹ ہو گیا۔“ مرزا نے جواب دیا۔

گنبد نما کمرے میں بیٹھے ہوئے بڑے بابو کو جوں ہی پتا چلا کہ حکومت نے فنڈ جاری کر دیے ہیں تو وہ دوڑے ہوئے چیئرمین کے کمرے کی طرف آئے۔ پی اے سے صاحب کی مصروفیت کا پوچھا تو پتا چلا کہ اندر چند صحافی حضرات چیئرمین کا انٹرویو لینے آئے ہوئے ہیں۔ بڑے بابو جلدی سے کمرے کی طرف لپکے، کیوں کہ ایسے موقعوں پر ہی وہ اپنے نمبر بڑھایا کرتے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی بڑے بابو کے منہ سے چاپلوسی کی خوشبو بکھرنے لگی۔

”سر بڑا اچھا نیک شگون ہے۔ پریس والے آپ کا انٹرویو لینے آ گئے ہیں اور آج ہی فنڈ بھی ریلیز ہو گئے۔“

”بڑے بابو! پھر اسی بات پر صحافی بھائیوں کے لیے کھانے پینے کا انتظام کرو اور لفافے بھی بنوا دو۔“ چیئرمین نے جب لفافہ کہا تو ہاتھ کے اشارے سے لفافہ بھی بنایا جسے سمجھنے میں بڑے بابو نے ذرا دیر نہ لگائی اور اپنا خوشامدی منہ چیئرمین کے کچے کانوں کے نزدیک لاتے ہوئے دھیرے سے پوچھا۔

”سر پچاس کا کافی رہے گا؟“

”ارے نہیں بھئی! پورا ایک کا بنانا۔ ہمارے دوست فل پیج اور کلر میں چھاپ رہے ہیں۔“

”جی بہتر!“ یہ کہتے ہوئے بڑے بابو جس برق رفتاری سے کمرے میں داخل ہوئے تھے اسی سے واپس لوٹ گئے۔

حکومت کی طرف سے ملنے والے ترقیاتی فنڈ کا پہلا چیک چیئرمین کی اپنی شہرت کی مد میں جاری ہونے والا تھا۔

چار کے ٹولے کی اپنے گھروں کو واپسی کا وقت ہو چلا ہے۔ مگر یہ دفتر سے سیدھے اپنے گھروں کو جاتے ہی کہاں ہیں۔ کسی کو کہیں سے وصولی کرنا ہے اور کوئی وصولیوں کو کرسی کی مضبوطی پر خرچ کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہے۔

☆☆☆☆

عرفان احمد عرفی

فریم سے باہر

ٹیپ رولنگ...
سٹینڈ بائی...
سٹاف! ایسکارٹ!
فریم سے باہر...
ایکشن...

رات کا انتہائی ناآسودہ پہر۔ کردار دروازے کو آہستگی سے اَن لاک کرتا ہے۔ کلوز تا ئٹ شاٹ میں مین لابی کے چوبی فرش پر نپا تلا قدم اَیسٹبلش کرتا ہے کہ کردار گھر میں مہمان ہے۔ انٹر کٹ میں بالائی منزل کے بیڈ روم میں بستر سے لگی میزبان آنٹی جھٹ سے بیدار۔ پیشتر اس کے کہ مہمان بیسمنٹ کی سیڑھیاں اتر کر گیسٹ روم تک جائے، آنٹی خواب گاہ کی ساڑھی اوڑھے، نیم بیدار اور نیم خوابیدہ آنکھوں میں پر تپاک چمک لیے سیڑھیوں پر نمودار۔

”آ گئے تم؟“

”اس کا بتایئے وہ گھر آئی کہ نہیں؟“

”ان ڈراموں کی لوکیشنیں ہی آبادیوں سے دور ہیں شہر کے دوسرے کنارے۔ آج بھی پوچھے

لوٹے گی اور صبح تمہارے جاگنے سے پہلے پھر کسی شوٹ پر روانہ۔ کیا پوچھتے ہو؟ جب سے اس شہر میں آئے ہیں۔ دن رات کی چکی یوں الٹائے پلٹائے رکھتی ہے جیسے توے پر روٹی''

"اور آپ کیوں جاگ اُٹھیں؟ میرے آنے پر؟ میں بہت شرمندہ ہوتا ہوں۔ اتنی رات گئے آپ نیند سے بیدار ہوتی ہیں''

ننگے پیروں چلتی آنٹی آگے بڑھتی ہے اور ممتا بھری اپنائیت سے مہمان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے۔

"تمہارا انتظار میں تھیں، مصالے دار اور کراری بھنڈی جو میں نے خاص طور پر پکا رکھی ہے اور جو مرغی بھون رکھی ہے، وہ کر رہی ہیں۔ جب تک نیچے جا کر تازہ دم ہو لو، میں توے سے دو پھلکے اتارنے یوں گئی اور یوں لائی ''

میزبان کے جذبے میں خلوص کی بھگار کا وہ عالم کہ بھوک نہ ہوتے ہوئے بھی مہمان انکار سے قاصر۔

اگلے منظر میں مہمان جب تک شاور لینے کے بعد نائٹ سوٹ پہن کر سرہانے رکھے فلور لیمپ کی چھتری کے زاویے خواب آور بنا رہا ہوتا ہے۔ دونوں ہاتھوں میں ٹرے تھامے تمازتوں سے مہکتے پکوان اور نرم گرم رومال میں لپٹی خستہ روٹیوں کے ساتھ آنٹی دروازے پر انٹری دے چکی ہے۔

کافی ٹیبل پر کھانا چنتے ہی فلور کشن سرکاتی اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتی ہے۔ مہمان جیسے جیسے نوالے نگلتا ہے، بےاختیار واہ واہ کہہ اُٹھتا ہے۔ محنت کا فیڈ بیک ملنے پر وہ پھولے نہیں سماتی۔ پھر اگلے ہی شاٹ میں جھریوں سے بھرے چہرے پر تشویش کے سائے نمودار ہو جاتے ہیں۔

"شہر میں حالات کیسے ہیں؟ آج کیا کیا ہوا؟''

گزشتہ کسی بھی قسط میں آنٹی ملکی صورت حال سے باخبر رہنا اتنا ضروری نہیں سمجھتی تھی لیکن اس سیزن میں وہ کچھ زیادہ ہی متفکر نظر آ رہی ہے۔

" کچھ نہ پوچھو آنٹی!۔ بہت کچھ بگڑ رہا ہے۔ سدھرتا نظر نہیں آ رہا ہے۔ لگتا ہے ہم بھی ایک نہ ایک روز اس سر پھرے جھگڑے کے ہالے میں آ جائیں گے''

یہ سنتے ہی سلوٹوں سے بھرے چہرے پر کپکپاتی باقی ماندہ زندگی بُجھ سی جاتی ہے۔۔ پپوٹوں میں پہلے سے دھنسی آنکھیں مزید اندر کو سرک جاتی ہیں۔ لگتا ہے ضعیف نظر اپنے اندر کھلے موتیے کی اوٹ سے آپ ہی آپ شہر کے اندرون کو زوم اِن، زُوم آؤٹ کر رہی ہے، جہاں سفاکی اپنے ناچ کو انتہائی بے باکی سے تگن کی نے پر کلائمکس دینے کی کوشش میں ہے۔

"آخر کیا چاہتے ہیں وہ؟ کیوں دشمن ہوئے پڑے ہیں؟ اپنے ہی لوگوں کے؟''

مہمان کے پوائنٹ آف ویو سے آنٹی کا سہما ہوا بگ کلوز اپ بھی اندر کی بے یقینی اور خوف کو

عیاں نہیں کر پاتا ہے۔

اگلے شاٹ میں آنٹی کے جاتے ہی مہمان لیمپ کی روشنی بجھاتا ہے اور سرہانے پر سر رکھے وائس اوور میں سوچتا ہے۔

” حالانکہ جس ساحلی علاقے کی محفوظ عسکری اسکیم میں تم رہتی ہو آنٹی! یہاں تو دہشت گردی کی صرف خبر ہی پہنچ سکتی ہے۔ پر تو بھلا ہو تمہاری سپر سٹار بیٹی کا جس کی بدولت تم شہر کے گنجان علاقوں کی بند گلیوں کی زندگی سے ان کشادہ بنگلوں کی ہمسائیگی میں آ بسی ہو۔“

وہ کروٹ بدلتا ہے تو فلیش بیک میں چلا جاتا ہے۔

آنٹی کے ساتھ پہلی ملاقات برسوں پہلے میلوں دور گیریژن سٹی میں ہوئی تھی جو دارالحکومت کے پڑوس میں ہے، تب آنٹی جنرل ہیڈ کوارٹروں کے پچھواڑے ایک گنجان علاقے میں تاریک گلی کے نکڑ پر دو بے روزن کمروں کی کوٹھری میں رہتی تھی۔ آنٹی کی بیٹی بے نام تھی، کم سن تھی اور شاید سکول کے آخری سال میں تھی یا کالج کے پہلے برس میں، مہمان کو یاد نہیں۔ ایک مقامی براڈ کاسٹنگ ہاؤس میں لڑکی بطور صدا کارہ بچوں کے میگزین شو کی میزبانی کرتی تھی۔ مہمان ان دنوں ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھتا تھا۔

لڑکی کی آواز میں کھنک اور لب و لہجے کے اُتار چڑھاؤ میں تب بھی منظر نامے متحرک تھے۔

ڈرامہ نگار کے ہی لکھے ایک ریڈیائی اسکرپٹ کے مرکزی کردار کو ہنگامی بنیادوں پر آواز کی ضرورت آن پڑی۔ پروگرام منیجر کے دفتر میں کم سن صدا کارہ کا نام تجویز ہوا۔ بالغ مکالمہ بازی ماں کی اجازت کے بغیر غیر اخلاقی سمجھی گئی۔ لہٰذا آنٹی کے پاس جانا پڑا جو اپنی بے ساختہ اور معصوم باتوں کی چاشنی اور ہاتھوں کے نمک سمیت پہلی بار متعارف ہوئی۔

کم سن صدا کارہ کے تین، چار یا پانچ بڑے بھائی تھے۔ ایک بھی تعارف کے قابل نہ تھا۔ اسی لیے ان کی تعداد بھی یاد نہیں۔ بیٹوں کی بے ہنری اور غربت نے آنٹی کو تب بھی بے یقینی اور وسوسوں میں گھیر رکھا تھا۔ لیکن ماں کی شیریں سخنی گھر میں چیختی چلاتی آف مائیک، چھینا جھپٹی کسی باہر والے پر عیاں نہ ہونے دیتی تھی۔ تنگدستی کے باوجود میزبان کی وضع داری اور رکھ رکھاؤ میں کشادہ دلی کی جھلک تھی۔

ٹیلنٹ کی آواز سننے میں جتنی جاندار تھی، اتنی بے جان وہ نظر آنے میں تھی۔ میل نیوٹرشن کی ماری زنگ آلود رنگت۔ صاف دکھائی پڑتا تھا اگر کبھی غلطی سے ترکاری میں گوشت رچا بھی ہوگا تو بھائی، بہن کا ہاتھ بڑھنے سے پہلے ہی تگڑی بوٹیاں جھپٹ لیتے ہوں گے۔ لڑکی کی آنکھوں میں گہرائی تو تھی لیکن خون کی کمی نے آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اس قدر نمایاں کر رکھے تھے کہ گہرائی خالی پن کا تاثر دیتی۔

جسم کے لاغر پن نے اعتماد اور بھروسے کے قدم لڑکھڑا رکھے تھے لیکن ڈرامے میں صدا کاری کا موقع ملتے ہی سٹوڈیو کے فلور پر کہانی نے ٹویسٹ بھر لیا۔

اپنی عمر سے پختہ کرداروں میں اتر کر جب لڑکی نے بالغ جذبات سانسوں کی بھرپور طغیانی کے ساتھ ڈلیور کیے تو پہلی ٹیک میں ہی عمر کے کئی برس ایک جست میں پھلانگ گئی اور جب ریڈیو کے کاونٹنٹ سے بطور ڈرامہ آرٹسٹ معاوضے کا چیک وصول ہوا تو دو کمروں کی کوٹھری میں قدم رکھتے ہی وہ کسی اینی میٹڈ سپیشل ایفیکٹ کی طرح پلک جھپکتے ہی قد آور ہو گئی اور بے روزن کمروں کی چھت سے جا لگی۔

خوشحالی کا خواب اور کفالت کی ذمہ داری دو ایسے رنگین اور بلیک اینڈ وائٹ جواز تھے کہ تعلیمی مستقبل کے ٹریک کو بغیر کسی منطقی انجام کے ادھورا چھوڑ دینا خاصا تسلی بخش تھا۔

منی سکرین پر بطور اداکارہ اپنی صلاحیتیں منوانے کے لیے ضروری تھا کہ آواز کی دنیا چھوڑ کر لائٹ اور میک اپ کی دنیا میں ٹوئنٹی فور سیون دستیابی کی منادی کروا دی جاتی لہٰذا آنٹی لڑکی کو مخملیں ارادوں کی گٹھری میں لپیٹ، ٹرین میں لاد پوٹھوہار کی پتھریلی زمین سے میلوں دور، ساحلی شہر کی چمک منڈی میں لے آئی جہاں ڈرامہ اور فیشن انڈسٹری کا ٹنسل ٹاؤن ہلاکتوں اور گمشدگیوں کے مرگ زار میں اُن دِنوں بھی بجھتا دمکتا رہتا تھا۔

جب نئے چہرے کا کورا کینوس اس بہروپ نگر کے بے روپ گرومروں، فوٹو گرافروں، سٹائلسٹوں کے ہاتھ لگا تو انہوں نے اپنی بدہیئت خواہشوں اور بے رنگ حسرتوں میں ایسا ایسا رنگ بھر دیا کہ خود اداکارہ بھی اپنا عکس دیکھ کر دنگ رہ گئی۔

جلد پر بیس اور فاؤنڈیشن کے لیپ نے ڈی فیوزروں، ریفلیکٹروں، فلیش گن اور سرد گرم اجالوں کی چھتریوں کی زد میں ایسے ایسے کمال کر دکھائے کہ اصل اور منعکس میں مماثلت ڈھونڈنا ناممکن ہو گیا۔ پوسٹ کے مانیٹروں پر فوٹو شاپ جیسی ڈیجیٹل جمالیاتی تکنیکوں نے چٹکی بجاتے ہی اداکارہ کا لارجر دین لائف امیج رسالوں، اخباروں اور بل بورڈوں کی زینت بنا دیا۔ اب وہ چہرہ نہیں آزاد معیشت کا برانڈ لوگو بن گیا جو کسی بھی ریمپ پر رینگنے والی چال کی ڈھال اور ہر چلن کی چلمن بن جانے کو بہت تھا۔ ہر انگ کو رنگ اور ہر رنگ کو ڈھنگ مل گیا ہر ادا کو بردا، ہر نرت کو قرات اور ہر داؤ کا ایک بھاؤ تھا۔

ماں جو ستاروں کے جھرمٹ میں پہلے تو اداکارہ کی آن لوکیشن ایسکارٹ تھی جب دو چار ڈرامے اور کمرشل آن ایئر ہوئے تو حلقۂ یاراں کی روشن دماغ آنٹی بن کر دمک اٹھی۔ جونہی ٹیلنٹ پر پرائس ٹیگ نتھی ہوا کوچہ و بازار کا ہجوم امڈ آیا۔ یہ الگ بات کہ جھریوں سے بھرے پپوٹوں میں دھنسی معصوم اور متجسس آنکھوں میں برسوں پہلے چھوڑ کر آنے والے گنجان صدر بازار کا پچھواڑہ اب بھی زوم اِن، زوم آؤٹ ہوتا رہتا تھا، جہاں پڑوس کے صحن میں کھلی چنبیلی محلے بھر کو اب بھی مہکاتی ہوگی۔

بہت سال تک شوبز کی اس بے عرش و فرش دنیا میں اداکارہ نے غلامی بھی کی اور راج بھی، مرعوب بھی ہوئی اور بارعب بھی ٹھہری۔ کہیں اِن ڈور میں محکوم تو کسی آؤٹ ڈور میں حاکم۔ ہر چھوٹے بڑے

پروڈکشن ہاؤس میں تیار ہونے والی کامیاب اور ناکام سیریل کے لیڈ رول کیے۔ مقامی، بین الاقوامی منڈیوں میں فروخت ہونے والی اشیاء کو خریدنے پر اکسایا اور تیسرے درجے کی سستی اجناس کے لیے بھی جھوٹ سچ بول دیا۔ ہر معتبر، غیر معتبر ایوارڈ حاصل کیا۔ پھول بھی نچھاور ہوئے، کیچڑ بھی اچھلا۔ ڈورمیٹ سے انتظارگاہ، انتظارگاہ سے کاسٹنگ کاؤچ اور پھر ریڈ کارپٹ تک کا سفر بھی کرڈالا۔

اپنی تمام صلاحیتیں بارہا آزما لینے کے بعد جب ہر پتہ کھیل لیا تو ثانوی کرداروں میں بطور کریکٹر ایکٹر سکرین پر نظر آنے لگی۔

اداکاروں کا امیج تو باسی، تازہ ہوتا رہتا ہے کہ یہ کھیل کا حصہ ہے لیکن آنٹی کے ہاتھ کے ذائقے میں پہلے سے بھی زیادہ لذت اور اپنا بنا لینے کا تڑکا رچ بس چکا تھا۔۔ فین کلب میں سے کوئی آنٹی کو ملنے گھر آجاتا تو واپس جانے کا نام نہ لیتا۔ خاطر تواضع کے لیے ٹرالی پر جلوازمات سجے ہوتے، ان کی رنگینی بھی کسی ہائی ڈیف سے گرفتار کیے سکرین شاٹ سے کم نہ ہوتی۔

”اسے کہیں وہ اب ایسے کریکٹر نہ قبول کرے جو اس کے امیج کو دھندلاتے ہیں۔ اتنے سال لیڈ رول کرنے کے بعد اب نیگیٹیو کرداروں میں مت سامنے آئے۔۔“ اڑوس پڑوس سے آئی عورتیں سپر سٹار کی ذاتی زندگی کے بارے میں کریدتیں تو آنٹی الٹا ان سے شہر کی تازہ ترین صورتحال کی اپ ڈیٹ لینے لگتی۔۔

”بیٹا جیسی عوام، ویسے ڈرامے۔۔ قوم نے بھی تو صرف لیڈر ہی پیدا کیے ہیں، ہیرو کون ہے؟۔۔ یہ تو بتاؤ آج سنا ہے پھر دھماکہ ہوا؟ کتنے مارے گئے؟ کتنی ماؤں کی گودیں اجڑ گئیں؟ آخر یہ کب تک ہوتا رہے گا؟
“

”چھوڑیں پرے آنٹی! یہ روز کی بات۔ یہ بتایئے کہ یہ جو ان دنوں اخباروں میں اس کی شادی کی خبریں چھپ رہی ہوتی ہیں، تو یہ سب کیا ہے؟ اسے سمجھائیں میڈیا سے دوٹوک بات کرے۔ اسے بدنام کرنے کی کیوں کوشش کرتے ہیں“

”ساری دنیا میں ملک کی بدنامی ہو رہی ہے۔ شرم کی بات ہے۔ اس کی میڈیا کو پرواہ نہیں۔۔۔ پھر کچھ ہوا آج شہر میں، کیا دیکھا تم نے آج نیوز چینلوں کی سکرینوں پر مجھے بھی تو پتہ چلے۔۔“

”آنٹی! لوگ جیلس ہوتے ہیں اس کی شہرت سے۔ ہر کسی کے بس کی بات نہیں!۔۔ ایسی فیلنگز اور ایموشنز سکرین پر کون لا سکتا ہے“

”ان میں سے کون ہے جس نے بچپن میں زندگی کو اتنے قریب سے دیکھا ہوا! یہ لڑکیاں تو گرامر، کانونٹ میں رومیو جیولٹ پر ماتم کر کے بڑی ہوئی ہیں۔ جو ٹرینگ آپ کی لڑکی کو ہے، ریڈیو کے مائیک پر، وہ انھیں کہاں؟“

" آنٹی کل ایک پلے میں اس کی آنکھوں کے گرد حلقے بنے دیکھے ۔ آج کل کے ڈراموں اور سوپس میں تو مائیں بھی بہت سیکسی ہوتی ہیں سنفڈ باربی کی طرح ۔۔ اسے کہیں چہرے پر ریٹنکل نہ بنوایا کرے"

" بیٹا ۔! ۔ مجھے تو مدت ہوئی سیٹ پر گئے ،خیر یہ بتاؤ ڈراموں کی مائیں تو بھری بھرائی ہوتی ہیں لیکن ان خودکش حملہ آوروں کی مائیں پتھر سے بنی ہیں کیا؟ لگتا ہے انہوں نے یہ بچے بغیر لگن کے جن دیئے"

" مجھے یقین ہے آنٹی! وہ آج بھی شاپنگ مال جاتی ہوگی تو ہجوم گھیر لیتا ہوگا اسے"

" معصوم جانوں کو بھی لے بیٹھتے ہیں یہ کم بخت ۔ سنا ہے لاشوں کے چیتھڑے اڑ اڑ کر دور پاس کے درختوں اور بالائی منزلوں پر جا چپکتے ہیں"

" اسے کہیں میڈیا والوں کے سوالوں کے جواب بہت دھیان سے دیا کرے ۔ یہ جاہل صحافی اپنے اخبار رسالے بیچنے کے لیے سیلی بریٹیز کو بلیک میل کرتے ہیں"

" بلیک میل تو میں ہو رہی ہوں اپنی ہی بیٹی کے ہاتھوں مجھے کوئی خبر کیسے ہونے لگی ۔۔۔ اس گھر میں کون سی اخبار آتی ہے جو مجھے پتہ ہو شہر میں کیا ہو رہا ہے گھر کے ہر ٹی وی سے کیبل اتاری ہوئی ہے اس نے ۔۔ مجھے تو صرف اس روز پتہ چلتا ہے کہ باہر کچھ برا ہوا ، جب شہر میں ہڑتال ہوتی ہے ۔ ڈرامے والے رخصتی کا سیٹ لگائے بیٹھے رہ جاتے ہیں ، شوٹ کینسل ہو جاتی ہے اور یہ لال جوڑا پہنے دلہن کے گیٹ اپ میں گھر لوٹ آتی ہے ۔۔ ایک بار تو میرا دل بھی خودکش جیکٹ کی طرح پھٹ کر رہ جاتا ہے ۔ ایسا لگتا ہے بریکنگ نیوز کی لال پٹی میرے گھر کی دہلیز تک آ گئی ہے ۔"

اگلے منظر میں رائٹر سامان سمیت کر ایئر پورٹ کے لیے روانہ ہو رہا ہے اور آنٹی مین لابی میں کھڑی اسے انتہائی اداسی سے دیکھ رہی ہے ۔

"اگر وہ اتنی ہی مصروف رہنے لگی ہے کہ گھر آئے مہمان سے بھی نہیں مل سکتی تو پھر اس کام کو چھوڑ دے"

"میرے منہ کی بات چھین لی تم نے ۔ میں تو کب سے یہی چاہتی ہوں ۔ سب کچھ تو دیکھ لیا ۔ پیسہ ، شہرت ، عزت ، رسوائی ، اب کیا رہ گیا ہے جھیلنے کو؟ ۔ اب تو نامراد کیمرہ مین بھی اس پر پہلے جیسی لائٹ نہیں پھینکتے ۔ میں تھک چکی ہوں اس کی حفاظت کرتے کرتے ۔ چاہتی ہوں اسے زندگی بھر کے لیے کسی کے حوالے کر دوں اور خود واپس جاؤں اپنے شہر ، اسی جنرل ہیڈ کوارٹر کے پچھواڑے ، دو کمروں کی کوٹھری میں ۔ لوگ منہ پر تو تعریفیں کرتے ہیں ، ساتھ کھڑے ہو کر تصویریں بھی اترواتے ہیں ، لیکن جب اپنانے کی بات آتی ہے تو قدم پیچھے ہٹا لیتے ہیں"

اگلے سین میں ڈرامہ نگار کیب میں سوار ہو کر ایئر پورٹ کے لیے روانہ ہو چکا ہے اور آنٹی کے بے

جان لبوں پر ابھی تک جیسے آج کی ملکی صورت حال کے بارے میں کوئی سوال اٹکا ہے۔ دیکھنے والے سمجھتے ہیں آنٹی کو آج بھی شوٹ کینسل ہونے کا دھڑکا ہے۔

اس کے بعد طیارے کے ٹیک آف کا پاسنگ شاٹ ہے۔ ہم ڈزالو کر کے طیارے کے اندر آتے ہیں۔ ڈرامہ نگار بیضوی کھڑکی میں جھکا نظروں سے اوجھل ہوتا سمندر کنارے میلوں میں پھیلا بےترتیب شہر دیکھ رہا ہے

۔

وائس اوور : ”قدم تو پیچھے ہٹ جاتے ہوں گے آنٹی! تم نے خود تو کبھی کوئی پکوان کچے پن میں آنچ سے اٹھا کر دسترخوان پر نہیں چنا، جب خوب اچھی طرح پک جاتا، مہک جاتا تو مہمانوں کو پیش کرتی۔ بیٹی تو تمہاری ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی، اس کے چہرے پر غازہ لیپ کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ ابھی اسے پکنے تو دینا تھا“

کہانی تیزی سے آگے بڑھتی ہے اور ہم کلائمکس کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ کیا دیکھتے ہیں کہ رات کا وقت ہے اور دارلحکومت کی شاہراہ ہے، لانگ شاٹ میں دور دور تک ہُو کا عالم ہے۔ ڈرامہ نگار انتہائی پریشانی میں کار دوڑاتا گیریژن سٹی کی جانب رواں ہے۔ وہ کان سے فون لگائے جس کسی سے بھی بات کر رہا ہے اس سے اسٹیبلش ہو رہا ہے کہ وہ قتل گاہ کے اس پار تاریک گلی کے نکڑ تک جانے کی کوشش میں ہے جہاں آنٹی کچھ دن پہلے اپنے آبائی گھر میں لوٹ آئی ہے۔ سامنے کی لوکیشن آنٹی کے گھر کے اُتنے ہی قریب ہے جتنی قربت سے وہ ہمیشہ لوکیشن پر ہوتا ایکشن دیکھتی رہی ہے۔ عوام میں غم اور غصے کی لہر ہے۔ ہر چہرہ ہراساں اور مشتعل۔ سیکیورٹی کی صورت حال انتہائی نازک۔ رائٹر کو قدم قدم پر اہلکاروں کو بتانا پڑ رہا ہے کہ وہ ڈرامہ نگار ہے، اُسے جانے دیا جائے۔

ایک دو پولیس کے ناکے ایسے بھی ہیں جہاں اُس کی جیب میں پائے گئے سرخ بال پوائنٹ کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ میٹل ڈیٹیکٹروں سے اس کی خوب جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔

رائٹر کو فکر ہے، آنٹی نے اتنے قریب سے پہلی بار دھماکے کی آواز سنی ہو گی اور کون جانے معصوم جانوں کے فضا میں چیتھڑے اُڑ کر دور پاس دیواروں اور چھتوں سے چپکے ہوں تو پپوٹوں میں دھنسی بے جان آنکھوں نے بھی ایسا کوئی دلخراش منظر زُوم اِن کر لیا ہو۔

اگلے ہی لمحے ہم ڈرامہ نگار کے پوائنٹ آف ویو سے آنٹی کو قریب سے دیکھتے ہیں کمرے کے نیم اندھیرے، نیم اجالے میں آنٹی کا سولو شاٹ چہرے کو کسی حد تک واضح کر تو رہا ہے لیکن اتنے قریب سے ایکشن دیکھنے کے باوجود آنٹی کا چہرہ ایکسپریشن لس ہے جیسے سیٹ پر آف لائیٹ بیٹھے ہوئے لوگوں کا ہوتا ہے۔ آنکھوں میں ساحلی شہر کا ٹنسل ٹاؤن بجھا پڑا ہے جیسے تاریکی سے آلودہ ہر گوشہ غیر معینہ مدت کے لیے احتجاجی ہڑتال پر ہے اور زندگی مفلوج ہے۔

ڈرامہ نگار کیو دینے کی کوشش میں ہے تا کہ آنٹی اندر سے اپنے خوف کی بھڑاس نکالے مبادا صدمے کی کیفیت سکتے کو ہمیشہ کے لیے منجمد کر دے۔ آنٹی لاتعلقی سے رسمی سا اظہارِ افسوس کرتی ہے اور نظر لکھاری کے چہرے سے ہٹا کر موضوع بدلنے کی کوشش میں اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگتی ہے۔

شاید یہ رائٹر بھی نہیں جانتا ہے کہ ٹینسل ٹاؤن چھوڑنے سے ایک دن پہلے وہ اپنی فوٹو جینک بیٹی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کسی کی رکھوالی میں دے کر لوٹ آئی ہے۔ ”بہت برا ہوا آنٹی! حالات تو اب بگڑیں گے، اِتنا بڑا قومی سانحہ اتنی بڑی سُپر سٹار ایک ہی نشانے میں ڈھیر کر دی گئی۔۔ اب تو یہ سب تم نے برہنہ آنکھوں خود دیکھ لیا“

”چھوڑو پرے۔ یہ روز کی بات۔۔ ہماری کونسی شوٹ کینسل ہوئی پڑی ہے جو لوکیشن پہ سرخ پھولوں سے لدا سیٹ سائیں سائیں کر رہا ہو گا۔ تم کہو! بھوک تو بہت لگی ہو گی کچھ گرم کر کے لاؤں“

آنٹی کے تھکے ماندے چہرے پہ منظر فریز ہو کر وِنڈو میں سکڑ جاتا ہے اور کلوزنگ سکرول چلنا شروع ہو جاتا ہے۔

☆☆☆☆

غافر شہزاد

لمحے کی موت

سوچیں دماغ میں گڈ مڈ ہو جاتی ہیں۔ چیزوں کے سلیقے میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ جب ترتیب بگڑ جاتی ہے تو اشیاء کو نئے معانی مل جاتے ہیں، گویا اشیاء کی ترتیب ہی ان کی اصل پہچان ہوتی ہے۔ واقعات کی ترتیب اتھل پتھل ہو جائے تو تاریخ کی تشکیل نو ہو جاتی ہے۔ پرانا زمانہ اچھا تھا۔ تاریخ میں واقعات ایک زمانی ترتیب سے لکھ دیئے جاتے اور یوں زمان و مکان کی نسبت سے ایک منظر نامہ آنکھوں کے سامنے

ابھر آتا۔ مگر جدید انسان کا دعویٰ ہے کہ اس کا ذہن کثیر جہات میں ایک ہی وقت میں سوچ سکتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی سے متعارف ہونے والی اشیاء اس کو بعض اوقات ایسے ہی کسی موڑ پر لا کھڑا کرتی ہیں کہ وہ سچ اور جھوٹ، ہونی اور انہونی، اجالا اور اندھیرا، دن اور رات، پانی اور آگ کے درمیان میں معلق کہیں خود کو محسوس کرتا ہے۔ اس کے حواس کچھ اور کہہ رہے ہوتے ہیں اور اس کا دماغ کسی اور طرف جا رہا ہوتا ہے۔ سوچوں، چیزوں اور واقعات کا گڈمڈ ہونا تو پریشانی پیدا کرتا ہے مگر رنگوں باہم مل کر نئے رنگوں کو شکل دیتے ہیں اور یہ نئے رنگ مل کر پرانی تصویروں کو بالکل نئے معنی عطا کرتے ہیں مگر زندگی محض رنگوں سے مزین تو نہیں۔ کائنات میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی ترتیب کو توڑنا، دریافت کرنا اور نئے معنی معلوم کرنا ہی تحقیقی اور تخلیقی کام ہے۔ دماغ میں برپا ایسی جنگ وجدل بعض اوقات انسان کو ایسے نقطہ پر لا کھڑا کرتی ہے کہ موت و حیات کے مابین والی کیفیت سے گزرنا پڑتا ہے۔ فیصلہ نہیں ہو پاتا، یقین اور بے یقینی کی دھند میں ایک ہیولہ سا ابھرتا ہے اور پھر اس کی پہچان کبھی کچھ بن جاتی ہے اور کبھی کچھ۔ بسا اوقاف تو بالکل تضاد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ علی حسین بھی ایسی ہی ایک مشکل میں پھنس گیا تھا۔

علی حسین کی مشکل کوئی ایسی فلسفیانہ نہیں تھی۔ بات بہت معمولی سی تھی۔ اپنی یادداشت پر اعتبار کر کے وہ کچھ لوگوں کے سامنے ایک دعویٰ کر بیٹھا تھا۔ یہ کوئی خدائی یا پیغمبری کا دعویٰ بھی نہیں تھا۔ اس وقت بات چونکہ مانی نہ گئی اب اس کو ثابت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ثبوت مل جاتا تو اس کی مشکل بہت آسان ہو جاتی۔ ثبوت کی تلاش کے لیے اسے اپنی یادداشت کا سہارا لینا پڑ رہا تھا اور اس کی یادداشت اس کو بھٹکا رہی تھی اور وہ لحہ بہ لحہ الجھتا ہی جا رہا تھا۔ جیسے دلدل میں اتر رہا ہو۔ اب تو اس کا سانس بھی غیر متوازن ہو چلا تھا۔ ہاتھ پاؤں ساتھ دینے سے قاصر ہو رہے تھے، بہت تھک گیا تھا۔

ایک مقامی ہوٹل میں ہر ہفتے تنقیدی اور تخلیقی بصیرت رکھنے والے کچھ لوگ اکٹھے ہوتے تھے۔ کوئی افسانہ، مضمون، غزل، نظم یا کوئی فن پارہ پڑھا جاتا، لوگ دھیان سے سنتے اور پھر اپنے اپنے نقطہ نظر اور علم کی حدود میں رہتے ہوئے اس تخلیق پر نقادانہ اظہارِ خیال کرتے۔ بعض اوقات یہ اظہارِ خیال بہت دھواں دھار ہو جاتا۔ اختلاف اور باہمی رنجشوں کے کئی پہلو باہم خلط ملط ہو جاتے۔ فضا بہت بوجھل ہو جاتی۔ ایسی ہی صورت حال اس دن بھی پیدا ہو گئی۔ اس ادبی محفل کا کئی دہائیوں سے یہ طے کردہ اصول تھا کہ پہلے سے شائع شدہ کوئی مضمون، افسانہ، نظم وغیرہ تنقید و تحسین کے لیے پیش نہ کی جائے۔ اس کے پیچھے منطق بہت سادہ تھی کہ شائع ہونے کے بعد مضمون یا افسانے میں چونکہ تبدیلی کی گنجائش باقی نہیں رہتی اس لیے غیر مطبوعہ تخلیقات ہی پیش کی جائیں تاکہ لکھاری اٹھائے گئے سوالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی تخلیق پر نظر ثانی کرے۔ مگر ایسا ہوا کبھی نہیں تھا۔ تخلیق کار عمومی طور پر ناقدین سے متفق نظر نہیں آتا تھا۔

پچھلے چند برسوں سے ایک نیا رویہ جنم پذیر ہو چکا تھا۔ تنقید کے لیے پیش کی جانے والی تخلیق کا خالق اپنے حواریوں اور دوستوں کا ایک گروہ ساتھ لے کر ایسے موقع پر حاضر ہوتا اور وہاں بیٹھے لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا کہ کس کس کو وہ اپنی حمایت میں لایا ہے۔ اب تو یوں ہونے لگا تھا کہ لوگ صدارت کے لیے بھی اپنی مرضی کے نام پیش کرنے لگے تھے۔ ایک سمجھدار اور محتاط صدر اپنی گفتگو سے یہ معلوم نہ ہونے دیتا کہ وہ تخلیق کار کی حمایت شعوری طور پر کر رہا ہے مگر کئی زیرک لوگ اس کا بھی پتہ لگا لیتے تھے۔ اس روز بھی کچھ ایسی ہی صورتحال تھی۔ ایک مقامی کالج کی لیکچرر جس نے ابھی ابھی ادب کی وادی میں قدم رکھا تھا۔ ایک مضمون اس تنقیدی مجلس میں لے آئی۔ مضمون لکھنے والی نے زیادہ توجہ کرسی صدارت پر بیٹھنے والے شخص کی نامزدگی پر دی تھی۔ اور اپنے مضمون کا موضوع پہلے سے ہی صدر کو بتا دیا تھا اور صاحبِ صدارت نے خوب تیاری کر رکھی تھی۔

تنقیدی مجلس میں مضمون تنقید کے لیے پڑھا گیا۔ مضمون کے اختتام پر صاحبِ صدارت نے چند تعارفی جملے کہنے کے بعد حاضرین کو مضمون کے حوالے سے گفتگو کی دعوت دی۔ یہاں تک تو سب کچھ یک سطحی اور ایک ترتیب سے چل رہا تھا۔ بس اس کے بعد ترتیب بگڑ گئی، واقعات الجھ گئے۔ بے شمار لوگوں کی متضاد آرا اور سوچیں اتھل پتھل ہو گئیں۔ بس ایک کنکر پھینکا گیا یہ کنکر کا پھینکا جانا اس عمومی ترتیب کا حصہ نہیں تھا۔ کسی نے نہایت اعتماد سے قدرے بلند آواز میں کہا کہ یہ مضمون تو مطبوعہ ہے۔ شائع شدہ ہے لہذا اس پر تنقیدی حوالے سے گفتگو نہیں ہو سکتی۔ پہلی بار جب یہ آواز لگائی گئی تو صاحبِ صدارت نے اس جانب توجہ نہیں دی اور ایک دوسرے حواری سے گفتگو کے لیے کہہ دیا۔ گفتگو کا آغاز ہو گیا مگر واقعات کی ترتیب ایک مرتبہ پھر بگاڑ دی گئی۔

"جناب والا! میں یہ مضمون شائع شدہ اپنے ساتھ اگلے اجلاس میں لے آؤں گا" وہی آواز دوبارہ ابھری۔ صاحب صدارت نے اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے ان وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو ایک عمومی تسلسل میں لانے کی کوشش کی اور وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ مگر چونکہ یہ مروجہ اور طے شدہ روایات کے خلاف بات تھی اس لیے اس مرتبہ کچھ اور آوازیں بھی اس میں شامل ہو گئیں۔

حواریوں کا ٹولہ صاحبِ صدارت کی مدد کے لیے متحرک ہو گیا۔ ایک آواز آئی "مضمون نگار نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس بات کا انکار کیا ہے کہ یہ شائع شدہ مضمون ہے"۔

"ظاہر ہے اس نے یہی کہنا ہے وہ اس بات کا اقرار تو کبھی نہیں کرے گی۔" تسلسل توڑنے والے کی آواز کی بازگشت سنائی دی۔

حواری پھر مدد کو آئے "جناب والا مضمون نگار نے تقریب شروع ہونے سے پہلے بتا دیا تھا یہ ایک نا تمام اور نامکمل مضمون ہے لہذا یہ کیسے ممکن ہے کہ نامکمل مضمون شائع کروا دیا جائے"۔

اب تسلسل توڑنے والے کا ایک ساتھی بولا جو اس اسٹریوٹائپ فضا سے خاصا اکتا گیا تھا۔

”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس پلیٹ فارم پر ادھوری اور نامکمل تخلیقات برائے تنقید پیش کی جا سکتی ہیں اگر ایسا ہے تو یہ محض ہمارا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ اگر تخلیق کار خود ہی اپنی تخلیق کی حتمی شکل سے مطمئن نہیں ہے تو سراسر ناانصافی ہوگی کہ یہاں بیٹھے ہوئے صاحبان علم وفراست اس ادھورے اور نامکمل فن پارے پر تنقید کریں“۔

صاحبِ صدارت اب قدرے سنبھل چکے تھے لہٰذا کہنے لگے ”چونکہ مضمون نگار کا کہنا ہے کہ غیر مطبوعہ ہے تو ہمیں اس بات پر یقین کر لینا چاہیے“۔

صورت حال کو سنبھالنے کے لیے ایک اور کوشش۔ ایک دوسرے حواری نے دلیل دی ”جناب والا تیس سال ہو گئے ہیں میں نے کبھی کوئی غزل، نظم کسی ادبی پرچے میں اشاعت کے لیے نہیں بھیجی مگر پھر بھی میری غزلیں اور نظمیں رسائل و ادبی جرائد میں شائع ہو رہی ہیں۔ بعض اوقات دوست بھی آپ کی کوئی تخلیق آپ کو بتائے بغیر شائع کروا دیتے ہیں۔ ممکن ہے مضمون نگار کو اس بات کا علم ہی نہ ہو کہ اس کا یہ مضمون شائع ہو چکا ہے“۔

پیدا ہونے والی لہروں پر تیرتے ہوئے تختے کو ہچکولوں سے بچا کر ایک ہموار سطح پر تیرتے رہنے کی ایک اور کوشش نے ماحول کے بوجھل پن کو قدرے ہلکا کر دیا۔

”جناب والا! میں اگلے اجلاس میں وہ رسالہ پیش کر دوں گا جس میں یہ مضمون شائع ہو چکا ہے اور آپ کو یہ تمام کاروائی قلم زد کرنا پڑے گی“۔

”آپ اگر ابھی رسالہ پیش کرتے تو ٹھیک تھا اب اگلے ہفتے جب لائیں گے، تب دیکھیں گے“۔

صاحبِ صدارت نے ایک بار پھر ترتیب میں تسلسل کی کوشش کی۔

ایک اور حواری کی صدا نے اسے سہارا دیا۔ ”جناب اگلے ہفتے ہم میں سے کوئی ہوگا، کوئی نہیں، مگر کون سچا ہے یہ کیسے معلوم ہو پائے گا۔ لہٰذا مضمون پر گفتگو کا آغاز کیا جائے۔ اگلے ہفتے جب یہ رسالہ لائیں گے تو اگلا صدر فیصلہ کرے گا کہ کیا کرنا ہے“۔

”جناب والا! یہ بات بالکل غیر آئینی، مروجہ اور طے شدہ ضابطے کے صریحاً خلاف ہے کہ شائع شدہ تخلیق پر تنقیدی گفتگو اس مجلس میں کی جائے“۔ تسلسل توڑنے کی کوشش والا اپنی گفتگو کے نقطۂ آغاز والی دلیل پر پلٹ آیا مگر اس کی آواز میں شکستگی تھی۔ حواریوں نے صاحبِ صدارت کے اختیارات کے چپوؤں سے لہروں کی بگڑی ہوئی ترتیب میں ہچکولے لیتی ہوئی کشتی کو عمومی ترتیب میں لانے میں کامیابی حاصل کر لی اور گفتگو چل پڑی۔

فضا کے بوجھل پن کو کم کرنے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگی، یہ زمانی و مکانی ترتیب بھی بہت مضبوط گرفت رکھتی ہے، اپنے شکنجے میں آئی اشیاء کی ترتیب و تشکیل کو واپس عمومی زاویوں پر افقی سمت میں لے آتی ہے اور اس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ سنے جانے والے مضمون کے مندرجات اس شعوری طور پر پیدا کی جانے والی اتھل پتھل میں گم ہو گئے۔ وہ نقاط جن پر گفتگو ہو سکتی تھی اس اتار چڑھاؤ میں کہیں زیرِ آب چلے گئے۔ اب ان کو کون چن کر سطح پر لائے لہذا گفتگو بے سمت ہو گئی اور عنوان کے حوالے سے ایک عمومی گفتگو کا آغاز ہو گیا۔ حواری جو پہلے ہی تیاری کر کے آئے تھے انہوں نے مضمون پر تنقید کے بجائے موضوع پر تقریریں شروع کر دیں۔ اپنی تقریروں کو وہ مضمون کے ساتھ جوڑ نہیں پائے لہذا سمجھ نہ آئی کہ گفتگو کو کیسے سمیٹیں اور گفتگو اس عمل میں طویل تر ہو رہی تھی۔

یکے بعد دیگرے ایک دو تین سرگوشیاں ابھریں۔ ”جناب مضمون میں پیش کیے جانے والے خیالات و تجزیات پر بات کی جائے۔ مضمون کو پرکھا جائے۔ تنقیدی معیارات کی کسوٹی پر جائزہ لیا جائے“۔

ایک مرتبہ پھر حواریوں نے اس اٹھنے والی سرگوشی کو دبا دیا۔ مگر علی حسین جسے شائع شدہ مضمون پر گفتگو کی اجازت دینے پر اعتراض تھا اس کی ذہنی کیفیت میں ابھی عمومی تسلسل نہیں آیا تھا لہذا اٹھ کر کھڑا ہو گیا تا کہ اس کی بات سنی جائے۔ ایک مرتبہ پھر صوتی لہروں نے سماعتی تختے پر نقش گری شروع کر دی۔ خالی سلیٹ پر نقش ابھرنے لگے۔ ایک نئی ترتیب، ایک نیا نقش، ایک نیا منظر نامہ تشکیل پا گیا۔ رنگ گڈمڈ ہو گئے مگر نیا رنگ نہیں نکلا۔ اسی پرانے رنگ پر بات لوٹ گئی۔ یہ بگاڑ کی صورت کوئی ایسی طاقت ور تھی کہ اس نے صاحبِ صدارت کی ذہنی ترتیب کو بھی بدل دیا۔ ان کی آواز کی فریکونسی بھی بدل گئی۔ لہریں لہروں سے ٹکرا گئیں۔ بادل بادل سے رگڑ کھا گئے، گڑگڑاہٹ، مگر کچھ لوگوں کو یہ گڑگڑاہٹ ایک بادل کی گرج محسوس ہوئی اور پھر گرج کے بعد چمک اور لمحہ بھر کے لیے ایک بالکل نئی ترتیب، نیا منظر نامہ تشکیل پا گیا۔ حواریوں کے پھڑپھڑاتے پروں کی صدا اس گھن گرج میں دب گئی۔

صاحبِ صدارت کی شکست خوردہ آواز سماعتوں سے آخری بار ٹکرائی ”کسی کو اعتراض ہے تو وہ یہاں سے اٹھ کر باہر چلا جائے ایسے لوگوں کی یہاں کوئی گنجائش نہیں جو اپنے ذہن میں پہلے سے کوئی ایجنڈا لے کر آتے ہیں“ مگر تیز و تند طوفان لے آنے میں کامیاب ہونے والا شخص اور بھی اونچی آواز میں بولا ”حکمران کہتے ہیں اگر ملک پسند نہیں تو ملک چھوڑ دو، صاحبان عقل و خرد کہتے ہیں ہماری مرضی کے خلاف آواز اٹھانی ہے تو محفل چھوڑ دو، مگر کیوں------ آخر کیوں؟ ہم بھی اتنا ہی استحقاق رکھتے ہیں، جتنا آپ کا، جانا ہے تو پہلے آپ جائیں“۔

اس کے بعد تو کشش جہات کا نقشہ ہی بدل گیا۔ کئی حواریوں کے ہاتھ ان کے سروں سے بلند ہوئے۔ مگر ترتیب بدل چکی تھی۔ اب تو محض لکیر پیٹنے والی بات تھی۔ طوفان کے گزر جانے کے بعد زمین پھر ویسی ہی نکل آتی ہے۔ مگر طوفان اپنے ساتھ بہت کچھ بہا لے جاتا ہے۔ نئے سرے سے آبادکاری ہوتی ہے کچھ نئے عنصر پرانے عناصر کی جگہ لے لیتے ہیں اس روز بھی ویسا ہی ہوا تھا۔ مگر اس سارے وقت میں مضمون نگار کے ہونٹوں پر ایک دائمی مسرت کھلی رہی، حواری اس دائمی مسرت سے حوصلہ پکڑتے رہے اور ترتیب بدلنے والے سمجھتے رہے کہ یہ تمسخرانہ انداز تضحیک ہے کہ جو مرضی کرلو، جو مرضی کہہ دو۔ جیسے مرضی طوفان اٹھالو، میرے لکھے ہوئے لفظ صرف تمہارے لیے مطبوعہ ہونگے۔ یہاں بیٹھے ہر شخص کے لیے غیر مطبوعہ ہیں، ان کا جج تمہارے اکیلے کے جج سے بہت بھاری، بہت طاقت والا ہے اور یہی جمہوریت کا حسن ہے۔ جیت ہمیشہ ان کی ہوتی ہے جو تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں۔ بات ان کی مانی جاتی ہے جن کے کھیسے میں الفاظ کے آرڈیننس ہوتے ہیں اور اس کا اختیار صرف میرے پاس ہے۔ قیمت اور اہمیت صرف میرے ان لکھے اور پڑھے جانے والے الفاظ کی ہے۔ اس مخطوطے کی نہیں جو تمہارے گھر میں کہیں پڑا ہے۔ جسے تم اس لمحے میں حاضر نہیں کرسکتے۔ جاؤ لے کے آؤ عملی ثبوت، تب تک یہ زمان و مکان اپنی ترتیب بدل چکا ہوگا۔ ان نشستوں پر اور لوگ براجمان ہونگے۔ معلوم نہیں انہیں تمہارے مطبوعہ کاغذات سے تب دلچسپی ہوگی یا نہیں، وہ گزر جانے والے وقت کو مستقبل میں لے آنے کی اجازت دیں گے یا نہیں۔ اگر دے بھی دیں گے تو کیا فائدہ، میں تو یہاں اس نشست پر موجود نہیں ہوں گی جس کی خجالت کے لیے تم یہ سارا کشت کاٹو گے۔ یہ دائمی مسکراہٹ جو صرف ہونٹوں پر نہیں تھی، آنکھوں میں بھی تھی، سرخ و سپید گالوں پر تھی۔ نشست پر ڈھیر ہوئے جسم کے بظاہر نظر نہ آنے والی حرکات و سکنات میں بھی تھی۔ ایک چیلنج تھا۔ جاؤ ہم ان لمحوں کو یہیں ساقط کرتے ہیں۔ تم میں ہمت ہے تو اس ترتیب کو بدل کر دکھا دو۔ ہمیں خود پر تم سے کہیں زیادہ اعتماد ہے۔ اس لیے کہ زمانوں سے زمین پر وقت ہمارا ہم دوش رہا ہے۔ ہم وقت ہیں جو نہیں بدلتا، مگر تبدیل ہوتی ہے اس وقت سے جڑی ہوئی ہر شے، ہر سوچ، ہر ترتیب، ہر نقش، مگر وقت نہیں بدلتا۔

وقت کے ہاتھوں ہونے والی شکست نے علی حسین کے اندر ایک خوفناک ہلچل پیدا کردی ہے۔

وہ جو ترتیب و تسلسل بدلنے چلا تھا اپنے اندر خوفناک تبدیلی لے کر وہاں سے رخصت ہوا۔ مگر ہار نہیں مانی۔

”میں اگلے ہفتے ہر لمحہ اور ہر لمحے سے جڑی ہوئی ترتیب واپس لاؤں گا“۔ یہ اس کی سوچ تھی مگر اس کے لیے اسے ثبوت چاہیے تھا، مطبوعہ رسالہ، جو اس کے گھر میں اس کی اسٹڈی میں پڑا تھا، اس کی دسترس میں تھا۔ اس نے گھر پہنچ کر اس رسالے کو ڈھونڈھ کر محفوظ کرنا تھا اور پھر اگلے ہفتے کا انتظار کہ جب یہیں اس مقام پر سب کچھ یونہی ہونا تھا۔ بس وقت میں تبدیلی آ جانا تھی۔ مگر اس کے نزدیک وقت اشیاء سے

جڑا ہوا تھا۔ اشیاء تبدیل ہوتی ہیں تو وقت بدل جاتا ہے۔ اگر ان نشستوں پر ایسے ہی لوگوں نے بیٹھنا تھا تو اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ ان نشستوں پر یہی چہرے تھے یا ان جیسے کوئی اور، ہونگے تو انسانوں کے ہی چہرے، اس کا جھگڑا صرف مضمون نگار سے نہ تھا۔ اگر باقی لوگ اس کے پیش کردہ ثبوت کو مان لیتے ہیں، دیکھ لیتے ہیں تو وہ ترتیب و تسلسل کو توڑنے میں کامیابی حاصل کرسکتا تھا اور اس کا تو مقصد ہی یہی تھا۔

گھر پہنچتے ہی اس نے قدرے اعتماد کے ساتھ اس رسالے کو ڈھونڈنے کا آغاز کیا۔ اس کا خیال تھا وہ نہایت آسانی سے یہ رسالہ ڈھونڈ پائے گا۔ مگر یہاں بھی زمان و مکان کی ترتیب بدل چکی تھی۔ یہ رسالہ اب وہاں نہیں تھا، جہاں اس کو پورا یقین تھا۔ سٹڈی میں جو تبدیلی تھی وہ ایک عمومی تبدیلی تھی۔ اس سے کوئی تسلسل ٹوٹا نہیں تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ رسالہ وہاں نہیں مل رہا تھا۔ وہ اتنی جلدی مایوس ہونے والا نہیں تھا۔ اس ہفتے کراچی سے یہ دو ادبی رسائل آئے تھے۔ ایک رسالہ اسلام آباد سے اور ایک یہیں لاہور سے۔ سب کے تازہ شمارے یہیں موجود تھے اس نے شماروں کو ایک سے زیادہ بار کھنگالا۔ ایک ایک مضمون اور مضمون نگار کا نام فہرست میں دیکھا۔ رسالے کی ورق گردانی کی، مگر جیسے یہ مضمون تو عنقا ہو گیا تھا۔ اس نے گزشتہ شمارے تلاش کیے۔ سب دیکھے، ایک ایک کر کے مگر وقت اس کو شکست دینے کے درپے تھا۔ مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کو اپنی بینائی اور اپنی یادداشت پر پورا اعتماد تھا۔ ہاں اس نے رسالے میں مضمون پڑھا نہیں تھا، مگر اس نے فہرست میں مضمون کا عنوان اور مضمون نگار کا نام ضرور پڑھا تھا بلکہ اپنے پاس بیٹھے ایک غیر ادبی دوست کو یہ کہا بھی تھا کہ اس عنوان کے تحت اس نے بھی کوئی بیس پچیس سال قبل ایسا ایک مضمون لکھا تھا۔ اس نے اپنے دوست کو فون کیا۔ اس نے بھی اقرار کیا کہ ہاں جب میں تمہارے پاس بیٹھا چائے پی رہا تھا اور میرا دھیان ایک ہفت روزہ رسالے کے صفحات پر تھا، تم نے اس عنوان کے تحت اپنے لکھے جانے والے مضمون کا تذکرہ کیا تھا۔ یہ سچ ہے مگر میرا اصل دھیان ہفت روزہ رسالے کے کھیلوں کے صفحہ پر تھا جہاں مقبول ٹینس سٹار کی شادی کے پانچ ماہ بعد ہی اپنی بیوی سے علیحدگی کی سنسنی خیز رپورٹ درج تھی، جسے میں پڑھ رہا تھا مگر میں نے تمہاری بات سنی ضرور تھی۔

لو جی اب تو ایک اور سند بھی مل گئی۔ وہ جو ایک شک اس کے دل میں سر اٹھانے لگا تھا، اس تصدیق نے اس کا سر کچل دیا تھا۔ ”کیا تمھیں اس رسالے کا کچھ اندازہ ہے جو میرے ہاتھ میں تھا“۔ یہ اس کا اگلا استفسار تھا۔ مگر دوست اس کو اس کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس نے دوبارہ رسائل کو ایک ترتیب سے اکٹھا کیا۔ ایک ایک کر کے تمام رسائل کی فہرستیں دیکھیں مگر اس عنوان کا کوئی مضمون اس مضمون نگار کا نہیں تھا۔ ہاں ایک رسالہ جو اسے بذریعہ پوسٹ آیا وہ یہاں موجود نہیں تھا۔ اس رسالے سے اس کی بیوی کی

دلچسپی بھی رہتی تھی کیونکہ اس کی بڑی بہن اس میں کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی۔ اس نے اپنی بیوی سے پوچھا مگر اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ تو پھر وہ رسالہ گیا کہاں؟ اس نے یہاں تک سوچا۔ ”رسالے کے اوراق کتنے گرام کے تھے۔ فہرست جفت یا طاق صفحہ پر ایک کالم یا دو کالم میں چھپی ہوئی تھی۔ ٹائیٹل 65 گرام والا تھا یا 210 گرام والا“۔ کچھ صحیح طرح سے یاد نہیں آ رہا تھا۔ کبھی یاد آ رہا تھا اور نہیں بھی۔ وہ پھر اپنے دوست سے مدد کا طلب گار ہوا۔ مگر مصروفیت کی وجہ سے اس کا دوست اس روز نہ آ سکا۔ اب اس نے صبح کا انتظار شروع کر دیا۔ ایک مرتبہ پھر وقت نے ثابت کر دیا تھا کہ اشیاء اور واقعات کی ترتیب و تشکیل وہ کرتا ہے اس پر کسی دوسرے کا اختیار نہیں ہو سکتا۔ صبح ہوئی، ناشتہ کیا، دفتر جانے کے بجائے اس رسالے کے دفتر جا پہنچا جس کا شمارہ اسے مل نہیں رہا تھا۔ ابھی رسالے کا مدیر و دیگر عملہ نہیں آیا تھا صرف چپڑاسی نے دفتر کھولا تھا اور صفائی میں مصروف تھا اس نے چپڑاسی سے تازہ شمارہ مانگا جو اسے با آسانی مل گیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ پہلا صفحہ الٹا، فہرست پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی، پھر مضامین کو انفرادی طور پر فہرست میں دیکھا۔ عنوان کے اعتبار سے بھی اور مضمون نگار کے نام کے اعتبار سے بھی مگر وہ مضمون اس شمارے میں بھی نہیں تھا اب تو وہ تقریباً حواس باختہ ہو چکا تھا۔ زمین کھا گئی، آسمان نگل گیا، آخر ایسا کیا ہوا، حروف اڑ گئے، صفحات دھل گئے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مضمون نگار کی دائمی مسکراہٹ ایک مرتبہ پھر زندہ ہو گئی جو اپنے اندر معانی و مفہوم اور تاثرات کی بے شمار جہات لیے ہوئے تھی۔ مضمون نگار نے وقت کو مات دے کر دائمی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ وہ دفتر نہیں گیا واپس گھر آیا اور ایک مرتبہ پھر اسٹڈی میں موجود رسائل کو ادھیڑنے لگا۔ وقت کیسے گزر گیا، شام ہو گئی۔ مگر وہ رسالہ کہیں نہیں ملا۔ بیوی سے بچوں سے استفسار کیا ان سے پوچھا ان کا کوئی ملنے والا تو نہیں آیا تھا۔ مگر کسی سے کوئی شواہد نہیں ملے۔ شام کو دوست آ گیا اس کو پریشانی کے عالم میں دیکھ کر پریشان ہو گیا اور اس لمحے کی ایک ایک جزئیات کو یاد کرنے میں اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔

یہ سچ ہے جدید انسان کا ذہن ایک ہی وقت میں کثیر جہات میں سوچ سکتا ہے۔ یہ اس کا دعویٰ ہے اور اس صداقت کو مختلف اوقات میں ثابت بھی کیا گیا ہے۔ مگر جدید ٹیکنالوجی بعض اوقات اس کو ایسے موڑ پر لا کھڑا کرتی ہے کہ سچ اور جھوٹ، ہونی اور انہونی، اندھیرا اور اُجالا، دن اور رات، آگ اور پانی کے درمیان میں کہیں خود کو محسوس کرتا ہے۔ سوچیں اور چیزیں آپس میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ علی حسین کا واسطہ بھی لمحے کے ایسے ہی کسی حصے سے پڑ گیا تھا۔ اس کی یادداشت اس کو بھٹکا رہی تھی۔ وقت اس کی انگلی پکڑنے سے منکر نظر آ رہا تھا۔ علی حسین اور اس کا دوست بیٹھے اس دن کے ایک ایک لمحے کی فرد فرد جزئیات کو یاد کر رہے تھے مگر کہیں سے کوئی مدد نہیں مل رہی تھی۔ آخر کار رسالہ مل گیا، وہیں سٹڈی روم میں پڑا ہوا تھا۔ کئی بار وہاں نظر پڑی مگر تب نظر نہ آیا اور اب یوں لگا جیسے ابھی ابھی عالمِ غائب سے ظاہر ہو گیا ہو۔ علی حسین نے رسالہ

اٹھا کر اسی وقت گاڑی میں رکھ دیا۔ اگلے اجلاس میں ضرور ساتھ لے کر جاؤں گا۔ اجلاس میں موقع ملے نہ ملے، مگر رسالہ تو میرے پاس ہو گا۔

اگلے اجلاس تک ماہِ رمضان شروع ہو چکا تھا اور اتوار کی شام کو ایک دوست نے علی حسین کو افطار پارٹی پر بلا رکھا تھا۔ گذشتہ کئی برسوں سے ماہِ رمضان کے ہر پہلے اتوار کو تمام دوست، کلاس فیلو اکٹھے ہوتے۔ خوب باتیں ہوتیں، کسی کو غیر حاضری کی اجازت نہ تھی۔ علی حسین نے سوچا، افطاری کے بعد چپکے سے نکل آؤں گا۔ اجلاس میں اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لیے یہ رسالہ پیش کرنا بہت ضروری تھا۔ اس کی غیر حاضری سے کئی مطالب نکالے جا سکتے تھے۔ علی حسین نے اپنے دوست سے بھی گذارش کی اور مہربانی کا طلب گار ہوا۔ بظاہر دوست مان گیا مگر علی حسین کو لگ رہا تھا نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ افطاری کے بعد نماز کے لیے آدھ گھنٹہ وقفہ ہوتا تھا اور اسی وقفے میں علی حسین نے افطار پارٹی سے غائب ہونا تھا۔ مگر وقت نے اس کے لیے کچھ اور لکھ رکھا تھا۔ کئی برسوں بعد کاشف امریکہ سے لوٹا تھا۔ اپنے عزیز ترین دوست کاشف کو وہاں اچانک پا کر وہ حیران و ششدر رہ گیا۔ اسی روز دوپہر کاشف پہنچا تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو علی حسین بھول گیا کہ اسے اجلاس میں پہنچنا ہے بلکہ اس دوران ادبی تنظیم کے سیکرٹری کا فون بھی آیا، مگر علی حسین نے موبائل کی آواز بند کر رکھی تھی اس لیے اس کو پتہ نہ چلا۔ پتہ تو اس کو وقت گزرنے کا بھی نہ چلا کہ جب سارے دوست میز پر سجے بے شمار انواع و اقسام کے کھانوں پر ٹوٹ پڑے۔ نہ تو اس روز علی حسین وقت کو اپنے حق میں موڑ سکا اور نہ ہی وقت ہونے والے واقعات کو زمانی اعتبار سے ایک ہی وقت میں مختلف جگہوں پر وقوع پذیر ہونے سے روک سکا۔ تب اس کے ہاتھ میں ثبوت نہیں تھا اس لیے وہ شکست کھا گیا اور آج ہاتھ میں ثبوت تو تھا مگر وہ وہاں نہیں تھا، جہاں اسے اپنے سچ کو ثابت کرنے کے لیے ثبوت پیش کرنا تھا۔ زمان و مکان کا یہ بعد صدیوں سے انسان کے لیے چیلنج لیے اس کے سامنے کھڑا ہے۔ ایک طرف زمان دوسری طرف مکان اور ان دونوں کے درمیان تعلق تلاش کرتا ہوا حقیر و بے مایہ انسان۔ خس و خاشاک کی طرح معلق رہتا ہے، کب کس لمحے کی موت ہو جاتی ہے، پتہ ہی نہیں چلتا، معلوم ہی نہیں ہوتا، مگر تکون کا وجود ازل سے ہے، ابد تک رہے گا۔

☆☆☆☆

فرخ ندیم

کچھ لکھنے سے پہلے

اس سے پہلے کہ میں کچھ لکھتا---

ایک دھماکہ ہوا اور زندگی ٹوٹ کر یوں ب۔کھ۔ر۔ی جیسے مسجد کے فرش پہ تسبیح کے منکے یا طوفانی زلزلے سے بے بس ب۔س۔ت۔ی۔ا۔ں پہاڑوں سے گرتی پرکھوں کی ہڈیاں تک ہلا دیتی ہیں۔ ملکی، غیر ملکی اور نجی ٹیلی ویژن سپیکر پھاڑ پھاڑ کر بول رہے تھے کہ پاکستان چوک میں الاماں کے پرخچے اُڑ چکے ہیں۔ گویا صور پھونکے جانے کے بعد موت نے مسکراتی قینچی انگلیوں میں لیے نئے قبرستان کا فیتہ کاٹ دیا ہو۔ دوام بخشنے والی سب دعائیں دھول اور دھوئیں میں بکھرتے انسانی اعضا سے لپٹی سینہ کوبی کرتی پکی پکی سڑکوں پہ ایسے گرتی ہیں جیسے زخمی پرندے گردنوں اور چونچوں کے بل گرتے ہیں۔ انہونیوں کی بھرمار میں یہ سرخ اچانکے کوئی نئی رسم تھیں۔ جب عام انسانی زندگی قدم قدم پہ مرگھٹ میں اترے اور آزاد تجارتی منڈیوں کی ثقافت میں قدریں قیمتوں سے رگڑ کھاتی بارودی ہونے لگیں تو جسم دیوانہ وار بٹوارہ ڈھونڈتے ہیں۔ اور ہم سادہ لوح یہ سمجھتے ہیں کہ سب قسمت کا کھیل ہے۔

دھماکہ ہوا اور کئی من جسمانی ملبہ چھوٹی بڑی سفید کالے شیشوں والی گاڑیوں پہ اس شدت سے سرخ کیچڑ برسانے لگا کہ سب کی سب اُلٹے ٹائروں کی چیخیں نکالتے اور بیک مرر کے سہارے مُڑتے ہوئے ورکشاپوں میں کھانس کھانس کر سانسیں بحال کرنے لگیں۔ ہمیشہ کی طرح ہر طرف ایک ہی آواز تھی ”پیچھے ہٹو---پیچھے ہٹو---پیچھے ہٹو“ اور---پیچھے ہٹتے ہوئے کسی کی آواز ”اور کتنا پیچھے ہٹیں---؟؟؟“ بڑی بڑی دیواروں سے ٹکرائی اور نیچے گر کر دم توڑ گئی----- اس کے ساتھ ہی زمین کے اس دہشت زدہ خطے کی سڑکیں سنسان ہو گئیں۔ بوکھلاہٹ بحال کرنے کو قلم ہاتھ میں لیے کھڑکی سے باہر جھانکتا ہوں تو پرانی رائفل کا بٹ میری ناک جھنجھوڑ کر کہتا ہے، ”پاگل تو نہیں ہو تم---پیچھے ہٹو---ایمرجنسی لگ چکی ہے“۔ لفظ ایمرجنسی کا دھماکہ اتنا شدید تھا کہ ایک چھلانگ لگا کر میں نے کمرے میں کھڑی رجائیت کی آنکھوں پہ دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ اسی افراتفری میں قلم میرے ہاتھ سے گر کر پچھلی دیوار سے لگ گیا۔ پتہ نہیں میں کیا لکھ رہا تھا---؟ میں لکھ رہا تھا کہ میں بھول رہا تھا۔ میں لکھتے لکھتے بھول رہا تھا یا میں بھولتے بھولتے لکھ رہا تھا۔ میں کچھ لکھ رہا تھا کہ گھڑی کی سوئیوں کی آہٹ پہ میرے شعور کی آنکھ کھلی۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا کہ پچھلی رات کے پچھلے پہر اُلٹے پاؤں سوچتا ہوا مٹی سے بنے چولہے کے گرد دو مٹیالے انسانوں کو اک دوجے کی آنکھوں

سے پرانی گرد صاف کرتے دیکھنے کے لیے کھلے آسمان تلے ورطہ حیرت میں ایک گوٹھ پہنچ چکا تھا۔ مشیتِ ایزدی کی نیم ٹھنڈی ریت پہ معتوب دھڑکنوں کو لکھتے لکھتے بُھول رہا تھا یا میں بُھولتے بُھولتے لکھ رہا تھا۔

دیوار پہ لگی گھڑی پہ ٹکٹکی باندھے کب سے پلٹ پلٹ کر سوچ رہا تھا کہ اس معتوب ریت پہ وہ دو مٹیالے کردار کون تھے جن کی دھڑکنوں کی بازگشت کچھ اس طرح تھی۔

"فکر کیوں کرتے ہو، یہ دہکتی ریت ہمارے تلوے تو جلاتی ہے مگر رفتار تیز اور فاصلے کم کرتی ہے۔"

"ہم محنت کش ہیں۔ وڈیروں کی بنائی قسمت سے ہارتے ہارتے ہاری ہو گئے۔ گوٹھ کی خوشیوں کو یہ قسمت دونوں ہاتھوں کی پانچوں پانچوں انگلیوں سے چپڑ چپڑ چاٹ رہی ہے۔ اسی طرح۔۔۔ ہمارا اونٹ بھی چاٹ گئی"۔

"مگر اونٹ مَرا ہے نا۔۔۔ تمہارا دل مَرا نہ میری جان۔ ہم لوگ اپنے ہی پسینے سے اپنے جسموں کو ٹھنڈک دینا جانتے ہیں۔ اُمید رکھو پگلی، ہمیں اپنے حصے کی کھیتی ضرور ملے گی۔ تم شہر جانے کی تیاری کرو۔ دل لگا کے محنت کرنا، دیکھنا جھالروں سے سجا اونٹ کی مہار تیرے ہاتھ میں ہوگی"۔

"سنا ہے شہر میں بم پھٹتا ہے تو خون کی بارش ہوتی ہے اور کوئی بیماری بھی ہے ایمرجنسی جو سارے ملک کو لگی ہوئی ہے۔ ایسے میں شہر۔۔۔؟"

"میں نے بھی سنا ہے۔۔۔ لیکن قرض کا طوق پہنے کب تک حاکم کے طویلے میں بندھے رہیں؟ اگر کسی نے ہمارا مقدر لکھا ہے تو اسے میرا دھڑکتا ہوا دل، آنکھوں کے بے حساب رتجگے، میری نسلوں کے عذاب، میرے گوٹھ کی چر چر کرتی چٹختی ہنڈیاں اور میرے گھر کے خالی برتن۔۔۔ کچھ تو احساس ہوگا اُسے میری بے بس زندگی کا۔۔۔ لگتا ہے وہ کچھ لکھتے لکھتے بھول گیا ہے"

بس۔۔۔ یہی کہانی تھی جو میں لکھتے لکھتے بھول رہا تھا یا میں بھولتے بھولتے لکھ رہا تھا۔ میں نے کتنا سوچا تھا کہ ایک اونٹ بناؤں گا اور اس کی مہار اس سانولے سے نوجوان کے ہاتھ میں دوں گا تاکہ وہ اس کے گلے کی گھنٹیوں سے اپنے راستوں کی سیاہ بختی دُور کر دے۔ اس کا ایک اپنا اونٹ تھا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ رات کو کسی نے اسکو زہر دے دیا۔ بس دو ہی دنوں میں اونٹ کی بلبلاہٹ پہ مکھیاں بھنبھنانے لگیں۔ جس دن اونٹ کا وقت ختم ہوا اسی دن معتوب ریت پہ دو جڑواں کچے گھروں کی زندگی مفلوج ہو گئی۔ ایک گھر اس سانولے مہاری کا جو اپنے حصے کی بارش کی خاطر بڑی حویلی کی غلام گردش کی طرف ہانکا جا رہا تھا۔ دوسرا خاموش گھر جس میں میرے اونٹ کی وجہ تجسیم وصل کی بانہوں کو ترس رہی تھی، دن بدن دراڑوں کے شکنجے میں سکڑتا ہی جا رہا تھا۔ دیواروں کی اوٹ میں مضطرب اور دل گرفتہ کہانی کی پُر رعنائی کونج کی طرح گردن گھما

گھما کے ڈوبتے سورج کی طرف دیکھتی تو شام کھنکار بن کر میرے تصورات کی مسافتوں کو مزید گھائل کر دیتی۔ اپنے خارج سے باخبر اور ورطہ تخلیق، میں سوتے جاگتے اس کی چوڑیوں کی چھن چھن سے مسحور چن چن کر جزئیات نگاری کرتا تا کہ ریت کی گود میں نڈھال ایک ثقافت کو سانسیں دے سکوں۔

کئی بار میں اپنے تصوراتی طلسم میں خیمہ زن جزئیات نگاری کو الٹ پلٹ کر دیکھتا کہ کہیں کوئی بے وقت کا موسم، ہوا، رات گرد و غبار کوئی ایسی شر انگیز سرسراہٹ تو نہیں کہ متن کی رگیں لرزتی ہوئی ٹوٹنے لگیں۔ انہی اندیشوں کے خوف سے میں قدم اور قلم دونوں پھونک پھونک کر رکھتا۔ دائیں ہاتھ میں قلم اور بائیں ہاتھ میں ضروریاتِ زندگی کی لمبی فہرست تھی جس کے بوجھ تلے میرے سانس لمبے اور قدم چھوٹے ہوتے جا رہے تھے۔ ایک طرف تصور اور دوسری طرف حقیقت۔ ایک طرف تو میری کہانی اور دوسری طرف بھی میری کہانی۔۔۔ جسے میں نے لکھنا تھا۔ اپنے خارج اور داخل کے درمیان ایک شاقول سے لٹکا میں اپنے حصے کی زمین کبھی اِدھر کبھی اُدھر تلاش کرتا۔ اپنے شکستہ باطن میں شرارے لگی شریانوں کو ترتیب دینے بیٹھتا تو اُس صحرائی حسن کے ٹوٹتے چوڑیاں گجرے کہانی کا کلیجہ کاٹتے میری آنکھوں کے سامنے واورولوں میں غائب ہو جاتے۔ پرچھائیوں سے پناہ مانگتے یہ چوڑیاں گجرے سر پٹخ پٹخ کر فنِ تخلیق سے دوٹیالوں کا سنجوگ مانگتے۔ پر۔۔۔ ان کو کیا معلوم کہ میری ذات کے محرکات کے متوازی بہت سارے بارود بھرے سماجی اور سامراجی محرکات ہیں جو ہلکی سی آواز پر بھی اندھا دھند ڈرون کر دیتے ہیں۔ تصور اور حقیقت مجھے کلاووں میں اس طرح تقسیم کرتے کہ میرے ذہنی ارتعاش اور انتشار سے کہانی کے اجزائے ترکیبی جاڑے کے موسم میں گرتے ہوئے یاس مارے زرد پتوں کی طرح ٹوٹتے بکھرتے اور انہی واورولوں کے دوش پہ غائب ہوتے محسوس ہوتے۔ ایک طرف مجھے اپنے گھر کی سانسوں کو بچانا تھا تو دوسری طرف معتوب ریت پہ چرچراتی چٹختی ہڈیوں کے درمیان معتوب خوابوں کی کہانی لکھنا تھی۔

پھر ایک دن میں کھڑکیوں دروازوں سے پھونکیں مارمار کر بارود صاف کرنے لگا۔ بارودی گرد و غبار نے میری آنکھوں میں ایسی رڑک ماردی کہ کئی بار کسی کپڑے کو گچھو کر کے اور منہ کی ہوا سے گرم کر کے آنکھوں کو ٹکور کرنا پڑا۔ کوئی چھ دن لگ گئے مجھے اپنی ذات کے مٹی پانی آگ ہوا یکجا کرنے میں۔ وقت دیکھا تو یاد آیا میں نے کہانی بھی لکھنا ہے۔ ساتواں دن اتوار کا تھا۔ اُس دن میں نے ایک خوبصورت اونٹ تراشا اور اُس کی مہار اپنے اُس سانولے کردار کے ہاتھ میں دے دی جس کا نام میں نے سچل رکھا تھا۔

میرا گھر ساحل سمندر سے قریب نہ تھا پھر بھی میں چھت سے سچل کو رنگ برنگی جھالروں، ستاروں، شیشوں، گھنگھروؤں اور گھنٹیوں سے سجے دادا کی مہار تھامے دیکھ سکتا تھا۔ سچل نے اونٹ کا نام شاید دادا ہی

رکھا تھا کیونکہ کہانی کا سارا بوجھ دادا ہی نے اٹھانا تھا۔ یہ دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا کہ سلوموشن کی طرح ڈوبتے ہوئے سورج کے ڈھلتے ہوئے زرد سائے میں سچل اور اونٹ کے سوا ساحل سمندر پہ بس بیابان وقت تھا۔ نہ قدموں کے نشان، نہ خالی ڈبے، نہ ٹافیوں کے ریپر، نہ سگریٹ کے خالی پیکٹ۔۔۔! لگتا ہے کسی نے سوئی کے نکے میں آسیبی آکاس بیل ڈال کے شہر کی گلیاں، سڑکیں سی دی ہیں۔ سچل کبھی شہر کی طرف، کبھی ریت میں اپنے اور دادا کے دھنستے ہوئے قدم، کبھی پلٹتی ہوئی سمندر کی لہروں اور کبھی ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف دیکھتا ہے۔ میری کہانی پھر ڈوب رہی تھی۔ اسی چھت سے گھر کی طرف دیکھا تو قلم پکڑی انگلیوں پہ کپکپی طاری ہو گئی کیونکہ اجتماعی سماجی المیہ میں مجھے اپنی بقا کی جنگ بھی لڑنا تھی۔ گھر کی چار دیواری پہ مسائل اتنے زیادہ گھنے تھے جیسے نخلستانی چڑیوں کے گھونسلوں کے گرد کائی اُگتی ہے۔ اپنے چوزوں کی مسکراہٹ لینے گھر سے قدم باہر رکھتا ہوں تو ایک اور دھماکہ ہوا اور سماجی ایمرجنسی سے ہوتا ہوا کئی کہانیوں سمیت ایمرجنسی میں ایمرجنسی وارڈ داخل کرا دیا گیا۔ پھر وہی آوازیں "پیچھے ہٹو"، "پیچھے ہٹو"، "پیچھے ہٹو"۔ رات کے پچھلے پہر جب ہوش آیا تو پچھلی دیوار سے لگے میرے بستر پہ پڑی اَن لکھی کہانی پہ لاتعداد سلوٹیں پڑ چکی تھیں۔

معلوم نہیں مجھے پیاس لگی تھی یا نہیں مگر کوئی اجنبی شیشے کا گلاس تھامے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ گلوکوز کی تھیلی بستر کی دوسری طرف ایک سٹینڈ سے لٹک رہی تھی۔ میں ساحلِ سمندر جانا چاہتا تھا۔ اپنے چوزوں کے بال و پر کی فکر بھی تھی مگر میں بُری طرح زخمی تھا۔ پٹیوں میں لپٹے سر میں یادداشت بحال بھی ہو رہی تھی۔ پانی پینے سے پہلے میں نے بازو سے سوئی نکالی۔ اجنبی ہمدرد نے وارڈ میں شور مچا دیا۔ ڈاکٹرز، نرسیں اور اردگرد کھڑے لوگ میرے اس پاگل پن کو دیکھتے میری طرف بھاگے۔ اسی افراتفری میں پانی کا گلاس فرش پہ گرا اور ٹ۔و۔و۔ٹ کر ذُور ذُور تک بکھر گیا۔ میرا ذہن بھی آزاد تلازمۂ خیال سے بندھا فلیش بیک کرتا ہوا معتوب ریت پہ چھوٹی سی مصلوب بستی کے ایک چھوٹے سے گھر کے چھوٹے سے دروازے پہ دستک دینے لگا۔ جہاں میری کہانی کی بیچاری رعنائی جس کا نام میں نے نگھی رکھنا تھا، فاقوں مر رہی تھی۔ دروازہ کھلا تو میں نے ایک مرجھائے ہوئے مرمریں حسن کو آنکھیں مل مل کر دیکھا۔ میری دلچسپی کی پروا کیے بغیر اس نے بھی تشبیہ و استعارے ایک ایک کر کے اپنے جسم سے اتارے اور میری چھاتی پہ پھینک دیے۔ وہ پیچھے مُڑنے لگی تو اَن لکھے متن، خیال، آہنگ میری آنکھوں میں تحلیل ہو کر معدوم ہونے لگے۔ میرے اعصاب کچھ اس طرح تن گئے کہ مجھ سے رہا نہ گیا۔ سارے ماحول میں میری آواز گونجی "ٹھہرو، کچھ دن اور انتظار کرو"۔۔۔ ایسا نہیں ہوا۔ وہ میرے حالات جان چکی تھی۔ شاید وہ تو سچل کو بھی بھول چکی تھی۔ اُلٹے قدموں

آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتی چلی گئی اور سناٹوں میں گم ہو گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

یہ وہ جملہ تھا جو اس دن ایمرجنسی وارڈ میں ختم ہونے والی ہر کہانی پہ کہا جاتا۔ دونوں ہاتھوں سے میں نے آنکھیں چھپا لیں اور تخیل میں بھاگتا ہوا ساحلِ سمندر کی طرف پلٹا۔

سلو موشن کی طرح ڈوبتے ہوئے سورج کے ڈھلتے ہوئے زرد سائے میں ا۔و۔ن۔ٹ اور مہاری بچل گھنے سایوں کی طرف ہانکے جا رہے تھے۔

میں بھی پلٹا۔ آنکھیں مل مل کر دیکھا کہ کنٹونمنٹ کا عملہ جگہ جگہ بکھرا ہوا م۔ا۔ض۔ی سمیٹنے میں مصروف ہے۔ ایک خاکروب نے لکڑی کے تین ٹکڑے اکٹھے کیے پھر ان کو آپس میں جوڑتے ہوئے بولا، "ش۔ہ۔ر" دس 10 KM!!! پتہ تمہیں کیا بنتا ہے۔۔۔!!!

اور یہ سب کچھ۔۔۔ میرے کچھ۔۔۔ لکھنے سے پہلے ہو گیا۔

☆☆☆☆

کرن شفقت

دل، دریا، دھڑکن، دھمال!!

میں یہ بات وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ یہ کہانی ہے یا حقیقت! افسانہ ہے یا داستان، قدیم ہے یا جدید! وہ شاید اس لیے کہ یہ دریا کی کہانی ہے جو بہت قدیم ہے اور یہ انسان کی بھی کہانی ہے جو اُس سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ یہ کہانی میں نے نانی اماں سے سنی یا دادی اماں سے۔ اپنی ماں سے سنی یا اپنے آپ سے! اس کہانی کا تعلق بھی اُسی دریا سے ہے جو کبھی نیل اور کبھی گنگا بن جاتا ہے، کبھی فرات اور کبھی چناب کہلاتا ہے۔ نیل ہو تو موسیٰ کا دوست اور فرعون کا دشمن کہلاتا ہے۔ گنگا بنے تو رام اور سیتا کی پوتر محبت کا عینی شاہد بن کر تاریخ کو گواہی دیتا ہے۔ فرات بنے تو ایک پاکیزہ خاندان کی پیاس کی علامت بن کر وقت کے ماتھے کا جھومر بن جاتا ہے اور اگر چناب کہلائے تو سوہنی مہینوال کا رقیب بن کر وقت کے پتّوں پر ٹھاٹھیں مارتا ہوا کچے گھڑے کی بے ثباتی پر قہقہے لگاتا ہے۔

اس کہانی میں یہی دریا، دوابہ گاؤں سے ڈیڑھ دو میل دور بہتا ہے جس میں دیہاتی حسن و سادگی کی مجسم تصویر، تعبیر رہتی ہے۔ تعبیر جس قدر حسین ہے اُسی قدر ذہین بھی ہے جس کی اُبھرتی ہوئی جوانی کے گرد اس کی اپنی بے خبری، سادگی، بے نیازی اور الھڑ پن کے وقار کا پہرہ ہے، جس کا عشق اس کی کتابیں اور وہ خواب ہے جس میں وہ گاؤں کی سب سے پڑھی لکھی تعبیر کے روپ میں زندہ ہے۔ دسویں جماعت میں پڑھنے والی تعبیر اپنے بابا خوشی محمد اور ماں بلقیس کے خوابوں کی بھی تعبیر ہے اور سارے گاؤں کی آسوں اور اُمیدوں کا مرکز بھی۔ وہ سارے گاؤں کی بوڑھی عورتوں کی ذلاری، سکھیوں کی پیاری اور نوجوانوں کے سپنوں کی رانی ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ دوابہ گاؤں اگر جسم ہے تو تعبیر اس کی روح۔

یہ کہانی اسی تعبیر کی کہانی ہے جو ہر رات گاؤں سے ڈیڑھ دو میل دور بہتے دریا کو اپنے سینے میں چھپی دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو کر دھڑکتے ہوئے محسوس کرتی ہے۔ اماوس کی راتوں میں جب رات بچھڑے ہوئے چاند کی جدائی کے دکھ اور نئے چاند کی اُمید کے زیرِ اثر تاریکی اور سناٹے کی اُنگلی پکڑے گاؤں کی پگڈنڈیوں سے گذرتی ہے تو دریا تعبیر کی دروازے پر دستکیں دینے لگتا ہے۔ جب رات چاند کا ٹیکا اپنے ماتھے پر سجائے مسرور و شاداں گاؤں کے کھیتوں سے اٹکھیلیاں کرتی ہے تو دریا تعبیر کے بستر کے گرد دھمال ڈالنے لگتا ہے۔ عام راتوں میں دریا اس کی آنکھوں کے دونوں کناروں کے درمیان بہنے لگتا ہے۔ اس کی لہریں تعبیر کے دل کی دھڑکن بن جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں تعبیر کی ہم راز صرف چھت کی وہ کڑیاں ہوتی ہیں

جن کی طرف چاروں شانے چت لیٹی تعبیر دیکھتی ہے۔ چھت کی کڑیاں اُس سے دریا کی باتیں کرتی ہیں۔ اسے مشورے دیتی ہیں۔ کبھی اُسے ڈراتی ہیں اور کبھی اس کا حوصلہ بڑھاتی ہیں۔ تعبیر کو یہ کڑیاں کبھی اپنی دوست اور کبھی دشمن لگتی ہیں۔ سارا دن عام لڑکیوں کی طرح ہنستی مسکراتی گھر کے کام کرتی اور کتابوں سے کھیلتی تعبیر کا دل شام ہوتے ہی دریا کے ساتھ سفر کرنے لگتا ہے۔ وہ دنیا و مافیہا سے بےخبر ہو کر لہروں کا ہاتھ تھامے صدیوں کے سفر پر روانہ ہو جاتی ہے۔ اس کی اس حالت سے اس کے والدین کی طرح پورا گاؤں پریشان ہے۔ کوئی تعبیر کی اس حالت کو کسی جن بھوت کا سایہ سمجھتا ہے۔ کوئی اسے تعبیر کا دماغی خلل قرار دیتا ہے اور کوئی اسے نفسیاتی مسئلہ سمجھ کر اس کے والدین کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ تعبیر کو شہر لے جائیں اور کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھائیں۔ خود تعبیر بھی نہیں جانتی کہ شام ہوتے ہی اس کے قدم خود بخود دریا کی طرف کیوں اُٹھ جاتے ہیں؟ دریا کے کناروں پر پھرتی تعبیر کو دیکھ کر دریا جھومنے کیوں لگتا ہے؟ اسے ایسے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ دریا اسے چھونے کے لیے بےقرار ہے۔ اس کی چوڑیوں کی کھنک دریا کی لہروں سے ہم آہنگ کیوں ہو جاتی ہے؟ اس کی پائل کی جھنکار اور دریا کے بہاؤ کا ردھم ایک ہی ترنم کیسے بن جاتے ہیں؟ اس کے دل کی دھڑکن دریا کی لہروں پر کیوں تیرنے لگتی ہے؟ کبھی اسے دریا تعبیر لگتا ہے اور کبھی تعبیر دریا محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ خود بھی دریا کی لہروں کو چھو کر وصال آمیز لمس کی سرشاری اور سرمستی میں کھو جاتی ہے۔ دریا اسے اپنا بچھڑا ہوا محبوب لگتا ہے۔ دریا سے دن بھر کی جدائی اور ہجر شام ہوتے ہی وصال میں ڈھل جاتے ہیں۔

تعبیر کے والدین کو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ اس کے سالانہ امتحانات سر پر ہیں اور اس کی توجہ اور انہماک کتابوں کی طرف کم ہو رہا ہے۔ تعبیر کا باپ اس کی ماں کے مشورے سے ماسٹر کرم دین کے گھر کی طرف جا رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ ماسٹر کرم دین کے بیٹے مراد سے کہے کہ وہ تعبیر کو امتحانات کی تیاری کروا دے۔ مراد جو شہر میں کسی بڑے کالج میں پڑھتا ہے اور آج کل چھٹیوں پر گاؤں آیا ہوا ہے۔ تعبیر کا باپ اسی موقعے سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ مراد کی وجہ سے تعبیر کی توجہ پڑھائی کی طرف زیادہ ہو جائے گی۔ اور وہ دسویں جماعت میں اچھے نمبر لیکر پاس ہو جائے گی۔ اس کا خواب ہے کہ تعبیر بھی شہر جا کر کسی بڑے کالج میں پڑھے اور اپنے خاندان اور گاؤں کا نام روشن کرے۔ یہی سوچتا ہوا خوشی محمد ماسٹر کرم دین کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ ماسٹر کرم دین اسے اندر بُلا لیتا ہے۔ دونوں بیٹھک (ڈرائنگ روم) میں بیٹھ جاتے ہیں۔ خوشی محمد ماسٹر کرم دین سے اپنے آنے کا مقصد بیان کرتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ وہ مراد کو اس بات پر راضی کرے کہ وہ تعبیر کی امتحان کی تیاری میں مدد کر دے۔ ماسٹر کرم دین مراد کو بلاتا ہے۔ خوبرو اور نوجوان مراد باوقار انداز میں چلتا ہوا بیٹھک میں آتا ہے اور سلام کر کے ایک موڑھے پر بیٹھ جاتا ہے ”مراد

پتر خوشی محمد کی دھی تعبیر دسویں جماعت میں پڑھتی ہے، اس کے سالانہ امتحانات ہونے والے ہیں اور خوشی محمد چاہتا ہے کہ تم اس کی بیٹی کو امتحان کی تیاری کروا دو‘‘۔ اپنے باپ کی بات سن کر مراد اثبات میں سر ہلاتا ہے اور کہتا ہے کہ اُسے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اگر تعبیر اس کے گھر آ جایا کرے تو اسے پڑھانے میں آسانی ہوگی۔ خوشی محمد اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا اور یوں تعبیر گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر پڑھنے کے لیے مراد کے گھر جانا شروع کر دیتی ہے۔ ذہین وفطین، محنتی اور کتابوں سے دلچسپی رکھنے والی تعبیر کے پڑھنے کے انداز سے مراد کو یقین ہو جاتا ہے کہ تعبیر واقعی اپنی زندگی کے اہم ترین مقصد کو پا لے گی۔ مراد جو خود ایک تعلیم یافتہ، سلجھا ہوا، رکھ رکھاؤ اور آداب کو سمجھنے والا نوجوان ہے، پوری توجہ اور دلچسپی سے تعبیر کو پڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ تعبیر اپنے تعلیمی سفر کو مراد کا ساتھ پا کر اور تیزی سے مکمل کرنے میں مگن ہو جاتی ہے۔ کچھ دن اسی رفتار اور انداز میں گذرتے ہیں۔ پھر ایک دن مراد کو احساس ہوتا ہے کہ جیسے وہ لاشعوری طور پر تعبیر کے پڑھنے کے لیے آنے کا منتظر رہنے لگا ہے۔ اسے تعبیر کا ہر وقت پہنچنا بھی دیر سے آنا لگتا ہے، وہ اس خیال کو اس روز مرہ کے عادی ہو جانے سے تعبیر کرتا ہے اور کسی بھی ممکنہ خیال کو ذہن سے جھٹک دیتا ہے لیکن یہ خیال خواب بننے کی بجائے یقین میں بدلنا شروع ہو جاتا ہے۔ مراد کو لگتا ہے کہ وہ تعبیر کو پڑھاتے ہوئے کچھ اور بھی سوچنے لگا ہے۔ تعبیر کے قرب میں اس کا دل ایک اور انداز سے بھی دھڑک رہا ہے۔ اس کی نظریں کتابوں پر لکھے لفظوں کی بجائے تعبیر کے چہرے کو پڑھنے کی بھی چور کوشش میں مصروف ہو گئی ہیں۔ اس کے ہاتھ تعبیر کے ہاتھ سے کتاب لیتے ہوئے اس کی چھونے کی تمنا بھی کرنے لگے ہیں اس کے کان تعبیر سے سبق سننے کے ساتھ ساتھ کچھ اور سننے کی خواہش میں سرخ ہونے لگے ہیں۔ اس کے سانسوں کی گرمی تعبیر کے جسم کی خوشبو سے ہم آہنگ ہونے کے لیے بے تاب ہونے لگی ہے۔

تعبیر کو پڑھاتے پڑھاتے اچانک اس کی نظریں اس کے کانوں کی بڑی بڑی بالیوں کا جھولا جھولنے لگتی ہیں وہ بالیوں سے نظریں چراتا ہے تو آنکھ اپنی پڑھائی میں مگن تعبیر کے ماتھے پر خود بخود گر آنے والی ایک معصوم سی لٹ سے کھیلنے لگتی ہے۔ وہ لٹ کی زنجیر سے نظروں کو آزاد کرتا ہے تو اس کا چہرہ اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ چہرے سے آنکھ ہٹتے ہوئے اس کے نرم یاقوتی ہونٹوں سے نکلنے والے لفظوں کے ترنم سے سرشار ہونا شروع کر دیتی ہے۔

کبھی اسے تعبیر کا سراپا نور اور خوشبو میں نہایا ہوا محسوس ہوتا ہے اور کبھی اس کی نازک کلائیوں میں پڑی رنگ برنگی چوڑیوں کی کھنک پچھلے زمانے کی دیوی دیوتاؤں کی گنگناہٹ لگنے لگتی ہے اور وہ اس گنگناہٹ کو اپنے دل کی دھڑکن کے اندر محسوس کرنے لگتا ہے۔ کبھی چلتی ہوئی تعبیر کے قدموں کی دھمک اسے زندگی کے سینے پر پھول کھلاتی اور پائل کی جھنکار ان پھولوں پر شبنم گراتی محسوس ہوتی ہے۔

تعبیر کو پالینے کی خواہش دل کی زمین میں جڑ پکڑنے لگتی ہے اور وہ بے چین ہو جاتا ہے، خوفزدہ ہو جاتا ہے، کہیں ایسا کچھ نہ ہو جائے جو یقین، اعتبار اور بھروسے کے کچے گھروندے کو ریت کے ڈھیر میں تبدیل کر دے۔ جذبات کا طوفان ہوش کے در پے نہ ہو جائے، وہ خیال کی آلودگی سے بھی بچنا چاہ رہا تھا وہ اپنے کسی بھی جذبے کو کوئی بھی نام دینے سے گھبرا رہا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ یہ سب جو ہو رہا ہے اسی کو محبت، عشق اور پیار کا نام دیا جاتا ہے لیکن وہ اپنے جذبوں اور یہ سب کچھ جو ہو رہا تھا، کو فی الحال اسی طرح کا کوئی بھی نام دینے سے گریزاں تھا جب تعبیر چلی جاتی تو اس کی پریشان خیالی اسے تھکا دیتی۔ وہ اپنی سوچوں کی مسافت سے ہانپنے لگتا، تھک جاتا۔ ذہن و دل کی کشمکش اسے برزخ کا وہ عالم لگتا جہاں فیصلے کے انتظار کی سولی پر لٹکنا ہوتا ہے۔ جہاں امید و یاس کی قیامتیں ٹوٹتی ہیں۔ جہاں جسم شل اور ذہن چیخ جاتے ہیں وہ تعبیر کو دوبارہ دیکھنے تک جس اذیت سے گذرتا، تعبیر کو دیکھ کر وہ ساری اذیت سرشاری میں بدل جاتی، ساری تھکن سکون کا لباس اوڑھ لیتی، آنکھوں کی جلن برف کے اولوں کی طرح سرد ہو جاتی۔ وہ عالم برزخ سے فیصلے کی جنت میں پہنچ جاتا جہاں تعبیر، تعبیر کے خواب، تعبیر کی خوشبو، تعبیر کا قرب، تعبیر کا لمس، تعبیر کی گفتگو اس کے لیے جنت کے انعامات بن جاتے لیکن تعبیر کے جاتے ہی وہ ایک بار پھر وسوسوں بے یقینیوں اور ناامیدیوں کی اتھاہ گہرائیوں کی طرف لڑھکنے لگتا، تاہم کہیں کہیں امید اور یقین کے پتھر اس کا حوصلہ بن جاتے اور وہ پاتال میں لڑھک جانے سے بچ جاتا، اندھیرے اجالے دھوپ چھاؤں، ہنسی و خوشی اور یقین و بے یقینی کے راستے پر چلتے چلتے آخر وہ منزل آ گئی جو تعبیر کا خواب تھی جس کے لیے اس نے مراد کو رہنما اور ہم سفر بنایا تھا۔

مراد کی رہنمائی اور تعبیر کی یکسوئی محنت اور لگن نے اسے دسویں جماعت میں نمایاں ترین پوزیشن کا حقدار بنا دیا تھا۔ تعبیر کو پتہ تھا کہ اس دوران وہ متعدد بار دریا سے دور رہنے کے گناہ کی بھی مرتکب ہوئی ہے لیکن تکمیل کے سفر میں دریا سے دوری اس کی تپسیا تھی۔ اس کا امتحان تھی۔ دریا بھی شاید اس کی تکمیل کا منتظر تھا سو اس نے بھی تعبیر کے دیر سے آنے یا نہ آسکنے کا کبھی برا نہیں منایا، سو آج تعبیر دریا، مراد، ماں باپ، سکھیوں سہیلیوں، گاؤں کے لوگوں اور خود اپنی نظروں میں سرخرو تھی اس نے وہ سب کچھ پا لیا تھا جس کی اس نے تمنا کی تھی۔

امتحان میں کامیابی کا دن اس کے لیے اس کی زندگی کا سب سے حسین اور سب سے مکمل دن تھا اس کے چاروں طرف بہاریں رقصاں تھیں۔ پھول اس کے قدموں میں بچھے جا رہے تھے، پرندے اس کی دھڑکنوں کے اندر چہچہا رہے تھے۔ فضاؤں کی گنگناہٹ اس کے ہونٹوں کا ترنم بن کر فضاؤں میں بکھر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے اشک ستارہ ساز چراغ محسوس ہو رہے تھے۔ اس کے دل کی دھڑکن، منزل آشنائی کی طمانیت کی ہم آواز بنی ہوئی تھی۔ اس کا رُواں رُواں تکمیل کے نشے میں چور، بہکا بہکا لگ رہا

تھا۔ تعبیر اس کیفیت سے سرشار پورے گاؤں میں اپنے ہاتھوں سے مٹھائی تقسیم کر رہی تھی۔ دوسری طرف مراد اور دریا بے چینی سے اس کے منتظر تھے۔ مراد کو یقین تھا کہ آج کا دن تعبیر کی نہیں اس کی اپنی کامیابی کا دن ہے۔ آج کے دن پر تعبیر کے بعد سب سے زیادہ اس کا حق ہے۔ آج وہ تعبیر کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔ اس سے زندگی بھر کے پیمان باندھ لینا چاہتا تھا۔ دل کھول کر رکھ دینا چاہتا تھا تعبیر کے سامنے۔ وہ اظہارِ محبت کے لیے لفظوں کی بجائے اپنے اشکوں کو ترتیب دے رہا تھا۔ وہ سانسوں کے زیر و بم کو اظہار کی لے اور دھڑکن کو ردھم بنانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ادھر دریا کی لہریں موج، موج مستی کی کیفیت میں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ دریا اپنے سینے پر تعبیر کے قدموں کی دھمک کو محسوس کر رہا تھا وہ تعبیر کو اپنی آغوش میں لے کر لہروں کا جھولا جھلانے کے لیے بے تاب تھا۔ مکمل تعبیر، مکمل دریا اور پھر تکمیل کی وہ معراج جو مکمل ہی تب ہوتی ہے جب دونوں ملنے والے مکمل ہوں، نہ محب ادھورا نہ محبوب آدھا۔ دونوں سربسر زاویے سے مکمل سربسر انداز میں پورے۔ آج دریا تعبیر کو عشق کی معراج سے سرفراز کرنے جا رہا تھا۔ اس کی لہریں اُٹھ اُٹھ کر وہ راستہ دیکھ رہی تھیں جہاں سے تعبیر کا نور نہایا سراپا نمودار ہونا تھا۔

مراد کی دھڑکنوں کی ترتیب بھی وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بے ترتیب ہوتی جا رہی تھی، اور پھر اچانک وہ لمحۂ وصال آ پہنچا۔ تعبیر دریا کے پاس جانے سے پہلے مراد کی محنت کوشش اور توجہ کا بھرپور شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی وہ اپنے ہاتھوں سے مراد کو وہ مٹھائی کھلانا چاہتی ہے جس کی مٹھاس اس کی کامیابی تھی جس کا ذائقہ اس کی تکمیل سے تخلیق ہوا تھا اور جس کا رنگ اس کی کامرانی کا رنگ تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور شام کے ملگجے اندھیرے سے ذرا پہلے کے جھٹپٹے میں تعبیر روشنی کا استعارہ بن کر نمودار ہوئی اور کمرے کے ساتھ ساتھ مراد کا دل بھی چودھویں کے چاند کی روشنی سے دمکنے لگا۔ تعبیر کامیابی کے غرور کے نشے میں چور نازبردار قدم اٹھاتی مراد کی طرف بڑھی۔ مراد کی بے چینی نے بھی تمام تر تقاضے بالائے طاق رکھے اور آگے بڑھ کر تعبیر کے ہاتھ تھام لیے۔ مراد نے اس کی کامیابی پر اشکوں اور لفظوں کی آمیزش سے ترتیب پانے والے جذبات کا اظہار کیا۔ تعبیر نے بھی بھیگی آنکھوں سے اظہارِ تشکر کے تمام راستے طے کیے اور طویل مسافت کے بعد منزل پر پہنچنے والی سانس اس کے سینے سے نکلی اور مراد کی سانسوں میں گھل گئی۔ چار ہاتھوں کے درمیان رکھی مٹھائی کو دونوں کی دلی کیفیت محسوس ہوئی تو وہ دونوں کے ہاتھوں میں شیرنی گھولنے لگی۔ مراد کے ہاتھوں کی سختی سے مٹھائی کا دم گھٹنے لگا تو تعبیر کے ہاتھوں کی نرمی اسے ہوا دینے لگی۔

ایک دم مٹھائی کی محسوسات تعبیر کے ہاتھوں سے ہوتی ہوئی اس کے دل پر دستک دینے لگی مراد کے ہاتھوں کی سختی اسے تحفظ کا مضبوط حصار لگنے لگی اور اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب مراد کے ہاتھ بازو بن کر پوری کی پوری تعبیر کو اپنے حصار میں لے چکے ہیں۔ مراد کے سانسوں کی گرمی اس کے چہرے کو ٹھنڈک کا

احساس دلانے لگی اس نے منزل پر پہنچنے کے بعد کی سرشاری کا ذائقہ پہلی بار مراد کے بازوؤں میں چکھا تو اس کا جی چاہا کہ وہ دعا کرے کہ اب یہاں سے آگے زندگی کبھی سفر نہ کرے ۔

دوسری طرف تعبیر کے لیے دریا کا انتظار وحشت میں بدلنے لگا پہلے تو اس نے اپنا سر کناروں پر پٹخا اور پھر بے چین ہو کر چیخنے لگا دریا کا شور اس بیوہ کے بین کی طرح لگ رہا تھا جو سہاگ کی سیج پر پہنچنے سے ذرا پہلے چوڑیاں توڑنے پر مجبور کر دی گئی ہو ۔ دریا کی لہریں ایک دوسرے سے گلے مل مل کر تعبیر کی بے وفائی کا سوگ منانے لگیں ۔ ٹوٹنے لگیں، بپھرنے لگیں، بھنور نے اپنے گھنگھرو اتار پھینکے اور اس کا رقص وحشت ناک ہو کر اپنے ہی گرد چکر لگانے لگا ۔ دریا کی بے تابی اور غصہ بڑھا تو نجانے کہاں سے آسمان پر بادلوں کی ٹولیاں سیاہ لباس میں ماتم کرتی نمودار ہو گئیں ۔ ہواؤں نے اپنے ضبط توڑ دیئے اور طوفان کی شکل اختیار کر گئیں ۔

آج رات دوابہ گاؤں پر قیامتِ صغریٰ کی رات تھی ۔ پورے گاؤں میں ہواؤں کی چیخوں، بادلوں کی گرج، بجلی کی چمک، آسمان سے گرتے پانی کے بین، دریا کے شور اور گاؤں کے کچے در و دیوار کے لرزنے کے سوا نہ کچھ سنائی دے رہا تھا اور نہ دکھائی ۔ دریا آج سب کچھ تہس نہس کر دینا چاہتا تھا ۔ اس کا دکھ، غم ہجر اور تعبیر کی بے وفائی کی وجہ سے جوار بھاٹا بن گیا تھا ۔ اس کا پورا جسم زلزلوں کی زد پر تھا ۔ وہ خود بھی ٹوٹ رہا تھا اور عالمِ وحشت میں اپنے کناروں کو بھی ریزہ ریزہ کر رہا تھا ۔ تعبیر باہر کی صورتِ حال سے بے خبر مراد کی بانہوں میں جگڑی سکون، چین اور وصال کا جھولا جھول رہی تھی کہ اچانک اس کے کان جو روح کی خاموشی سننے میں مگن اور آنکھیں جو اپنے اندر کی سرشاری کی نظارگی میں مگن تھیں، ایک ساتھ جاگیں، انھیں لگا کہ اس خاموشی اور نظارگی میں کہیں خلل آ رہا ہے ۔ کچھ اور بھی ہے جو اس خاموشی، سناٹے اور منظر کے علاوہ ہے ۔ تعبیر کے حواس رفتہ رفتہ جاگے تو اسے باہر لوگوں کی چیخ و پکار، طوفان اور بارش کا شور سنائی دینے لگا ۔ وہ گھبرا گئی ۔ اسے دریا سے باندھے ہوئے عہد و پیمان یاد آ گئے ۔ وہ مراد کی بانہوں میں کسمسانے لگی ۔ مراد کی قربت اچانک بیزاری اور وحشت میں بدلی تو وہ مراد سے اپنا آپ زبردستی چھڑا کر باہر کی طرف بھاگی ۔ اس کا رخ دریا کی طرف تھا ۔ تعبیر کے ماں باپ بھی تعبیر تعبیر کرتے گاؤں کی طوفان زدہ گلیوں میں پاگلوں کی طرح پھر رہے تھے ۔ لیکن تعبیر سب سے بے خبر صرف دریا کو منانے کی لگن کے ساتھ وحشی ہرنی کی طرح دریا کی طرف بھاگی جا رہی تھی ۔ مراد اُسے پکارتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے سرپٹ بھاگ رہا تھا ۔ مراد کو تعبیر اور تعبیر کو دریا کے سوا کسی کا ہوش نہ تھا ۔ تعبیر جانتی تھی کہ دریا کی وحشت اور غضب کی وجہ وہ خود ہے ۔ وہ دریا سے بے وفائی کی مرتکب ہو چکی ہے ۔ اسے اس بے وفائی کی ہر صورت تلافی کرنا تھی ۔ دریا کو سمجھانا تھا کہ اس کی تعبیر بے وفا نہیں ۔ وہ تو صرف مراد کو اس کی محنت کا صلہ دینے گئی تھی ۔ اس کے ساتھ چلنے کے انعام کا وعدہ پورا

کرنے گئی تھی۔ اس کا پہلا اور سچا عشق تو صرف دریا ہی ہے۔ اسے یقین تھا کہ دریا سے دیکھ کر نرم پڑ جائے گا اور اس کا گاؤں اس تباہی سے بچ جائے گا جو اس کی وجہ سے دوابہ کا مقدر بن گئی ہے۔ تعبیر کو نہ اپنا ہوش تھا نہ اپنی تھکان کا۔ ڈیڑھ دو میل دور بہتا دریا اسے صدیوں کی مسافت پر لگ رہا تھا۔ اس کے تیز بھاگتے قدموں کے نیچے آ کر رستے مر رہے تھے لیکن اسے کسی کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اسے دریا کی آغوش کے سوا کچھ یاد نہیں تھا۔ مراد اس کے پیچھے بھاگتا بھاگتا اتنا پیچھے رہ گیا تھا جتنا پیچھے خود مراد کی قربت کے چند لمحے۔ ایک بھولے بسرے خواب کی طرح مراد اور اس کی قربت جو چند لمحے قبل ایک حقیقت تھی اب ایک وہم کے سوا کچھ نہیں تھی۔ تعبیر دریا دریا کرتی دل اور دھڑکن کی انگلی پکڑے بھاگی جا رہی تھی۔ اس کے پاؤں سے دھمال لپٹ گئی تھی۔ ایک ایسی دھمال جو دائرہ بننے کی بجائے صراطِ مستقیم کی شکل اختیار کر جاتی۔ ایک ہی سمت میں پڑتی دھمال اتنی برق رفتار تھی کہ بچپن، جوانی، سکھیاں، سہیلیاں، کتابیں، ماں باپ، مراد سب کچھ زمانوں کے فاصلے پر چلا گیا تھا۔

آخر تعبیر کے پاؤں دریا کے کنارے بچھی ریت سے وصال آشنا ہونے لگے۔ ریت جو اپنی زندگی میں ٹوٹ کر رُلائی گئی تھی، ایک نرم قالین کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ ٹوٹی ہوئی، بکھری ہوئی، تھکی ہوئی، آبلہ آبلہ، شکست اشک اور شکستہ تعبیر کو بس اتنا یاد ہے کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں دریا کی لہروں سے ہم آغوش ہو گئے تھے۔ اس کے جسم نے لہروں کا لمس محسوس کر لیا تھا۔ آنکھوں نے جی بھر کر روئے ہوئے دریا کی آنکھوں میں جھانک لیا تھا۔ پھر اس کے بعد تعبیر کو کچھ ہوش نہیں رہا۔ بے ہوش پڑی ہوئی تعبیر کے چہرے کا جمال وصال کے بعد کی دوشیزگی سے نکھر رہا تھا۔ دریا پُرسکون تھا۔ ہوائیں مدھم سُروں میں واپس پلٹ آئیں تھیں۔ بارش نے بھی تیور سُر ترک کر دیئے تھے۔ رات، تعبیر اور دریا ایک ہی مقام پر اکٹھے تھے۔ تعبیر اور دریا کا وصال دیکھ کر رات شرما گئی۔ اس نے اپنا زادِ راہ سمیٹا اور سب کچھ صبحِ کاذب کے دامن میں ڈال کر وقت کے ساتھ کہیں دور نکل گئی۔

دوابہ کے لوگوں اور مراد کو صرف اتنا یاد ہے کہ تعبیر طوفانی رات میں دریا کی طرف گئی تھی۔ دن کے اُجالے نے کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔ سو وہ تعبیر کے ماں باپ، مراد اور گاؤں کے لوگوں کو کیا بتاتا کہ تعبیر کہاں گئی ہے۔ رات جو تعبیر اور دریا کے وصال کی عینی شاہد تھی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گم ہو چکی تھی۔ اگلے دن لوگوں کو پُرسکون دریا اور اس کے خالی کنارے ملے، جن پر تعبیر کی کوئی نشانی، کوئی سراغ موجود نہیں تھا۔

دوابہ گاؤں کی ہر نسل دریا سے یہ پوچھتی ہے کہ اس رات سے آج تک دوابہ تعبیر سے خالی کیوں ہے۔ گاؤں کے بڑے بزرگ اپنے بچوں کو یہ حکم دے کر مرتے ہیں کہ وہ دریا سے تعبیر کا پتہ پوچھتے رہیں۔ شاید کبھی دریا کو گاؤں پر رحم آ جائے اور وہ اس کی تعبیر اس کو واپس کر دے۔ اس دن سے آج تک نہ کبھی دریا

دوابہ گاؤں سے دور ہٹا ہے نہ بپھرا ہے نہ غضب ناک ہوا ہے، خاموشی اور سکون کے ساتھ بہتا ہے۔ اس کی خاموشی سکون اور اطمینان ہی شاید دوابہ کے لوگوں کے سوال کا جواب ہے۔ لیکن یہ جواب اُس وقت تک دوابہ کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گا جب تک تعبیر کی طرح کوئی اور دریا کی زبان سمجھنے والا پیدا نہیں ہو جاتا۔

مبشر زیدی

فریبا

یہ ایران کے شہر مشہد کا ذکر ہے، چار سال ہونے کو آئے۔ میں خیابان آیت اللہ شیرازی پر اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ ایک موڑ پر سڑک پار کرنی تھی۔ تیز رفتار گاڑیاں سامنے سے زوں زوں کرتی گزر رہی تھیں۔ ایک بار سڑک صاف دیکھ کر میں نے قدم آگے بڑھایا۔ میرے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی آگے بڑھی۔ اسی وقت ایک برق رفتار کار نے تیزی سے موڑ کاٹا۔ میں ایک دم پیچھے ہٹا اور لڑکی نے گھبرا کے میرا ہاتھ تھام لیا۔ کار گزر گئی۔ ہم بچ گئے۔

وہ لڑکی شرمندہ سی ہو گئی۔ میں زیرِ لب مسکرایا۔ ہم دونوں نے سڑک پار کر لی۔ دو چار قدم چل کر مجھے احساس ہوا کہ لڑکی نے میرا ہاتھ ابھی تک نہیں چھوڑا۔ میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ ایسا لگا جیسے میرے دیکھنے پر اسے خیال آیا کہ وہ میرا ہاتھ چھوڑنا بھول گئی ہے۔ میں چلتے چلتے رک گیا۔ وہ بھی ٹھہر گئی۔

”ممنون۔“ میں نے مسکرا کے کہا، جیسے وہ نہیں گھبرائی تھی بلکہ میں ڈر گیا تھا۔

”خوش آمدید۔“ اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی، جیسے واقعی ایسا ہی ہوا ہو۔ ہاتھ پھر بھی نہیں چھوڑا۔

یا خدا! یہ کیا ماجرا ہے، یہ لڑکی ہاتھ کیوں نہیں چھوڑتی؟ مجھے ایسا لگا کہ اس لڑکی کو غلطی کا احساس ہو گیا تھا لیکن اب وہ اپنی غلطی کا لطف اٹھا رہی تھی۔ میں نے کہا، چلو یونہی سہی۔ اب میں نے گرفت مضبوط کی اور آگے چل پڑا۔ وہ بھی چل پڑی۔

میں نے ہاتھ تھامے تھامے اس کا جائزہ لیا، چوبیس پچیس سال عمر ہو گی۔ ایرانی روایت کے

مطابق کاٹن کا کوٹ چڑھایا ہوا تھا لیکن اس کے ساتھ جینز پہنی ہوئی تھی۔ بال اسکارف میں چھپے تھے لیکن سیاہ لٹیں ماتھے پر لہرا رہی تھیں۔ بڑی بڑی آنکھوں میں شوخی تھی۔ گلابی ہونٹوں پر تھوڑی مسکراہٹ تھی، تھوڑی فارسی۔ مجھے صرف مسکراہٹ کا مطلب آتا تھا۔

سو دو سو میٹر چلنے کے بعد اس نے ہاتھ چھڑایا اور بازو تھام لیا۔ ایرانی معاشرے میں اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ عوامی مقامات پر اکثر جوڑے باہوں میں باہیں ڈالے گھومتے پھرتے ہیں۔

آخر میں ایک ریسٹورنٹ کے سامنے رک گیا۔ اس کی طرف دیکھ کر بھنویں چکائیں۔ یعنی پوچھا، خانم کیا ارادہ ہے۔ خانم کا ارادہ نیک تھا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔

ریسٹورنٹ میں کھانا پینا تو بہانہ تھا، اصل بات تو یہ تھی کہ خانم سے گفت و شنید کرنی تھی۔ مجھے فارسی نہیں آتی تھی، اسے اردو یا انگریزی سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ ارے بھئی پھر ہم کیا باتیں کریں؟ تمھیں مجھ سے کیا دلچسپی؟ مجھے تم سے کیا لینا دینا؟

لیکن اگر ہم بیچ چوراہے ٹکرا گئے ہیں تو کوئی تو وجہ ہوگی۔ خانم تمھارا نام کیا ہے؟ فریبا؟ خوب۔ اپنا نام بتایا، ملک کا نام بتایا، کام بتایا، سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری۔

زبان سے بے شک کم گفتگو ہوئی لیکن آنکھوں نے بہت باتیں کیں۔ میں نے سر سے پاؤں تک پورا ایران جی بھر کے دیکھا۔ مس ایران نے بھی نقشے کے تمام خطوط خوب واضح کیے۔

معلوم ہوا کہ فریبا بی بی مطلقہ ہے اور اپنی بیوہ خالا کے ساتھ رہتی ہے۔ کسی لائبریری میں ملازمت کرتی ہیں۔ یہ جان کر اسے بہت خوشی ہوئی کہ جس غیر ملکی سے اتفاقاً ٹکر ہوئی ہے، وہ نویسندہ ہے۔

فریبا بی بی نے انار کا جوس ختم کرنے کے بعد دوبارہ میرا ہاتھ تھاما اور ہم پھر نکل کھڑے ہوئے۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئی جو پرانے مشہد کی صاف ستھری گلیوں میں سے کسی ایک گلی میں واقع تھا۔ اس نے اپنی بوڑھی خالا سے میری ملاقات کرائی، جنھوں نے فارسی میں نہ جانے کیا کیا باتیں کیں جو میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ فریبا نے ان کا آسان فارسی میں ترجمہ کیا لیکن وہ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ بعد ازاں جو واقعات پیش آئے، وہ فارسی نہ جاننے کے باوجود مجھے اچھی طرح سمجھ آئے اور ان کا ترجمہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

میں ایک ہفتے کے لیے مشہد گیا تھا اور اگلے چھ دن میں نے وہیں گزارے۔ اس عرصے میں مجھے

اس گھر میں کوئی مرد نظر نہیں آیا۔ میں فریبا سے پوچھنا چاہتا تھا کہ خانم، تمھارے ماں باپ کہاں گئے، دیگر رشتے دار کہاں ہیں، لاچھپیری کب جاتی ہو، کب آتی ہو، گزر بسر کیسے ہوتی ہے۔ یہ سب جاننا چاہتا تھا لیکن اس کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔

چھ سات دن ایسے گزر گئے کہ پتا ہی نہیں چلا۔ واپسی کا دن آیا تو اس کی آنکھوں میں اداسی کے ڈیرے نظر آئے۔ میرا دل بھی کٹ کے رہ گیا۔ میں اس شہر میں محبتیں کرنے تو نہیں آیا تھا۔ یہ میں کیا کر بیٹھا۔ دل میں اپنے آپ کو ملامت کیا اور اس کی آنکھیں پونچھ کے واپس چلا آیا۔

واپس آنے کے بعد میں نے فریبا کو بھلانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ہر دوسرے دن خواب میں وہی نظر آتی۔ یہ بھلا کیا بات ہوئی۔ وہ تو ایک عارضی ساتھ تھا، وہ تعلق ختم ہوا۔ بہت سے دن گزر چکے ہیں، وہ یقیناً اپنے حال میں مست ہوگی۔ وہ تو مجھے یاد بھی نہیں کرتی ہوگی۔ میں اسے کیوں یاد کروں؟

کئی سال گزر گئے، ایران کی یادیں مدھم پڑنے لگیں۔ میں نے کئی دوسرے ملکوں کے دورے کر لیے۔ کئی بار کمپنی نے بھیجا اور سال میں ایک بار بیوی بچوں کے ساتھ سیر کے لیے جاتا رہا۔ گزشتہ سال ہم دبئی گئے تھے، اس سے ایک سال پہلے تھائی لینڈ، اس سے ایک سال پہلے ملائیشیا۔

میں نے اس سال موسم گرما میں چھٹیاں نہ لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ بیوی بچوں کو سمجھایا کہ اس سال پیسے بچا لیتے ہیں، اگلے سال کسی یورپی ملک چلیں گے لیکن وہ نہ مانے۔ بچے تو مان جاتے لیکن اصل مسئلہ بیوی کی ضد کا تھا۔ ضد صرف یہ نہیں کہ چھٹیاں لینی ہیں بلکہ یہ بھی کہ ایران جانا ہے۔ مشہد مقدس جا کر امام علی رضا کے روضے پر حاضری دینی ہے۔ ضد کی وجہ یہ تھی کہ اس نے کوئی منت مان لی تھی۔ یہ خواتین منتیں بہت مان لیتی ہیں۔ وعدے خود کرتی ہیں، پورے ہم مردوں سے کرواتی ہیں۔

ایران ایئر کے طیارے میں بیٹھتے ہوئے پتا نہیں کیوں میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

مشہد ایئرپورٹ سے نکلتے ہوئے میں نے سیاہ شیشوں والا بڑا سا چشمہ چہرے پر سجا لیا۔ ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد باہر جھانکنے کے بجائے سر جھکا کے اپنے آئی فون پر گیم کھیلتا رہا۔

یہ جان کر مجھے تسلی ہوئی کہ ہمارا ہوٹل میدان طبرسی پر واقع ہے۔ خیابان شیرازی نادر شاہ کے مقبرے کی جانب ہے، وہ کوئی اور سمت ہے۔ ہمارا ہوٹل اس سے دور ہے۔ اچھی بات ہے۔ شکر ہے۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ حرم نہیں جاؤں گا، بازار رضا نہیں جاؤں گا، نمائش گاہ نہیں جاؤں گا۔ میری

بیوی دونوں بچوں کے ساتھ امام کے روضے کے چکر لگاتی رہی، میں ہوٹل میں بیٹھا فیس بک کھنگالتا رہا۔ بہت ہوا تو خیابان دانش گاہ جا کر کتابوں کی دکانوں کا معائنہ کرلیا۔ چار دن کی تو بات ہے، پلک جھپکتے میں گزر جائیں گے۔

جس رات ہماری واپسی کی پرواز تھی، اس سے چند گھنٹے پہلے میری بیوی کہنے لگی کہ اسے ایک ایرانی چادر چاہیے۔ میں نے کہا، میدان طبری سے حرم تک درجنوں دکانیں ہیں، کہیں سے بھی لے لو۔ وہ کہنے لگی، سب دکانیں دیکھ چکی ہوں، ویسی نہیں ملی جیسے مجھے چاہیے۔ کیا آپ بازار رضا لے چلیں گے؟

میں پریشان ہوگیا۔ ارے بھئی اتنا بڑا شہر ہے، ایک بازار رضا ہی رہ گیا ہے کیا؟ وہ مہنگا بھی بہت ہے۔ اور ہمارے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔ چلو ہم میدان طبری سے حرم کی طرف جانے کے بجائے مخالف سمت میں چلتے ہیں۔ ادھر بھی بہت سی دکانیں ہیں۔

یہ بات میری بیوی کو پسند نہیں آئی لیکن وہ میرے کہنے پر چلنے کو تیار ہوگئی۔ رمضان کی آخری تاریخیں تھی اور سڑک پر ایک اژدہام تھا۔ زائرین حرم کی طرف جا رہے تھے اور ہم دوسری جانب۔ دکانیں دیکھتے چلے، چلتے گئے، بڑھتے گئے۔ بیوی ساتھ ساتھ قدم بڑھاتی رہی۔ پہلے ایک موڑ آیا، پھر ایک چوراہا۔ اس کے بعد کی دکانیں بھی دیکھ لیں۔ میری بیوی کو مطلوبہ چادر نظر نہ آئی۔ اس کا موڈ آف ہوگیا۔ میں شرمندہ ہوگیا۔

واپسی کا سفر شروع ہوا۔ میں سوچنے لگا کہ بیوی کو بازار رضا لے جانا پڑے گا۔ سڑک پر رش زیادہ تھا، ہماری رفتار سست تھی۔ پہلے وہی چوراہا آیا، پھر موڑ آ گیا۔ تیز رفتار گاڑیاں سامنے سے زوں زوں کرتی گزر رہی تھیں۔ ایک بار سڑک صاف دیکھ کر میں نے قدم آگے بڑھایا۔ اسی وقت ایک برق رفتار کار نے تیزی سے موڑ کاٹا۔ میں ایک دم پیچھے ہٹا اور بیوی کو بچانے کے لیے جلدی سے ہاتھ تھام لیا۔ کار گزر گئی۔ ہم بچ گئے۔

میں نے بیوی کا موڈ اچھا کرنے کے لیے مذاق سے کہا، ”ممنون۔“

جواب ملا، ”خوش آمدید۔“

میں حیران ہو کر پلٹا، بیوی دونوں بچوں کے ہاتھ تھامے پیچھے کھڑی تھی۔

خانم نے میرا ہاتھ چھوڑ کے چہرے سے نقاب ہٹایا۔ وہ فریبا تھی۔

سعدیہ

ملبہ

کٹ کر گرنے والے شجر تلے دبے، آخری ہچکی لیتے ہوئے بوڑھے کی مثال چراغِ صبح کی پھڑپھڑاتی ہوئی لو کی سی تھی جس کو بچانے کے لیے مزدور "مدد مدد" پکار رہے تھے جسے سن کر آنے جانے والا ہر گاڑی سوار رُک کر وقوعہ کی نوعیت کا جائزہ لینے کے بعد ایک نظر ملبے کے ڈھیر اور پھر اپنے بغیر سلوٹ، اُجلے لباس کو دیکھ کر آگے بڑھ جاتا۔ معززین شہر کے نزدیک شاید بوڑھے کو بچانے سے بہتر بھی کئی کام ہوں گے جو ان کے اُجلے لباس کا بغیر شکن شرمگی کا سبب بنتے جب کہ غیر اہم آدمی اپنی فکر میں غلطاں آگے بڑھتے گئے۔ کون جانے یہ زرد رنگت، پپڑی جمے ہونٹوں، گرد سے اَٹے سفید بالوں اور دبلے پتلے جسم والا لاغر بوڑھا، ستم رسیدہ حالات کے ہاتھوں وقت سے پہلے ہی بُڑھاپے کی بھٹی میں جھونک دیا جانے والا کل کا بچہ اقبال تھا جو چند دھندلی یادوں کی رہنمائی میں بیتے ہوئے بچپن کی طرف لوٹنے کی کوشش کر رہا تھا جو تیسری جماعت کی آخری رو میں میلی وردی پہنے بیٹھا ہر دفعہ پلک جھپکنے کے بعد فوراً ماں کی طرف اِس شک سے دیکھتا کہ کہیں وہ چلی نہ گئی ہو۔ یوں وہ چھٹی تک ماں کو کلاس کے باہر بٹھائے رکھتا۔ وہ بھی عجب نادان تھی سب گرہستی چھوڑے، بیٹھی اقبال کا انتظار کیا کرتی۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے اقبال ضرورت سے زیادہ لاڈ اٹھواتا، اُس کا جی ہرگز پڑھائی میں نہ ٹھہرتا۔ وہ بضد رہتا کہ جب تک چھٹی کی گھنٹی نہیں بج جاتی ماں بھی اُس کے ساتھ سکول میں بیٹھے۔ یوں اُس کی ضد کے ہاتھوں مجبور ماں سکول کی ہی ہو کر رہ گئی--- وہ پہلے درجے سے تیسرے تک تو پہنچ گیا لیکن پہلے دن والی ضد برقرار تھی۔

وہ تیسرے درجے میں ہی پڑھ رہا تھا جب سردی گرمی میں تھڑے پہ بیٹھ کر انتظار کرنے والی ماں شدید نمونیا میں مبتلا ہو کر چل بسی۔ اقبال نے اُکھڑے ہوئے پلستر والے خالی تھڑے کے پاس کھڑے ہو

کر ماں کو اُس حسرت وشدت سے یاد کیا کہ مردہ ماں نمودار ہو گئی۔ ماں کی صورت دیکھتے ہی اقبال تیسری جماعت کا ننھا بچہ بن گیا اور بے قراری سے پیار بھرے شکوے کرتے ہوئے ماں کو اپنے مسائل اور مشکلات سے آگاہ کرنے لگا جو وہ اب تک ماں کے بغیر جھیل چکا تھا۔ وہ ماں کو اُس کے ہم عصروں کی رودادیں بھی سناتا رہا۔ وہ سمجھ نہیں پارہا تھا کہ کون سی بات ماں کو ابھی سنائے اور کون سی پھر کے لیے اُٹھا رکھے۔ شاید کوئی پختہ وہم اُس سے سب کچھ اُگلوا رہا تھا کہ آئندہ کبھی وہ ماں سے دوبارہ مل نہیں پائے گا لہٰذا اُسے اپنی باتوں میں یوں اُلجھائے رکھے کہ مبادا وہ چلی جائے! افسوس۔۔۔ کسی بے رحم ہتھوڑے کی کاری ضرب نے کافی زیادہ اینٹیں ایک ہی وار میں تھڑے پر گرا دیں جن کی دھول سے اس کی آنکھیں اَٹ گئیں۔ آنکھیں مل کر دھول صاف کرنے تک ماں، اقبال کا درد اپنے بے تار دامن میں سمیٹے، بنا کچھ کہے، اوجھل ہو چکی تھی۔ ماں کی ہمدردی حاصل کرنے سے محروم اقبال آج ساٹھ برس پہلے ماں کے چلے جانے سے زیادہ دکھی ہوا اور وہیں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر خود کو تسلی دینے لگا۔

پسینے میں شرابور ایک مزدور باہر جانے والے راستے کے اوپر گولائی میں سفید پتھر پر کندہ ”گورنمنٹ پرائمری سکول“ اور ”علم بڑی دولت ہے“ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا جس کے نیچے اقبال کا باپ اِس وعدے کے ساتھ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں تھا کہ باپ اس کے لیے میٹھی گولیاں اور چورن لا کر اُسے باقی بچوں سے پہلے گھر لے جائے۔ اقبال یہ محسوس نہیں کرتا تھا کہ ماں کے چلے جانے کے بعد بڑھتی ہوئی ذمے داریوں نے باپ کو کتنا کمزور کر دیا تھا، چناں چہ وہ کسی سہمے ہوئے پرندے کی طرح اُس کے ساتھ چمٹا روزانہ کہا جانے والا جملہ دہرائے جا رہا تھا کہ اگر باپ اُسے گھر لے جائے تو وہ کبھی ضد نہیں کرے گا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر وہ اکیلا گھر گیا تو اُسے ہیڈ مسٹرس باجی صوفیہ جو سفید برقعہ پہنتی تھی اور بلاوی کے ساتھ جا کر گھر گھر سے بچوں کو نکالتی تھی، اُسے بھی کسی گلی سے واپس موڑ لے گی۔ اُس کی آنکھوں میں ہیڈ مسٹرس کا پُرنور سراپا اُتر آیا جنھیں بچے، جوان اور بوڑھے احتراماً باجی صوفیہ کہا کرتے۔ وہ باجی صوفیہ ہی تھی جس نے نہ صرف اپنی محنت سے خریدی گئی جگہ سکول کے لیے وقف کر کے اس پر عمارت بھی کھڑی کی بلکہ نئی نسل کے سامنے آنے والے وقت کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے، بغیر کسی لالچ کے گھر گھر سے بچوں کو اکٹھا کر کے اُنھیں علم کی حکمت سے روشناس کرانے کا بیڑہ بھی اُٹھایا ہوا تھا۔ وہ باجی صوفیہ کے خیالوں میں ہی گم تھا کہ اُسے خیال آیا کہ جس جگہ وہ کھڑا تھا وہاں سے بائیں جانب، دو گز کے فاصلے پر ہی دفن کیا گیا تھا جہاں روزانہ صبح ہر طالبِ علم ضرور حاضری دے کر فاتحہ خوانی کرتا۔ اُس نے دل ہی دل باجی صوفیہ کی مغفرت کے لیے دعا کی اور آگے بڑھنے کو ہی تھا کہ ننھے اقبال نے ایک دفعہ پھر اُس کی اُنگلی تھام لی۔ اقبال اپنی ضد پوری نہ ہونے پر ناشتہ کیے اور خرچ کا ایک آنہ لیے بغیر ہی سکول آ گیا تھا اور باپ ایک کے بجائے دو آنے

ہاتھ میں لیے لڑکھڑاتے ہوئے اُس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اقبال لکڑی کے بڑے سارے پھاٹک کے پیچھے چھپ کر باپ کی پریشانی کا تماشا دیکھنے لگا۔ جب اُس نے پھاٹک کے پیچھے سے باہر جھانکا تو منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ پھاٹک کے اوپر کی دیوار تقریباً گرائی جا چکی تھی۔ ”علم بڑی دولت ہے“ شاید آج اقبال کی سمجھ میں آ رہا تھا جب وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوا زمین پر بکھرا پڑا تھا۔

باجی صوفیہ کی محنت کا ثمر گورنمنٹ پرائمری سکول کی عمارت پرانی ہو کر اِس قدر خستہ ہو چکی تھی کہ خدشہ درپیش تھا کہ اگر اُسے گرایا نہ گیا تو کسی روز خود ہی ڈھے کر نقصان کا باعث ہو گی۔ اِس سکول کا پرانا طالبِ علم ہوتے ہوئے اقبال پہلے تو گرتی ہوئی عمارت کو باہر سے ہی دیکھتا رہا لیکن جیسے ہی دیواریں گریں اور راستہ بنا تو وہ یادوں کی اُنگلی تھامے نیم مسمار شدہ عمارت کے اندر چلا آیا۔ ایک ایک سے وابستہ یاد نے اُسے اپنی گود میں سمیٹ لیا۔ وقت کا پہیہ اس تیزی کے ساتھ اُلٹے چکر میں گھوما کہ سیاہ پتھر سے بنی، بل کھاتی ہوئی سیڑھیوں سے گر کر نیچے آتی ننھی نزہت اُس کے قدموں کے پاس آ کر رکی۔ پورے سکول میں حکم لاگو تھا کہ تفریح کے وقت ہر بچہ اپنی تختی چھوٹی چھپڑی پر دھوئے گا۔ یہ چھپڑی استعمال شدہ پانی کے نامناسب نکاس کی وجہ سے وجود پا رہی تھی۔ اقبال اپنی تختی کو پہلے ہی سے املا لکھنے کے لیے اُجال کر سیڑھیوں کی دھوپ میں سُکھا رہا تھا جب نزہت چمکتی ہوئی تختی لے کر سیڑھیاں چڑھی اور اقبال کے پاؤں سے ٹھوکر کھا کر اِس بُری طرح بے وزن ہوئی کہ احاطے میں جا کر رُکی جس سے اُس کا دایاں بازو ٹوٹ کر لٹک گیا۔ خود پر ندامت کرتا اقبال اُسے اُٹھانے کے لیے زمین پر جھکا تو چھت کا ایک بڑا حصہ عین اقبال سے چند قدم پر آن گرا۔ ٹھیکے دار نے غصے میں اونچی آواز لگائی:

”بزرگو! یہاں سے ہٹ جائیں اور ہمیں اپنا کام کرنے دیں۔ کیوں اپنی جان کے دشمن ہوئے ہیں؟“

اقبال شرمسار سا عمارت کی پچھلی طرف چلا گیا جہاں تفریح میں بچے ککلی اور شٹاپو کھیلنے میں مصروف ہوتے اور کچھ بچے چھپن چھپائی بھی کھیلتے اور جو ایک مرتبہ چھپ جاتا اُسے ڈھونڈنا ناممکن ہوتا۔ اِسی دوران میں تفریح کا وقت ختم ہو جاتا اور بلاوی زور زور سے سیٹیاں مارتے ہوئے کھیل کے میدان میں پہنچ جاتی، جو بچہ بھی اُس کے قریب ہوتا اُسے دو تھپڑ مار کر اُسے فوراً اپنی جماعت میں پہنچ جانے کا حکم سنا دیتی۔ اقبال جیسے ہی کھیل کے میدان میں پہنچتا، اُسے بلاوی کے ڈر سے بھاگتے ہوئے اپنی جیب میں رکھے سکے کے گر جانے کے خیال کے ساتھ ہی مرتے ہوئے بہروپیے کو بچانے کی فکر لاحق ہو جاتی۔ جمعرات کو بھی آدھا دن ہوتا اور چھٹی کی گھنٹی کے ساتھ ہی بہروپیا بوتل کے جن کی طرح کسی نئے بہروپ میں دل دہلا دینے والی چیخ کے ساتھ نمودار ہو جاتا تو تمام سکول اُس کی جانب کھنچنے لگتا۔ خون کی دھار اُس کے ماتھے سے پھوٹ کر چہرے سے

گردن کی جانب سانپ کی طرح رینگ رہی ہوتی۔ وہ بچوں کے دائرے میں گول گول گھوم کر ہر کسی سے ملتجی نظروں سے مدد کی فریاد کرتا۔ خون میں لت پت بہروپیا جس بچے کے بھی پاس جاتا وہ خوف زدہ ہو کر چند قدم پیچھے ہٹ جاتا تو بہروپیا گول دائرے کے عین وسط میں کھڑے ہو کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے زوردار چیخ سے فریاد کرتا۔ کسی نے اُسے بولتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ وہ اپنا مدعا اشاروں کنایوں اور مختلف قسم کی آوازوں سے بیان کرتا۔ جب مدد کے لیے کوئی تیار نظر نہ آتا تو وہ مایوس ہونے لگتا۔ ماتھے پر خون کی لکیر جم جاتی۔۔۔۔ اور اس سے بھی کہیں تیز دھار سر کے عین وسط میں سے فوارے کی طرح پھوٹ پڑتی جسے دیکھتے ہی بچے خوف زدہ ہو کر بھاگنے لگتے اور چھوٹے بچے گلے پھاڑ پھاڑ کر رونے لگتے۔ اردگرد کھڑے بچوں کا خوف وہراس دیکھ کر بہروپیا بھی پریشان ہو جاتا اور جیسے ہی لہو کی دھار کو انگلیوں سے چھوتا تو مزید کچھ دیکھنے کی تاب نہ لاتے ہوئے تھر تھر کانپتے ہوئے زمین پر ڈھیر ہو جاتا اور چند سیکنڈ تڑپنے کے بعد جان دے دیتا۔ بہروپیے کے مرتے ہی میدان میں گہرا سکوت چھا جاتا۔ ہر کوئی نظروں میں سوال لیے ایک دوسرے کو دیکھنے لگتا اور خالی کشکول میں پھینکا جانے والا پہلا سکہ اپنی جھنکار سے سناٹے کے خوف کو ختم کر دیتا۔ اس کے بعد کشکول سکوں کی لگاتار جھنکار سے گونجتا رہتا۔ چھن چھن کی آواز جیسے جیسے بہروپیے کے کانوں سے ٹکراتی، اس کی سانسیں بحال ہونے لگتیں اور اس کے مردہ جسم میں زندگی جاگنے لگتی۔ وہ باری باری اپنی آنکھیں کھول کر دائیں اور بائیں طرف کھڑے لوگوں کا جائزہ لیتا اور پوری طرح زندہ ہو جانے کے بعد اُسی طرح اچانک غائب ہو جاتا جیسے نمودار ہوا تھا۔

اقبال جان گیا تھا کہ مردہ بہروپیے میں زندگی صرف سکوں کی کھنک سے ہی لوٹائی جا سکتی تھی چناں چہ وہ ایک سکہ ہمیشہ سنبھال کر رکھتا۔ اُسے سکہ کھو جانے سے زیادہ پریشانی بہروپیے کی موت کی تھی۔ وہ مٹی میں ہاتھ مار مار کر سکہ ڈھونڈنے لگا کہ خشک جوہڑ پر نیم دائرے میں بیٹھے تختیاں اور سلیٹیں صاف کرنے والے بچے اُسے حیرت کے ساتھ دیکھنے لگے۔

مٹیالے پانی میں سیاہی اور ملتانی مٹی کی دھاریاں جھیل میں دریا کے پانی کی طرح تھیں۔ وہ گندے پانی میں ہاتھ ڈبو کر وقت کی گرد کو دھو ڈالنے کی غرض سے خشک چھپڑی کے کنارے پر آن بیٹھا۔ اس نے چھپڑی کی پیاس بجھانے کے لیے نلکے کی ہتھی اوپر اُٹھائی تو وہ بے جان پرندے کی طرح نیچے آن گری۔ چند قدم کے فاصلے پر درخت کے نیچے کھڑی اس کی جماعت کی اُستانی مس مریم کی دل فریب مسکراہٹ اُسے اپنی اور کھینچنے لگی۔ وہ لگاتار مسکرائے جا رہی تھی۔ اقبال اُس کے دھیان کی بے دھیانی میں چلتے ہوئے نلکے سے ٹکرا گیا جس پر مس مریم نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور قہقہے کے زیر و بم اس کے بدن سے اُبھرنے لگے۔ اقبال حیرت زدہ، دم سادھے اس کے حسین سراپے میں کھو گیا۔ اس کے اندر ایک

عجیب ہیجان برپا ہونے لگا۔ مس مریم اطمینان سے ہاتھ باندھے، درخت کے ساتھ ٹیک لگائے، بے خبر مسکراتی رہی کہ آرے سے کٹے درخت کو مضبوط رسوں کی مدد سے گرایا جانے لگا۔

اقبال تو گرتے ہوئے تنے سے ٹیک لگائے، مسکراتی ہوئی مس مریم کو بچانے کے لیے آگے بڑھا تھا!

☆☆☆☆

سلمیٰ اعوان

الیگزینڈر پُشکن مالداویائی ''ساشا'' سے ملاقات

اس اپارٹمنٹ کی کونسی چیز ایسی تھی جو اپنی تاریخی حیثیت میں کم قیمتی ہونے کے باعث کمتر توجہ کے قابل تھی۔ شاید کوئی بھی نہیں۔ پھر میں نے اس کمرے میں کیوں ڈیرہ لگا لیا تھا جو اُنکی خواب گاہ تھی اور جہاں نتالیا کا دلکش پورٹریٹ اور تصویریں آویزاں تھیں۔

کوئی چہرہ اس ظالمانہ حد تک بھی خوبصورت ہوسکتا ہے۔ جیسا دیواروں پر ٹنگا ہے۔ میری آنکھوں کی ایکس رے مشین اسکے ایک ایک نقش کی باریکی میں اتری تھی۔ اسکے بالوں کے براؤن سنہری شیڈ نے بے اختیار ساحلوں پر ڈوبتے سورج کے شفق رنگوں کی مجھے یاد دلائی تھی۔ یہ فنکار کے نوک برش کا مبالغہ ہر گز نہیں تھا۔ وہ ایسی ہی تھی۔ ماسکو اور دارالحکومت پیٹرزبرگ کی کورٹ سوسائٹی کی سب سے زیادہ زبان زد شخصیت۔

یہ رُوس کے بے بدل عظیم قومی شاعر اور نثر کے بڑے لکھاری الیگزینڈر سر گیوچ پشکن {Aleksandr Sergeevich Pushkin) کا گھر تھا ویسے تو دراصل یہ جگہ شہزادی والکنو سکایا کی ملکیت تھی۔ پر زارشاہی کیطرف سے پشکن کو رہائش کے لیے عنایت ہوئی تھی۔ یہاں اُس نے اپنی زندگی کا ایک سال گذارا۔ اس کی موت کے بعد اسے میوزیم بنا دیا گیا۔

بڑی تھوڑی سی زندگی۔ 25 مئی 1799ء کی پیدائش اور 10 فروری 1837ء کو وفات۔ درمیانہ مختصر سا وقت ہنگاموں، باغیانہ سرگرمیوں، بغاوتوں، رومانوں اور تخلیقی کاموں میں بسر ہوا۔

''کیٹس کی طرح بھلا اتنی کم عمر کیوں لکھوا کر آیا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا''۔

ہماری واپسی اب سر پر تھی سات دنوں کا ہواؤں میں اُڑتے ہوئے پتہ بھی نہ چلا تھا۔ اور ابھی تک اسے دیکھا نہیں گیا تھا۔ پشکن میوزیم نہ دیکھا جاتا تو میرے لیے آگرہ پہنچ کر تاج محل نہ دیکھنے والی بات ہو

جاتی تھی۔ جو مجھے قطعاً قبول نہ تھی۔ پس بھاگی۔ الیگزینڈر رکالم کے پاس مویا کا نہر کے کنارے پر خوبصورت سہ منزلہ اور دو منزلہ عمارتوں کے حصار میں گھری نمبر بارہ کے سامنے جا رکی۔

میں نے پُشکن کو نہیں پڑھا تھا۔ جب رُوس کے لیے تیاری کے مراحل میں تھی ذوالفقار تابش ایک دن فون پر تھے۔ تابش صاحب میرے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ محبت سے گویا ہوئے۔

”تم نے کن کن رُوسی لکھاریوں کو پڑھا ہے“۔

جنہیں پڑھا تھا گنوا دیا۔ سوال ہوا۔ پُشکن نہیں پڑھا۔ میں کتاب بھیج رہا ہوں۔ اُسے پڑھے بغیر نہ جانا۔

سچی بات ہے میں ممنون بھی ہوئی اور دعا بھی دی کہ چلو میرا ایک عظیم شاعر سے ابتدائی تعارف تو ہوا۔ ظ انصاری صاحب کا منظوم ترجمہ بھی کمال کی چیز تھی۔

بلند و بالا براؤن محرابی دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ تو ایک شاہانہ عظمت کا پَرتو ہر سو بکھرا ہوا نظر آیا تھا۔ یہ میوزیم دوستووسکی سے بہت مختلف تھا۔ محرابی صورت والے برآمدوں سے آگے وسیع لان جس میں گول چبوترے پر کھڑا پُشکن دراصل اپنی عظمت کے بلند مینار پر کھڑا ہے جسکا اعتراف اس کی موت کے بعد ہوا۔

شاعر اپنے ددھیالی حوالے سے رُوسی اشرافیہ کی اونچی کلاس سے تعلق رکھتا تھا۔ ماں ایتھوپیا کے ابرام پیٹرووچ ہنی بال کی نواسی تھی جسے افریقہ میں اغوا کر کے قسطنطنیہ لایا گیا اور عثمانی سلطان نے اسے پیٹر اعظم کو تحفے کے طور پر بھیجا۔ پیٹر اعظم کو اپنا یہ خادم بے حد پسند تھا۔ اُس کی شادی خاص طور پر منصب دار گھرانے میں کی گئی۔

میں اُس وقت ڈرائینگ روم میں تھی۔ آسمانی رنگ کی دیواروں والا کمرہ جسکا سامان آرائش بے حد سادہ اور مختصر تھا۔ دیوار پر پُشکن کا پورٹریٹ سجا ہوا تھا۔

اُلجھے اُلجھے گنگھریالے بال موٹی آنکھیں اور موٹے ہونٹ رخساروں پر پھیلی پر ٹھوڑی پر سمٹی ہوئی داڑھی۔ پشکن اپنے افریقہ سے تعلق پر ہمیشہ نازاں رہا اور جب کبھی بھی اس کا سانولا رنگ اس کی گرم مزاجی اس کی باغیانہ طبیعت اور خود سری زیر بحث آئی اُس نے ہمیشہ مسرور لہجے میں کہا۔

”مجھے اپنے مشرق سے تعلق پر فخر ہے۔ اور افریقیوں سے مجھے قلبی محبت ہے“۔ اور اس کا اظہار اس کی شاعری میں کہیں کہیں پر کہانیوں اور تاریخی ناولوں میں خاصی مقدار میں ہوا۔

کمرے میں رکھی میزوں پر خوبصورت شمع دان، ٹیبل لیمپ اور اُس کی شاعری کے دستی نمونے سجے تھے۔

جس ماحول میں اُس نے آنکھ کھولی تھی وہ گھر بھی علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ اُس کا چچا شاعر، اُس کی

پھوپھیاں ادب شناس اور اُس کے گھر میں اُس وقت کے رُوسی ادب کے مایہ ناز ادیبوں جن میں نکولالیا کرامزن Nilolai Karmzin اور ویسلے زلو سکائے۔

Vsily Zhulov Sky کا کثرت سے آنا جانا تھا۔ اُس کے باپ کے گھر کی الماریاں اگر فرانسیسی ادب سے مالامال تھیں تو جس گھر میں اُس نے اپنی آخری سانسیں لیں وہاں بھی فرنچ لٹریچر کثرت سے تھا۔

میں اُس وقت اُس کے سٹڈی روم میں تھی۔ جہاں سبز دیواروں کی چھتوں کو ہاتھ لگاتی الماریاں پاؤں سے سر تک انتہائی قیمتی کتابوں سے سجی ہوئی تھیں۔ دراصل اُس کی پرورش جس ماحول میں ہوئی اس میں فرانسیسی کلچر اور ادب رُوسی کلچر اور ادب کے ساتھ بُہت نمایاں تھا۔ اُس کے گھرانے کے بچوں کے لیے نوکر چاکر اگر دیہاتوں سے آتے تو ایک اتالیق کا فرانسیسی ہونا بھی ضروری تھا۔ یقیناً یہی وجہ تھی کہ وہ بُہت چھوٹی عمر میں سترھویں اور اٹھارویں صدی کے فرانسیسی ادب سے روشناس ہو چکا تھا۔

اُس کی میز پر کاغذ پڑے تھے۔ بڑا خوبصورت ٹیبل لیمپ سجا ہوا تھا۔ ایک جانب کتابوں کا ڈھیر تھا۔ ایش ٹرے، ڈیکوریشن پیس اور بڑے خوبصورت پیپر ویٹ تھے۔ کُرسی کا رُخ ذرا سا ٹیڑھا تھا یوں جیسے کوئی لکھتے لکھتے کسی کام سے اٹھ کر باہر چلا جائے۔ وہ بھی تو شاید ہی اُٹھ کر باہر گیا تھا اور پھر اس کُرسی پر دوبارہ بیٹھنا نصیب نہ ہوا تھا۔

اُس کی پیدائش ماسکو کی تھی۔ ابھی بھی اس کے والدین اور رشتہ داروں کی تصویریں دیکھتی ہوئی باہر آئی تھی۔ باپ سرجی لیوووچ Lvovich اگر اپنی ظاہری ہیت میں رومانوف کے زبردست زاروں جیسا تھا تو ماں نادیزدا ہنی بال بالشت بھر لمبی گردن پر ٹکے خوبصورت چہرے والی متکبر اور نخوت پسند عورت نظر آتی تھی۔ یوں عملی زندگی میں وہ تھی بھی ایسی ہی۔ بچوں سے لاپروا اور لاتعلق سی۔ پشکن کی شاعری میں ماں کا ذکر نہیں۔ ہاں البتہ اپنی آیا سے محبت کا کئی بار اظہار ہے۔

اس شرارتی ضدی اور ہٹ دھرم سے بچے کو گیارہ سال کی عمر میں سکول کے جس بورڈنگ ہاؤس میں بھیجا گیا۔ وہ الیگزینڈر اوّل نے روس کے اعلیٰ طبقے کے بچوں کے لیے Tsarkoye Selo میں امپریل لائسیم کے نام سے قائم کیا تھا۔ پُشکن منفرد اور مشکل بچہ تھا۔ رُوسی اور فرانسیسی لٹریچر میں اس کی کارکردگی بہت نمایاں تھی۔ باقی مضامین میں بس گذارہ تھا۔

اُس کی شاعرانہ صلاحیتوں نے بھی اسی عمر میں پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے تھے۔ یہاں اُس کا ہدف اُس کے ناپسندیدہ ہم جماعت اُستاد خاص طور پر مذہبی تعلیم اور سرکاری کارندے بنتے مگر اس قیام نے اُسے ذہنی اور فکری بلوغت بھی دی۔

صرف سولہ سال کی عمر میں اُس نے رُوسی اشرافیہ کے ایک بڑے اجتماع میں اپنی نظم سنائی۔ داد سمیٹی اور لوگوں نے یک زبان کہا۔ ’’مستقبل میں روس کا عظیم شاعر ہوگا۔‘‘

’’رِپن‘‘ کی یہ پینٹنگ میں نے بڑے کمرے میں دیکھی تھی۔ کرسیوں پر بیٹھے عمر رسیدہ اُدھیڑ اور نوجوان مردوں عورتوں کا ایک ہجوم ایک طرف دھری میزوں کے آگے کرسیوں پر بیٹھے غالباً جج صاحبان اور عین درمیان میں نوخیز سا لڑکا ہاتھ اٹھائے نظم پڑھتا ہوا۔ کس غضب کا انداز تھا۔

نپولین کا رُوس پر حملہ آور ہونا اور اُس کا شکست کھانا۔ فوجی جوانوں کا سکول کے دیوار کے پاس سے مارچ کرتے اور ترانے گاتے ہوئے گذرنا اور اُس کا انھیں دیکھنا اُس کی اوائل عمری کے وہ نقش تھے کہ جن کی کیفیات کے عکس اُس کی آئندہ شاعری میں نمایاں ہوئے۔ اسی طرح یورپ سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ترقی پسند خیالات کے ساتھ واپس آ کر مجلسوں اور محفلوں میں لیکچر دینا، مباحثے اور مذاکرے کرنا اور اس کی اِن میں مسلسل شرکت نے اُس کے فکری شعور کی تربیت کی۔

میوزیم کے کمروں کے دروازے اندر ہی اندر ایک دوسرے میں کھلتے چلے جاتے تھے۔ کہیں بچوں کے کمرے، کوئی نشست گاہ تو کوئی نتالیا کا ڈریسنگ روم۔ کمروں کا جداگانہ رنگ وروپ انھیں انفرادیت دینے کے ساتھ ساتھ جمالیاتی ذوق کا بھی حامل تھا۔

تھوڑی سی دیر کے لیے برآمدے میں پڑی بینچ پر بیٹھی تو پُشکن کی زندگی کے کچھ نئے پہلو سامنے آ گئے تھے۔ ملازمت سرکاری ملی اور اونچی بھی تھی۔ رئیسانہ ٹھاٹ باٹ تو پہلے ہی تھے۔ یہ دور مکمل لہو ولعب اور عیاشیوں میں گذرا۔ ناچ گانے، تھیٹر جوئے بازی، شراب نوشی، مذہب اور حکومتی اراکین پر طنز و مذاق تو خیر عام سی باتیں تھیں۔

جلد باز بھی تھا اور جذباتی بھی۔ ذرا سی بات پر گولی سے فیصلہ کرانے پر مصر ہو جاتا۔ اس کے احساسات وجذبات کی بے باکی نے جنس، رومان اور سیاست پر اُس کی خوبصورت طبع آزمائی کو بطور ایک رومانی شاعر کے اُسے اہم کیا۔

اُس کی طویل بیانیہ نظم ’’رُسلان اور لُدمیلا‘‘ روسی معاشرے کی ایک فوک عشقیہ داستان منظر عام پر آئی۔ تین ہزار مصرعوں کی اس نظم نے روسی شاعری کو نئے رنگ وآہنگ سے سجا کر دنیا کی ترقی یافتہ شاعری کے مقابلے پر کھڑا کر دیا تھا۔

پھر ایک حیرت انگیز اور عجیب سی بات ہوئی بے حد عجیب۔

کوئی تیس (30) بتیس (32) کے دائرے میں گھومتی ایک قدرے فربہی مائل جسم کی دراز قامت لڑکی میرے پاس آ کر رُکی۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور دو سوال پوچھے۔ پہلا سوال تو چلو سیاحوں

سے ہر کوئی پوچھنے کا حق رکھتا ہے کہ آپ کہاں سے ہیں؟ لیکن دوسرے سوال نے مجھے حیرت کے سمندر میں پھینک دیا تھا۔ میں اس کا چہرہ دیکھتی تھی کہ آخر اس درجہ باریک بینی سے اُسے میری حرکات کا مشاہدہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

میں نے مسکراتے ہوئے اُس کا بازو پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھایا اور کہا۔

تاریخ میں اپنا نام بڑے آدمی کے طور پر لکھوانے والے لوگوں کے محبوب یا ان کے زوج کے بارے میں جاننے کا بالعموم فطری تجسس ہر کسی کو ہوتا ہے۔ نتالیا کی تصویروں کے سامنے دیر تک کھڑے ہونے کی وجہ یہی احساس اور یہی فطری تجسس تھا۔

”خبیث عورت“۔

اُس نے ہونٹ سکوڑے اور ایک ایسے لہجے جس میں دُکھ گھلا ہوا تھا بولی۔

ایسے بے مثال شاعر جس نے تھوڑے سے وقت میں رُوسی ادب کو اتنی بے شمار جہتیں دیں۔ اس کی بے وفائی اور کٹھورپن کی بھینٹ چڑھ گیا۔ یوں اگر وہ اس کے عاشق جارج دی انتھیس کے ساتھ ڈوئل میں اُس کی گولی کا نشانہ نہ بھی بنتا تب بھی ایک دن اس نے مرجانا تھا۔ بس یہی ایک دو سال اور جی لیتا۔ گھٹن اور پریشر نے اس کا سینہ پھاڑ دینا تھا۔“

میں بٹر بٹر اس کا چہرہ دیکھتی تھی۔

ایسی شُستہ انگریزی بولتی تھی کہ اپنے نو دن کے قیام میں ایک دن بھی اتنا رواں لب ولہجہ سننے کو نہ ملا تھا۔ وہ مالداویا کے دارالخلافہ کیشینیف (Kishinev) کی ساشا تھی جو لندن کی کسی یونیورسٹی میں رُوسی ادب پڑھاتی تھی۔ ان دنوں پیٹرز برگ آئی ہوئی تھی۔ اور اس ٹورسٹ گروپ کی منتظر تھی جس نے دو بجے میوزیم پہنچنا تھا۔ پُشکن کی سچی عاشق۔

میں گُنگ سی بیٹھی اسے تھا حیرت سے دیکھتی تھی۔ مغربی پہناوے میں لپٹی اس لڑکی کے اندر کیسی مشرقی روح تھی۔ ایسے خیالات و احساسات تو ہم تیسری دنیا کی عورتوں کے ہوتے ہیں جنہیں بڑا دقیانوسی کہا جاتا ہے۔

محبت کے خمیر میں گندھی ساشا کی قربت مجھے اس سردی سرزمین پر بہار کے کسی معطر جھونکے کی مانند محسوس ہو رہی تھی۔

اس کی Ode To Liberty پڑھی ہے آپ نے؟ ساشا نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

دراصل اس کی یہی نظم اُس کی جلاوطنی کا باعث بنی تھی۔ اس نظم میں زار رُوس ”الیگزینڈر اول“ کے

اس ظلم وزیادتی پر بھر پور احتجاج اور دکھ کا اظہار تھا جس کا وہ اپنے والد پال اوّل کو قلعہ میخائلو-کائے میں دھوکے سے قتل کرنے کا مرتکب ہوا تھا۔

پر یہ جلاوطنی بڑی نعمت ثابت ہوئی تھی۔ رُوس کی جنوبی ریاستوں کوہ یورال کوہ قاف کی وادیوں بحیرہ ارل اور بحیرہ کیپسین کے ساحلی علاقوں نے اس کے مشاہدے، اس کے تجربے اور انسانی فطری رویوں کے مطالعے نے اس کے علم میں اضافہ اور تخلیقی کام میں رنگ بھرا۔ ترکوں، چرکسوں، تارتاریوں، جارجیائی اور کاکیشیائی قبائل کے لوگوں سے میل جول اور جنوب کے علاقائی حسن، سادگی اور تصنع سے پاک ماحول اس کی شاعری پر کئی جہتوں سے اثر انداز ہوا۔ اس دور کی شاعری پر لارڈ بائرن کا بھی اثر ہے۔ "Sea" اس کی واضح مثال ہے جہاں وہ بائرن کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اُس کے دنیا سے جانے پر افسردہ ہے۔

“The Caucasian Captive” کوہ قاف میں رہنے والے قبائل چرکسوں اور کاکیشیوں کے ایک روسی قیدی کی زبان سے اُن کے رہن سہن، اُن کی دلیری شجاعت، اُن کے گھوڑوں کے اوصاف، انکی مہمان نوازی کا ذکر کرتے ہوئے وہ رُوس کے جیالے سپہ سالاروں کو بھی خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ جنھوں نے ان قبائل کے ساتھ سرحدی لڑائیوں میں داد شجاعت دی تھی۔

مستی سلاف کہ جب روسی فوج ماری گئی تھی اور وہ تن تنہا لڑا اور فتح یاب ہوا۔

اس کے لہجے کا فخر اور غرور بہت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے روس کا دو سر والا عقاب سے سجا پرچم فضا میں لہرایا تو ہم کس قدر مُسرور اور سُرخرو تھے۔

روسی جرنیل سیسیانوف کا ذکر کرتے ہوئے بھی اس کا انداز اسی تفاخر میں ڈوبا ہوا ہے کہ جب شمالی قازقستان کے تیریک دریا کے پانی لہو بن گئے تھے۔ اُن چٹانوں اور پانیوں پر سیسیانوف کی پیشانی کی چمک تھی۔ روسی جرنیل یرمولوف کے بارے میں لکھتے ہوئے قازق لوگوں کو خبردار کرتا ہے۔

”ذرا سن اے قازق یرمولوف آتا ہے۔“

مجھے ہنسی آ گئی تھی۔ کتنا مانوس سا یہ فقرہ تھا۔ میں نے ساشا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

ساشا مجھے تمہارے اِس فقرے سے اپنے لوگ یاد آ گئے ہیں جو اپنے اپنے سیاستدانوں کے لیے کہتے ہیں۔

ذرا ٹھہرو قاضی حسین آتا ہے۔ ذرا سُنو نواز شریف آتا ہے۔ ذرا سُنو بے نظیر آتی ہے۔

ساشا کِھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ اس کی ہنسی مجھے باغیچے میں سبز گھاس پر بکھری دھوپ کی مانند خوبصورت لگی تھی۔

پُشکن یوں بھی یرمولوف کا بہت مداح تھا کہ وہ زارِ روس کا مخالف اور دسمبر کے باغیوں کا حامی

تھا۔

ان لوگوں کے شب وروز کی پُشکن ایک ایسی تصویر پینٹ کرتا ہے کہ ان کی معاشرت کے سبھی رنگ، ان کی فکری سوچ اور علاقے کا حُسن وروپ یوں سامنے آتا ہے کہ قاری خود کو کسی گرفت میں لینے والی فلم کے سامنے محسوس کرتا ہے۔

یہی صورت The Gypsies میں ہے۔ بلقان کے خانہ بدوشوں کی زندگی کی ایک سچی تصویر جس کے مرکزی کردار شہری مردالیکو بسرابیہ (بلقان کا ایک علاقہ جس پر روسیوں اور ترکوں کی لڑائی ہوتی رہی) کی زیمفیرا اورا۔ کا بوڑھا باپ جسے سنتے ہوئے مجھے احساس ہوا تھا کہ خانہ بدوشوں کے فطری احساسات وجذبات سرحدوں سے اور فاصلوں سے کتنے بلندوبالا ہیں۔ بنجارے ہمارے ہاں بھی ایسے ہی ہیں۔ شاعر نے کیسی سچی ان کی عکاسی کی ہے کہ ایک تابناک تصویر سامنے آ گئی ہے۔

باغیچہ سرائے The Fountain Of Bakhchisarai کی اس طویل نظم میں شاعر کا تاریخ پر گہرا مطالعہ، عمیق مشاہدہ اور ذاتی تجربہ بہت شدت سے نظر آئے۔ روس کے جنوب کی وہ ریاستیں جن پر کبھی تاتاریوں کے جھنڈے لہراتے تھے۔ اور چنگیز خان کے پوتے کے گولڈن ہورڈ (فوجی لشکر) یوکرائن، ماسکو، ہنگری اور پولینڈ تک کے علاقوں کو روندتے پھرتے تھے۔

نظم میں حرم کی عورتوں کی زندگی، ان کے نفسیاتی وجذباتی مسائل، خواجہ سراؤں کے کردار، سلطان کا حرم کے اندر زندگی گزارنے کا ڈھنگ، تاتاری گیت، ان گیتوں کے کردار زریمہ جو جارجیا کی فتح کے بعد سلطان کے حرم میں داخل ہوئی اور پولینڈ کے شہر باغیچہ سرائے کی شہزادی ماریا جسے تاتاری خان اپنا دل دے بیٹھا تھا۔ شاعر نے کس کمال سے منظر کشی کی تھی کہ ایک ایک منظر اپنی چھوٹی چھوٹی جزئیات کے ساتھ سامنے آتا تھا۔

اس طویل نظم کا وہ حصہ بہت خوبصورت ہے جہاں تاتاریوں کے عروج وزوال کی داستان کو اختتام پذیر کرتے ہوئے ان کے ویران محلوں، افسردہ باغوں اور قبرستانوں کے ساتھ ساتھ اس فوارے کا بھی ذکر ہے۔ جو شہزادی ماریا کی یاد میں تاتاری خان نے بنایا تھا۔ فوارے کے اوپر ہلال اور صلیب ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ اُس کا نام محل کی عورتوں نے ”آنسوں کا فوارہ“ رکھ چھوڑا تھا کہ باغیچہ سرائے کی شہزادی وہاں بیٹھ کر اپنے محبوب کی یاد میں رویا کرتی تھی۔

ساشا نے کتنے خوبصورت انداز میں اُس کی شاعری کے چند اہم شہ پاروں کو بیان کیا تھا۔ سُن کر مزہ آیا تھا۔

"Prophet" بھی ایک شاہکار مختصر نظم ہے۔ دیکھیے رُوح کی تشنگی سے ہلکان شاعر کو چھ پروں

والے فرشتے نے اپنی سُبک انگلیوں سے چھو کر اس کا سینہ چاک کر کے کیسے اس میں سچ کہنے کے انگارے بھر دیئے ہیں۔

’’سنوزرا‘‘۔

میرے دل کی جگہ شُعلوں جیسے انگارے رکھ دیئے گئے ہیں۔ آگ بھڑکی۔ سینہ پھٹا۔ کوئی لاش جیسے ویرانے میں پڑی ہو۔ اور پھر کہیں کوسوں دُور سے کسی غیبی آواز کی پکار۔ کہا گیا۔ اپنا سر اٹھا۔ آنکھیں کھول کہ تو پیغمبر ہے اور میری رُوح تیرے اندر ہے۔ میرا پیغام سُنا کہ سوئے ہوئے لوگ جاگ اٹھیں۔

سچی بات ہے میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا تھا۔ پیغمبروں پر نزول کی ساری کیفیات سامنے آ گئی تھیں۔

ان نظموں کی نغمگی۔ معنوی خوبصورتی۔ حددرجہ دلکشی۔ اشعار کا توازن اور تناسب ان کی جامعیت اور بندش۔ اس کی چار مصرعوں کے بند والی نظمیں رُوسی زندگی کی حقیقی ترجمان بن گئی تھیں۔ فطرت کے عناصر ہوا، سُورج، روشنی، اندھیرا زندگی کے ہنگامے اور حقیقتیں اس کی شاعری کے وجود میں یوں گُھستی تھیں جیسے انسان کے وجود میں سانس۔ شہرت کا ہما سر پر بیٹھ گیا تھا۔

اس کی شاعری کے حسن میں نئے رنگ بھرنے میں ان ذی علم منچلوں کا بھی ہاتھ ہے جو اپنے حقوق کے لیے جلوس نکالتے، ہڑتالیں کرتے اور زار کے خلاف سازشوں کے جال بُنتے رہتے۔

دسمبر 1825ء کی انسانی حقوق کی تحریک (دسمبرسٹ موومنٹ) کے حامیوں کے جلوسوں پر جب گولیاں چلیں۔ گرفتاریاں ہوئیں۔ باغی سولیوں پر چڑھائے گئے۔ بے شمار جلاوطن ہوئے۔ جانتی ہو۔ ساشا نے میری طرف دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے عقیدت و محبت کا ایک سمندر نظر آیا تھا۔

اُن کی زبانوں پر اس کے اشعار تھے۔ اُن کے سامان میں پُشکن کے خطوط تھے۔

میں ایک ٹک اس کے چہرے اور اس کے ہونٹوں کو ہلتے دیکھتی تھی۔

’’سُنو‘‘۔

اُس نے گنگنانا شروع کیا اپنی لے میں وہ گنگناتی چلی گئی یہ سوچے بغیر کہ مجھے روسی نہیں آتی۔ شاید اُسے جلد ہی احساس ہو گیا تھا۔

’’اوہ‘‘ وہ انگریزی بولنے لگی تھی۔

سائبیریا کے جنگلوں، بیابانوں میں تمہارے دل اور عزائم بلند رہیں۔ تمہاری قید کے مہیب غاروں میں میری آواز تم تک ہر صورت پہنچے گی۔ تمہاری یہ آہنی بیڑیاں اور تمہارے زندان کی تیلیاں ایک دن ٹوٹ جائیں گی اور وہ صبح طلوع ہوگی کہ جب تمہارے ہم وطن تمہیں خوش آمدید کہیں گے۔ یہ ایک نئی صبح ہوگی جس کا

تمہیں انتظار ہے۔

مجھے فیض یاد آیا تھا۔ اور میری آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

"پُشکن نے بہت سارے عشق کیے تھے" ابھی اتنا ہی بول پائی تھی۔

اس کے لہجے میں تیزی تھی۔ اس نے میری بات کاٹ دی تھی۔ "شاعر تو ہوتا ہی عشق کرنے کے لیے ہے۔ لڑکیوں اور عورتوں کا اس سے اور اس کی شاعری سے عشق بہت ضروری ہے۔ یہ عمل نہ ہو تو اکثر تخلیق کے سوتے نمو نہیں پاتے۔ تمہارے ہاں شاعر سے عشق نہیں کیا جاتا۔"

"بنیادی طور پر تو دنیا کے ہر خطے کے انسان اپنی نفسیات اور جبلّت میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ کم و بیش ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ دیس کے شاعروں کی لمبی قطار آنکھوں کے سامنے آ گئی تھی۔"

"مجھے دیکھو ساشا میری آنکھوں میں جھانکو میں اس کے عشق میں گرفتار ہوں۔ تمہارے ساتھ بیٹھی باتیں کرتی ہوں۔ تمہارے لیے نہیں اپنی تسکین کے لیے۔"

پُشکن نے اپنی جلاوطنی کا زمانہ مالدوایا میں گزارا۔ تین چار سال۔ اس نے ہم لوگوں سے محبت کی۔ ہمارے اوپر لکھا۔ ہماری تہذیبی زندگی اور کارناموں کو اپنی شاعری میں سمو کر اسے عام کیا۔

کیشنیف میں لینن سٹریٹ پر وہ خوبصورت سفید بڑا سا گھر ابھی بھی ہے جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ کیکرا اور لائم کے درختوں سے سجی سڑک پر میرے نانا کے گھر سے تھوڑی ہی دُور ایک ہزار سال پُرانے پتھر کا محرابوں والا پھاٹک ہے جس پر تُرکوں سے چھینی ہوئی توپوں سے ایک گھنٹی بنا کر لگائی گئی ہے۔ اس کے پاس ہی واقع پارک میں جب بھی شام کو کھیلنے جاتے۔ میں اس ستون کے پاس ہمیشہ رُکتی۔ اس پر نصب مجسّمے کو دیکھتی اور اپنی بڑی بہن سے پوچھتی۔ جو مجھے بتاتی۔ یہ بہت بڑا شاعر ہے۔ ہمارا شاعر

یہ الیگزینڈر پُشکن ہے۔

مالداویائی لوگ پُشکن سے بہت پیار کرتے ہیں۔

رُوسی لوگوں اور ان کے کلچر سے محبت بھی اُنھیں پُشکن کی وجہ سے ہے۔

پھر ساشا نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اٹھا کر اس کمرے میں لے گئی جہاں ٹی وی پر اس کی زندگی کی ڈاکومنٹری چل رہی تھی۔ ہم دونوں میٹ پر بیٹھ گئیں۔ میں نے دیوار سے ٹیک لگائی تھی۔

سکرین پر میرے سامنے پسکوف کا شہر آیا۔ اس شہر کا گاؤں میخائلوفسکو ے اس کی خاندانی جاگیر پہ بنا ہوا وہ گھر جہاں وہ عظیم شاعر رہتا تھا۔

دوسری جنگ عظیم میں نازیوں نے اِس علاقے کو تباہ کر دیا تھا۔ رُوسی کلچر کی سب یادگاریں ملیامیٹ ہو گئی تھیں۔ ساشا نے مجھے بتایا۔ جنگ کے فوراً بعد حکومت نے محفوظ خاکوں کے مطابق گھر دوبارہ

اسی انداز میں تعمیر کیا۔ پُشکن کی آیا آرینا رودیونوونا کے گھر کو بھی ٹھیک کیا گیا۔ سوویت حکومت نے ہر اُس یادگار کو محفوظ کیا جو کسی نہ کسی حوالے سے شاعر سے متعلق تھی۔ دونوں گھر سکرین پر میرے سامنے آئے۔ یہاں اُس نے قیدِ تنہائی کاٹی تھی۔ سخت سردیوں میں برف سے ڈھپنے راستے اور گھر کی کھڑکیوں دروازوں سے جھانکتی تنہائی اُداسی اور ویرانی کے گمبھیر سے تاثر نے مجھے افسردہ کر دیا تھا۔

"سویتا گورسک" کی خانقاہ میں شاعر کی قبر پر ہر سال لگنے والے میلے کی جھلکیاں تھیں۔ لوگوں کا ہجوم بے کراں تھا۔ ان کی محبتوں اور چاہتوں کے اظہار تھے۔

"تو آؤ پھر مینا و ساغر کی بات کریں۔"

جب وہ Tsarkoye Selo میں زیرِ تعلیم تھا پیلس کے شاہی باغوں میں بہت سی لڑکیوں سے اس کی دوستی تھی۔ وہ اپنی نظمیں انہیں سناتا اور مُسکراتے ہوئے کہتا۔

"صرف تمہارے لیے۔"

بحیرہ کیپسین کے ساحلی حصوں جارجیا پاکیشیا، یورال کے پہاڑی سلسلوں قازقستان میں اپنے قیام کے دوران یہاں کی توبہ شکن حسن کی مالک عورتیں اس کی کمزوری بنیں۔

کارولینا سوبیز کائے کمال کی خوبصورت عورت تھی۔ عمر میں اُس سے بڑی تھی۔ ذہین۔ حسین اور عیّار۔ دھڑلے نخرے نخرے اور شاعرانہ ذوق کی حامل۔ اُس کی شاعری کی نزاکتوں اور باریکیوں کو سمجھنے والی۔

پشکن بھی اس کی ذہانت اور رسیلی آواز کا شیدائی تھا۔ جارجیا کو روسی گروزین کہتے ہیں اپنی ایک نظم میں گروزینی حسینہ کو مخاطب کرتے ہوئے اُس نے جس دل پذیر انداز میں اُس کے حسن، اس کے گروزینی گیتوں اور ان میں چھلکتے اپنے گھر سے دور ایک انسان کے احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ وہ اپنی مثال آپ تھا۔

نائٹ اور Beneath the blue sky of her native land وہ اکثر اُس سے فرمائش کر کے سنا کرتی۔

اینا کیرن بوڑھے جرنیل کی بیوی Amalia Riznich کسی بڑے تاجر کی بیوی۔ اینا اولینیا اینا وولف بے شمار عورتوں کا وہ شیدائی اور بے شمار عورتیں اس پر عاشق۔

پُشکن انسانوں کو سمجھنے میں تیز تھا پر عورتوں کو سمجھنے میں بودا۔ اِن ڈھیر ساری عورتوں میں سے کسی نے بھی اُس سے بےلوث اور دل و روح کی سچائی سے پیار نہیں کیا تھا۔ سوائے اینا وولف کے۔ پر مصیبت تو یہ تھی کہ شاعر اُس کے لیے جذبوں کی وہ شدت محسوس نہیں کرتا تھا۔ گو اس نے کچھ وقت اس کے ساتھ ضرور

گذارا۔

کونٹس علیزہ وورونسوطر حدارا اور خوبصورت ہی نہ تھی اوڈیسہ کے گورنر کی بیوی بھی تھی۔ اور گورنر کو اس کے معاشقے کا علم ہو گیا تھا۔ تو عتاب کا گولہ برسا۔ اوڈیسہ سے اُس کا اخراج ہوا بہت سارے الزامات کے ساتھ۔ جن میں بدچلنی بھی ایک تھا۔ سرکاری ملازمت ختم۔ زار نے اُسے میخائلوفسکوئے پر نظر بند کر دیا۔

رشتے دار تو پہلے ہی نالاں تھے۔ ماں باپ کے ساتھ تعلقات بھی خوشگوار نہ تھے باپ اس کی باغیانہ سرگرمیوں پر ہمیشہ سے تشویش اور فکر میں مبتلا رہتا تھا۔ بیٹا شاہی اشرافیہ میں اس کے لیے باعث فخر بننے کی بجائے شرمندگی اور ذلالت کا موجب بن رہا تھا۔ زار بھی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کے باپ کو تاکید کی گئی تھی کہ بیٹے پر کڑی نظر رکھے، اس کی ڈاک کھولی اور پڑھی جائے اور جہاں روکنے والی ہو، روکی جائے۔ ایک بدنام سی کہانی اس پیرائے میں بھی مشہور ہو گئی تھی کہ اُس نے اپنے باپ کو مارنے کی کوشش کی۔

خاندان کا متفقہ فیصلہ تھا کہ اُسے جاگیر پر تنہا چھوڑا جائے۔ شاید خاندان کا یہ بائیکاٹ اور انتہائی قدم اُسے راہ راست پر لے آئے۔ پورا خاندان نومبر کے وسط میں سٹیٹ سے چلا گیا اور پُشکن وہاں صرف آیا آرینا کے ساتھ رہ گیا۔

پر وہ بھی شاعر تھا اور شاعر بھی خداداد۔ حالات کا ہر تازیانہ اس کی شاعری کے لیے مہمیز ثابت ہو رہا تھا۔

سرکاری نگرانی اور بغیر اجازت کے باہر نہ جانے کی سزا نے اُسے ٹک کر بیٹھنے اور نامکمل کاموں کی تکمیل کی مہلت دی۔ ''ایوگے نی انے گن Eugene Onegin'' کا پورا خاکہ ترتیب دیا گیا۔ بلکہ تین چار باب مکمل بھی کیے۔

اُس کی خاندانی آیا آرنیا (Arina Rodionovna) کی شفقت اور پیار نے اُس پر عام رُوسیوں کی سادہ دلی، محبت، ہمدردی اور ممتا کے نئے رنگ وا کیے اس پر اس طبقے کی وہ خوبیاں آشکارا ہوئیں جن سے بالائی طبقہ محروم تھا۔

آرینا نے پُشکن کو زمانوں پرانی وہ فوک کہانیاں سنائیں جو حکمت و دانائی سے پُر اور زندگی کے تجربے سے گندھی ہوئی تھیں۔ یہ وہی تھی جس نے اس نوع کی زندگی کے احساسات سے اُسے روشناس کیا اور اس کی جھلک اس کی بہت سی نظموں میں ظاہر ہوئی۔

آرنیا پُشکن کی کئی حماقتوں اور غلطیوں کو چھپا جاتی۔ ممتا کی چھاؤں میں اس کی پریشانیوں کو سمیٹ لیتی۔ ''Winter evening'' میں وہ اُسی سے مخاطب ہے۔

محبت اور عقیدت کی ایک اتھاہ ہے اُس کے لہجے میں جب وہ کہتا ہے۔

’’جام کا پیالہ اٹھا اور میرے ساتھ پی کہ تو مجھ جیسی دکھی جوانی کی ساتھی ہے۔ آ کہ ہم اپنی تلخیاں اس جام میں گھول لیں۔ مجھے ننھی چڑیا کا گیت سنا۔ مجھے اُس لڑکی کا گیت سنا جو بہت سویرے پانی بھرنے جاتی ہے۔‘‘

برسات اور خزاں دونوں موسم اُسے بہت بانٹ کرتے تھے۔ برسات جب گلیاں اور سڑکیں کیچڑ سے لت پت ہوتی تھیں اور خزاں جب انگور پکتے تھے۔

پھر دوستوں کی کوششوں سے ماسکو واپسی ہوئی۔ یہ چھ سات سال اس کی ادبی زندگی کا عروج تھے جس میں اُس نے رزمیہ شاعری کی ’’ایو گے نی اُنے گن Eugene Onegin‘‘ منظوم ناول میں فکر وسوچ اور بیان کی دلکشی و بےساختگی نے رُوسی شاعری کو مالا مال کر دیا۔ رُوسی تاریخ کا ایک اہم واقعہ پلتاوا بھی جب منظوم صورت میں منظرِ عام پر آیا تو قدامت پرست روسی بھی پُشکن کی شاعرانہ عظمت کا معترف ہوا۔

The Bronze Horse man کو بھی تنقید نگاروں نے اُس کا شاہکار کہا ہے۔

ساشا بولے چلی جاتی تھی اور میری نگاہیں جو سکرین پر جمی تھیں دل جمعی سے وہاں اُسے دیکھ نہ پاتی تھیں۔ روس کی ایلیٹ کلاس کے مجمع میں شاعرانہ کلام سناتے ہوئے قدیم کلاسیکل سٹائل کے کپڑوں میں ملبوس یہ تصویر بھی کسی کمرے میں دیکھی تھی۔ ماسکو کا وہ گھر جہاں وہ پیدا ہوا۔ سکول جہاں اُس نے پڑھا۔ اُس کے ڈھیروں ڈھیر انداز۔

یہاں رُوس میں اُس نے نتالیا کو دیکھا۔

نتالیا گنچارووا۔ نتالیا گنچاروا کے نام نے مجھے بھی چونکایا تھا۔ میں ٹی وی چھوڑ کر یکسوئی سے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ اسی قدر خوبصورت تھی جتنا ایک شاعر اپنی شاعری میں حسن کے کلڑے باندھ سکتا ہے۔ سولہ سال کی بالی عمر کی چنچل وشوخ وشنگ لڑکی جس کے حسن اور اداؤں کی رُوس کی ایلیٹ کلاس میں دھوم مچی ہوئی تھی۔

اب پُشکن کی شادی کی تفصیلات ہوں۔ ساشا اُس کی عاشق صادق ہو اور مجھ جیسی سیاح عورت ہو جسے بہر حال ایک بڑے انسان کی زندگی کے اس پہلو سے انتہائی دلچسپی تھی۔ خود ہی جان جائیے کہ سُننے اور سُنانے میں شوق ومستی کا کیا عالم ہوگا۔

یہ کس قدر دلچسپ بات ہے کہ اس کی محبت کا آغاز اگر نتالیا کے نام سے ہوا تو اختتام بھی نتالیا کے نام سے ہو رہا تھا۔

’’نتالیا میرے دل میں ہی نہیں دماغ میں بھی گھس گئی ہے۔‘‘ اس نے اپنی ساس کو لکھا تھا۔

سُسرال کو شادی کی ذرا جلدی نہیں تھی۔ ان کے مطالبات بھی بے شمار تھے اور تحفظات کی بھی لمبی لسٹ تھی۔ گو باپ نے بولدی نو کی جائیداد اس کے نام کر دی تھی۔ شاہی ملازمت بھی مل گئی تھی کہ شہرت بطور شاعر مسلّمہ ہو چکی تھی۔ کتابوں کی آمدنی بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ پر زندگی میں میانہ روی اور اعتدال نام کی کوئی چیز تھی ہی نہیں۔

شاعر کا دل بُری طرح اس پر آ گیا تھا۔ اُس کے لیے وہ کسی دیوی کا روپ دھار گئی تھی۔

’’میڈونا‘‘ میں وہ اُسی سے مخاطب ہے۔

’’کاش میں نتالیا ہوتی۔ اور پُشکن نے وہ نظم میرے لیے لکھی ہوتی۔‘‘ ساشا ہنستے ہوئے بولی تھی۔

میں بھی ہنس پڑی تھی اور میں نے کہا تھا۔

’’جو تمہیں پیار کرتا ہے اُسے پُشکن جیسا ہی سمجھو۔‘‘

’’ذرا سنو۔‘‘

اس کی تشنہ سی آرزو سامنے آتی ہے۔ ’’کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ میں اپنا گھر بھی بناؤں گا اور پرانے شاہکاروں سے اسے سجاؤں گا۔‘‘

’’اونیگن‘‘ میں اُس کی دلی خواہش کُھل کر سامنے آتی ہے۔

’’اب میرا مطمع نظر گھر والی ہے۔ میری سب سے بڑی تمنا پُرسکون زندگی اور گوبھی کے سوپ کا پیالہ ہے۔‘‘

ساشا کی آنکھوں میں اترتی نمی مجھ سے پوشیدہ نہ رہی تھی۔

’’میڈونا‘‘ میں اُس نے نتالیا کے حسن کو حُسن مریم سے تشبیہ دی اور پاکیزگی مسیح ابن مریم جیسی چاہی۔ نظم میں اُس کا یہ اظہار کہ اس کی تخلیق اس خوبصورت رنگ و روپ کے ساتھ خدا نے بنائی ہی اُس کے لیے ہے۔ خوبصورتی اور رعنائی کے اس مجسمے کو وہ اپنے گھر میں دیکھنے کا خواہشمند ہے کہ جس کے ریشے ریشے میں اُس کی مشقت گھلی ہوئی ہے۔

دل کھول کر اُس نے دلہن اور سُسرال کی خواہشوں کو پورا کیا۔ شادی 1831ء میں جس شاہانہ انداز اور کرّ وفر سے ہوئی اُس نے اُسے ساٹھ ہزار روبل کے قرضے کے نیچے دبا دیا تھا۔

’’پر دیکھو‘‘

ساشا رُک گئی تھی۔ میری آنکھیں تجسس کی لَو سے دہکتی اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ چند لمحے ایک پُراسراری خاموشی میں لپٹے گذر گئے۔

شادی سے قبل وہ مضطرب سا تھا۔ بے چین سا عجیب سے جذبات و احساسات کی یلغار کی زد میں

آیا ہوا جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

"کیا یہ انتہائے مسرت ہے۔" اس نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

"ہاں نہیں شاید۔"

اس نے باری باری تینوں جواب خود کو دیئے۔ پر پھر بھی کہیں اضطراب تھا۔

اور شادی سے اڑتالیس گھنٹے قبل وہ تانیہ کے پاس گیا جس کا خانہ بدوشوں سے تعلق تھا۔

"تانیہ کچھ گاؤ۔ کوئی ایسی چیز جو میرے لیے خوش قسمتی کی تعبیر ہو۔ تم جانتی ہو میں شادی کر رہا ہوں۔"

تانیہ کی خوبصورت غزالی آنکھوں میں گذرے دنوں کے خوبصورت عکس جھلملائے۔ بغیر ایک لفظ بولے وہ اٹھی اس نے کتیارا اٹھایا۔ قالین پر بیٹھی۔ تاروں سے نکل کر جو گیت فضا میں بکھرا، اس میں حُزن وملال کا وہ رچاؤ تھا جس نے ساری فضا کو پل جھپکتے میں غمناک کر دیا۔ شاعر نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا اور کسی چھوٹے سے بچے کیطرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

تانیہ کی آنکھیں بند تھیں۔ لمبی گردن پورے وقار سے کھڑی تھی گیت کا حُزن اور شاعر کی سسکیاں پورے ماحول پر پھیلی ہوئی تھیں۔

"آہ" بہت دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور کہا۔ اس گیت نے مجھے ختم کر دیا۔ یہ کسی بڑے صدمے کی پشین گوئی ہے خوشی کی نہیں۔

میں عجیب سے سحر میں گرفتار اُسے سُنتی تھی۔

اور جب تقریب عرُوسی میں ایک دن باقی تھا۔ اس نے اپنے دوستوں سے کہا۔

"تو آؤ کہ میرے ساتھ مل کر میرے کنوار پنے کی زندگی کو دفن کرو۔"

اور اس کے گھر ے درجن بھر دوست اکٹھے ہوئے اور چاہا کہ محفل موج و مستی ہو۔ پر حیرت زدہ ہوئے کہ وہ کیسی اذیت میں ہے۔

اپنی جوانی کو، اپنی آزادی کو، الوداع کہنے کے لیے اس نے اپنی نظم میں سے چند اشعار پڑھے۔

"میں موت کب چاہتا ہوں مجھے تو زندگی کی آرزو ہے۔ میں غم سے آگاہ ہوں اور فکر و پریشانی سے بھی میرا تعلق ہے۔"

ایسے اشعار جیسے وہ جوانی کو رخصت نہیں کر رہا تھا بلکہ زندگی سے رخصت لے رہا تھا۔ جیسے وہ نئی زندگی کو نہیں بلکہ موت کو خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ جیسے آج کے بعد اس کی زندگی میں کل نہیں ہوگا۔

اور میز کے گرد بیٹھا اس کے دوستوں کا ٹولہ دہشت زدہ سا اُسے دیکھتا تھا۔ اور پھر اس نے روندھے گلے اور بھرائی آواز میں انہیں خدا حافظ کہا اور اپنی منگیتر سے ملنے چلا گیا۔

میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ میں اس کمرے میں نہیں تھی۔ اور یقینا ساشا بھی نہیں ہوگی۔ زمان و مکان کے فاصلے سمٹ چکے تھے۔ اور وجود وقت کی اس ٹنل میں داخل ہو چکا تھا۔ جہاں دو صدی قبل کا دورانیہ متحرک تھا۔

یہ اٹھارہ فروری 1831ء کا سرد برفیلی کٹیلی ہواؤں کے جھکڑوں میں جھولتا جھومتا دن تھا۔ پشکن کی شادی کا دن۔ مذہبی رسوم کی ادائیگی ماسکو کے چرچ Ascension میں ہو رہی تھی۔ ماسکو کی ایلیٹ کلاس چرچ میں اس اتنی شاندار شادی اور اخراجات کے تخمینوں پر تبصروں اور حاشیہ آرائیوں میں مصروف تھی۔ زرق برق گاؤن پہنے اور منقش ٹوپیاں اوڑھے داڑھیوں والے پادری منتظر تھے۔

دلہن کی آمد، اس کا شاہانہ عروسی لباس، روشنیوں کا سیلاب اور گیتوں کی آوازیں سنہری کارپٹ پر چلتی دلہن کی تمکنت، حسن اور بانکپن اتنا بھرپور تھا کہ وہ مسکرایا۔ اپنی گردن کو اکڑایا سینے کو اوپر اٹھایا اور اپنی قامت کو لمبا کیا کہ دلہن اس سے لمبی تھی۔

سٹیوارڈ نے تقریباتی کراؤن ان کے سروں پر رکھے اور پادری نے انھیں زندگی اکٹھے گذارنے کے دعائیہ جملے کہے۔

اور جب انگوٹھیاں پہنائی جا رہی تھیں۔ اچانک ایک آرائشی سنگار پٹی فرش پر گری۔ خود کو اس سے بچانے کے لیے وہ جھکا۔ رحل سے ٹکرایا۔ صلیبی مجسمہ اور گوسپل ایک بھدی آواز سے گرے اور پشکن کی کینڈل بجھ گئی تھی۔

شاعر کھڑا ہوا۔ چہرے پر پیلاہٹوں کی زردی کے ساتھ۔ ڈوبتی شکستہ آواز اس کے ہونٹوں سے نکلی۔

“All the bad omens”

ناتالیا سے شادی پر وہ خوش تھا۔ گو شادی مسائل کے انبار لیکر آئی۔ غیر معمولی شخصیت غیر معمولی عزم و حوصلہ والا۔ جی داری سے کھڑا رہا جم کر کام کیا۔

”انچار“ بھی ایک شاہکار نظم ہے۔ سلطنتوں کی ریشہ دوانیاں بے رحمی۔ سرحدوں کی وسعتوں کے لیے انسانوں کا قتل۔

”انچار“۔ ”پریشانی“ اور ”پشیمانی“ تخلیق ہوئیں۔

اس نے نثر، ڈرامہ، تنقیدی مضامین اور ادبی اخبار (لترا تورنایا گزیتا جو آج بھی شائع ہو رہا ہے) میں لکھا اور خوب لکھا۔ “Poet” جو زمانے کے چلن، لوگوں کے اطوار، حسد، جلن، جیسے رویوں پر مشتمل ہے جنہیں وہ بخوبی سمجھتا ہے اور خود سے کہتا ہے کہ تیرا مطمئن اور ثابت قدم ہونا ضروری ہے۔ ہجوم کی فکر نہ کر۔ واہ واہ کے نعروں پر نہ جا۔

اِسی دوران اس نے نکولائی گوگول کی کہانیوں کے مجموعے

پر بُہت سے تنقیدی مضامین لکھے اور انہیں اپنے رسالے The Contemporary میں شائع کیا۔ مشہور زمانہ ڈرامہ Boris Godunov بہت پہلے کے لکھے ہوئے پر نظر ثانی کی۔ اور چھاپا۔ "The Stone Guest" ڈرامہ بھی بہت مقبول ہوا۔

نتالیا کو دراصل یہ احساس ہی نہیں تھا کہ جس نے اُسے پسند کیا، اُسے چاہا اور اپنی شریک زندگی بنایا وہ کیا ہے۔ مہنگے ترین ملبوسات، منفرد جیولری، اپنے گرد عاشقوں کا ہجوم اور عیش وعشرت سے لبریز زندگی اس کا منتہا تھا۔

1831ء میں شادی ہوئی اور 1835ء تک وہ چار بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ ماریا الیگزینڈر، گریگوری اور نتالیا۔ آغاز کا کچھ وقت اس نے پُشکن کی جاگیر پر گذارا۔ کیپٹل پیٹرزبرگ میں آنے کے بعد اس نے باقاعدگی سے کورٹ سوسائٹی میں جانا شروع کر دیا۔ مداحوں اور عاشقوں کا ہجوم اس کے گرد اکٹھا ہوگیا تھا جن میں زار نکولس اوّل سرفہرست تھا۔ اُسے نفرت تھی زار سے "Cloud" میں بادل کے استعارے میں اس نے زار کو ہی مخاطب کیا تھا۔

یہ شب و روز چکّی کے ان دو پاٹوں کی طرح تھے جن میں وہ پس رہا تھا۔ زار نکولس کی طرف سے ملنے والا کورٹ ٹائٹل بہت توہین آمیز تھا جس نے اُسے غضبناک کیا۔ پر نتالیا کا رویہ اس سے بھی زیادہ توہین آمیز تھا۔

ابھی اس پر ہی اکتفا نہ تھا کہ دارلحکومت کی فضاؤں میں نتالیا کے ایک نئے سکینڈل کی افواہیں اڑیں۔ یہ فرنچ نوجوان جارج ڈی اَنتھیس (George d' Anthes) حسن و جوانی اور وجاہت کا دلآویز نمونہ جسے ڈچ سفیر ہیکرن نے اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا۔

"The Gypsis دی جپسیز" کے کردار اگر حقیقی تھے تو الیکو کا کردار اس کا تخلیق کردہ تھا۔ رُوسی شہری مرد۔ خانہ بدوش زیمفیرا کی ماں تاریکی میں جب اس کے باپ کو چھوڑ کر اپنے کسی آشنا کے ساتھ چلی جاتی ہے تو شاعر کہانی کے ہیرو الیکو کی زبان سے زیمفیرا کے باپ بوڑھے خانہ بدوش سے کہتا ہے کہ تم نے اس درندے کا پیچھا کیوں نہ کیا۔ دونوں کو گولی کیوں نہ ماری۔ بوڑھے کا جواب اس کے من کو نہیں لگا تھا جب اس نے کہا۔

"محبت پر تو کوئی اختیار نہیں اور جوانی آزاد ہوتی ہے۔"

جب زیمفیرا بھی کسی اور کے ساتھ دل لگاتی ہے اور رات کی تاریکی میں اپنے عاشق سے ملنے جاتی ہے تو الیکو دونوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے کہ محبت میں کیسی شراکت داری؟

تو وہ بھی الیکو ہی تھا۔ جوش غضب اور رقابت سے بھرا ہوا۔

”تو پھر آؤ۔ ڈوئل لڑتے ہیں۔“ اس نے للکارا۔

یہ خوفناک اور شدید قسم کی ڈوئل تھی۔ بڑا اعلی نشانہ باز تھا۔ وہ تو چھوٹی چھوٹی شرطوں کا فیصلہ گولیوں سے کرنے کا عادی تھا اور ہمیشہ جیتا تھا۔

”تو پھر کیا ہوا؟ وہ زندگی سے کیسے ہار گیا؟“

میرا اپنا لہجہ گلوگیر سا تھا۔

”جو دل سے ہار جائیں۔ زندگی بھی انھیں ہرانے پر تل جاتی ہے۔“

اس کا تو غیض و غضب اسے اٹھا کر لے گیا تھا۔ ورنہ وہ تو ہارا ہوا تھا۔

شدید زخمی تھا۔ لوگ اٹھا کر اسی گھر میں لائے۔ اور پورا پیٹرزبرگ اس گھر پر ٹوٹ پڑا تھا۔ لوگ مشتعل تھے۔ گلیوں اور سڑکوں پر ماتم کی کیفیت میں تھے۔ غضبناک تھے۔ موت کی خبر کو دو دن تک چھپایا گیا۔ دو دن بعد بھی ہجوم اتنا بپھرا ہوا تھا کہ آدھی رات کو خاموشی سے میت گورسک مناسٹری میخائلوفسکائے کے نزدیک اس کی ماں کے پہلو میں دفن کے لیے لے جائی گئی۔

بہت دیر تک ہم چپ چاپ بیٹھے رہے تھے۔ نتالیا کے بارے میں میرے پوچھنے پر ساشا نے کسی قدر تلخی سے کہا تھا کوئی پانچ چھ سال تو زار نکولس اوّل کی باقاعدہ رکھیل رہی۔ پھر کہیں پیٹرو وچ لینسکوئے سے ملی۔ زار کی مکمل آشیرباد کے ساتھ اس سے شادی کی۔ دو بیٹیوں کی ماں بنی۔ 1863ء میں فوت ہوئی۔

”ساشا نے وقت دیکھا۔ جن لوگوں کی وہ منتظر تھی وہ آنے والے تھے۔ ہم دونوں اکٹھے کھڑے ہوئے۔ میں نے اس کے سینے پر بوسہ دیا اور ملال گھلی آواز میں کہا۔ ساشا میرے پاس الفاظ نہیں جو تم جیسی پیاری لڑکی کا شکریہ ادا کریں۔ اگر کبھی کہیں پاکستان کا نام پڑھو تو اپنے آپ سے ضرور کہنا کہ اس دیس میں تمھیں یاد رکھنے والی ایک عورت رہتی ہے۔ اور ہاں اگر کبھی آؤ تو میرے پاس آنا۔ تمھیں پردیس میں اپنے گھر کا احساس ملے گا۔

پھر میں اس کمرے میں گئی جہاں اسے زخمی حالت میں لایا گیا تھا۔ وہ بستر جہاں اسے لٹایا گیا۔ وہ بندوق جس سے وہ زخمی ہوا۔ میز پر پڑی وہ گھڑی جو اس کی آخری سانس کے ساتھ ساکت کر دی گئی تھی۔ چھوٹی سوئی دو (2) اور تین (3) کے درمیان اور بڑی نو (9) پر۔

وہ آگاہ تھا اپنے مقام سے۔ ایسے ہی تو اس نے کہیں لکھا تھا کہ ایک دن رُوس کی سرزمین پر میرا نام ہوگا دنیا کی زبانوں پر میرا کلام ہوگا۔ اور زار شاہی کا منارہ میری عظمت کے سامنے سرنگوں ہوگا۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف

جگہیں، چہرے، یادیں اور خیال

انیسویں صدی کے فرانس میں انقلاب کی سرخ آگ میں دہکتے ہوئے فروزاں چہرے جو بجھ گئے، خوابوں سے لبالب بھری آنکھیں جو چھلک گئیں، درد میں ڈوبی ہوئی روحیں، ذلت، درماندگی، بھوک اور تحقیر کی بدبودار آلائشوں سے لتھڑی ہوئی زندگی، کھڑکیوں اور دروازوں کی جھریوں سے جھانکتی ہوئی بے پایاں مخلوق، جو اشرف ہونے کے خواب سے بھی محروم تھی اور ان کی تقدیر بدل ڈالنے کے گمان میں مست جوان خون کی ندیاں جو گندی نالیوں میں بہتی رہیں، قانون، جو نابینا تھا، بے رحم تھا اور تختے کی طرح بے لچک تھا، اور خدا جو اس اندھے اور بے حس قانون کے مجرموں کو پناہ دے رہا تھا، ان کی عزت افزائی کر رہا تھا، انھیں ان کی کھوئی ہوئی روح لوٹا رہا تھا اور بدلے میں کچھ بھی نہیں مانگتا تھا۔ محبت جس نے برف بھرے دلوں میں دیا جلایا، اکھڑی ہوئی، ریزہ ریزہ زندگی کے ٹوٹے ہوئے دھاگوں کو چھوٹی چھوٹی گرہیں لگا کر جوڑا، زخموں کو اپنے سانس کی حرارت دے کر اچھا کیا، مہمل کو کلمہ کر دیا۔ اور رقابت کہ جب بھی کہیں دو ایک ہوئے تو تیسرا، جو محبت کا اتنا ہی متلاشی تھا مگر کسی نامعلوم وجہ سے محروم رہا، ٹوٹ گیا۔

عمر کی چوتھی دہائی میں اعصاب اتنا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے، چٹخنے لگتے ہیں، اسی لیے جب میں اور اسد برطانیہ کی سب سے بڑی سکرین بی۔ ایف۔ آئی۔ آئمیکس (I Max) پر ”لے مزربل“ (Les Miserables) دیکھ کر نکلے تو واٹرلو اسٹیشن تک جانے کے لیے وہ چھوٹی سے سرنگ عبور کرتے ہوئے مجھے ابکائی تک نہیں آئی جس کے دونوں طرف زرد سیال بہ رہا تھا اور سڑاند کے بھبھوکے اٹھ رہے تھے۔

وکٹر ہیوگو (۱۸۰۲۔۱۸۸۵) کا یہ ناول کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے اور لندن میں گزشتہ ستائیس سال سے اس ناول پر مبنی میوزیکل تھیٹر چل رہا ہے۔ لیکن سینما کے لیے پہلی بار فلمایا گیا ہے۔ آج لندن میں اس فلم کا آخری شو تھا۔ تقریباً تین مہینے تک یہ فلم لندن کے مختلف سینماؤں میں دکھائی جاتی رہی ہے اور دو ماہ سے میں یہ کہتی رہی ہوں کہ یہ فلم ضرور دیکھوں گی۔ فروری میں پیرس میں بھی اسے دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اس لیے میں نے اسد سے کہہ دیا تھا کہ اگر کسی ایک سینما میں بھی یہ دکھائی جا رہی ہو تو مجھے ضرور لے چلے۔ اس نے بتایا کہ اتفاق سے صرف ایک سینما میں آج اس کا آخری شو ہے اور ہم دونوں

سٹریٹفرڈ سے جوبلی لائن پکڑ کر سیدھے واٹرلو پہنچ گئے۔ میٹرو سے نکل کر سینما تک جانے کے لیے سڑک پار کرنے کی بجائے ہم نیچے سرنگ میں اتر گئے اور داخل ہوتے ہی اس کے دونوں طرف سے تعفن کے غبار نے اٹھ کر ہمارا استقبال کیا۔

”اسد، لندن میں بھی؟؟“

میں نے سوالیہ نظروں سے اسد کی طرف دیکھا ان نظروں میں صرف سوال ہی نہیں، شرمندہ کرنے کی پوشیدہ خواہش بھی تھی۔ آخر وہ لندن کا اتنا گرویدہ جو ہے تو لندن کی بدصورتیوں پر اسے جواب دہ تو ہونا پڑے گا۔

مگر ”ہم ذات“ نے اندر سے ایک چپت لگائی۔

”صرف ایک سرنگ کے تعفن پر بغلیں بجانے کی ضرورت نہیں، یہ بھی تو دیکھو کہ انھوں نے یہ سرنگ بنائی ہے، کس لیے، کہ لوگوں کو سڑک پار کرنے میں دشواری نہ ہو، وہ کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائیں، گاڑیاں چلتی رہیں، ٹریفک اژدہام میں نہ پھنس جائے۔ یہ تعفن انھوں نے پیدا نہیں کیا، یہ تم جیسے لوگوں کی سینکڑوں سال کی بے تہذیب زندگی کی بے صبری کا نتیجہ ہے۔“

میں نے بے آرام ہو کر ہم ذات کے منھ پر ہاتھ رکھا اور اسد کی طرف دیکھا جو مجھے ہنس کر ٹال رہا تھا۔

”آپ کچھ کھائیں گی باجی؟“

”نہیں، اب گھر چلتے ہیں۔“

”لے مزریبل“ کے مناظر مجھے اندر سے چھو رہے تھے۔ میں ہر کردار کے ساتھ جی اور مر رہی تھی۔

”خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟

قانون کیا ہے اور جرم کیا ہے؟

حسن کیا ہے؟ کیسے اثر انداز ہوتا ہے، کسے نصیب ہوتا ہے اور کیوں ہوتا ہے، اگر نہیں ہوتا تو کیوں نہیں ہوتا؟

کون اچھا ہوتا ہے، کون برا ہوتا ہے؟

کہاں جا کر حق اور ناحق مل جاتے ہیں؟ سیاہ اور سفید ایک ہو جاتے ہیں اور کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔

وہ مقام ہست کا ہے یا نیست کا۔ فنا کا یا بقا کا؟“

میں بڑی مدت بعد پھر اسی خلا میں جا نکلی تھی۔

”فلم کیسی لگی باجی؟“ اسد نے مجھے چونکایا۔

”فلم؟ ہاں ۔۔۔ سکرین بہت بڑی تھی۔“ بعض چیزوں کو اچھے یا برے کے آسان سے عنوان میں سمو دینا کتنا مشکل ہوتا ہے ۔

”جی، بیس بائی اٹھارہ میٹر کی ہے۔“

”یہاں صرف ہولی وڈ کی فلمیں لگتی ہیں، برٹش فلمیں نہیں بنتیں؟“

”کیوں نہیں، برٹش فلم اندسٹری تو خاصی بڑی ہے ۔ یہ فلم بھی برٹش ہے، مگر ہولی وڈ میں بنی ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی، فلم برٹش ہے مگر بنی ہولی وڈ میں ہے؟“

”جی، اکثر ایسا ہوتا ہے کبھی اسپانسر برٹش ہوتے ہیں، یا ڈائریکٹر اور پروڈیوسر برٹش ہوتے ہیں مگر فلم ہولی وڈ میں ہی بنتی ہے اور ایکٹر امریکن بھی ہوتے ہیں اور برٹش بھی۔ اب اس فلم ہی کو دیکھ لیجیے، اسے ورکنگ ٹائٹل فلمز نامی برطانوی کمپنی نے پروڈیوس کیا ہے اور یونی ورسل فلمز، امریکہ نے ڈسٹری بیوٹ کیا ہے ۔ اس کے کردار امریکی بھی ہیں اور برطانوی بھی۔ ”سلمز ڈوگ ملینئر“ (Slums Dog Millionair) بھی برٹش فلم تھی مگر ہولی وڈ میں بنی تھی۔“

”اچھا تو ساری فلمیں، ڈرامے یہ لوگ مل کر کرتے ہیں۔“ اندر سے آواز آئی مگر میں نے سنی ان سنی کر دی ۔

”۲۰۱۰ میں، لندن میں اس ناول پر مبنی میوزیکل تھیٹر کو چلتے ہوئے پچیس سال ہو گئے تو اس پر ایک میوزیکل فلم بنانے کا اعلان کیا گیا تھا اور ۵ دسمبر ۲۰۱۲ کو یہ فلم لندن میں ریلیز ہو گئی تھی۔ آج تین مارچ ۲۰۱۳ء ہے اور اب تک اسے بیسیوں ایوارڈ مل چکے ہیں، جن میں تین اکیڈمی ایوارڈ بھی شامل ہیں۔“ اسد نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔ انگریزی فلموں کے بارے میں اس کی معلومات کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ تقریباً ہر فلم دیکھتا ہے اور بعض تو کئی کئی بار۔ اس نے اپنا پاس بنا رکھا ہے اس لیے کم دیکھے یا زیادہ، جیب پر بوجھ نہیں پڑتا۔ یہ فلم بھی اس نے میری خاطر دوبارہ دیکھی ہے اور اس سکرین پر اس کا پاس بھی کام نہیں آیا۔ ٹکٹ بھی مہنگی تھی۔ عام سکرین کی ٹکٹ دس گیارہ پونڈ ہے، اس کی سترہ پونڈ کے قریب ہے ۔

”ہاں، اداکاری کا آسکر تو ہیو (Hugh) کو ملنا چاہیے تھا۔“ مجھے پھر وہ منظر چبھنے لگے ۔

”یہ جو ۱۹۳۰ میں فرانس کے انقلاب کا منظر تھا، یہ کسی حقیقی واقعے کی عکاسی ہے یا خیالی ہے؟“

”فرنچ ریوولیوشن؟“

”مگر وہ تو اٹھارویں صدی میں تھا۔۔“

”پتا نہیں“

گھر آتے ہی میں نے سائیں گوگل (google) سرکار کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔

(اگر میرے پاس آئی فون ٹو (IPhone II) کے اس گھسے پٹے سیٹ کی بجائے آئی فون فور یا فائیو ہوتا تو وہیں ٹرین میں بیٹھے بیٹھے دیکھ لیتی۔ ان لوگوں نے کیسے کیسے "شیطانی" آلے ایجاد کر لیے ہیں، ہنھ---)

جولائی ۱۸۳۰ میں فرانس میں انقلاب کی ایک نئی لہر اٹھی تھی جس نے شاہ چارلس دہم کی سلطنت کے پاؤں اکھیڑ دیے۔ لیمارک (Jean Maximilien Lamarque _۱۷۷۰_۱۸۳۲) کی موت نے نوجوانوں کو ایک کیفے میں جمع ہو کر بغاوت کا علم بلند کرنے پر اکسایا اور حکومت اور باغیوں میں خونی تصادم ہو گیا۔ سرخ پرچم لہرائے گئے اور انسانی آزادی کے ترانے روح کے ساز پر گائے گئے۔ موت سے، جنگ سے، غربت اور افلاس سے نجات کے لیے، ان نوجوانوں کا جذبہ قابلِ داد تھا۔

لیکن پھر میں نے دیکھا کہ اس جدوجہد سے صرف دو ہفتے پہلے، ۵ جولائی ۱۸۳۰ کو فرانس کی فوجوں نے الجزائر پر قبضہ کر لیا تھا جو آنے والے ایک سو سال سے بھی زیادہ عرصے تک قائم رہا۔ پتہ نہیں فرانس کے ان جوشیلے، انسانی آزادی کے متوالے نوجوانوں نے الجزائر پر قبضے کے خلاف بھی کوئی ترانہ گایا تھا یا نہیں؟

یہ سوال دیر تک میرے اندر گونجتا رہا۔

وسیلہ ظفر

مجھے لندن آئے ہوئے دو مہینے ہو چکے ہیں۔ وقت جیسے پر لگا کر اڑتا رہا اور خود میں بھی تو پر لگا کر اڑتی رہی۔ یہ دو مہینے مسلسل سفر میں گزرے، لندن تو بس ایک سفر سے دوسرے سفر کے درمیان کا وقفہ تھا۔ میری سیلانی روح سارے حساب چکانا چاہتی تھی، مگر حساب کس سے چکائے جاتے ہیں اور کب چکتے ہیں؟ جب آخری متاع رائیگانی ہی ٹھہری تو حساب کتاب کتنا بے معنی ہے۔

دسمبر کی ۲۹ تاریخ تھی جب میں اور عارف صبح کے تین بجے ائر پورٹ جانے کے لیے گھر سے نکلے۔ موسم خلاف توقع سازگار تھا، آسمان بالکل صاف تھا اور چاند مکمل ہو چکا تھا۔ ساڑھے تین ماہ کے لیے گھر، بچوں اور عارف سے دور جانے کا یہ پہلا موقع تھا اس لیے دل بیٹھ رہا تھا مگر ظاہر کرنا مناسب نہیں تھا۔ آخر شوق بھی تو مجھے ہی تھا۔ اس شوق نے مجھے کیسے کیسے دن نہیں دکھائے، کیا کیا تجربات نہیں کروائے۔ عمر نکل گئی مگر شوق دل سے نہیں نکلا--- حالانکہ جانتی ہوں کہ شوقین ہونا ان انسانوں کے لیے کتنی بری بات ہے جو کسی کائناتی نظام کی تکمیل کے لیے مؤنث کے صیغے میں پیدا ہوئے ہوں۔

اس بار میں یونی ورسٹی اوف لندن کے سکول اوف افریکن اینڈ اورینٹل سٹڈیز میں تین ماہ کے لیے چارلس والس (Charles Wallace) فیلوشپ پر لندن جا رہی تھی۔ لیکن پروگرام صرف لندن کا نہیں

تھا۔ خیال یہ تھا کہ یورپ کی مختلف یونی ورسٹیوں کے کتب خانے بھی جھانک لوں اور اگر کوئی کام کی چیز مل جائے تو سمیٹ لوں۔ ہائیڈل برگ، روم، پیرس، ایڈنبرا اور اوکسفرڈ اس پروگرام میں شامل تھے۔ ہائیڈل برگ، روم اور ایڈنبرا سے تو اپنے موضوعِ تحقیق پر لیکچر دینے کے دعوت نامے بھی مل چکے تھے۔ ایک مصروف اور مہماتی سفر کے تمام تر امکانات میرے سامنے کھلے تھے مگر دل پیچھے مڑ مڑ کر دیکھے جا رہا تھا۔ انسان کیسے ہمیشہ متضاد کیفیتوں میں گھرا رہتا ہے۔ نامعلوم منزلیں اور راستے اسے اپنی طرف بلاتے ہیں اور مانوس جگہیں اور مکان دامن نہیں چھوڑتے۔ وہ لوگ کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں جن کی ترجیحات، توقعات اور توجہات بالکل واضح اور نپی تلی ہوتی ہیں اور جو پوری طرح یکسو ہو کر ان سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔ یہاں تو یہ عالم ہے کہ پنڈولم کی طرح ایک انتہا سے دوسری انتہا تک جانے کی خواہش جھولا جھلائے رکھتی ہے۔

عارف مجھے خدا حافظ کہ کر واپس مڑے تو دنیا یکا یک بدل چکی تھی۔ محفوظ، آرام دہ، محبت بھرے ماحول کی بجائے اب ایک کے بعد ایک چیلنج سامنے نظر آ رہا تھا۔ بڑے بڑے سوٹ کیس بیلٹ پر رکھنا، پھر تلاشی دینے کے بعد انھیں اتار کر دوبارہ روانہ ہونا، پرس اور ٹکٹ سنبھالنا۔ قطار میں لگ کر بورڈنگ پاس حاصل کرنا، امیگریشن کے مراحل سے گزرنا۔ لمبے سفر چھوٹے ضرور ہو گئے ہیں مگر آسان اب بھی نہیں ہوئے۔ سفر کی کلفتیں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتی ہیں اور مسلسل ذہنی دباؤ ڈالے رکھتی ہیں۔ یہ دباؤ پہلے درجے کی اس آرام دہ نشست میں بیٹھ کر بھی کم نہیں ہوا جو گلف ائر لائن کے کسی بے قاعدہ انتخاب کے نتیجے میں میری دوسرے درجے کی نشست کی ترقی کے بعد محض اتفاق سے مجھے مل گئی تھی۔

اس سفر کا پہلا مختصر پڑاؤ بحرین تھا۔ بحرین، جہاں میں کبھی نہیں گئی مگر میرے جسم و روح کا ماخذ و معدن بیس سال تک وہیں رہا۔ حالاں کہ اس وقت مجھے احساس تک نہ تھا کہ میں جو خود کو ایک مکمل اور خود مکتفی ہستی سمجھے بیٹھی ہوں، اصل میں کسی اور کی ہستی کا حصہ ہوں۔

وہ ”کوئی اور“، میر صاحب تھے، میر ظفر علی صاحب، میرے ابو، جنھوں نے روزگار کی تلاش میں بیس سال خود کو ہم سے دور رکھا۔ ہر دو سال بعد دو مہینے وہ ہمارے ساتھ گزارتے اور بس۔ ہم ان کے بغیر رہنے کے عادی ہو گئے تھے۔ ان کی موجودگی ہمارے لیے ایسے ہی تھی جیسے کسی پسندیدہ مہمان کی، کہ خوشی تو ہوتی ہے مگر دل ہی دل میں انتظار بھی کہ کب یہ جائے تو ہم اپنی روزمرہ کی زندگی شروع کریں۔ بیس سال تک ہر ہفتے باقاعدگی سے ائرمیل کے نیلے لفافے میں ان کا خط آتا رہا۔ امی کو پہلے سے پتا ہوتا تھا کہ کس دن ان کا خط آئے گا۔ اور ان کا خیال کبھی غلط ثابت نہیں ہوا۔ ہمیں معلوم ہی نہیں تھا کہ امی اور ابو میں کوئی جذباتی رشتہ بھی تھا۔ ہم نے تو انھیں ہمیشہ عملی مسائل پر ہی مصروفِ گفتگو پایا۔ بچوں کی تعلیم، گھر کی تعمیر، پیسوں کی کمی، رشتے داری کے تقاضے، محلے برادری کا لین دین، اکثر یہ گفتگو تلخی پر ہی ختم ہوتی اور کبھی کبھی تو زوردار لڑائی بھی ساتھ

لاتی۔ دونوں ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہراتے اور بات کبھی کسی نتیجے تک نہ پہنچتی۔ پر تو جب ابو رخصت ہو گئے تو کھلا کہ نصف صدی کی رفاقت کیا ہوتی ہے، مگر وہ بہت بعد کی باتیں ہیں۔

مجھے تو صرف یہ کہنا تھا کہ بحرین کے ہوائی اڈے پر ٹرانزٹ لاؤنج میں وارد ہوتے ہی میرے دل پر کیا کچھ نہیں گزر گیا۔ بچپن سے لے کر جوانی تک کی کتنی ہی یادیں، میکے کی خوشبو میں ملفوف کتنے ہی اجلے اور دھندلے منظر۔۔۔ ہم تینوں بھائی بہنوں نے اپنے اپنے طور پر اس جگہ کے کتنے ہی تصور باندھے تھے اور عمر کے ہر حصے میں یہ تصور بدلتے رہے تھے۔ جب ابو کو خدا حافظ کہتے تھے تو سوچتے تھے اب ابو جہاز میں بیٹھیں گے، جب انھیں خط لکھتے تھے تو خیال آتا تھا ابو اپنے کمرے میں بیٹھے اسے پڑھیں گے، کیسا ہوگا وہ کمرا؟، عید پر سوچتے تھے، ابو نے کیا کھایا ہوگا؟ کہاں گئے ہوں گے؟ (پہننے کا تو ہم سبھی کو معلوم تھا، دھوتی اور بنیان کے سوا انھیں اور کچھ بھی خوش نہ آتا تھا)، جب کسی کا اچھا نتیجہ آتا تھا تو ابو کو کھل کر بلکہ کھلکھلا کر ہنستا ہوا محسوس کرتے تھے۔ اگر کسی سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تھی، جیسا کہ ہر عمر میں ہو جاتی ہے تو دل ہی دل میں شکر بھی کرتے تھے کہ ابو بحرین میں ہیں۔ بحرین ہماری زندگیوں کا ایک ناگزیر حصہ رہا ہے۔ یہیں سے آنے والے چیک ہماری سب ضرورتوں کے کفیل رہے، حالاں کہ وہ چیک اتنے بھاری نہیں ہوتے تھے جیسے عام طور پر دبئی یا عرب امارات سے آنے والے چیک ہوتے ہیں۔ میر صاحب پرانے وقتوں کے میٹرک پاس ہی تو تھے، کسی شیخ کے ہاں اکاؤنٹنٹ قسم کی نوکری کرتے تھے اور اپنی غیر معمولی دیانت داری کے باعث، اتنی ہی غیر معمولی زود رنجی کے باوجود بہت دبنگ انداز میں کرتے تھے۔ امرتسر کے کشمیری ٹھہرے، پہلوانوں کا خاندان، بچپن سے کسرت کے نتیجے میں ڈیل ڈول کسی پہلوان سے کم نہیں، صرف آواز ہی اتنی اونچی کہ شریف آدمی دہل جائے اور اگر غصہ آ جائے تو پھر کوئی جائے کہاں۔ کئی نوکریاں اسی طیش اور دیانت کی نذر ہو چکی تھیں۔ پہلے ائر فورس سے پیچھا چھڑایا، پھر سول ایوی ایشن لاہور کے افسروں سے ضد مول لی کہ جھوٹی گواہی نہیں دیں گے اور ملازمت سے ہاتھ دھویا، پھر کئی قسم کے کاروبار کرنے کی کوشش کی، گاہکوں کو ڈرا دھمکا کر بھگا دیتے تھے اور بس ایک کرسی پر بیٹھ کر قلندری باتیں کرتے رہتے تھے۔ تبھی تو کوئی بھی کاروبار کامیاب نہیں ہوا۔ میرے ابو کاروباری ذہنیت سے اتنے ہی دور تھے جتنا کوئی کاروباری روحانی معاملات سے دور ہوتا ہے۔ پر تو امی کی ملازمت، کفایت شعاری اور غیر معمولی سوجھ بوجھ تھی جس نے ہماری زندگیوں کے سب چھوٹے موٹے روزنوں پر وضع داری کی مخمل کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ ابو اگر آتشین گولہ تھے تو امی لال پیلے شربت میں رچا ہوا برف کا گولہ۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ جس طرح بھی بسر کی ہو، ہمیں تو سارے موسم میسر رہے۔

تو یہ ہے بحرین۔۔۔ میں نے تقریباً دوڑ کر ٹرانزٹ لاؤنج کو پار کرتے ہوئے، ادھر ادھر کی فضا

کو اپنے اندر سمو لینے کی کوشش کی۔ میں جانتی تھی ابو یہاں نہیں ہیں، اب کہیں نہیں ہیں، لیکن دل کہتا تھا، اِدھر بھی

دیکھو، اُدھر بھی دیکھو، شاید یہی منظر ابو نے بھی دیکھے ہوں، اسی دروازے سے وہ بھی باہر نکلے ہوں، اسی راستے سے وہ بھی گزرے ہوں۔ دل بھی کتنا عجیب ہوتا ہے۔ بڑھاپے میں بھی بچہ بن جاتا ہے۔

بھاگم دوڑ اس لیے ضروری تھی کہ میری دونوں پروازوں کے درمیان صرف ایک گھنٹے کا وقفہ تھا اور پہلی پرواز ایک گھنٹہ تاخیر سے پہنچی تھی مگر چوں کہ دونوں پروازیں ایک ہی فضائی کمپنی یعنی گلف ائر لائن کی تھیں، اس لیے دوسری پرواز ابھی روانہ نہیں ہوئی تھی۔ مسافر جہاز میں بیٹھ چکے تھے اور صرف ہمارا ہی انتظار تھا۔ ہمارے جہاز میں داخل ہوتے ہی دروازے بند ہو گئے اور جہاز نے رینگنا شروع کر دیا۔

تقریباً دس گھنٹے کا سفر ایک تنگ سی نشست میں کاٹنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ میں بار بار پہلو بدل رہی تھی۔

اب اگر کوئی یہ کہنے لگے کہ ”چوں چراں کرتی محمل میں بیٹھ کر ہچکولے کھاتی ہوئی جاتیں تو اچھی رہتیں؟ اب اتنے بڑے جہاز میں یوں بیٹھی ہو جیسے کوئی اپنی نشست گاہ میں بیٹھا ہو۔ سامنے سکرین لگی ہے، ہیڈ فون گود میں رکھے ہیں، گھٹنوں پر کمبل ہے، گردن کے نیچے تکیہ ہے، بے شمار فلموں، ٹیلی وژن پروگراموں اور دنیا بھر کی خبروں میں سے کسی کا بھی انتخاب کرنے کی آزادی ہے، ابھی کچھ دیر میں میزبان خاتون ایک طشت سامنے رکھے گی، جس میں خوان چنے ہوں گے، ٹھنڈا گرم، نرم یا کڑا، ہر طرح کا مشروب حاضر ہے، اپنے ذوق اور طبیعت کے مطابق مانگ لو۔ وہ سامنے بیت الخلا بھی ہے۔ نشست کی جیب میں رنگین رسالہ بھی رکھا ہے، خریداری کا شوق بھی پورا ہو سکتا ہے اور تصویریں دیکھ کر بھی دل بہلایا جا سکتا ہے، کئی اخبار موجود ہیں، جو چاہو مانگ لو، اب اور کیا چاہیے؟“

اس آخری سوال پر میں نے تڑپ کر اِدھر اُدھر دیکھا، ”اب اور کیا چاہیے؟ اب اور کیا چاہیے؟“

یہ تو میرا کمزور پہلو ہے، یہاں کس نے چوٹ لگائی۔

مگر یہ کون ہے جو مجھ سے یوں مخاطب ہے، میں تو اکیلی چلی تھی۔

لیکن میں اکیلی نہیں تھی۔

مجھے پتہ ہی نہ تھا کہ وہ ہم ذات بھی بغیر ٹکٹ، بغیر ویزے کے، میرے ساتھ محوِ سفر ہے جس سے میری کبھی نہ بنی۔ وہ دشمن جو میرے ساتھ ساتھ میرے اندر ہی کہیں پلتا بڑھتا رہا ہے اور جس نے میری زندگی عذاب بنا رکھی ہے، یہاں بھی ڈھٹائی سے مجھے جھانک رہا تھا۔

میں نے بے بسی سے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور سنہری

روشنی میں نہائی ہوئی وسیع و عریض دنیا میرے سامنے پھیلی ہوئی تھی۔

جہاز دیار عرب کے ریت بھرے صحراؤں سے ہوتا ہوا تہران و ترکی کی برفانی چوٹیوں پر جھانکتا ہوا، اب یورپ تک آ پہنچا تھا۔ یونان، میلان، ویانا کے اوپر سے گزرتا ہوا لندن پہنچے گا۔

نیچے بہت دور کہیں کتنے ہی شہر آباد تھے۔ سڑکیں جال کی طرح پھیلی ہوئی تھیں، دریا موڑ مڑتے اور لمبی لمبی قطاریں بناتے تھے۔

اتنی بلندی سے ان ہنستے بستے شہروں کو دیکھنا۔۔۔

یہاں سے ان کی زندگی کی ساری ہلچل، ساری دوڑ دھوپ، ساری تگ و دو، کھیل کی طرح لگتی ہے جیسے کوئی ناٹک دیکھ رہا ہو۔

لوگوں کا بڑی مصروفیت کے عالم میں ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگے چلے جانا، نجانے کن کن مرحلوں کو سر کرنے میں مصروف ہونا، نجانے کیا کیا خواب بننا۔

یہاں اتنی بلندی سے یہ سب کچھ اتنا بے معنی لگ رہا ہے۔

(اور وہ جو اس سے بھی زیادہ بلندی سے یہ سب دیکھ رہا ہے اسے کیسا لگتا ہوگا۔۔۔“مگر وہ بلندی پر نہیں ہے، بے وقوف، وہ یہیں ہے، سر نشیب اور سر فراز میں، سر بلندی اور سر پستی میں، اس کے اندر، اس کی تہ میں، اس کی عمیق ترین سطحوں میں، خود تمھاری بھی، تمھیں یقین کیوں نہیں آتا؟ تم مان کیوں نہیں جاتیں؟” مجھے نیچا دکھانے کو یہ سب اسی ہم ذات کی چالیں ہیں۔ مجھے معلوم ہے۔)

یہ جو نیچے چوخانے سے بنے ہوئے ہیں، یہ مربعے اور مستطیلیں دراصل ملکوں کی سرحدیں اور ان کی لکیریں ہیں۔ ان لکیروں کو پار کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ پہلے اپنے ملک سے اجازت نامہ لینا پڑتا ہے کہ ہم اپنی لکیر کے پار چلے جائیں؟ پھر دوسرے ملک سے اجازت مانگنی پڑتی ہے کہ آپ کی لکیر پھلانگ کر اس طرف آ جائیں؟

وہ کہتے ہیں:

“کیوں آنا چاہتے ہو؟
واپس چلے جاؤ گے کہ نہیں؟
پکی بات بتاؤ! یہیں تو نہیں رہ جاؤ گے۔ ثبوت دکھاؤ۔
یہیں رہنے آئے ہو تو بتاؤ تم ہمارے کام کے ہو یا نہیں؟
نہیں ہو تو نہیں آ سکتے، یہاں صرف وہ رہ سکتے ہیں جو ہماری ترقی میں مدد دیں۔
مانا ہمارے پاس ہر چیز کی فراوانی ہے، مگر یہ ہم نے خود اپنی محنت سے پیدا کی ہے، تمھیں کیوں

دیں ۔ یہ صرف ہمارا حصہ ہے ۔ تم اپنے ملک میں جا کر اپنا حصہ حاصل کرو ۔

ہم فالتو خوراک سمندر میں پھینک دیں گے مگر تم جیسے مفت خوروں کو نہیں دیں گے ۔ ہم نے تمھیں بھی اپنی طاقت میں شریک کر لیا تو ہماری چودھراہٹ کیسے قائم رہے گی ۔ چلو بھاگو یہاں سے ۔“

اس ساری خود غرضی، ہٹ دھرمی اور اتراہٹ کو قائم رکھنے کے لیے کتنے پاپڑ بیلے جاتے ہیں، کتنے لمبے چوڑے نظام ترتیب دیے جاتے ہیں ۔ پاسپورٹ، ویزا، شناخت، تلاشی، کاغذات، شکوک و شبہات، ڈراوے، دھمکیاں، گرفتاریاں، سزائیں، پہرے داریاں اور جانے کیا کیا کچھ ۔ اس پر ستم یہ کہ diversity اور pluralism کا ڈھنڈورا بھی پیٹا جاتا ہے ۔ نوکریوں کی درخواستوں میں لکھا ہوتا ہے کہ خواتین، اقلیتوں اور متنوع نسلی اوصاف رکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی ۔ مگر یہ pluralism بھی تو ایک پردہ ہے، ایک نقاب ہے، مہذب ترین ممالک میں نسلی تفاخر اور تعصب کے نشان سر راہ مل جاتے ہیں ۔

”لیکن یہ بھی تو دیکھو، ان معاشروں میں ایسے لوگوں کی تعداد کیا ہے؟ کتنے لوگ ہوتے ہیں، متعصب اور کم ظرف؟ گنتی کے چند ناں؟ اور ذرا اپنی طرف دیکھو، دعویٰ اس دین کی وراثت کا، جس کا دوسرا خلیفہ اپنے غلام کے ساتھ سفر کرتا ہے تو دونوں ایک اونٹ پر باری باری بیٹھتے ہیں اور جب مفتوح شہر میں داخل ہونے کا وقت آتا ہے تو غلام اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہے اور فاتح شہنشاہ اونٹ کی نکیل پکڑے پیدل چل رہا ہے ۔ ہزاروں سال میں کسی اور نظام نے مساوات انسانی کی ایسی نظیر پیش کی ہو تو سامنے آئے ۔ مگر تم؟ اس دین کے علم بردار تو بہت بنتے ہو، کبھی اپنے گریبانوں میں بھی جھانک لو!“ ہم ذات نے میرے سر پر ایک چپت لگائی ۔

”ہاں، یہ ٹھیک ہے کہ کسی بھی معاشرے کے سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے ۔ جیسے وہ سب متعصب نہیں، ویسے ہی ہم سب بھی تو دہشت گرد نہیں!“ میں نے بات بدلنے کی کوشش کی ۔ میرے پاس ہم ذات کی دلیل کا کوئی جواب نہ تھا ۔

میں مشرق کی سرحد پار کر کے مغرب میں داخل ہو رہی تھی اور میرے ذہن میں وہی پکار برپا تھی، جس میں میرا انفرادی اور اجتماعی وجود نصف صدی سے مجروح ہوتا رہا ہے ۔

ہم کون ہیں اور وہ کون؟

ہم ان کے ”وہ“ (the other) ہیں یا وہ ہمارے ”وہ“؟

کیوں آج تک وہی ہیں جو ہمارے بارے میں سوچتے اور فیصلے صادر کرتے آئے ہیں؟ آخر ہم کہاں ہیں؟ ہم کیوں نہیں بولتے، ہم کیوں نہیں دیکھتے، ہم کیوں نہیں سوچتے؟

ہمارے لب کس نے سی دیے ہیں؟
یہ لب کون کھولے گا؟ کب کھولے گا؟

پہلی پہلی شامیں

پرواز ہیتھرو ائر پورٹ پر اتری تو موسم ابر آلود تھا۔ پرواز بالکل وقت پر پہنچ گئی تھی، امیگریشن کاؤنٹر پر ایک مسکراتے ہوئے شخص نے استقبال کیا۔

یہاں کیوں آئی ہیں؟

ریسرچ کرنے۔

کہاں؟

لندن یونی ورسٹی میں،

اور رہیں گی کہاں؟

میں نے پتا بتایا۔

کس موضوع پر ریسرچ کر رہی ہیں؟

وہ بھی بتایا۔ میرا خیال تھا یوں ہی رسمی سوال ہو گا لیکن وہ تو موضوع میں دلچسپی لینے لگا۔

''سفرنامے۔۔؟ مغرب کے؟۔۔۔۔اور جو یہاں سے تمھارے ہاں گئے تھے، ان کے؟

میں نے ہنس کر کہا، '' پھر تو اسکندرِ اعظم سے شروع کرنا ہو گا''۔

''جو بھی وہاں جاتا تھا واپس آنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ آخر کیا کشش تھی اس ملک میں؟''

اس نے میرے پاسپورٹ پر مہر لگائی اور پھر مسکرا کر اردو میں بولا،

''خدا حافظ''۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور اگلے مسافر کے لیے جگہ خالی کر دی۔

زینہ اتر کے نیچے آئی تو سامان بھی اپنی مخصوص بیلٹ پر پہنچ چکا تھا۔ سامان ٹرالی میں رکھا اور باہر کی راہ لی۔

لندن میں میری پہلی شام تھی، بادلوں سے ڈھکی ہوئی، بھیگتی اور گہری پڑتی۔ گاڑی ایک گھنٹہ لندن کی شاہراہوں پر دوڑتی رہی اور میں اس شام کی خاموشی سے محوِ کلام رہی۔ طرح طرح کے خیال دل میں آتے رہے، نئی نئی تصویریں ذہن کے پردوں پر بنتی اور بگڑتی رہیں۔ Porsche کا شوروم دیکھا تو محمد یاد آ گیا۔ وہ ہوتا تو کس قدر بے تاب ہو جاتا۔ بل بورڈ پر جدید فیشن کے لباس کا اشتہار دیکھا تو مومنہ کا خیال آیا، شاید اسے پسند آئے، سڑکوں کے کنارے فٹ پاتھ پر لگی سلیٹی رنگ کی بڑی بڑی ٹائلیں دیکھیں تو عارف کی وہ تصویر یاد

آ گئی جو شادی سے پہلے انھوں نے لندن سے بھیجی تھی، جس میں وہ ایسے ہی ایک فٹ پاتھ پر کھڑے تھے، اور میں نے اس فرش کو کتنی محبت سے دیکھا تھا۔ پھر جب امی ابو کا گھر بننے لگا تو پورچ میں اسی انداز کی ٹائلیں لگوانے کے لیے مستری کو پنسل سے نقشہ بنا کر دیا تھا۔ انسانی جذبات کیسے اس کی زندگی کا نقشہ بدل دیتے ہیں۔

یہ وہ لندن نہیں ہے جسے میرے تخیل نے ان دنوں تراش رکھا تھا جب عارف یہاں تھے اور میں اسے ان کی نظروں سے دیکھنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔

وہ بھی نہیں ہے، جو میں نے اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے سفرنامے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔

لندن اب کوئی ایسا شہر نہیں لگ رہا جسے دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں۔ عام سا، درمیانے درجے کا شہر ہے، نہ نیویارک جیسے اونچے اونچے سکائی سکریپر ہیں، نہ جرمنی کی طرح غیر معمولی صفائی ستھرائی، نہ سٹاک ہوم کی طرح گلیوں میں بہتا ہوا سمندر، نہ استنبول کی طرح اونچی نیچی، بل کھاتی سڑکیں۔ جدید عمارتیں کوئی ایسی خاص قابلِ دید نہیں ہیں کیوں کہ ایسی عمارتیں اب ہر ترقی یافتہ ملک کی سکائی لائن کا حصہ بن چکی ہیں اور پتھروں سے بنی ہوئی پرانی عمارتیں، گرجے، کیتھڈرل، حویلیاں کسی بھی اہتمام کے بغیر یوں کھڑی ہیں جیسے اب ان کی کوئی اہمیت نہ ہو، جیسے بعض جدید گھروں میں بزرگ، جو اپنی جائیداد بچوں کے نام کر چکے ہوں یا ریٹائرمنٹ کا سارا پیسہ استعمال کر بیٹھے ہوں، اپنے شاندار ماضی کی یادگار کی صورت موجود تو ہوتے ہیں لیکن اپنی تمام تر دانش، تجربے اور علم کے باوجود، غیر اہم، متروک اور کونے سے لگے ہوئے۔ ان پرانی عمارتوں کے سامنے، آس پاس، چوکوں میں سجے ہوئے مجسمے البتہ ابھی بھی اپنی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔ لیکن یہ سب تو سنٹرل لندن کی باتیں ہیں، جہاں مجھے کل جانا ہے۔

ابھی تو میں ہیتھرو ائر پورٹ سے نکل کر ایسٹ لندن کی طرف جا رہی ہوں۔ عارف کے دوست شاہد بھائی اور ان کی بیگم سمیرا بھابی نے مجھے ائر پورٹ سے لے کر میری رہائش گاہ تک پہنچانے کی ذمہ داری اٹھا رکھی ہے۔ بیچ بیچ میں وہ دونوں مجھے اپنے کسی سوال سے متوجہ کرتے ہیں تو میں چونک جاتی ہوں۔ میرے دل و دماغ میں خیالات اور جذبات کا ہجوم ہے۔ آنے والے تین ساڑھے تین ماہ کے بارے میں امیدیں، خواب اور اندیشے، پیچھے رہ جانے والوں کی یاد، موسم کے اثرات اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تنہائی کا خوف اور کشش دونوں بیک وقت مجھے گھیر لیتے ہیں۔ کئی برس بعد پہلی بار اتنے دن کی تنہائی میسر آ رہی ہے، اچھا بھی لگ رہا ہے اور تکلیف دہ بھی۔

ابھی بار دگر یہ تجربہ ہونا باقی ہے کہ تنہائی انسان کے اندر ہوتی ہے، باہر نہیں۔ یوسفی صاحب نے

کتنی اچھی بات لکھی ہے، کہ انسان دراصل اتنا ہی تنہا ہوتا ہے جتنا تنہا وہ خود کو سمجھتا ہے۔ اور بعد کے تجربے کا حاصل یہ نکلا کہ لندن میں سب کچھ مجھے ملا، اگر نہیں ملی تو تنہائی نہیں ملی۔ بس خود اپنے ساتھ ہونے کی لذت حاصل نہ ہوئی۔ لندن ہر وقت ایک آسیبی موجودگی کی طرح میری زندگی اور سوچ میں گونجتا رہا۔

دراصل لندن محض شہر نہیں، ایک طرزِ حیات ہے، ایک اندازِ فکر ہے، ایک قرینۂ زندگی ہے۔ جب آپ لندن میں رہنے لگتے ہیں تو لندن بھی آپ میں آ کر رہنے لگتا ہے۔ کبھی لگتا ہے اس سے محبت ہو گئی ہے، کبھی لگتا ہے، محبت نہیں ہے، وقتی ابال ہے، دور جاتے ہی ٹھنڈا پڑ جائے گا اور کبھی لگتا ہے کہ یہ آپ کے وجود کا حصہ بن گیا ہے۔

لیکن یہ سب بھی بعد کی باتیں ہیں۔

پہلی رات دل کا گھبرانا اور کرنا فون ٹورنٹو سے ریحانہ کا، دونوں ہی باتیں عجیب تھیں۔ مجھے ہمیشہ سے اپنے نئے نئے تجربے کرتے رہنے کی عادت پر کچھ ایسا اعتماد سا رہا ہے کہ دل گھبرانے جیسی باتوں کی مجھے خود سے توقع ہی نہیں ہوتی، مگر واقعہ یہ ہے کہ لندن کی پہلی رات میرا بہت دل گھبرایا۔ جی چاہا کہ اڑ کر واپس اپنے کمرے میں، اپنے بستر پر پہنچ جاؤں۔ اسی گھبراہٹ میں میں نے 'فیس بک' پر لکھ دیا کہ گھر یاد آ رہا ہے اور چند لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ ٹورنٹو سے ریحانہ کا فون آ گیا۔ ریحانہ سے میری صرف ایک ملاقات ہوئی ہے اور وہ بھی دو مہینے پہلے خیر پور کی کانفرنس میں۔ وہ ٹورنٹو سے اس کانفرنس میں شریک ہونے آئی تھیں۔ ان کے علاوہ ڈنمارک سے صدف مرزا، گلاسگو سے راحت زاہد اور ڈیوزبری سے غزل انصاری بھی تھیں۔ سب سے مل کر بہت اچھا لگا۔ ایک دوسرے کے فون نمبر لیے اور دوبارہ ملنے کے وعدے کیے۔ حالاں کہ سبھی کو معلوم تھا کہ اتنی دور دور رہنے والوں کا بار بار اتفاق سے ملنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن اس روز فیس بک پر میرا پیغام پڑھتے ہی، ریحانہ نے مجھ سے لندن کا نمبر لیا اور فوراً فون کر دیا۔ پھر دیر تک وہ میرا دل بہلاتی رہیں۔ ان کی یہ ادا اتنی اچھی اور غیر معمولی لگی، کہ دل واقعی بہل گیا۔ بعض اوقات کسی کی چھوٹی سی مہربانی، ذرا سی دلداری بھی کتنی تقویت دیتی ہے، انسان انسان کا کتنا محتاج ہے اور خود مکتفی ہونا کتنی ناقابلِ رشک بات ہے، حالاں کہ ہم اکثر اسی منزل کی تگ و دو میں رہتے ہیں۔

نیو ائر نائٹ

اکتیس دسمبر کی رات سرد اور تاریک تھی۔ لندن آئی (London Eye) کے ارد گرد متوالوں کا ہجوم دوپہر ہی سے جمع ہو رہا تھا۔ اسد، میرا خالہ زاد بھائی جو عمر میں مجھ سے اتنا چھوٹا ہے کہ مجھے بیٹوں کی طرح معلوم ہوتا ہے، اپنے نوجوان دوستوں کے ساتھ مجھے لینے آ گیا۔

چلیں باجی، کہیں گھوم آتے ہیں۔

مگر اتنی سرد رات میں سنٹرل لندن جانے کی ہمت نہیں پڑی۔ اس لیے وہیں کسی قریبی ریستوران میں جا کر کھانا کھانے پر اکتفا کیا۔ اس کے دوستوں سے ملی، ان سے باتیں کیں، ان کے مستقبل کے پروگرام سنے اور پاکستان کی سیاست میں ان کی دلچسپی ملاحظہ کی۔ ان میں سے ایک دو تو آنے والے الیکشن میں عمران خان کی پارٹی کو ووٹ دینے کے لیے خصوصی طور پر پاکستان جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وہ سب کے سب عمران خان کے پر جوش حامی تھے اور پاکستان کے مستقبل سے گہری وابستگی محسوس کرتے تھے۔ ان کی یہ امید ٹوٹ نہ جائے۔ دل کی گہرائیوں سے میں نے دعا کی۔

یہ تمام نوجوان ذہین اور قابل ہیں۔ ان میں سے بیشتر اٹھارہ انیس برس کی عمر میں ایف اے/ایف ایس سی کرنے کے بعد یہاں آئے تھے اور انھوں نے اپنی یونی ورسٹی کی تعلیم خود اپنی محنت کی کمائی سے حاصل کی ہے۔ مگر اس سفر کے دوران وہ مغربی معاشروں کی تہذیبی فضا سے اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ اب پاکستانی معاشرے میں جذب ہونا انھیں ناممکن نظر آتا ہے۔

یہ نہیں کہ وہ اپنی تہذیب، اپنی زبان، اپنی روایات سے باغی ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ ان کے خون سفید ہو گئے ہیں یا وہ دہریے یا کرستان ہو گئے ہیں، مگر انھیں پاکستان میں شادی کرنے سے خوف آتا ہے، وہ پاکستان کی معاشرتی زندگی کے جھمیلوں سے بیزار ہیں۔

اسد کی امی نے مجھے یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ اسے گھر آباد کرنے کے فوائد پر لیکچر دیتی رہوں اور ہو سکے تو کہیں شادی کرنے پر بھی آمادہ کر لوں۔ اس لیے میں بار بار ان کے سامنے یہ موضوع چھیڑ دیتی تھی۔ مگر چند ایک کے سوا وہ سب کے سب اس معاملے پر متفق نظر آئے کہ شادی ضرور کریں گے مگر ضروری نہیں کہ کسی پاکستانی لڑکی ہی سے کریں۔ پاکستان جا کر بیاہ کرنے پر وہ ہرگز راضی نہیں ہوئے۔ ان میں سے کچھ کے سابقہ تجربات تلخ تھے، کچھ انھیں دیکھ کر عبرت پکڑے ہوئے تھے اور کچھ اصولی طور پر یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کی خاندانی زندگی میں کچھ فوائد بھی یقیناً ہوں گے لیکن منافقت، دکھاوا، بناوٹ اور ایک دوسرے کے معاملات میں غیر ضروری دخل اندازی نے زندگی کو جو رنگ دے دیا ہے وہ انھیں منظور نہیں۔

اس بارے میں ان سے خوب بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ لیکن یہ نوجوان بالغ نظر اور سمجھ دار نظر آئے۔ اگرچہ اپنی عمر کے تقاضوں کے تحت وہ ابھی مستقبل کے نقشوں کو پوری طرح سمجھنے پر تیار نہیں تھے۔ انھیں ابھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ ایک دو دہائیاں اور گزر جائیں گی تو انھیں اپنی زبان اور تہذیبی مظاہر کی یاد کچوکے لگانے لگی۔ وہ اجنبی ثقافت سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرتے کرتے نڈھال ہو جائیں گے۔ زبان اور کلچر کی ہم آہنگی جو اس وقت انھیں بالکل بے معنی معلوم ہو رہی ہے، بڑھاپے میں لازمۂ حیات لگنے لگے گی۔

نوجوان اور خوش باش بے فکرے نوجوانوں کی اس ٹولی کے ساتھ ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا

کھانے کا تجربہ بھی دلچسپ رہا۔ وہ کبھی کسی ویٹرس کو چھیڑتے، کبھی ادھر ادھر کے ماحول پر کوئی شوخ فقرہ کستے یا مجھ سے نظر بچا کر ایک دوسرے کو اشارہ کرتے تو میں بھی پردیسی ہونے کا میٹھا میٹھا غم بھول جاتی۔ رات گئے انھوں نے مجھے گھر چھوڑا اور خود شاید کسی اور پروگرام کی تکمیل کے لیے روانہ ہو گئے۔ بے چارے نیوایر نائٹ کے اتنے گھنٹے مجھے کمپنی دینے میں برباد کر چکے تھے۔ مگر ان کی شائستگی اور خندہ پیشانی قابلِ داد تھی۔

سوآس میں پہلا دن

سوآس (SOAS) میں جین سیوری سے میری پہلی ملاقات ۲ جنوری کو گیارہ بجے ہونا تھی۔ لیکن میں صبح جلد ہی اٹھ بیٹھی۔ پہلے دن یونی ورسٹی جانے اور وقت پر پہنچنے کے احساسِ ذمہ داری کے دباؤ تلے میں نے جلدی جلدی ناشتہ کیا۔ شاہدہ باجی سے اسٹیشن تک جانے کا راستہ پوچھا مگر وہ مصر تھیں کہ مجھے خود ٹیوب اسٹیشن تک چھوڑ کر آئیں گی۔ میرے لاکھ انکار کے باوجود انھوں نے مجھے بس پر جانے کی اجازت نہ دی اور اپنے گھر سے قریب ترین، فیرلوپ انڈر گراؤنڈ اسٹیشن تک لے گئیں۔ وہاں جا کر انھوں نے میرے لیے ڈے ٹریول پاس خریدا، مجھے اسٹیشن سے لندن انڈر گراؤنڈ کا نقشہ اٹھا کر دیا اور اچھی طرح سمجھا دیا کہ واپسی پر ایک دو اسٹیشن پہلے ہی انھیں فون کر دوں تا کہ وہ مجھے لینے آ جائیں۔ پھر پاس کو مشین کی درز میں ڈال کر مجھے اندر دھکیل دیا۔

لیجیے جناب، یہ رہا لندن اور یہ رہی میں۔

اس لمحے سے پہلے تک میں مسلسل کسی نہ کسی کے دھیان، توجہ اور نگرانی کے حصار میں تھی۔ یہ پہلا لمحہ تھا جب مجھے اپنا راستہ خود ڈھونڈنا تھا اور میں اپنے سوا کسی کے ساتھ نہیں تھی۔ یہ احساس ایک طرف سرشار کر دیتا ہے تو دوسری طرف دل پر بوجھ بھی ڈال دیتا ہے۔

اندر جاتے ہوئے راستہ دو طرف کو مڑتا ہوا نظر آیا۔ دونوں طرف زینے بنے ہوئے تھے۔

میں نے گارڈ سے پوچھا،

“سنٹرل لندن؟”

اس نے دائیں ہاتھ کے زینے کی طرف اشارہ کر دیا اور میں آہستہ آہستہ پتھر کی پرانی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

فیرلوپ اسٹیشن انڈر گراؤنڈ نہیں ہے بلکہ زمین کی سطح سے خاصا بلند ہے اور گاڑی ایک پل کے ذریعے سڑک کے اوپر سے گزرتی ہے۔ اس لیے اسٹیشن کا منظر کسی پرانی انگریزی فلم کے سین جیسا لگتا ہے۔ بادلوں سے ڈھکا ہوا آسمان، کھمبے سے لگا ہوا گول گھڑیال، دیوار سے ٹیک لگا کر پڑے ہوئے لکڑی کے بنچ، سلیٹی پتھروں کا فرش، نیلے رنگ کے بورڈ پر ٹرینوں کے آنے جانے کے اوقات اور صرف دو متوازی

پٹڑیاں، ایک شہر کے مرکزی علاقے کی طرف جاتی ہوئی اور دوسری مرکز سے حاشیے کی طرف آتی ہوئی۔ دونوں طرف کے پلیٹ فارموں پر اکا دکا مسافر۔ یہ اسٹیشن مرکزی لندن سے تقریباً پون گھنٹے کی مسافت پر ہے اور اس پر کبھی زیادہ ہجوم نہیں ہوتا۔ آج بھی صرف دو مسافر ٹرین کے منتظر تھے۔ ڈجیٹل بورڈ بتا رہا تھا کہ شہر کی طرف جانے والی ٹرین کے آنے میں دو منٹ باقی تھے۔ میں بنچ پر بیٹھ گئی اور پیچھے دیوار پر لگے انڈر گراؤنڈ کے بڑے سے نقشے کو سمجھنے میں مصروف ہو گئی۔ عین دو منٹ بعد ٹرین زوں سے آئی اور کھٹا کھٹ اس کے برقی دروازے کھلنے شروع ہوئے۔ اترنے والا تو کوئی بھی نہیں تھا، چڑھنے والے بھی ہم تین ہی تھے اور ٹرین تقریباً خالی تھی۔ یہ سنٹرل لائن تھی جسے عرف عام میں ریڈ لائن بھی کہتے ہیں۔ اس وقت صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے اور لندن کی پبلک ٹرانسپورٹ کے مصروف ترین اوقات (peak hours) ختم ہو چکے تھے۔ اس دورانیے کو اوف پیک آورز (off-peak hours) کہتے ہیں۔ ان اوقات میں نہ صرف ٹرین میں نشست حاصل کرنا آسان ہوتا ہے بلکہ کرایہ بھی مصروف ترین اوقات کی نسبت کم ہوتا ہے۔ ساڑھے نو بجے صبح سے چار بجے سہ پہر تک یہی کیفیت رہتی ہے اور چار سے سات بجے شام تک دوبارہ مصروف ترین اوقات کی شرائط لاگو ہو جاتی ہیں۔

تین سال پہلے جب میں ایک ہفتے کے لیے لندن آئی تھی تو انڈر گراؤنڈ ٹرینوں کے نظام سے خاصی واقفیت ہو گئی تھی اس لیے کچھ نیا نہیں لگ رہا تھا لیکن اس بار یہ احساس نیا تھا کہ اب کے یہ نظام نسبتاً زیادہ دیر تک مددگار رہے گا۔ مجھے فیئرلوپ سے چودہ اسٹیشن چھوڑ کر ہولبورن اترنا تھا اور یہ تقریباً چالیس منٹ کا راستہ تھا۔ چالیس سے اکتالیس یا بیالیس تو ہو سکتے یا کبھی کبھی اڑتیس یا انتالیس منٹ بھی لگتے تھے لیکن اس سے زیادہ فرق کبھی نہیں پڑا۔

ہولبورن سے رسل سکوائر صرف ایک سٹاپ کے فاصلے پر ہے لیکن یہاں سنٹرل لائن سے اتر کر پکیڈلی لائن (بلیو لائن) تک جانے کے لیے ایک طویل برقی زینہ طے کرنا پڑتا ہے۔ پکیڈلی لائن انڈر گراؤنڈ کے غالباً آخری نچلے درجے میں چلتی ہے۔ اسی لیے جب میں رسل سکوائر پر اتری، اور مسافروں کے ہجوم میں خودکار طریقے سے پلیٹ فارم سے باہر نکلی تو خود کو اوپر جانے کے لیے نصب دو بڑی بڑی لفٹوں کے سامنے کھڑا پایا۔ دونوں کے سامنے لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ پہلے بائیں طرف کی لفٹ نمبر ایک آنے والی تھی، چنانچہ لوگوں کی کوشش تھی کہ اس کے سامنے جگہ مل جائے لیکن بہت سے لوگ یہ اندازہ کر کے کہ پہلی لفٹ میں جگہ ملنا مشکل ہوگا، لفٹ نمبر دو کے سامنے بھی جمع ہو رہے تھے۔ لفٹ آئی اور اس کے دروازے کھلے تو اندر کھڑے ہوئے لوگوں کی تین قطاریں نہایت منظم طریقے سے عقبی دروازے سے باہر نکلتی ہوئی دکھائی دیں۔ ایسی ہی تین قطاریں اندر داخل ہوئیں اور عقبی دروازے کی طرف رُخ کر کے کھڑی ہو

گئیں۔ نہ کوئی دھکم پیل، نہ کوئی جلد بازی، نہ نفسا نفسی۔ ذرا عجیب عجیب سا لگا۔ میں بھی درمیان کی قطار میں کھڑی ہوگئی۔ جب لفٹ اوپر جا کر رکی اور اعلان ہونے لگا کہ دروازوں میں رکاوٹ نہ ڈالیں اور اپنے ٹکٹ تیار رکھیں، تو میں نے بھی ٹریول پاس بیگ سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

لندن یونی ورسٹی کے اسکول اوف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کا جو پتہ میرے پاس تھا، اس پر رسل سکوائر لکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جب میں اسٹیشن سے باہر نکلوں گی تو ایک بڑا سا چوک نظر آئے گا اور اس کے اردگرد کہیں ایک بڑی عمارت ہوگی جس پر جلی حروف میں SOAS کا بورڈ لگا ہوگا۔ تین سال پہلے بھی میں ایک مرتبہ یہاں آ چکی تھی لیکن تب اسد میرے ساتھ تھا اور مجھے راستہ ڈھونڈنے اور یاد رکھنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ اب کے میں جو اسٹیشن کے سرخ پتھروں والے محرابی دروازوں سے باہر نکلی تو خود کو ایک پتلی سی سڑک پر پایا جس کے دونوں طرف سڑک سے بھی زیادہ چوڑے پتھر ملے فٹ پاتھ بنے ہوئے تھے اور بالکل سامنے لندن کے مشہور گروسری اسٹور ٹیسکو (Tesco) کا بورڈ نظر آ رہا تھا۔ ایک دو لوگوں سے پوچھا لیکن اتفاق سے میرا انتخاب غلط نکلا۔ ان میں سے کوئی بھی سوآس کی عمارت اور اس کے محل وقوع سے واقف نہ نکلا۔ میں نے بغیر کسی اندازے کے سڑک پار کی اور سامنے کی گلی میں گھس گئی اور ناک کی سیدھ میں چلنا شروع کر دیا۔ مگر کہیں کسی ایسی عمارت کے آثار نظر نہ آئے جس کی تصویر میرے حافظے میں محفوظ تھی۔ آخر کار میں نے راستہ چلنے والوں کو غور سے دیکھنا شروع کیا تا کہ کسی کے طالب علم ہونے کا گمان ہو تو اس سے پتا پوچھوں۔ کئی چینی، ایشین اور یورپین طالب علم نما راہگیروں سے پوچھتے پچھاتے جب میں تقریباً چالیس منٹ کے بعد سوآس کی کالج بلڈنگ کے سامنے پہنچی تو سوا گیارہ بج رہے تھے۔ ابھی مجھے جین سیوری کو تلاش کرنا تھا۔

جین سے فیلوشپ کے سلسلے میں کئی مہینے سے برقی ڈاک کے ذریعے رابطہ رہا تھا۔ میرے ذہن میں اس کی ایک خاص تصویر بھی بنی ہوئی تھی۔ جین نے مجھے یہاں آنے سے پہلے تفصیل سے تمام ہدایات لکھ بھیجی تھیں۔ اس نے تو سوآس کی عمارت اور اس کے محل وقوع کے آن لائن نقشے کا لنک بھی بھیجا تھا۔ عمارت میں داخل ہو کر استقبالیے سے رجوع کیا اور انھیں بتایا کہ مجھے جین سیوری سے ملنا ہے۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر انھوں نے مجھے ملاقاتی (visitor) کی پرچی تھمائی اور یہ پرچی دیکھ کر اونچے اسٹول پر بیٹھے ہوئے طویل قامت، سیاہ فام پہرے دار نے نہ صرف اٹھ کر اپنے کارڈ کی مدد سے داخلے کا مشینی راستہ کھول دیا بلکہ مجھے چوتھی منزل پر جین کے کمرے کا محل وقوع بھی سمجھا دیا اور اس کمرے کے قریب کھلنے والی لفٹ کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ میں پورے ساڑھے گیارہ بجے جین کے کمرے میں داخل ہوگئی۔

پہلا کمرہ رحیمہ بیگم کا تھا۔ رحیمہ بیگم چوڑے چکلے، شگفتہ چہرے والی بوٹے قد اور قدرے بھاری

جسم کی نوجوان لڑکی تھی۔ میں نے اپنا تعارف کروایا اور وہ بہت گرم جوشی سے مجھے ملی۔ آواز سن کر پچھلے کمرے سے جین بھی اٹھ کر آ گئی۔ میرے تصورات کے برعکس وہ انتہائی دھان پان سی، تیکھے نقوش کی خاتون تھی۔ ابتدائی خیر مقدمی کلمات کے بعد اس نے ایک دو فون کیے اور پھر بہت ندامت سے معذرت کرنے لگی کہ ابھی تک میرے دفتر کی چابی اسے حاصل نہیں ہو سکی اور اگر میں برا نہ مانوں تو ایک دو دن تک اسی کے کمرے میں مجھے ایک کمپیوٹر اور میز کرسی فراہم کر دی جائے۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ پھر جین نے ایک ایک کر مجھے ان تمام سہولیات سے آگاہ کیا جو سوآس کی جانب سے مجھے مہیا کی جانے والی تھیں۔ ان میں پرنٹ، سکین اور فوٹو کاپی کی لامحدود سہولت کے ساتھ مفت لوکل اور انٹرنیشنل فون کی سہولت بھی شامل تھی۔ لیکن ان سب سہولیات سے فائدہ اٹھانے کے لیے میرے پاس سوآس کا سٹاف کارڈ ہونا ضروری تھی۔ چناں چہ جین اور میں سب سے پہلے نچلی منزل پر واقع لائبریری تک گئے جہاں جین نے میری تعیناتی کا خط دکھایا اور پندرہ منٹ کے اندر اندر وہیں میری تصویر کھینچ کر مجھے ایک عدد سٹاف کارڈ فراہم کر دیا گیا۔ یہ کارڈ گویا کھل جا سم سم کا منتر تھا۔ عمارت میں داخلے سے لے کر لائبریری سے کتاب حاصل کرنے، اور بعد میں جا کر معلوم ہوا کہ پورے یو کے کی تمام یونی ورسٹیوں کی لائبریری تک رسائی کے لیے یہی کارڈ کارآمد ثابت ہوگا۔

سٹاف کارڈ کے بعد اگلی باری سوآس کے حوالے سے میرے برقی پتے کی کلید (password) مقرر کرنے کی تھی۔ یہ برقی پتا میرے یہاں آنے سے پہلے ہی تیار کر لیا گیا تھا۔ چناں چہ جین مجھے لے کر عمارت کی سب سے نچلی، زیر زمین منزل (basement) میں واقع آئی ٹی سیکشن میں آ گئی جہاں میں نے اپنی مرضی سے ایک کلید مقرر کر لی۔ یہ گویا دوسرا منتر تھا کیوں کہ اس پتے سے میں نہ صرف یونی ورسٹی کی عمارت میں جابجا پڑے مختلف کمپیوٹر کھول سکتی تھی بلکہ فوٹو کاپی مشینیں، سکینرز اور پرنٹر بھی استعمال کر سکتی تھی۔ لائبریری کی آن لائن سہولتوں تک رسائی کے لیے بھی مجھے اس پتے کی ضرورت تھی۔ اس کی مدد سے میں گھر بیٹھے لائبریری کی کتاب اپنے پاس رکھنے کی مدت بڑھوا سکتی تھی، کسی خاص کتاب کے بارے میں درخواست کر سکتی تھی، ان مجلوں کے متن تک رسائی حاصل کر سکتی تھی جو صرف سوآس کے طالب علموں اور اساتذہ کے لیے مخصوص ہیں اور ایسے ہی کئی اور کاموں کے لیے یہ برقی پتا مفید ثابت ہوتا رہا۔ یہی پتا یونی ورسٹی کی ویب گاہ پر میری شناخت تھا اور اس کی مدد سے کوئی بھی میرا نام ونشان ڈھونڈ سکتا تھا۔

سٹاف کارڈ اور برقی پتے کی یہ مرکزیت اور انفرادیت نہایت کارآمد ہے۔ اس کے ساتھ یہ یونی ورسٹی کے ارباب اختیار کو اپنے اسٹاف اور طالب علموں کے بارے میں مسلسل معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ کون کس وقت یونی ورسٹی کی عمارت میں داخل ہوا، کتنے بجے لائبریری میں گیا، کتنے کاغذ پرنٹ کیے، کتنے صفحات فوٹو کاپی یا سکین کیے گئے، سکین کیے ہوئے صفحات برقی ڈاک کے ذریعے بھیجے

جاتے ہیں، چناں چہ یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کس نے کیا سکین کیا۔ ایک طرف تو افراد کو سہولت فراہم کرنے کی ذمہ داری پوری ہوتی ہے اور دوسری طرف انتظامیہ کو اپنا کنٹرول قائم رکھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ ایسا کنٹرول ہے جو بظاہر دکھائی نہیں دیتا اور نہ محسوس ہوتا ہے۔ ہر شخص خود کو مکمل طور پر آزاد سمجھتا ہے اور اپنی آزادی اور اختیار کو استعمال کرسکتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ کسی بھی وقت یہ آزادی ایک مسلسل نگرانی کی صورت اختیار کرسکتی ہے۔ مگر میرے علم میں کوئی ایسا واقعہ نہیں آیا جب عملی طور پر ایسی کوئی صورت پیش آئی ہو؛ بلکہ یونی ورسٹی کے ہر درجے کے سٹاف کا مجموعی رویہ بھرپور تعاون اور باہمی امداد کے اصول سے مزین نظر آیا۔

جب یہ دو مرحلے طے ہو گئے تو جین، جو اسی دوران فون کر کے میرے کمرے کی چابی حاصل کر چکی تھی، مجھے ساتھ لے کر کالج بلڈنگ کی چوتھی منزل کے ایک کونے پر واقع کمرہ نمبر ۴۴۰۵ میں پہنچ گئی۔ یہ نسبتاً بڑا کمرا تھا۔ یہ کمرا پبلک انٹرنیشنل لا کے پروفیسر عیائین سکوبی (Iain Scobbie) کا تھا جن کی تحقیق و تدریس کا خصوصی موضوع مسئلہ فلسطین و اسرائیل ہے۔ ایک کونے میں ان کی میز کرسی لگی تھی اور دیواروں پر لگی شیلفوں میں قانون کی موٹی موٹی کتابوں کے ڈھیر لگے تھے۔ دوسری طرف تین لمبی میزیں جڑی ہوئی تھیں جن میں سے ایک میرے لیے تھی۔ باقی کی دو میزیں خالی تھیں مگر پروفیسر صاحب کے ریسرچ اسسٹنٹ کبھی کبھی آ کر کوئی کام کر لیتے تھے۔

جین نے جلدی جلدی میری میز درست کی، کمپیوٹر اور اس کے اجزا کو درست طور پر جمایا، ایک ٹوکری میں کاغذ، کاپیاں، قلم، پنسلیں اور دیگر لوازمات ڈھیر کیے، ساتھ رکھے لاکر کی چابی تالے میں ڈالی اور مجھے اپنی ذاتی کلید استعمال کر کے کمپیوٹر کھولنے کی ہدایت دی تا کہ اسے اطمینان ہو جائے کہ میری رسائی یونیورسٹی کے مرکزی نظام تک ہو گئی ہے۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد وہ پھر مجھے ساتھ لے کر باہر نکل آئی۔ کمرے کی چابی میرے حوالے کی اور عمارت کی ہر منزل پر رکھے پرنٹر، سکینرز اور فوٹو کاپی مشینوں کے استعمال کا طریقہ سمجھایا۔ پھر اس نے مجھے وہ کمپیوٹر روم دکھائے جہاں میں کسی بھی وقت کمپیوٹر استعمال کر سکتی ہوں۔ آخر میں ہم تیسری منزل پر واقع ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچے جسے کھولنے کے لیے تالے پر ایک خفیہ نمبر دبانا پڑتا ہے۔ یہ کمرا صرف اساتذہ کے لیے مخصوص ہے۔ ڈاکیا ہر روز یہاں آ کر نہ صرف ہر استاد کے مخصوص خانے میں اس کی ڈاک رکھ دیتا ہے بلکہ اگر کسی نے کوئی خط بھیجنا ہو تو وہ بھی ایک مخصوص ٹوکری میں رکھ دیا جاتا ہے اور ڈاکیا یہیں سے وہ خط لے جاتا ہے۔ اس کمرے کو ایکوئپمنٹ روم (Equipment Room) یعنی آلہ خانہ کہتے ہیں اور یہاں پرنٹر، سکینرز اور فوٹو کاپی مشین بھی موجود ہے۔ جین نے مجھے تالے کا خفیہ نمبر بتاتے ہوئے کہا کہ باہر رکھی ہوئی مشینیں چوں کہ طلبہ اور اساتذہ دونوں کے استعمال میں ہوتی ہیں اس لیے

اکثر انھیں استعمال کرنے والوں کا ہجوم رہتا ہے۔ ایسے میں میں ضرورت پڑنے پر ان مشینوں کا استعمال کر سکتی ہوں جو صرف اساتذہ کے لیے مخصوص ہیں۔

آخر کار ہم واپس جین کے کمرے میں پہنچے جہاں اس نے مجھے تحفے کے طور پر سوآس کے نشان (logo) والا ایک کپڑے کا تھیلا اور کارڈ رکھنے کا البم دیا۔ میرے استفسار پر کہ لندن میں پرانی کتابوں کی دکانیں کہاں ہیں اور برٹش لائبریری یہاں سے کتنی دور ہے، جین نے اپنی دراز کھولی اور لندن کے گلی کوچوں کے مفصل نقشوں پر مشتمل اپنی ایک کتاب مجھے مستعار دے دی، مجھے فیلوشپ کی حدود و قیود سے آگاہ کیا اور میں پوری طرح مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

چارلس والس فیلوشپ

چارلس والس فیلوشپ سے میری پہلی شناسائی کئی برس پہلے محض اتفاق سے ہوئی تھی۔ میں ان دنوں ایک پوسٹ ڈوک فیلوشپ کے لیے کسی برطانوی یونی ورسٹی میں نگرانِ تحقیق تلاش کر رہی تھی۔ اسی تلاش کے دوران سوآس کے زبان وثقافت کے شعبے کی سینئر لیکچرار ڈاکٹر فرنچسکا سے برقی ڈاک کے ذریعے رابطہ ہوا تھا اور انھوں نے مجھے اس فیلوشپ کے لیے درخواست دینے کا مشورہ دیا تھا۔ پھر میری چھوٹی بہن کی دوست ڈاکٹر رفعت النسا نے، جو خود بھی میری چھوٹی بہنوں کی طرح ہے، یہ فیلوشپ حاصل کی اور اوسٹر یونی ورسٹی (Worcester University) میں تین مہینے کا عرصہ کامیابی سے گزارا۔ رفعت نے بھی اصرار کیا کہ مجھے اس فیلوشپ کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔

آخری اور کارگر مشورہ نشاط ریاض نے دیا جو برٹش کونسل پاکستان میں پروگرام مینیجر ہیں۔ نشاط سے میری پہلی ملاقات تین سال قبل برٹش کونسل کی ایک ورکشاپ کے دوران ہوئی تھی۔ اس ورکشاپ کے لیے پاکستان بھر کی یونی ورسٹیوں سے تیرہ اساتذہ کا انتخاب ہوا تھا۔ یہ انتخاب برٹش کونسل پاکستان اور ہائر ایجوکیشن کمیشن پاکستان نے مشترکہ طور پر عمومی مقابلے کے بعد کیا تھا۔ ورکشاپ کے لیے ان منتخب یونی ورسٹی اساتذہ کو لندن کے قریب ونڈسر کے مقام پر لے جایا گیا، جہاں دیگر ممالک کے نمائندہ اساتذہ بھی آئے اور برٹش کونسل برطانیہ نے ان تمام اساتذہ کے لیے بین الاقوامی تحقیقی روابط بڑھانے اور کثیر ثقافتی (multi-cultural) ماحول سے ہم آہنگ ہونے کی تربیت دی تھی۔ اس ورکشاپ کے دوران نشاط بھی مشاہدہ کار کے طور پر موجود تھیں۔ ان کی مہربان اور دلکش مسکراہٹ نے وہیں ہم سب کو موہ لیا تھا لیکن یہ ربط پاکستان واپس آنے کے بعد زیادہ مستحکم ہوا جب ہم سب نے پاکستان کی تمام یونی ورسٹیوں کے ہم کار اساتذہ کو اپنی تربیت کے نتائج میں شریک کرنے کے لیے Cascading Workshops کا پروگرام بنایا۔ یہ ورکشاپیں پاکستان کی چھوٹی بڑی متعدد یونی ورسٹیوں میں منعقد ہوئیں۔ انھیں عملی شکل دینے

میں برٹش کونسل سے نشاط ریاض اور ایچ ای سی سے نورآمنہ کا تعاون اور رہنمائی مسلسل شریکِ حال رہی۔ یہ تعاون رسمی اور سرکاری نوعیت کی کارروائیوں سے کچھ بڑھ کر تھا۔ ہمیں محسوس ہوا کہ یہ دونوں خواتین اپنے فرائض منصبی کو محض پیشہ ورانہ ذمہ داری نہیں بلکہ شخصی لگاؤ، حب وطن اور ایمان کا جزو سمجھتی ہیں۔ ہم سب کے سب ان کے خلوص اور دوستانہ رویے کے قائل بلکہ گھائل ہو گئے تھے۔ انھی ملاقاتوں کے دوران کسی دن نشاط نے برسبیلِ تذکرہ چارلس والس فیلوشپ کی بات کی تھی۔ اس دفعہ میرے حالات کچھ مختلف تھے، مومنہ یونی ورسٹی کے ہوسٹل میں جا چکی تھی، محمد خود انحصاری سیکھ رہا تھا اور عارف کو بھی تین ماہ کی جدائی کے شاق گزرنے کا امکان مدھم پڑتا معلوم ہوتا تھا۔ یونی ورسٹی کے حالات بھی پہلے کی نسبت کچھ حوصلہ افزا معلوم ہوتے تھے۔ چناں چہ میں نے رفیع سے رہنمائی حاصل کی اور درخواست دینے کا ارادہ کر لیا۔

چارلس والس فیلوشپ کا اہتمام چارلس والس ٹرسٹ کی جانب سے کیا جاتا ہے۔ یہ ٹرسٹ ایک برطانوی تاجر چارلس والس کی وصیت کے مطابق ۱۹۸۱ میں برطانیہ میں قائم ہوا تھا۔ چارلس والس نے انیسویں صدی کے اواخر میں نوآبادیاتی ہندوستان میں خاصی دولت کمائی تھی۔ اس کا انتقال ۱۹۱۲ میں، ساٹھ برس کی عمر میں لندن میں ہوا۔ وفات سے پہلے اس نے وصیت کی تھی کہ اس کی دولت جن لوگوں کی مدد سے کمائی گئی ہے انھی پر خرچ کی جائے۔ چناں چہ اس کا ایک حصہ برطانوی خزانے میں داخل کیا گیا اور دوسرے حصے سے برطانوی ہندوستان سے تعلق رکھنے والے چار ممالک کے لیے ٹرسٹ قائم کیے گئے۔ یہ چار ممالک بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش اور میانمر (سابقہ برما) ہیں۔ بھارت اور پاکستان کے ٹرسٹ برٹش کونسل کے تعاون سے کام کرتے ہیں۔ اس ٹرسٹ کے زیر اہتمام ہر سال پندرہ سے بیس پاکستانی اسکالر برطانوی یونی ورسٹیوں میں تحقیق کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ فیلوشپ کا دورانیہ تین ماہ ہے۔ درخواست دینے سے پہلے امیدوار کو کسی نہ کسی برطانوی یونی ورسٹی سے رابطہ کر کے اپنے لیے دعوت نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے۔ بیشتر امیدواروں کے لیے یہی سب سے مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ کئی یونی ورسٹیاں اور ان کے پروفیسر اس معاملے میں سرد مہری کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور پلٹ کر جواب نہیں دیتے، یا جواب دیں بھی تو دلچسپی کا اظہار نہیں کرتے۔ زیادہ تر چھوٹی اور نئی یونی ورسٹیاں جوش و خروش سے اس موقع کا خیر مقدم کرتی ہیں مگر وہاں تحقیق کے مواقع محدود ہوتے ہیں۔ دراصل یہ ٹرسٹ برطانوی یونی ورسٹیوں کو کوئی معاوضہ ادا نہیں کرتا۔ اسی لیے یونی ورسٹیاں اور پروفیسر حضرات بھی اس میں زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ البتہ دو تین بڑی یونی ورسٹیاں ایسی بھی ہیں جو اس شرط کے ساتھ امیدواروں کو قبول کرتی ہیں کہ انتخاب وہ خود کریں گی۔ ان میں اوکسفرڈ یونی ورسٹی، ایڈنبرا یونی ورسٹی اور لندن یونی ورسٹی شامل ہیں۔ یہ یونی ورسٹیاں اپنی ویب سائٹ پر علیحدہ اشتہار دے کر درخواستیں طلب کرتی ہیں اور امیدواروں کے تحقیقی منصوبے جانچ پرکھ کر انھیں منتخب

کرتی ہیں۔ ان کی اپنی شرائط بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً لندن یونی ورسٹی بھارت سے ہر سال ایک فیلو منتخب کرتی ہے مگر پاکستان سے دو سال میں ایک بار چارلس والس فیلو کو منتخب کیا جاتا ہے۔

ان تمام الجھنوں سے گھبرا کر میں نے رفیع کے مشورے سے لندن سے باہر کسی نسبتاً چھوٹی یونی ورسٹی سے رابطہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ رفیع ہی نے مجھے اوسٹر یونی ورسٹی (Worcester University) کی پروفیسر کرس سے متعارف کرایا اور انھوں نے اپنی یونیورسٹی کی جانب سے مجھے دعوت نامہ ارسال کر دیا۔ میں نے خوشی خوشی درخواست کا فارم بھرا، تحقیقی منصوبہ بنایا اور دعوت نامے کی نقل منسلک کر کے، حسب ضابطہ ٹرسٹ کو بھیج دیا۔ کچھ عرصے بعد مجھے خط ملا کہ میرا نام انٹرویو کے لیے منتخب ہونے والے امیدواروں کی فہرست میں شامل ہے اور ٹرسٹ کے سیکرٹری ٹم بچرڈ (Tim Butchard) مقررہ تاریخ کو امیدواروں سے انٹرویو لیں گے۔ میں بھی حاضر ہو گئی۔ انٹرویو ہوا، نشاط ریاض بھی ٹم کے ساتھ موجود تھیں، بہت اچھی گفتگو ہوئی۔ ٹم نے میری درخواست کا اچھی طرح مطالعہ کر رکھا تھا۔ سوال جواب کرنے اور مجھ سے ایک دو نظمیں مع انگریزی ترجمہ و تشریح سننے کے بعد ٹم نے میری درخواست کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگے:

”آپ کی درخواست بہت متاثر کن ہے، مگر اس میں ایک کمزوری ہے۔“

میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔

”آپ نے جس یونی ورسٹی کا دعوت نامہ حاصل کیا ہے، وہ آپ کے لیے موزوں نہیں۔“

”جی؟“

”میں یہ نہیں کہہ رہا کہ یہ یونی ورسٹی اچھی نہیں ہے۔ لیکن آپ کے مضمون اور موضوعِ تحقیق کے متعلق اس یونی ورسٹی میں وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہاں تو جنوبی ایشیا کے مطالعات کا شعبہ تک نہیں ہے۔ آپ کیسے اس یونی ورسٹی میں تحقیق کریں گی؟“

”یہ تو مشکل نہیں ہے۔ چوں کہ اس فیلوشپ کی شرائط میں یونی ورسٹی کی تدریسی ذمہ داریاں شامل نہیں ہیں اس لیے میں اپنی تحقیق کے وسائل برٹش لائبریری سے حاصل کر سکوں گی۔“ میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”آپ کا مطلب ہے کہ آپ اس دعوت نامے کو صرف فیلوشپ حاصل کرنے کے لیے استعمال کریں گی اور تحقیق کہیں اور کریں گی۔“

”جی ہاں اور جی نہیں، یقیناً میں اس یونی ورسٹی کی ہم نصابی سرگرمیوں میں شریک رہوں گی، یہیں سیمینار بھی دوں گی، پروفیسروں سے تعارف حاصل کروں گی اور اپنی یونی ورسٹی سے تعاون کے امکانات تلاش

کروں گی، جو فیلو شپ کا بنیادی تقاضا ہے۔ لیکن اپنی تحقیق کے وسائل کے لیے لندن اور دیگر شہروں کی لائبریریوں سے استفادہ کروں گی۔''

مگر ٹم میری بات سے قائل نہیں ہوئے۔ کچھ اور رد و قدح کے بعد انھوں نے کہا کہ آپ کا تحقیقی منصوبہ تو لندن یونی ورسٹی کے اسکول اوف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں ہی بہترین طور پر پروان چڑھ سکتا ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ سواس میں بھی ہماری فیلو شپ پیش کی جاتی ہے؟''

''جی ہاں، مجھے معلوم ہے مگر سواس میں ہر سال درخواستیں طلب نہیں کی جاتیں۔''

''چند ماہ بعد وہ پھر درخواستیں طلب کرنے والے ہیں۔ کیا آپ وہاں درخواست دینا پسند کریں گی؟''

مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔

''تو کیا آپ -----؟؟''

''میرا خیال ہے کہ آپ سواس کے لیے درخواست دیں۔ میں ان کے شیڈول سے آپ کو آگاہ کر دوں گا اور آپ کی درخواست کی ایک نقل بھی انھیں بھیج دوں گا، مگر یاد رکھیے، وہ اپنے فیلو کا انتخاب سو فی صد آزادی سے کرتے ہیں۔ میں اس انتخاب پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ آپ کی کامیابی آپ کی درخواست اور تحقیقی منصوبے پر ہی منحصر ہے۔''

اب کچھ اور کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ ٹم نے مجھے اس انتخاب سے باہر کر دیا تھا۔ میں منھ لٹکا کر واپس آ گئی اور عہد کیا کہ ہرگز سواس میں درخواست نہیں بھیجوں گی۔ کون ایک دفعہ پھر اس سارے تکلیف دہ مرحلے سے گزرے۔ درخواستوں کے فارم بھرنا کون سا آسان کام ہے اور ٹم نے کہہ بھی دیا ہے کہ وہ انتخاب پر اثر انداز نہیں ہو سکتے تو پھر فائدہ ہی کیا ہے۔

میں چپ چاپ واپس آ گئی اور انگلستان جانے کا خیال دل سے نکال دیا۔ کچھ دن بعد برٹش کونسل سے مجھے باقاعدہ اطلاع بھی مل گئی کہ میرا نام اس سال کے منتخب فیلوز میں شامل نہیں ہے۔

اس واقعے کو چند ہی روز گزرے تھے کہ مجھے ٹم کا برقی خط موصول ہوا جس میں سواس میں درخواست دینے کی تاریخ اور طریق کار سے آگاہ کیا گیا تھا اور مجھے کہا گیا تھا کہ اگر میں چاہوں تو اس سال کے سواس کے مخصوص فیلو کے لیے اپنا تحقیقی منصوبہ اور درخواست بھیج سکتی ہوں۔ کافی دن تک میں نے اس مشورہ پر کان نہیں دھرا۔ پھر یکا یک مجھے جوش سا آیا۔ ٹم کی وعدہ پوری کرنے کی ادا بھی مجھے بھائی اور میں نے وہی منصوبہ ایک نئی درخواست کے ساتھ سواس روانہ کر دیا۔ درخواست دینے کی آخری تاریخ جولائی ۲۰۱۲ تھی اور اشتہار میں صاف صاف لکھا تھا کہ انتخاب کی اطلاع اکتوبر ۲۰۱۲ کے اواخر تک دی جائے گی لہٰذا اس دوران تفتیش کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ میں نے بھی درخواست دے کر کان لپیٹ لیے۔

اکتوبر کا دوسرا ہفتہ تھا کہ مجھے سوآس فیلو کے طور پر منتخب ہونے کی اطلاع مل گئی۔

تحقیقی منصوبہ

میں نے سوآس میں جو تحقیقی منصوبہ بنا کر بھیجا تھا اس کا موضوع تھا:

The West in South Asian Muslim Discourse: A Study of Urdu travelogues, Notes and Letters 1757-1857

اس موضوع پر کام کرنے کا خیال کافی عرصے سے میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔ کچھ سال پہلے میں نے پاکستانی اردو افسانے پر گیارہ ستمبر کے واقعے کے اثرات کا مطالعہ شروع کیا تھا۔ اسی مطالعے کے دوران مجھے خیال آیا کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں اور مغرب کے درمیان جس کشمکش کو تہذیبی تصادم اور نظریاتی یا مذہبی ٹکراؤ کا نام دیا جا رہا ہے اور جس کی بنیاد پر مسلمانوں، خاص طور پر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو بنیاد پرست اور دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے، اس کے تاریخی تناظر کا مطالعہ کروں اور یہ جاننے کی کوشش کروں کہ کیا مسلمان ہمیشہ سے مغربی تہذیب کے مخالف ہیں؟ کیا انھیں سائنسی و علمی ترقی اپنے مذہبی عقائد کی دشمن معلوم ہوتی ہے؟ کیا وہ مغربی معاشروں کی بنیادی اقدار کے دشمن ہیں؟ آج سے کم و بیش ڈھائی سو برس پہلے جب انگریزوں نے عملی طور پر ہندوستان پر سیاسی و عسکری غلبہ حاصل کر لیا تھا، تو اس وقت کے ہندوستانی مسلمان اسے کس نظر سے دیکھتے تھے؟ مغلوں کے زوال کے بعد انگریز ہندوستان کی نئی سیاسی قوت بن کر ابھرے تو مقامی باشندوں، خاص طور پر مسلمانوں نے اس سیاسی قوت کے سامنے کیسے مزاحمت کی؟ اس مزاحمت کا رنگ محض سیاسی تھا یا علمی، معاشرتی اور ادبی سطح پر اس مزاحمت کے آثار نظر آتے ہیں؟

یہ ایک بہت بڑا منصوبہ تھا اور میرے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ ہر سطح پر اس سوال کا جواب حاصل کر سکوں۔ اس لیے میں نے اس کے صرف ایک پہلو کو پیش نظر رکھنے کا پروگرام بنایا۔ میں نے ان سفرناموں، یادداشتوں اور خودنوشتوں کا مطالعہ کرنے کا ارادہ کر لیا جو ۱۷۵۷ سے ۱۸۵۷ء تک کے عرصے کے دوران، جنوب ایشیائی مسلمانوں نے مغرب کے بارے میں رقم کی تھیں۔ یوں بھی تاریخ کے علم کا بڑا ماخذ کسی خاص دور کی تحریریں ہوتی ہیں خواہ وہ علمی و ادبی کاوشیں ہوں یا مختلف نوعیت کے ریکارڈ اور دستاویزات۔

جب میں نے اس موضوع پر کام کرنے کے لیے ابتدائی معلومات اکٹھی کرنا شروع کیں تو مجھے معلوم ہوا کہ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں یعنی ۱۷۵۷ کی جنگ پلاسی کے بعد سے، جب انگریزوں نے بنگال اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کر لی، انھیں وہاں کے زمین داروں سے ٹیکس جمع کرنے کا اختیار مل گیا اور عملی طور پر وہ ہندوستان کے ایک بڑے علاقے کے حکمران بن گئے تو ہندوستان میں سماجی و معاشرتی سطح پر کئی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ ہر دور کے حکمرانوں کی طرح انھوں نے بھی اپنے عہد میں، مقامی مؤرخین کی

سرپرستی کر کے ان سے تاریخیں لکھوائیں، کتب تصنیف کروائیں اور ان کی زبان و ادب کی سرپرستی کی۔ اسی زمانے میں دیار مغرب کے اولین سفرنامے لکھے گئے جن میں پہلی بار ہندوستانی مسلمانوں نے مغربی تہذیب و تمدن، سیاست اور معاشرت پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ان سفرنامہ نگاروں کے سفر کے مقاصد بہت مختلف تھے۔ ان میں سے کچھ تو سفارتی یا سیاسی مقاصد کے تحت انگلستان گئے تھے، کچھ کو ملازمت کی مجبوری سے جانا پڑا، کچھ نے علمی تجسس اور پیاس کی تسکین کے لیے اس سفر کی صعوبتیں برداشت کیں، کچھ کسی انگریز مربی کی محبت یا مروت میں وہاں پہنچے اور کچھ محض سیر و سیاحت کے شوق میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ مقاصد کے ساتھ ساتھ ان کی سماجی حیثیت میں بھی فرق تھا۔ ان میں سے کچھ اپنے علاقوں کے رئیس تھے اور طبقۂ امرا میں ان کا شمار ہوتا تھا، کچھ آسودہ حال مگر درمیانے طبقے کے افراد تھے اور کچھ عام ملازمت پیشہ لوگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے اپنے زمانے، سماجی مرتبے اور علمی حیثیت کے مطابق اپنا احوال مختلف زبانوں میں بیان کیے ہیں۔

یوں میرے کام کی تحریریں کم از کم چار مختلف زبانوں میں موجود ہیں، جن میں عربی، فارسی، اردو اور انگریزی شامل ہیں۔ ان میں سے چند ایک تک رسائی حاصل ہو گئی اور چند ایک کے اصل متن تک پہنچنے کے لیے مزید کوشش درکار تھی۔ لگتا تھا کہ ہندوستان یا برطانیہ جائے بغیر بات نہیں بنے گی، مگر اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ ہماری یونی ورسٹی تحقیق کے لیے فنڈ تو فراہم کرتی ہے مگر وہ سفر پر خرچ نہیں کیے جا سکتے اور یہاں مسئلہ ہی سفر کا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ پرانے ذخائر اور مخطوطات جھانک کر دیکھ لوں، شاید کہیں کوئی ایسی تحریر بھی مل جائے جو ابھی تک منظر عام پر نہیں آئی، شاید کوئی نئی دریافت ہو جائے، شاید میں کوئی تیر مار سکوں۔

ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ سوآس کی فیلوشپ کا امکان روشن ہو گیا۔ مگر میں نے ابتدائی معلومات حاصل کرنے کا کام جاری رکھا۔ جوں جوں اس بارے میں میری معلومات بڑھتی گئیں، میرے شوق اور تجسس میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ جب میں نے لندن میں قدم رکھا تو میں اکیلی نہیں تھی۔ مرزا اعتصام الدین، دین محمد، میر محمد حسین، ابو طالب لندنی، یوسف خان کمبل پوش، نواب عبدالکریم، مسیح الدین علوی اور لطف اللہ بھی میرے ساتھ تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے میری دو نہیں، اٹھارہ آنکھیں ہیں، میں جہاز کی کھڑکی سے جھانکتی تو مجھے سمندر کی وہ طوفانی لہریں سنائی دیتیں جو ''ازابیلا''، ''مورس'' اور ''یورپا'' پر پہلی بار سمندری سفر کرتے ہوئے ان مسافروں کو صدیوں قبل سنائی دی تھیں، کبھی کہیں سے فلائنگ فش کا نظارہ دکھائی دیتا، کبھی جھولتے ہوئے جہاز کے ہچکولے میرے ذہن کی کسی عقبی کھڑکی سے برآمد ہوتے اور کبھی دور کہیں سینٹ ہیلنا اور کیپ اوف گڈ ہوپ کے ساحلوں کی ہوا مجھے چھو کر گزرتی۔ پھر ان سب کی حیرتیں،

مایوسیاں اور مسرتیں بھی مجھے جھیلنا پڑتیں۔ فٹ پاتھ دیکھ کر حیران ہونے والے، رات کو سڑکوں کے کنارے جلتے ہوئے لیمپوں کی روشنی سے مرعوب ہو جانے والے، باغوں اور فواروں کے نظارے سے مسحور ہونے والے، اور دوسری طرف اپنے مشن کی ناکامیوں کا دکھ اٹھانے والے اور اخلاق و انصاف کے پردے میں چھپی خود غرضانہ بے رحم سیاست کا شکار ہونے والے، ہندوستان کے مسلمان مسافر میرے اندر دوبارہ جی اٹھے تھے۔

لندن پہنچے ابھی چند ہی روز ہوئے کہ ایک نسوانی سایہ بھی میرا ہم سفر ہو گیا۔ یہ مریم تھی۔ پہلی ہندوستانی خاتون، جسے جہانگیر (۱۶۰۵ ۔ ۱۶۲۷) نے ملکہ الزبتھ کے نوجوان سفیر ولیم ہاکنز کو اپنے دربار سے وابستہ رکھنے کے لیے، اس کی زوجیت میں دے دیا تھا اور وہ ۱۶۱۴ میں لندن پہنچی تھی لیکن جب اس کا سفر شروع ہوا تھا تو وہ ولیم ہاکنز کی شریک حیات تھی اور جب ختم ہوا تو ٹاورسن اس کی تقدیر اور زندگی کا مالک بن چکا تھا۔ ہاکنز نے کسی پراسرار وبائی مرض کا شکار ہو کر راستے ہی میں دم توڑ دیا تھا۔ یہ واقعہ میرے زمانہ تحقیق سے بہت پہلے سترھویں صدی کی دوسری دہائی میں پیش آیا تھا لیکن مریم کی حیرت اور قسمت کے دھچکے بھی میرے ہم رکاب ہو گئے۔

اب لندن میں اکیلے گھومنا کہاں ممکن رہا تھا۔ ایک جلوس میرے ہمراہ تھا اور اس جلوس کی قیادت اسی دشمنِ جاں، اسی ہم ذات کے ہاتھ میں تھی جس نے میری زندگی کو دو ٹکڑے کر رکھا ہے۔ نصف صدی ہونے کو ہے، میری اور اس کی جنگ ختم ہوتی ہے نہ ہم دونوں میں صلح کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ اس دونیم زندگی کو جھیلتے جھیلتے میری قوت حیات ادھموئی ہو گئی ہے۔ جب بھی میں کسی ایک نتیجے پر پہنچتی ہوں، تصویر کا دوسرا رُخ مجھے اپنی جھلک دکھانے لگتا ہے۔

”حقیقت صرف سفید نہیں ہے بی بی! یہ سیاہی بھی حقیقت ہے۔ اسے بھی دیکھو!“

میرا ایمان کے اندر کفر اور کفر میں ایمان دکھائی دینے لگتا ہے۔

گناہ اور ثواب، سزا اور جزا، اندھیرا اور اجالا اس طرح مدغم ہو جاتے ہیں کہ ایک دھند لکے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

اگر یہ میری نظر کی کمزوری ہے تو کاش کوئی مجھے ایک عینک لا دے،

اگر یہ عقل کا فتور ہے تو کیا وہ سارے یونانی، جرمن اور فرانسیسی فلسفی مل کر بھی اس کمی کو پورا نہیں کر سکتے؟

اور اگر یہ روح کی بیماری ہے تو کہاں ہیں ممتاز مفتی کے دھوبی اور اشفاق احمد کے رنگ ریز، کیوں اس کا مداوا نہیں کرتے؟

توصیف تبسم

آخری مکالمہ

انھیں پتہ تو معلوم ہوگا
سنو، یہ جزیرہ بھی معدوم ہوگا!
سمندر کے چاروں طرف اک سمندر ہے
سفر کرنے والوں کو معلوم ہوگا!
نئی اور پرانی، بڑی اور چھوٹی
سبھی کشتیوں کا مقدر فنا ہے
ہوا کے تھپیڑے
پھٹے بادباں کب تلک سہہ سکیں گے!
سنو!
کالے پانی کے نیچے تہوں میں

جو لاوا چھپا ہے
وہی ابتدا اور وہی انتہا ہے!
بظاہر سمندر پہ کائی کی تحریر ساکت ہے
مگر اس کے نیچے اک آتش فشاں ہے
وہ دیکھو!
سمندر کے سینے پہ کھلتے ہوئے بادباں کی نشانی
فریب سفر ہے
فریب نظر ہے!
اُدھر جلتے سورج کے نیچے
پسینے میں ڈوبے بدن، چپوؤں پر ہتھیلی جمائے
بپھرتے سمندر کے غیظ و غضب سے الجھتے
سمندر کہاں جا کے گرتا ہے
سنو!
یہ جزیرہ بھی معدوم ہو گا

عبدالرشید

ہاتھوں کی کہانی

کالی رات میں ہر عفریت بھیانک ہے
اور یہ میرا سایہ بھی عفریت ہے
یے سے یے تک
ہر تقریر کا منبع ہے

پھسلن سے بڑھ کر پھسلن ہے
ہاتھ ادھورے ہیں
دیوار پہ ان کا نقش برائے حیرت ہے

ایسے خاکوں کے موجد ہیں
خود بھی خام مواد کی صورت

کسی پُرانے کشف کے بکھرے حصّے ہیں

بارش ان کو پھاہا ہے اور موسم کی دلداری سے
پھپُھولے ہیں، ایک جنہیں دو ہیں یہ
اپنی تنہائی کے ساتھی
میرا جو بھی نام ہو یہ تو اصلی ہیں

جو بھی دشواری ہے اس کا رستہ ہیں
جو بھی کنارے پر ہیں اُسے دھکیلنے والے ہیں
چُپ بیٹھے ہوں تو جُھرمٹ ہیں

دل بھی ٹُوٹنے والی چیزوں کی تقدیر ہے
لیکن ہاتھ تو بکھری چیزوں کے معمار ہیں
بخیہ کھول کے بخیہ سینے والے
سر حجاب سے بے پروا

ذہن سے دانہ دانہ پھسلتا رہتا ہے
چیزوں اور اشکال میں جو تفریق ہے
ساری گڈ مڈ ہے
ہاتھ بھی اور بستر بھی مردم دیدہ ہیں

جیسے زخم کو چھیلیں ایسے ہاتھوں کو دھوتا ہوں
کسی پُرانی یاد کے دھبّے جو ناسور بنے ہوں

نموں کے زیرِ جاں چشموں میں پنپ رہے ہوں

ہاتھ قلم کے موجد تھے جب سالم تھے
قرطاس میں سپنے بو کر زندہ دل
اب تھک کر چور سپاہی کی مانند ہیں
ہار کے جو افسردہ گھر کو لوٹ رہا ہو

محمود شام

اپنی دریافت

میں اپنی ذات کے زنداں میں خود مقید تھا
مرے حواس گرفتار کر رہے تھے مجھے
کشاکشوں نے کیا تھا محاصرہ میرا
طناب کھینچ رہے تھے ہر ایک رخ اعصاب
مرے سوال مجھے لاجواب کرتے تھے
مرے خیال مرا احتساب کرتے تھے
سمٹ گیا تھا میں اپنے ہی خول میں کچھ روز
اک اضطراب مجھے ریزہ ریزہ کرتا تھا
عجیب حشر مری سانس سانس برپا تھا
یہ اپنا شہر مجھے اجنبی سا لگتا ہے
کہ آس پاس مرا ہو رہا تھا بے معنی
وہ ماہ و سال جو میرے ہی تھے گزارے ہوئے
مرے ہی سینے میں سنگین تھا تارے ہوئے
عجب لڑائی تھی۔ دونوں طرف ہی میں خود تھا

مرے دماغ میں چھڑتی تھیں نت نئی جنگیں
ہوئی ہے صلح ۔ کئی دن مذاکرات کے بعد
بہت سکون ہے دنیا میں کشف ذات کے بعد
اب اپنے آپ میں بھی خود کو دیکھتا ہوں میں
اور اردگرد بھی خود کو ہی پا رہا ہوں میں
یہ سارا شہر یہ دنیا مرا تسلسل ہے
گئے زمانے بھی میرے نئے زمانے بھی
میں اپنے آپ سے نکلا تو پا سکا خود کو

محمد اظہار الحق

خواب زار

جس آراستہ حجلۂ جاں فزا میں تولّد ہُوا تھا
وہاں اب مویشی بندھے ہیں
انار اور ریحان، سیب اور انجیر کا باغ اب تک نہیں لگ سکا ہے
نہ اس بین کرتے خرابے میں کوئی عمارت بنی ہے
جو خشتی فصیل اردگرد اس کے اٹھی بھی ہے
تو فقط وحشتوں میں اضافہ ہوا ہے
وہ کیکر کے دو پیڑ جو وسط میں تھے
جو برسوں کے ہمراز تھے
چلچلاتی ہوئی دھوپ میں بان کی چارپائی
گھسٹتی ہوئی چارپائی
پہ سائے کی چھت ڈالتے تھے
اب ان میں سے اک رہ گیا ہے
ڈھلکتی ہوئی عمر کے ضعف میں جو بچا ہے

برس ہیں کہ ہفتے، مہینے ہیں یا چند لمحے
اجازت بھی تعمیر کی جانے افلاس کو دے سکیں گے
مرے تین بیٹے
مرے بعد کس کو خبر ہے
اب وجد کے اس قطعہء بے نشاں کو کوئی شکل دے پائیں گے یا نہیں

لیکن اک عالمِ سرخوشی
جو پر اسرار خوابوں میں اکثر میسر ہے، حیران کن ہے
حویلی اسی ثروت وشان سے اب بھی قائم ہے
کمرے بھی موجود ہیں
وہ بھی جس میں تولد ہوا تھا
جو مشرق کے رخ پر ہیں وہ بھی اسی طرح ہیں
نیم چھتی پہ جس کی کتابیں رکھی تھیں وہاں بھی
کئی بار کیا سینکڑوں بار جانا ہوا
اس کے اندر جو تاریک حجرہ نما کوٹھری تھی
جہاں ساز وسامان تھا اور زینیں پڑی تھیں
کئی بار روشن ہوئی ہے
کوئی حصۂ صحن ایسا نہیں ہے جہاں
اک نہ اک رات سورج نہ اترا ہو
ہم جولیوں کی معیت میں کھیلا نہ ہو

یہ تو کل رات کا واقعہ ہے
درختوں کے سائے میں بستر لگے تھے
بہت آمد و رفت تھی
میہماں تھے
سواری کے گھوڑے تھے
خدام تھے
دوغ شیریں کے اور شیر کے جام تھے

جدامجد تھے، ان کی کتابیں تھیں، فرزند تھے
فقہ اور شاعری کے نظارے تھے
کیا نرم گفتار تھے اور دری بولتے تھے
ہوا چل رہی تھی
درختوں کی اس سمت جو باغیچہ تھا
وہاں پھول ہی پھول تھے
پھول جو جاگتے میں زمانوں سے دیکھے نہیں تھے ۔

نصیر احمد ناصر

محبت آخری نشانی ہے

جب کشتیاں دریاؤں سے
اور کنارے پانیوں سے اوب جائیں
اور راستے بستیوں کے نواح سے گزرتے ہوئے
اچانک کسی ہائی وے کی زد میں آ کر کچلے جائیں / تو سمجھ لینا
زمین پر میرے اور محبت کے دن پورے ہو چکے ہیں
اور میں آخری معرکہ بھی ہار چکا ہوں
اور تمہاری بھیجی ہوئی دعاؤں کی کمک
اور اپنے محافظ لفظوں سمیت مارے جانے سے پہلے
کسی تنگ نشیبی راستے میں / زخموں کی تاب لانے
اور تابکار شعاعوں سے آکسیجن کشید کرنے کی
بے سود کوشش کر رہا ہوں
اور عین جنگاہ میں
تمہارے لیے لکھی ہوئی نظمیں

اور امن خوابوں سے بھری ہوئی ڈائریاں
اُن درختوں کے ساتھ ہی کوئلہ بن چکی ہیں
جو شعاعی حملے سے پہلے
پھولوں سے لدے ہوئے تھے
اور جن کے نیچے میں آخری بار بیٹھا تھا
اور سوکھی روٹی کے ٹکڑے بمشکل حلق سے اتارے تھے
اور پانی کے بچے کھچے چند قطروں سے ہونٹ تر کیے تھے
اور جب تم دیکھو
کہ وقت اچانک رک گیا ہے
اور شام کی اذانیں بلند ہونے سے پہلے دن طویل ہو گیا ہے
اور کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے
تمھیں ہر چیز بدلی ہوئی لگے
تو بے چین ہو کر مجھے یاد نہ کرنا
ورنہ وہ آسانی سے
تمہارے دل کے راستے سے مجھ تک پہنچ جائیں گے
اور میری موت کو
فتح کی نشانی کے طور پر حنوط کر لیں گے
اور جب میرے بجائے
کوئی اور جانور نما مخلوق
تمہارے فارم ہاؤس پر پہنچے
تو حیران مت ہونا
اور چپکے سے دروازہ کھول دینا
اور وہ استقبالی بوسے
جو تم نے میرے لیے پس انداز کر رکھے ہیں
کسی خلائی بھیڑیے کے برقی ہونٹوں سے مَس کرتے ہوئے
رو مت پڑنا
ورنہ زمین پر ہمیشہ کے لیے دھوئیں کے بادل چھا جائیں گے
اور جب ہوا کا آخری جھونکا پورٹیکو میں سے گزرتے ہوئے

سرگوشیوں میں میرا پیغام ڈی کوڈ کرنے کی کوشش کرے
تو اس طرف مڑ کر مت دیکھنا
ورنہ وہ تمہاری روح کے کمزور ترین حصے سے واقف ہو جائے گا
اور وہیں اپنے مشینی دانت گاڑ دے گا
اور سنو!
مکمل سپردگی سے پہلے/کسی اور نشانی کا انتظار مت کرنا
انسانی ادوار میں
محبت کا مرنا آخری نشانی ہے!!

تبسم کاشمیری

شہر کا نوحہ

سب دروازے بند ہیں
روشنی کی آواز نہیں سن سکتے/سب دریچے بند ہیں
خوش بو کی دھڑکن سنائی نہیں دیتی
پنچھی کی اڑان ساکت ہے
باغوں میں لہو کے پھول اگتے ہیں
لاشوں کی پنیری بوئی جاتی ہے
مردے اگنے لگتے ہیں
لہو کی کھاد بہت زرخیز ہے
بادل برس برس کر تھک گئے ہیں
وہ چھتوں پر سہمے ہوئے کھڑے ہیں
بارش نوحہ پڑھ رہی ہے
دریا ایک ماتمی دھن سن رہے ہیں
سڑکیں سجود میں ہیں
دن خون سے لتھڑی آنکھیں

اور اپنا دریدہ بدن اٹھائے
فصیلِ شہر کے نیچے گُم سُم پڑا ہے
رات دروازوں سے سر ٹکراتی ہے
شہر بارود پہ بیٹھا ہے
سب دروازے بند ہیں / میں کسے آواز دوں
مری آواز بے آواز ہو چکی ہے
مری لالٹین ٹمٹمانے لگی ہے
اور اندھیرا شہر کو نگلنے والا ہے

صبا اکرام

کاسہ گیر

فلک سے کوئی عذاب اُترا
نہ آگ برسی
سیہ شب کے کسی پہر میں
جو دی تھی سیلِ بلا نے دستک
ہمارے دَر پر
اُسی درندہ صفت گھڑی کے
شِکم سے پیدا ہوا ہے
چنڈال جیسا کوئی
کہ جس کی آمد سے
گھر نہ آنگن نہ چھت سلامت
سپرد کر کے اُداس طاقوں کے

اپنے سارے ادھورے سپنے
اَنا کے کھیتوں کو لانگ کر ہم
سلگتے صحرا میں تشنگی کے
اُٹھائے کاسہ بھٹک رہے ہیں!

زاہد مسعود

خود ساختہ مشکلات کا نوحہ

تاریخ
حکمرانوں کے جھوٹ کو سچ بناتی ہے
جغرافیے کے مفادات
لوگوں کے خون کا سودا کرتے ہیں
ہم
تاریخ اور جغرافیے کی زنجیریں
آنے والی نسلوں کے پاؤں میں ڈال رہے ہیں
انھیں
بیداری سے بچانے کے لیے
خود ساختہ نظریے کی افیون چٹاتے ہیں
پرندوں، ہواؤں اور دریا کی لہروں کا کاروبار

نو پرافٹ نو لاس پر چلتا ہے
شاید اسی لیے
ان کی آزادی امر ہے

☆☆☆☆

ایوب خاور

اندھیرے کی مٹھی نہیں کھل رہی

(علامہ اقبال کے حضور)

اندھیرے کی مٹھی نہیں کھل رہی
اندھیرے کی مٹھی کسی سے نہیں کھل رہی
اندھیرے کی مٹھی میں بند ایک ڈبیہ ہے، ڈبیہ میں جگنو ہے
اور حبسِ بے جا میں ہے
پہرے داروں کے آپس کے جھگڑوں میں
ڈبیہ کی چابی کہیں گم ہوئی ہے/ گما دی گئی ہے/ کہ تالا لگا کر کے
چابی کو مٹھی کی درزوں کے اندر ہی سرکا دیا ہے کسی نے
کسی کو خبر ہی نہیں یا بتاتے نہیں ہیں جو اس راز کو جانتے ہیں
میں جس پیڑ کی سبز پتوں بھری شاخ پر آ کے بیٹھا تھا
اب وہ سیہ ہو چکی ہے/ دھواں اٹھ رہا ہے
اب اس پیڑ کی کچھ جڑوں سے دھواں اٹھ رہا ہے
دھوئیں میں اندھیرے کی بھی سانس گھٹنے لگی ہے
نظر کچھ نہیں آ رہا/ حبس کی صورتِ حال میں
وہ جگنو بجھے جا رہا ہے

اندھیرا کثافت کی میلی چکٹ ایک چادر کی مانند/ مجھ سے لپٹتا چلا جا رہا ہے
مرا دم گھٹا جا رہا ہے، مرے شاعرِ نکتہ داں!/ اے مرے راز داں!
کون فرعون ہے/ جس کے جادوگروں نے
اندھیرے کی مٹھی پہ ایسا کوئی سخت جادو کیا ہے
کہ بینائی کے ساتھ دانائی بھی منجمد ہو گئی ہے
یہ جگنو جو بے حس اندھیرے کی مٹھی میں بند ایک ڈبیہ کے اندر بجھے جا رہا ہے
اگر مر گیا تو؟

آصف ہمایوں

ہجرت

کسی شام دشتِ مُراد سے
چلیں ہجرتوں کی رُتوں میں ہم
کہ بھری ہیں جتنی بھی جھولیاں
خس و خار سے، گُلِ زخم سے
ہیں نشانیاں ترے قرب کی
مِری جان اب تو گزر گئی،
وہ دِلوں کا شعلہ بھڑک چکا
کسی راستے کے سُراغ پر
کوئی ربط اور نہیں کھُلا
جو بچا ہے رختِ سفر تو یہ

ابھی دردخانۂ دل میں ہے
ابھی زخم آنکھ کے تل میں ہے
ابھی اشک برف کی سِل میں ہے

☆☆☆☆

ماہ طلعت زاہدی

آزادیِ نسواں کے نام

سرخوشی سوگئی
روشنی سوگئی
دوستی سوگئی
خواہشِ وصل کیا
ہجر کی بے کسی سوگئی
زندگی کیا سے کیا ہوگئی
ایک کڑوا سا سچ
ایک جھوٹی قسم
ایک ٹوٹا بھرم
کس کی آنکھوں سے
نیندیں خفا ہوگئیں
کس کی باتوں سے
تاثیر جاتی رہی
دن گذرتا رہا
رات ڈھلتی رہی

خواب جائے اَماں
ڈھونڈتے رہ گئے
کام دنیا کے
ہر طور چلتے رہے
کس کی تنہائی
آنسو بہاتی رہی
کس کی پرچھائیں/سب سے نبھاتی رہی

فرخ یار

رودبارِ انگلستان کی کہانی

دن
جو میں نے اور مظفر نے
دل پتیاں والے فیضی سنگ گزارے
وہ ساتوں دن
بے ترتیب زمانوں میں
خوابوں کا اندولن ہیں
دوپہروں کی بے چینی میں
جیتے جاگتے حرف ہیں
دو آنکھوں، دو کانوں والے
جن کے ہاتھوں میں گندم کے خوشے
پوروں کی گنتی سے
ضربیں کھا کر
لامتناہی ہو جاتے ہیں

وہ ساتوں دن

جن میں باغ ہیں
پھول اور پھل ہیں
جو آنکھوں
گالوں اور سینوں سے ٹکراتے ہیں
تو گرما گرم وجود کے
بحری نقطے پہ
ڈھیرے ڈھیرے
دروازہ کھلتا ہے
رات کے پچھلے پہر کہیں
شہزادے اور شہزادیاں
ننگے پاؤں گھومتے
آخر موری دروازے کی گلیوں،
صحنوں، دالانوں میں سو جاتے ہیں
تاگا تاگا بنے گئے سالوں سے
نیلے دریاؤں کی تانت نکلتی ہے
اور چاند کی بڑھیا کے چرخے سے جا ملتی ہے
ہم اپنے ہی سائے میں
خوش فہمی کھینچے رہ جاتے ہیں

یہ ساتوں دن
سات جنم ہیں
سات قدم ہیں
جن کی راتیں
دن سے روشن
جن کے اندر دھڑک بھڑک کر

زندہ رہنے کی خواہش ہے
ہم اس خواہش کے سینے پر
کاگت کی پڑیا چپکا کر
میلوں دور نکل جاتے ہیں
فیضی جاگتا رہتا ہے

سعید احمد

قاصدی پھول کے خیال میں

کتنے برس رہے گی
بے نام کی اداسی
جو شام خواب میں ہے
اس شام کی اداسی
اک غیب کی گلی سے
آتی ہوئی مسلسل
آواز کب سنوں گا
پتھر بنا ہوا دن
جس سے پگھل پڑے گا
وہ ساز کب سنوں گا
گنتی کی دسترس میں
آئیں گی جب سمٹ کر
دردوں کی یہ قطاریں

جو شام خواب میں ہے
اس شام کا کنارہ
چھو لیں گی جب لپک کر
مرغابیوں کی ڈاریں

☆☆☆☆

بابر یعقوب

ہم دیوداسیاں ہیں

ہم دیوداسیاں ہیں
ان مندروں کی جن میں
گھاؤ سی گہری، کوکھ سے کوری گپھائیں ہیں
اور کوری گپھاؤں میں ہیں نس نس تراش پلتے گیندے کے پیلے پاپ
آدرش کے لہو میں لتھڑے فرش پہ دھکے مردنگ انگ میں ہے جیون کتھا کی تھاپ
ہم دیوداسیاں ہیں
ایسے پروہتوں کی
جو رات کے دلوں میں وہ پھونکتے ہیں منتر
کہ دودھیالے جسموں پہ رینگتے، لپٹتے، اندھے، حریص ناگوں کے لیس لیس نتھنے جنگل کا سانس پی لیں
موروں کے پر جلا دیں
کلیوں کے گھونسلے میں کوئل کی چونچ سی دیں
ہم دیوداسیاں ہیں
ان دیوتاؤں کی جو
آکاش کے سنگھاسن پہ چاندنی کی مایا میں دیکھتے ہیں درپن
ہم دیوداسیاں ہیں

دھرتی کی دھوپ، بھوک کی کالک، اچھوت چھایا میں جھیلتے ہیں جیون
جن کے اداس آنگن
میں گھنگھروؤں کی چھن چھن
بکھری تو لیکھ جاگے
نہ آتما کے پیچھے، نہ آتما کے آگے
آنکھوں کے سارے سپنے، دل کی تمام دھڑکن

ارشد معراج

اشتہار گم شدگی

ہماری تاریخ ٹائلٹس میں لکھی ہے
شجرہ، رڑیوں پر
سواں نے بہنے سے انکار کر دیا ہے
اور سفید بگلوں نے دریا کنارے رزق تلاش کرنے سے

اشتہاری لڑکی کو دیکھ کر
آنکھوں میں شہوت بھر آتی ہے
ہونٹ سلگنے لگتے ہیں
سانس پھولنے لگتی ہے
بدن کانپنے لگتا ہے
ازار بند ڈھیلے ہونے لگتے ہیں
ہمیں حدا امجد کا اشتہار گم شدگی دینا ہوگا

☆☆☆☆

ناہید قمر

ایک دعا کا ابتدائیہ

دل مُصِر ہے
سو لکھتا ہے زمانے راکھ ہیں
راکھ اہلِ دید کا رختِ سفر
دنیا و دیں
راکھ منبر اور مقابر
آگہی، وہم و یقیں
حلقۂ چشمِ فنا میں
صبر کی مضراب پہ
جرعہ جرعہ آنسوؤں کے تعزیے چلتے ہوئے
راکھ ہے پیمان دیوں کی
اے نگاہِ منتظر
جل چکے جو تیری محرابِ تغافل سے پرے

دفترِ کذب و ریا میں
منصفی کے باب میں
منحرف دورانیے کا طول ہی معمول ہے
ماجرائے غیر ہے رسمِ شہادت، خوں بہا
تہمتِ نفع و تجارت
کشتگانِ شوق پر
اک سراساں یاد کے محور پہ کفنایا ہوا
تہنیت کا شور کہلائے
عزاداروں کے بین
فیصلہ لکھیے بیانِ واقعہ سے پیشتر

خواب کی اجلی بشارت
لفظ کا پارس کوئی
زندگی کے حاشیے پر
بر سرِ سیلِ فراق
بھرتی آنکھوں نے باندھا
پُل دعائے سبز کا

عصرِ نو کو کس زماں کے رمز پر تاویل دیں
خطِ ماضی گنجلک ہے
لوحِ آئندہ اَدَق
کوئی اکسیری اشارہ
اے خدائے معرفت!
دل محوّر رہے

☆☆☆☆

شہزاد نیّر

کس گھاٹ لگوں

کس ساگر میں اتر پڑا ہوں
ہر رستے پر کتنی لہریں آگے پیچھے نکل رہی ہیں
جھاگ اڑاتی، ظلم کماتی
اپنے من کی موج میں بہتی
لہریں، لہریں نکل رہی ہیں
پیچ و تاب کی لہروں پر میں بل کھاتا لہراتا جاؤں
بے مرضی، بے قابو، بے دم بہتا جاؤں
بے بس ہاتھ بدن سے باہر
کس گرداب نے تھام لیے ہیں
گھوم رہا ہوں
دو پاٹوں میں پسنے والو مجھ کو دیکھو
سینکڑوں پاٹوں میں پستا ہوں
دور کنارے آنکھیں بھیج کے سارے منظر دیکھ رہا ہوں

ریت، کھجوریں، اونٹ، چٹائی
فوکس سے باہر لگتے ہیں
فولادی عفریت کی صورت
صاف دکھائی دینے والی موت سمندر میں پھرتی ہے
رنگ برنگی چھتری نیچے
رنگوں کی دھجیوں سے اپنے عضو چھپائے
تن کی لہر پہ مست ہُلارے لینے والے لوگ بہت ہیں
اُلٹے سیدھے پڑے ہوئے ہیں!
دُور کھڑے ننھے چہروں پر چُبھنے والی ریت اُڑتی ہے
میلی اور مٹیالی آنکھیں
حیرت حسرت گود میں لے کر
گورے چہرے دیکھ رہی ہیں
رنگ رنگ کے گھاٹ کھُلے ہیں
آسمان بے رنگ پڑا ہے
بند پڑا ہے
آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں
بے بس بازو ٹوٹ رہے ہیں
اور بھنور بے باک ہُوا
بادبان کے ساتھ گریباں چاک ہوا
کس اوٹ سیوں
میں کھارا پانی آنکھوں کا۔ کس اوک پیوں
بچکولے کھاتا جسم لیے کس گھاٹ لگوں؟

☆☆☆☆

فاضل جمیلی

مجھے کمرہ بدلنا ہے....!

مجھے کمرہ بدلنا ہے
یہ سیلنگ فین بوڑھا ہو چکا ہے
کھانستا رہتا ہے راتوں کو / مجھے گھڑیال کی یہ بے تکی،
ٹِک ٹِک بھی اب اچھی نہیں لگتی
یہ دیواریں اُدھڑتی جا رہی ہیں،
جس طرح بنیان اُدھڑتی ہے
یہ دروازے، یہ روشن دان / اِک دوجے سے لڑتے ہیں
چٹائی اور تکیے کی بھی آپس میں نہیں بنتی
ہواؤں سے لرزتی کھڑکیوں کو
اور کتنے دن تسلی دوں / سجی ہیں شیلف میں یا
جا بہ جا بکھری ہوئی ہیں اب / نہیں ہے ان کتابوں سے
کوئی بھی گفتگو میری
یہ آئینہ، کمینہ مجھ سے کہتا ہے
”تمہارا عکس دُھندلا ہے
وجودِ نامکمل ہو / تمہاری ذات اب ٹوٹے ہوئے
اِس فرش جیسی ہے

پہ استر کاریاں کر کے جو تم گھر سے نکلتے ہو
ادا کاری تو کرتے ہو…''
کہوں کیا اِس کمینے سے
کہ میں ایسا نہیں تھا، ہو گیا ہوں
مجھے اس بے یقینی سے نکلنا ہے
مجھے کمرہ بدلنے دو، مجھے کمرہ بدلنا ہے…!

محسن شکیل

زلزلہ زدگان کے لیے

آنسو مداوا تو نہیں بنتے غموں کا
پھر بھی میرے پاس لکھنے کے لیے
ایک نظم ہے
اور بہانے کے لیے ایک آنسو
نظم اور آنسو
مل کر
خوشیوں کی ترتیب کا باعث بن سکتے ہیں
نظم کا کاغذ تم چاہو تو
اشکوں کے پانی میں بہا دو
خوشیوں کی کشتی سی بنا کر
غم کے دریا پار بہا دو!
میری نظم اگر تم چاہو
امدادی کیمپ میں جمع کرا دو
خیموں اور پھولوں کے سنگ سنگ

کام آ جائے
زخم بھرنے میں
گر نہ آئے تو کاغذ کی
ناؤ بنا کر
اشکوں کے پانی میں بہا دو!

نوید صادق

میرا ذمّہ نہیں

شام سے ہم پریشان ہیں
کوئی وعدہ، کہیں کوئی عذرِ سخن
ہم سے آگے کہیں کوئی جانا نہیں

ہم سنبھالیں کہاں تک یہ بے داریاں
اے زمیں! تیرے ماتھے پہ جچتی مرے خون کی دھاریاں
میرا ہونا بھی ہیں اور نہ ہونا بھی ہیں

داستاں گو نے کس ڈھنگ دیکھا تجھے
ٹھیک سے بات کی تہہ کو پہنچا نہیں
اور میں ----
صرف اتنی خبر ہے مجھے
خیر میں ---میرے ہونے سے ہوتا ہے کیا!

کوئی ان ہونی ہونے کو ہے
کوئی لاوا کہ اندر ہی اندر

مجھے کیا تمھیں، سب کو کھانے لگا

سال ہا سال اس قریۂ خواب میں
ہم نے دہشت زدہ زندگی کاٹ دی

گفتنی تو نہ تھی
پھر بھی میں انجمن انجمن
داستانِ حیات!
ارتقائے بدن - - - ایک دو دن کا قصہ نہیں
خیر اس سے تمھیں کیا کہ تم اپنے پیکر سے ہٹ کر
کسی کی طرف دیکھتے بھی نہیں
اور دیکھو بھی کیوں!

خواب سے خواب تک
اپنے پرکھوں نے کیا کیا تماشے کیے
صرف تاریخ کے آئینے کی پچھاڑی سے دیکھو زرا
خیر چھوڑو،
تمھیں اتنی فرصت کہاں
یوں بھی اجداد کے عیش و آرام میں
تمکنت کے نشاں ڈھونڈنا باعثِ خیر و برکت رہا ہے سدا
یوں بھی سوچو کہ کل اگلی پشتوں کے اجداد ہو کر ہمیں
اپنے بارے میں عظمت بھری داستاں سن کے کتنا سکوں آئے گا

میرا جی! آپ راشد کی ضد دیکھیے
الٹی سیدھی حکایات کے راستے
اپنے اوہام کی پاٹ پوجا میں خود اپنے اجداد کی نفی کرنے لگا

آج کل مشکلوں میں گھرے دوستوں کی خبر چاہتے ہیں سبھی
لیکن ایسا بھی کیا
بن کہے، بن سنے اور دیکھے بنا
کوئی سب جان لے
میں خبردار کرنے چلا ہوں مگر
میرا منصب نہیں
میرا ذمہ نہیں

آج بھی ریل گاڑی کہیں راہ میں رہ گئی
آنے والے نے کوئی خبر بھی نہ دی

کوئی فٹ پاتھ پر
کب تلک سگرٹوں کے سہارے جیے
دھیان میں کوندتی بجلیاں راکھ کرنے لگیں
اور میں شہر کا آخری فرد ہوں

کچھ نہیں کھل رہا
بند کھڑکی کھلے تو میں آگے بڑھوں
روشنی میرے جیسوں کی قسمت نہیں

ویسے، پچھلی صدی میں سنا ہے کہ اک دل جلا جب حکیمِ زماں کی حکایات سن کر ’’بغاوت‘‘ ،
’’بغاوت‘‘ پکارا تو
لوگوں نے اس کا بدن اتنے ٹکڑوں میں بانٹا کہ گنتی نہیں ہو سکی ۔
میں مؤرخ نہیں ہوں کہ اس واقعہ میں کہانی بھروں ۔

یہ کہانی نہیں، آپ بیتی نہیں
کیا خبر، کیا ہوا، کیا نہیں ہو سکا

جو بھی ہے نامکمل ہے، مبہم ہے، بے کار ہے
میری جھولی میں نانِ جویں ڈال کر کوئی چلتا بنا
میرے پاؤں تو اجداد کی شان و شوکت کی بیڑی میں شل ہو گئے
اتنی سنسان لمبی گزرگاہ میں، میں اکیلا چلوں تو چلوں کس طرح

بھائی بھی چھوڑ کر چل دیا
اور بچے کہاں تک مرا ساتھ دیں
ان کو آگے کہیں دیکھتا ہے کوئی

میری آنکھوں کی بینائی کم پڑ گئی
اور رعشہ بدن کھٹکھٹانے لگا
شام سے دل پریشان ہے
کوئی آیا نہیں
دھیان میں وسوسے ہیں کہ کیا ہو گیا

اے زمیں! کوئی وعدہ، عقیدہ نہیں

رات کٹ کر نہیں کٹ رہی
اور گھگھیاتے گھگھیاتے اپنے تئیں
سب نے اپنے مقاصد کو پا ہی لیا
ایک میں رہ گیا
شہر کا آخری فرد ہونا بھی کیا کارِ بے کار ہے

اے زمیں! داستاں اپنے انجام سے چند لمحے مسافت پہ ہے
اور قبروں کی پرسش کو کوئی نہیں
آج بھی ---شام تک---
کیا خبر!

کیا رہے، کیا نہ باقی رہے
میں خبردار کرتا ہوں، لیکن سنو
میرا منصب نہیں
آگے جو ہو سو ہو
میرا ذمہ نہیں!!

عبدالکریم خالد

ساعتِ خوش گماں

شکستہ مکاں کے
کسی طاقچے میں
دھری رہ گئی
ساعتِ خوش گماں
اور۔۔۔
دہلیز پر
چند خواب پریشاں
کھلے آسماں کے تلے
دھول میں دھول ہوتے ہوئے
کچھ شگوفے
کسی پیڑ کی شاخ پر
آنکھ کھولے ہوئے
آسماں پر
کہیں تیرتا ابر پارہ
رسوئی میں
سوکھی چپاتی کے ٹکڑے

صحن میں پڑی
ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی
ذرا فاصلے پر
جنوبی طرف
چند کیکر کے جھنڈ
اِس طرف
ایک مٹی کا کچا گھڑا
بام پر
ایک روشن ستارہ
ستارے میں
حیران آنکھیں
اُن آنکھوں میں
سہما ہوا ایک بچہ
جسے دھیرے دھیرے
تھپکتی ہوئی
ایک لمسِ محبت کی گرمی
لبوں پر تھرکتی ہوئی
ایک لوری
ابھی چاند نکلا نہیں
رات ٹھہری ہوئی
اِک کہانی
مگر چل رہی ہے
دلِ مضطرب کے
سہانے سموں کی کہانی
شکستہ مکاں کے
کسی طاقچے میں

دھری رہ گئی
ساعتِ خوش گماں
اور---
دہلیز پر
چند خوابِ پریشاں---

حفیظ اللہ بادل

لمسِ بے باک

(وحید احمد کی نذر)

حسنِ ترتیب سے
جسم کو چاک سے جب اتارا گیا
میں نے ہاتھوں کی پوروں میں آنکھیں دھریں
ساتھ دل رکھ دیا
حسنِ صد رنگ کو
دل کی تفصیل سے میں نے دیکھا تو پھر
لمسِ بے باک سے
زاویے جتنے بھی تھے سمٹنے لگے
جتنی صدیاں بھی تھیں
پہلے آدم سے ہوتے ہوئے مجھ تلک آ گئیں
خود بخود باغ میں پھول کھلنے لگے

کھیت میں پھیلی سرسوں مچلنے لگی
جنگلوں میں ہوائیں سرکنے لگیں
یعنی چلنے لگیں
ساحلوں پر سمندر اترنے لگا
ایک دریا مخالف کو بہنے لگا
جسم کے سارے کونے مچلنے لگے
اس گھڑی مے کشوں کو سرور آ گیا
میری نیت میں آخر ----
فتور آ گیا
جسم اگلے سفر پر روانہ ہوئے
راستے جتنے بھی تھے دہکنے لگے
پھر مہکنے لگے
خون! کانوں کے نچلے کناروں سے آخر چھلکنے لگا

☆☆☆☆

زاہد امروز

میں دشمن کو زخمی نہیں کر سکا

مجھ میں سے اٹھ کر
جب تم چلی جاتی ہو
میں خالی پن سے بھر جاتا ہوں
تمہاری غیر موجودگی میری نسیں کاٹنے لگتی ہے
جب تم میرے دل میں سے جوتوں سمیت گزر جاتی ہو
میں نارنجی شام سے لڑتے ہوئے
اپنی تنہائی سے اوب جاتا ہوں
چہروں کے شور میں ہم روز کہیں ٹکرا جاتے ہیں
روحوں کے سنگم پہ جب تیسرا آ جائے
تو پریم گھاٹ گہنا جاتی ہے
دل میں زہریلی کرکراہٹ بھر جاتی ہے
ہم جتنے بھی کشادہ ہو جائیں
تیسرا بدن اِس میں کبھی پورا نہیں آتا
تم جانتی ہو
میں نے تمہارے سب چہرے اپنائے
اور تم نے میرے سارے لمس دہرائے

پھر بوسوں کے جنگل میں کس کی چیخ در آئی!
تم نے چیخ کو شانت کیا
اور پرائی بارشوں میں مسکرانا سیکھ لیا
میرا دکھ یہ ہے
مجھے تنہائی نے کند کر دیا
میں دشمن کو زخمی نہیں کر سکا ہوں

منیر فیاض

Lights Out

یہ معمول کی لوڈ شیڈنگ نہیں ہے
یہاں چاند، سورج، ستارے بھی بجھ چکے ہیں
مرے پھول بچوں کے چہرے بھی گل ہو چلے ہیں

(انرجی کرائسس عوامی حکومت کی دہری سیاست کا داؤ سہی)
خانقاہوں مزاروں پہ جلتے چراغوں کی لو
ٹمٹما کر سیہ ہو گئی ہے تو کیسے؟
کہ یہ تو دعاؤں، مرادوں کے روغن سے روشن رہی ہے
(کرائے کے پاور پراجیکٹس کیا میرے تاریک ہوتے دروں کو جلا دے سکیں گے؟)
مرے نصف اجلے کرے کے مقدر میں کس نے
سراپا ابد گیر تاریکیاں نقش کر دیں!
سنا ہے کہ صدیوں کی نوری مسافت پہ اک کہکشاں سے
شعاعیں چلی ہیں
جو شاید مری سمت ہی آ رہی ہیں
مگر راستے میں کئی بلیک ہولوں کے ناکے ہیں
جن سے گزرتے ہوئے کب کوئی بچ سکا ہے؟

زمیں پر ہوائیں بھی اس ہولناکی سے پتھرا گئی ہیں
مرے جسم میں رینگتی روشنائی
(جو کچھ بوند ہے)
اب سیاہی میں تبدیل ہونے لگی ہے
تو میں بھی؟
تو کیا اپنی بینائی میں بھی اندھیرے کے پیروں میں رکھ دوں؟؟؟

سید کامی شاہ

آپ بھیڑیوں سے مکالمہ نہیں کر سکتے۔۔۔

کلام روح کا مرہم ہے
اور سماعت کی عمدگی سے تعلق رکھتا ہے
اور شبد اور اسم صرف اُن دلوں پر اثر کرتے ہیں
جو دکھ اور درد سے آشنائی رکھتے ہوں
کان رکھنے والے تمام جاندار عمدہ سماعت بھی رکھتے ہوں
یہ ضروری نہیں
بھیڑیئے کان رکھتے ہیں
مگر کسی کو سننا پسند نہیں کرتے
انہیں صرف بھونکنے اور کاٹ کھانے سے غرض ہوتی ہے
اگر آپ بھیڑیوں کے کسی جھنڈ سے مکالمہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں
تو جان لیجیے کہ تمام دلائل اور نرم گفتاری کے باوجود
آپ بھیڑیوں سے مکالمہ نہیں کر سکتے
کیوں کہ انہیں گفتگو میں نہیں

بلکہ آپ کے تازہ خون اور گرم گوشت میں زیادہ دلچسپی ہے ۔

☆☆☆☆

الیاس بابر اعوان

میں

لا انتہا جہانِ مجسم سے بھی سوا
لامنتہا زمانوں میں رہتے ہوئے یہ عہد
قرنوں سے رینگتی ہوئی تقویم کائنات
آب و گل و شعورِ سرِ دو جہاں ، عدم
لا فلسفہ نہایتِ فہمِ پیمبری
ذوقِ نمو کی ہاتھ میں ریکھائیں دم بدم
کیا جانیے کہ کتنے برس کا ہے یہ چراغ
تہذیب سوختہ ہے ایاغِ حروف میں
فکر و خرد کی بحر و تلاطم میں کشتیاں
ابھریں کہیں تو رزقِ سمندر کہیں ہوئیں
اس اہتمامِ خوابِ تحیر میں ، میں نژاد
تنہا کھڑا ہوں اپنی نمائش کے واسطے
میں بھیڑ کے نواح میں معدوم آدمی

☆☆☆☆

نیناں عادل

جوالامکھی

نا گہاں
آتشیں لو بھڑکنے لگی سبز پتّوں تلے
تلملاتی، غضب ناک اور--- مشتعل
آگ
یک لخت بے تاب ہو کر اٹھی
آن کی آن میں
بیل بوٹے، شجر---
پھول، پتّے، ثمر---
راکھ کا ڈھیر ہونے لگے بے طرح
سرخ شعلے نگلنے لگے گھونسلے
(گھونسلوں میں پڑے گوشت کے لوتھڑے)
بس دھواں رہ گیا دور تک راہ میں
اور بدلتا گیا ایک جنگل ہرا! دیکھتے دیکھتے

سرنگیں خاک میں
سبز منظر کوئی یوں جلا آنکھ میں

☆☆☆☆

صدف غوری

مسلسل چلتے رہنا ہے

یقیں جانو
کسی بھی آنکھ کا کوئی
حسیں سپنا اگر ٹوٹے
تو اندر دور تک
سب کرچیاں ہی کرچیاں سی
پھیل جاتی ہیں
جہاں احساس ننگے پاؤں چلتا ہو
سفر ممکن نہیں رہتا
یقیں جانو
بہت ہی دور تک اندر
نقوشِ پا لہو صورت دمکتے ہیں
محبت کے مسافر کو
مسلسل چلتے رہنا ہے

کسی وعدے کسی اقرار کے پیچھے
کسی زنجیر یا پازیب کی جھنکار کے پیچھے
مسلسل چلتے رہنا ہے
مسلسل ----

ظفر اقبال

جس کا انعام ہے تاوان سے ملتا جلتا
چور تھا کوئی نگہبان سے ملتا جلتا

صورتِ حال بتائیں کہ چھپائیں اُس سے
واقف اپنا جو ہے انجان سے ملتا جلتا

کود پڑنا ہی تھا دریائے محبت میں ہمیں
کارِ دشوار تھا آسان سے ملتا جلتا

اور بھی پھول ہیں اُس تازہ بدن پر اِتنے
گُل ہے وہ آپ ہی گلدان سے ملتا جلتا

کبھی اس طرح سے دھوکا نہیں کھایا تھا کہیں
ظلم تھا ہی کوئی احسان سے ملتا جلتا

یہ گریبان تھا اِس وحشتِ دل کے ہاتھوں
رہ گیا ہے جو گریبان سے ملتا جلتا

عشق اپنی بھی سمجھ میں کہیں آتا کیوں کر
جہیں مضمون ہی عنوان سے ملتا جلتا

عمر اِک چاہیے پوری اِسے پڑھنے کو، ظفر
یہ جو طومار ہے دیوان سے ملتا جلتا

افتخار عارف

یادِ یاراں سے مہکتا رہے باغِ گلِ سرخ
لَو دیے جائیں اندھیرے میں چراغِ گلِ سرخ

فصلِ گل آئے گی، ٹھہرے گی ، چلی جائے گی
اپنے دامن میں چھپائے ہوئے داغِ گلِ سرخ

دل کا وحشت کا اثر کم ہو تو شاید ہاتھ آئے
خس و خاشاک کے موسم میں سراغِ گلِ سرخ

روشِ سبزۂ نورستہ کی شادابی پہ
چشمِ خوں بستہ کا انعام ہے باغِ گلِ سرخ

کوئی دن اور کہ آتی ہے ادھر بادِ شمال
پھر تو یہ رنگِ ہوا ہے نہ چراغِ گلِ سرخ

نظمِ سہراب سپہری سے ہوئی دل کی کشود

ورنہ اس فصل میں کس کو تھا دماغِ گلِ سرخ

* * * *

خورشید رضوی

اے جانِ نشۂ روحِ مئے ناب آ کبھی
حرفِ نگفتہ معنیِ نایاب آ کبھی

تاریک ہے مری رگِ جاں اک زمانے سے
اے رشکِ مہر، غیرتِ مہتاب آ کبھی

نکلے کسی طرح پہ مرا شوقِ عافیت
تو میرے گھر میں صورتِ سیلاب آ کبھی

یاں میرے پاس شورشِ اہلِ جہاں سے دُور
ہاتھوں میں تھام کر صدفِ خواب آ کبھی

موتی ہُوں میری آب کفِ دست پہ نہ دیکھ
ہو مجھ کو دیکھنا تو تہِ آب آ کبھی

مجھ پر بہت گراں ہے یہ یکسانی حیات

سپنے میں پھر سے اے دلِ بے تاب آ کبھی

☆☆☆☆

امجد اسلام امجد

آنکھیں شکستِ دل کی اگر ترجماں نہ ہوں
ہم بھی خدا مثال کسی پہ عیاں نہ ہوں

تنہائی سے شدید نہیں جو بھی ہو عذاب
منزل سے لاکھ دُور ہوں، بے کارواں نہ ہوں

شیشے میں بال آیا تو سمجھو کہ وہ گیا
رکھیے خیال! دوست کبھی بد گماں نہ ہوں

کیوں اِس قدر ہجوم ہے تاروں کا اُس طرف
ٹکرائے کہکشاؤں میں سیارگاں نہ ہوں!

مولا جو بے وقاری ہی لکھی ہے بخت میں
رکھنا وہاں کہ جاننے والے جہاں نہ ہوں

نظریں اُٹھا کے جو نہیں منزل کو دیکھتے
یہ رہگوارِ شوق کے افتادگاں نہ ہوں!

لفظوں کی دیکھ بھال سے بنتی ہے شاعری!

مہکیں گے کیسے باغ، اگر باغباں نہ ہوں

امجد میں ہوں تلاش میں ایسے جہان کی
جس میں کہ یہ زمین نہ ہو، آسماں نہ ہوں

پرتو روہیلہ

آگے بڑھ کر دیکھنا اور پیچھے مڑ کر دیکھنا
خونِ انساں رہ گیا اپنا مقدر دیکھنا

بے زباں کوچوں سے ساری عافیت رخصت ہوئی
اک غبارِ یاسیت ہے جس کو اکثر دیکھنا

کیسے خوابوں نے بڑھایا تھا مری آنکھوں کا نور
اب حقائق کی عطا، تاریک منظر دیکھنا

عقل و دانش پہ مری اٹھنے لگا ہے یہ سوال
دیکھنا سب اور پھر خاموش رہ کر دیکھنا

فوج کا لشکر تو سنتے آئے تھے صدیوں سے ہم
اپنی قسمت میں ہے اب مذہب کا لشکر دیکھنا

کچھ ہیولے رہ گئے آنکھوں میں اب، بے خدوخال
خوابِ ماضی ہو گیا تصویر پیکر دیکھنا

وقت ہی نے پھیر لیں آنکھیں وگرنہ ہم تو خود

چاہتے تھے اس کی آنکھوں میں اتر کر دیکھنا

وارثانِ تختِ شاہی گر یونہی بیٹھے رہے
ایک طوفانِ بلا اٹھے گا گھر گھر دیکھنا

ناصر زیدی

چہرے پہ ہجرِ یار کی یوں گرد اوڑھ لی
اُس کی عطا تھی چادرِ بے درد اوڑھ لی

اب تو کسی بھی پیڑ کا سایا گھنا نہیں
پتّوں نے اس طرح سے قبا زرد اوڑھ لی

طاری رہے غنیم پہ ہیبت تمام عمر!
عزمِ قوی پہ خوئے جواں مرد اوڑھ لی

اس کے سوا نہیں تھا علاجِ برہنگی
عِصیاں کو ڈھانپنے کے لیے فرد اوڑھ لی

اُجلے لباس میں بھی، مَیں پھرتا ہوں مُنفعِل
جیسے ڈٹی ہوئی سی کوئی نرد اوڑھ لی

عُمرِ گریز پا سے نبرد آزما رہا!

پھر یُوں ہُوا کہ موت سی ہمدرد اوڑھ لی

اب سَرد و گرم دہر کا کھٹکا نہیں رہا
ناصرؔ! کچھ ایسے مَیں نے زمیں سرد اوڑھ لی

نذیر قیصر

صورتِ خاک بدل سکتے ہیں
ہم بھی پوشاک بدل سکتے ہیں

شاخ میں جاگتی چنگاری ہے
خس و خاشاک بدل سکتے ہیں

تیری دنیا کو ترے لوگوں کو
تیرے عشاق بدل سکتے ہیں

اگر انسان بدل جائے تو
خاک و افلاک بدل سکتے ہیں

حرف معنی کو بدلنے والے
روحِ اوراق بدل سکتے ہیں

صورتِ کوزہ بدل سکتی ہے

کوزہ گر چاک بدل سکتے ہیں

خاک سے اڑتے پرندے قیصر
رنگِ افلاک بدل سکتے ہیں

سجاد بابر

قریۂ خاک میں مجھ ایسوں سے ٹکرائی ہو
تم کہاں سے ہو، یہاں کیسے چلی آئی ہو

سارے امکان کے بُرجوں کی طرف دیکھتے ہیں
صاعقہ! لحظہ منڈیروں پہ جو لہرائی ہو

آرزوؤں میں توانائیاں لو دینے لگیں
میرے آنگن میں بھی کچھ دیر جو سستائی ہو

ایک دو پل کی ملاقات میں وہ بھید کُھلے
جیسے اپنی کئی صدیوں کی شناسائی ہو

میری اجرک پہ مسلسل تری دزدیدہ نظر!
ہفت اقلیم لیے غم کی تمنائی ہو

اَپسرا! دہر میں تُو اپنا چمتکار دکھا

اب نصیبہ مرا--- تیشہ ہو کہ دارائی ہو

ماہِ صیام کی یہ تشنہ لبی، رودِ خیال
نت نئے ذائقے دیتی ہوئی سَردائی ہو

احمد صغیر صدیقی

شہر کو دیوانگی اچھی لگی
تھی روش کچھ اور سی، اچھی لگی

راہ اُس کی عمر بھر دیکھا کیے
دیکھنے کی چیز تھی اچھی لگی

دُور تک وہ راستہ سنسان تھا
دیر تک آوارگی اچھی لگی

ایک سیدھی راہ پہ چلتے ہوئے
ہم کو اپنی کج روی اچھی لگی

ہم نے دنیا کو یونہی رہنے دیا
کچھ بنی کچھ اَن بنی اچھی لگی

اُن سے اچھی شاعری کرتے رہے

ہم کو جن کی شاعری اچھی لگی

☆☆☆☆

صابرظفر

مثالِ جلوۂ یکتائی تک رسائی نہیں
کمال ہے، مگر اسبابِ رُونمائی نہیں

خموش ہے کہ وہ برتر ہے خامشی میں بھی
وہ جس کے سامنے تابِ سخن سرائی نہیں

وہ در ہے منبعِ فیضان و التفات و کرم
مَیں در بدر کہ مجھے ذوقِ جبہ سائی نہیں

وجود ہے ابھی اسرارِ غیب میں پنہاں
عدم سے بھی مجھے توفیقِ آشنائی نہیں

نثار، ناحیۂ نُور پہ نظر، پیہم
وہ عشق ہے کہ مجالِ گریز پائی نہیں

کلام کیا کروں، اذنِ اذاں نہیں ہے مجھے

خرام کیا کروں، آثارِ پیشوائی نہیں

خموش کر کے مجھے لب کُشا ہے ایک گروہ
مگر ظفرؔ، کوئی اعجازِ خوش نوائی نہیں

غلام حسین ساجد

طاقچے میں جب چراغِ اوّلیں رکھا گیا
آئنے پر پھول، آنکھوں پر یقیں رکھا گیا

کر رہے تھے خواب میری نیند سے پہلو تہی
رات تکیے پر کِسی سے سر نہیں رکھا گیا

یاد کرنا چاہتا ہوں اور یاد آتا نہیں
کچھ کہیں رکھا گیا اور کچھ کہیں رکھا گیا

کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے میری عُمر میں
میں جہاں رکھا گیا تھا پھر وہیں رکھا گیا

نعمتیں بجھتی چلی جاتی ہیں فرشِ خاک پر
جانے کیا کچھ تھا جِسے زیرِ زمیں رکھا گیا

حاشیہ بردار آنکھوں کو مِلا رنگِ نشاط

آئینہ بردار آنکھوں کو نہیں رکھا گیا

فرق پڑتا ہے کسے ساجد، اگر اس شوخ کو
ہم سفر رکھا گیا یا ہم نشیں رکھا گیا

عباس رضوی

سورج لمحے بھر میں خاک نہیں ہو سکتا
قصہ اتنی جلدی پاک نہیں ہو سکتا

مرنے والے جان گئے ہیں کیا کیا کچھ
جینے والوں کو ادراک نہیں ہو سکتا

خاک پہ سر ہیں اور ایسے مسرور ہیں جیسے
ہم سا کوئی خوش پوشاک نہیں ہو سکتا

کچھ نہ کہے اور دکھتی رگ پہ انگلی رکھ دے
موسم اتنا بھی سفاک نہیں ہو سکتا

خوابوں کی تعبیر بتانا کیا مشکل ہے
عشق مگر اتنا بے باک نہیں ہو سکتا

عشق کا موسم بیت گیا سو بیت گیا

اب یہ گریباں پھر سے چاک نہیں ہو سکتا

☆☆☆☆

تحسین فراقی

سرفروشوں نے بھی کب سر دیے اس معرکے میں
ہم نے بھی ہاتھ کھڑے کر دیے اس معرکے میں

ٹال سے ٹالتے کیا معرکہ بود و نبود
تم نے تو خواجہ سرا بھر دیے اس معرکے میں

ہول ایسا تھا ہوئے جاتے تھے پتّے پانی!
شیرِ نر سوتے میں ڈر ڈر دیے اس معرکے میں

خوں بہا کن کے عوض مانگتے پھرتے ہو یہاں
تم نے تو، ریت میں سر کر دیے اس معرکے میں

اکثریت نے معاً پھینک دیے تھے ہتھیار
چند ہی سرپھرے مر کر دیے اس معرکے میں

☆☆☆☆

نصرت صدیقی

ہو جائے اُجالا ہی اُجالا مرے آگے
پردے سے کسی روز نکل آ مرے آگے

یہ حُسن طلب ہے کہ یہ دھوکا ہے نظر کا
دریا کی طرح بہتا ہے صحرا مرے آگے

رستے میں کھڑے ہیں مری تصویر اٹھائے
آئینہ صفت نقشِ کفِ پا مرے آگے

میں دیکھ رہا تھا کہیں پھولوں کی نمائش
لے آیا کوئی تیرا سراپا مرے آگے

میں تیرے تعاقب میں کہاں تک چلا آیا
کعبہ مرے پیچھے نہ کلیسا مرے آگے

فرقت کے اندھیروں کو سمٹنا ہی پڑے گا
روشن ہے ترا وعدۂ فردا مرے آگے

سائے کی طرح ساتھ رہی ہے سدا نصرت
دنیا مرے پیچھے کبھی دنیا مرے آگے

سعید گوہر

بلا کا خوف، سناٹا، در و دیوار، خاموشی
کوئی معنی تو رکھتی ہے، یہ پُر اسرار خاموشی
کوئی اس دکھ کو کیا سمجھے کہ میرا کل اثاثہ ہے
سرِ دیوار---تنہائی، پسِ دیوار--- خاموشی
اگر مطلب سے خالی ہے تو ناکارہ ہے سیپارہ
مجھے درکار ہے، خوش معنیِ اظہار، خاموشی
شریعت اس میں کیا کہتی ہے، دینِ عشقِ برحق کی
کہ میں اقرار سمجھوں یا ترا انکار--- خاموشی
تکلم کرتے کرتے تھک گیا ہوں، پھر بھی گویا ہوں
مجھے لگتی--- ترے ہونٹوں کی یہ "بیمار خاموشی"
میں جب تنہائی کی خواہش میں آجاتا ہوں بستر تک
لگا دیتی ہے سوچوں کا کوئی بازار، خاموشی
جب اندر بولتا ہے، شاعری تخلیق ہوتی ہے
بنا دیتی ہے، ہم ایسوں کو بھی فنکار، خاموشی
کسی دن لوگ اٹھیں گے کہ حق لینا ہی پڑتا گا
اب اتنے ظلم پہ ممکن نہیں ، ہر بار خاموشی
"اندھیری" آنے والی ہے کہ بجلی گرنے والی ہے

ہمارے شہر کے اندر، "دھماکے دار" خاموشی
یونہی بولے گا تو اک روز تیرے ہونٹ سی دیں گے
بہت بہتر ہے گوہر یارا! میرے یارا! خاموشی

عزیز اعجاز

ازل سے حُسن کے معیار کی تلاش میں ہوں
بھٹک رہا ہوں ابھی پیار کی تلاش میں ہوں

جو مجھ سے میرے خسارے خریدنا چاہے
میں ایک ایسے خریدار کی تلاش میں ہوں

سکونِ قلب سے اُکتا گیا ہے دل میرا
میں اِن دنوں کسی آزار کی تلاش میں ہوں

متاعِ درد کو ارزاں نہیں کیا میں نے
ابھی تو گرمیِ بازار کی تلاش میں ہوں

نہ جانے کب سے ادھوری مری کہانی ہے
میں اس کے مرکزی کردار کی تلاش میں ہوں

نہیں ہے شوق مجھے دربدر بھٹکنے کا
میں ایک بچھڑے ہوئے یار کی تلاش میں ہوں

وہ جس سے پیار تھا غم دے کے چل دیا مجھ کو

سو آج کل کسی غم خوار کی تلاش میں ہوں

یہ راستے بہت آسان ہو گئے اعجاز
میں اب کسی رہِ دشوار کی تلاش میں ہوں

خالدطور

مرے دماغ کو طاقت رہائی دیتا ہے
خیالِ یار جو درد آشنائی دیتا ہے
جہانِ عشق میں باعث نہ کر تلاش کہ یاں
وصالِ یار ہی دردِ جدائی دیتا ہے
شعورِ ہست زمانے کی چیرہ دستی میں
بروئے جبر مجھے لب کشائی دیتا ہے
فشارِ غم ہے کہ احساسِ وسعتِ ہجراں
مجھے خزاں میں جو نغمہ سرائی دیتا ہے
گراں تمہیں ہیں سماعت پہ چیخنے والے
یہاں ہر ایک کو اونچا سنائی دیتا ہے
سیاہ شب کے مکیں اس پہ ٹوٹ پڑتے ہیں
یہاں کسی کو اگر کچھ سجھائی دیتا ہے
میں اپنے آپ سے جب بھی کلام کرتا ہوں
مجھے سکوتِ شبِ غم سنائی دیتا ہے
مسافروں کو مصیبت کا باہمی احساس
میانِ راہ سدا ہم رجائی دیتا ہے
میں جبر میں اے خالدؔ خدا نہ مان سکا

جسے غرور و ستم کبریائی دیتا ہے

☆☆☆☆

نسیم سحر

جس کسی سے بھی پوچھوں میں اپنا پتا
ہنس کے کہتا ہے یہ شخص ہے لاپتا
آج کے دن ہی کو زندگی جانئے
کل کی کیا ہے خبر، کل کا ہے کیا پتا!
وہ جو اِک شخص رہتا تھا اس شہر میں
کوئی اُس کی خبر، کوئی اس کا پتا؟
جب وہ نکلا مجھے ڈھونڈنے کے لیے
میں اُسی وقت سے ہو گیا لاپتا
جانے پھر کیا ہوا، وہ گلی کھو گئی
تھا تو کاغذ پہ اِک دیکھا بھالا پتا
حادثہ یہ ہوا ہے، نئے شہر میں
کھو گیا ہے کہیں وہ پرانا پتا
کوئے جاناں میں دانستہ میں کھو گیا
اب کسی کو مِرا کیا ملے گا پتا
کیا خبر ہے، کِسی دن بتا دے کوئی
تجھ کو میرا پتا، مجھ کو تیرا پتا
میں نسیمِ سحر چل رہا ہوں مدام

مجھ کو دریا پتا اور نہ صحرا پتا

☆☆☆☆

شاہدہ حسن

دل میں اک آگ سرِ شام جلاتی رہی میں
پھر اِسی آگ میں کچھ پھول کھلاتی رہی میں
اک تمنا جسے پہچان نہیں پایا دل
ایک خوشبو کہ رگِ جاں میں چھپاتی رہی میں
ایک دریا کہ جہاں تشنہ بہ لب عمر کٹی
ایک صحرا کہ جہاں پیاس بجھاتی رہی میں
اک ہنسی جس کو کوئی نام نہیں دے پائی
اک اداسی جسے لکھ لکھ کے مٹاتی رہی میں
اک سفر جس کو کیا دھوپ کی پوشاک میں طے
ایک گھر جس میں فقط چھاؤں بچھاتی رہی میں
ایک خلوت کہ جسے ترک نہ کر پائی کبھی
ایک محفل کہ بہ ہر رنگ سجاتی رہی میں
اک ہجوم ایسا کہ گُم کردیا جس میں خود کو
ایک تنہائی جہاں شور مچاتی رہی میں
بس کہانی ہے یہ عنوان نہیں ہے جس کا
کوئی رودادِ محبت کہ سناتی رہی میں

☆☆☆☆

حسن عباس رضا

اک آس پہ رکھ لیتا ہے، مرنے نہیں دیتا
یہ عشق مجھے خودکشی کرنے نہیں دیتا

دریا بھی اسی کا ہے، کنارے بھی اسی کے
لیکن مجھے پانی میں اترنے نہیں دیتا

رکھتا ہے ہمیشہ وہ مری پیاس ادھوری
خواہش کا کٹورا کبھی بھرنے نہیں دیتا

عیار ہے اتنا، کہ مرے شعر سنا کر
مجھ کو کسی وعدے سے مکرنے نہیں دیتا

ہر موڑ پہ آنکھوں کے بٹھا رکھے ہیں پہرے
اِک پل بھی گلی میں وہ ٹھہرنے نہیں دیتا

سب آئینہ خانوں پہ اسی کی ہے حکومت
جُز اپنے، کسی کو بھی سنورنے نہیں دیتا

آوارگی جاری ہے حسن آج بھی ، لیکن
اک شخص مجھے حد سے گزرنے نہیں دیتا

طارق نعیم

مرے وجود کا اعلان ہی کہاں ہوا تھا
دراصل وہ تو فرشتوں کا امتحاں ہوا تھا

ہزار صدیوں میں جا کر یہ بات کھلتی ہے
جو اَب تماشا ہوا پہلے یہ کہاں ہوا تھا

جب ایک ذات یہ کہتی تھی تم تو ہو ہی نہیں
مجھے بھی اپنے نہ ہونے کا کچھ گماں ہوا تھا

مرے خیال کی صورت گری تو اب ہوئی ہے
میں اِس سے قبل فسانوں میں ہی بیاں ہوا تھا

غضب تو یہ ہے وہاں اور کوئی تھا ہی نہیں
جب ایک عہد مرے اُس کے درمیاں ہوا تھا
☆☆☆☆

انجم خلیق

موت بِنا بھی دل سے نکلے لفظ سنائی دیتے ہیں
جیسے خواب اندھیرے میں بھی صاف دکھائی دیتے ہیں

تم تو ابھی آغاز میں ہو، ہم عشق کی بازی کھیل چکے
تم اور شکایت رکھتے ہو، ہم اور دہائی دیتے ہیں

یوں تو ہیں امکان بہت سے حیرت اور مایوسی کے
لیکن اب جو اہلِ سخن خاموش دکھائی دیتے ہیں

کتنی پرتیں رکھتے ہیں یہ سادہ سادہ شعر مرے
حرف کو حرمت، مجھے جِلا، اُس کو زیبائی دیتے ہیں

اُس کو جھٹلایا ہے تو اے دل، کیسی مروت، کون لحاظ
اب اس جرم میں ہم تم کو قیدِ تنہائی دیتے ہیں

شانِ غنا سے کہتا ہوں سب آنے والی نسلوں سے
جاؤ تمھیں دنیا ساری، ہم بنی بنائی دیتے ہیں

خود سے باتیں کرتے انجم یہ تنہا دیوانے لوگ
اوروں کو تو سامانِ محفل آرائی دیتے ہیں

نسیم عباسی

سارے چلن جدید زمانے کے اور ہیں
کھانے کے دانت اور دکھانے کے اور ہیں
بدلا ہوا ہے کچھ تو مرا اپنا عکس بھی
کچھ آئنے بھی آئنہ خانے کے اور ہیں
سوچا ہے اپنے آپ کو سر سے اتار کر
انداز اتنا بوجھ اٹھانے کے اور ہیں
فی الحال رس کشید کرے گی وہ پھول سے
اوقاتِ کار شہد بنانے کے اور ہیں
یہ اور بات ایک سا دونوں کا درد ہے
پاؤں کے زخم اور ہیں شانے کے اور ہیں
جاری ہے صبح و شام مری ذات کا سفر
کچھ مرحلے وجود میں آنے کے اور ہیں
بابِ جنوں میں سب کی کہانی ہے ایک سی
کردار صرف میرے فسانے کے اور ہیں
حق تو ضرور ہے اسے، اپنے حدود میں
لیکن اصول مار گرانے کے اور ہیں
ٹکسال اپنے وقت کی ایجاد میں نے کی

مالک مگر نسیم خزانے کے اور ہیں

☆☆☆☆

اشرف جاوید

اور ہے یہ دشت، وحشت اور ہے
سر میں سودائے محبت اور ہے
اندر اندر ٹوٹتا رہتا ہوں میں
یہ ستم، یہ بربریت اور ہے
منہدم ہو کر وہ پاؤں پہ گرا
یہ ہزیمت، یہ ندامت اور ہے
ہو گئے ہیں سب قویٰ میرے خلاف
خون میں چمکی بغاوت اور ہے
چل رہا ہوں سر اٹھا کر ہر قدم
افتخارِ یارِ تہمت اور ہے
یوں ہی تو آیا تمہیں شیشے میں بال
اور ہے شکوہ، شکایت اور ہے
جان کر بھی وہ تمہیں پہچانتا!
اب کے لاحق اجنبیت اور ہے
ریزہ ریزہ کر دیا اُس نے مجھے!
ہجر میں شورِ قیامت اور ہے
لطف تو دیتی ہے گل پاشی، مگر

لذتِ سنگِ ملامت اور ہے

☆☆☆☆

محمد سفیان صفی

نکل آئے چراغ گوہر سے
ہو طلوع آفتاب پتھر سے

اس کا آنچل جو سر سے سرکا تو
ہٹ گئی کائنات محور سے

اس شجر کی جڑیں لہو میں ہیں
روشنی پھوٹتی ہے اندر سے

نظر آتا ہے عشق آب سراب
گھونٹ بھر پیاس کے سمندر سے

کرچیاں دھڑکنوں کی چُنتا ہوں
بے قرار آئنے کے منظر سے

اے صفی تا سحر چھلکتی رہی
چاندنی شیشۂ گلِ تر سے

☆☆☆☆

شاہین عباس

ابتدا سا کچھ، انتہا سا کچھ
چل تماشا کریں ذرا سا کچھ
سامنے سے یہ کائنات ہٹاؤ
ہو رہا ہے مغالطہ سا کچھ
سر بہ سر ہوں سلامتی کے سر
میں ہوں رفتار و حادثہ سا کچھ
ایک خطرہ ہے آنے جانے میں
اِس سرا میں ہے دو سرا سا کچھ
چاک ادھڑتا ہے، خاک اکھڑتی ہے
کوئی ہوتا ہے رونما سا کچھ
اور تو کچھ نہیں ہے مٹنے کو
میں ہی میں ہوں بنا بنا سا کچھ
یہ سرکتے ہوئے زمین پہ لوگ
یہ کنہ سا کچھ اور گلہ سا کچھ
وقت پہ آگ، وقت پہ پانی
زندگی بھر کا تجربہ سا کچھ
جو نہ تیرا ہے اور نہ میرا ہے

پھر وہ کیا ہے ترا مرا سا کچھ

☆☆☆☆

سعود عثمانی

جو دل قریب ہو پہلے نشانہ بنتا ہے
سو اس کا تیر مجھی پہ چلانا بنتا ہے
یہ بوڑھی ماں کی طرح کچھ بھی کہہ نہیں سکتی
سو اس زمیں کا تمسخر اڑانا بنتا ہے
وہ گوری چھاؤں میں ہیں، اور سیاہ دھوپ میں ہم
سو ان کا حق ہے، انہی کا جلانا بنتا ہے
چراغ زادا! چراغوں سے تیری بنتی نہیں
ہواؤں سے ہی ترا دوستانہ بنتا ہے
خرد کے آڑھتیوں کو یہ علم ہی تو نہیں
کہ خوب سوچ سمجھ کر دوانہ بنتا ہے
میں ہاتھ جوڑتا ہوں ناصحانِ شعلہ زباں
بہت دکھوں سے کوئی آشیانہ بنتا ہے
نہ جانے یہ ہنرِ عیب ہے کہ عیبِ ہنر
غزل بناتا ہوں، آئینہ خانہ بنتا ہے
یہ لوگ مجھ کو کسی طرح بخشتے ہی نہیں
میں چپ رہوں بھی تو کیا کیا فسانہ بنتا ہے
بتا! میں دل کا کروں کیا؟ کہ ہر تعلقِ عشق
نیا بناتا ہوں لیکن پرانا بنتا ہے

خدا کو مانتا اور دوست جانتا ہوں سعود
اور آج کل یہ چلن کافرانہ بنتا ہے

☆☆☆☆

ڈاکٹر منیر رئیسانی

سوائے بختِ سرِ آسماں نہیں کچھ بھی
سوائے گردشِ سیارگاں نہیں کچھ بھی

نگاہِ مہر، سکوں، سادگی محبت کی
ہمارے شہر میں آسانیاں نہیں کچھ بھی

ہے بے کنار جوابِ سوالِ سجدۂ جاں
مری جبین ترا آستاں نہیں کچھ بھی

بدل چلی ہیں علاماتِ قید و آزادی
قفس، ہوائیں، گھٹن، آشیاں نہیں کچھ بھی

بکھر چلا کہیں دھیرے سے ایک سناٹا
کیا ہوا نے سخن، بے نشاں نہیں کچھ بھی

☆☆☆☆

بیرم غوری

ساعتِ رنجِ گراں ہے، کوئی ہے
ناصرِ تشنہ لباں ہے، کوئی ہے

پوچھتی پھرتی ہے، اک شام اداس
ماتمِ شہرِ گلاں ہے، کوئی ہے

واقعی ہے تو وہ آتا نہیں کیوں
یہ جو اک اور گماں ہے، کوئی ہے

کچھ نہیں، کوئی نہیں، پر مرا دل
کھینچتا ہے، کہ وہاں ہے، کوئی ہے

کھولتے کیوں نہیں امکاں کے در
ہے کوئی چارہ گراں ہے کوئی ہے

نہ سہی ابر نما، شاخ مثال

دھوپ ہے، در پئے جاں، ہے کوئی ہے

کیا کہوں، کون ہے، کیا ہے میرا
جو مرے ساتھ رواں ہے، کوئی ہے

افضل گوہر

مرے مزاج کا غصہ گیا نہیں مجھ سے
کہ یہ الاؤ کسی دن بجھا نہیں مجھ سے

وجودِ خاک پریشان کر رہا تھا مجھے
سو بارِ عمر زیادہ اُٹھا نہیں مجھ سے

تماشا دیکھنے والوں سے شرم سار ہوں میں
بنا رہا تھا تماشا بنا نہیں مجھ سے

میں تیری خاک کے سب بھید بھاؤ جانتا ہوں
یہ چاک اور یہ کوزہ نیا نہیں مجھ سے

کچھ اتنا تیز بہاؤ تھا غم کا دل کی طرف
ہزار روکنا چاہا رُکا نہیں مجھ سے

مراقبے میں پڑی شب کو چپ لگی ایسی

سُخن کسی بھی دِیے نے نہیں کیا مجھ سے

ہوائے عمرِ گریزاں ہوئی ہے کیا گوہرؔ
بدن کا سانس بھی پورا کھلا نہیں مجھ سے

امتیاز الحق امتیاز

جتنا بھی ڈرنا تھا ڈر آیا ہوں
میں اندھیرے سے گذر آیا ہوں

ایک وعدہ ابھی کرنا ہے مجھے
ایک وعدے سے مُکر آیا ہوں

وصف ایسا تھا کہاں مجھ میں کوئی
ہے غنیمت جو نظر آیا ہوں

کوئی پہلے مجھے کب دیکھتا تھا
اُس کو دیکھا تو نظر آیا ہوں

اپنا انداز ہی بھاتا ہے مجھے
اپنے ہی زیرِ اثر آیا ہوں

مجھ سے پتھر بھی گلے ملتے ہیں

مدتوں بعد اِدھر آیا ہوں

امتیاز اس سے تعلق توڑا
جو نہ کرنا تھا وہ کر آیا ہوں

عائشہ مسعود

یہ اور بات ہم کہ ابھی بدگماں نہیں
ورنہ ترے بغیر بھی دنیا کہاں نہیں

تجھ کو یہ زعم وجہِ بہاراں ہے تیری ذات
آ دیکھ ہجر میں بھی تو رنگِ خزاں نہیں

کس نے بدل دیے ہیں مناظر کے رنگ و بو
کچھ پھول تھے چراغ تھے اب تو یہاں نہیں

بار دگر نہ چاک پہ مجھ کو چڑھائیے
اب میری خاک میں کوئی صورت نہاں نہیں

ہم وہ ہدف نشاں ہیں کہ بچنا محال ہے
بے شک ہمارے ہاتھ میں تیر و کماں نہیں

پینا پڑے گا زہر بھی اب اپنے ہاتھ سے
گر رسم و راہ ہے یہی تو کچھ گماں نہیں

ہم پتھروں پہ چل کے بھی تجھ تک پہنچ گئے

ہم مانتے تھے راستے میں کہکشاں نہیں

گرداب میں رہیں کہ لگیں پار ہم یہاں
اس زندگی کی راہ میں سود و زیاں نہیں

رحمان حفیظ

کسی گماں کسی امکان پہ تو لکھوں گا
میں رحلِ شب پہ بھی نام سحر تو لکھوں گا

فگار انگلیاں ہوں یا پھٹی ہوئی آنکھیں
میں لکھنے والا ہوں تازہ خبر تو لکھوں گا

کہانیوں سے میں آنکھیں چراؤں گا کب تک؟
چلو زیادہ نہیں، مختصر تو لکھوں گا

سلگ رہا ہے تہِ فکر جو خیال اسے
میں آگ کر نہیں پایا شرر تو لکھوں گا

جو میرے قلب سے ابھرا، نظر میں ٹھہرا ہے
یہ ماہتاب کسی چرخ پہ تو لکھوں گا

ابھی تو دشتِ نظر میں بھٹکتا پھرتا ہوں

کبھی ملی کوئی اپنی خبر تو لکھوں گا

میں خوش بیاں ہی نہیں، خوش گماں بھی ہوں رحمان
سو بانجھ رت میں بھی برگ وثمر تو لکھوں گا

رخشندہ نوید

عکس بنتا گیا تھا پانی میں
نصب اک آئنہ تھا پانی میں

پھر کہیں جا کہ بن سکا آنسو
ایک عرصہ رہا تھا پانی میں

موج سے موج کی بغل گیری
ہجر کا سلسلہ تھا پانی میں

ایسے ہم لوگ مل نہیں سکتے
جیسے پانی ملا تھا پانی میں

میں پکڑتے پکڑتے ڈوب گئی
مجھ سے کچھ گر گیا تھا پانی میں

تو نے کچے گھڑے پہ رخشندہ

طے سفر کر لیا تھا پانی میں

☆☆☆☆

نویدحیدرہاشمی

خبر ملی تھی کہ اب میرا نام آ گیا ہے
اسی لیے ترے در پہ غلام آ گیا ہے

سلام ہو مرے مُرشد درود ہو مرے عشق
ترا مُرید بصد احترام آ گیا ہے

غموں نے آج بھی تلواریں کھینچ لیں ہیں مگر
ترا دیا ہُوا تعویذ کام آ گیا ہے

میں کائنات سے اب ہم کلام ہو رہا ہوں
ابھی ابھی مرے ہاتھوں میں جام آ گیا ہے

الجھ گیا ہے مرا دل ترے خیال کے ساتھ
پرندہ اُڑتے ہوئے زیرِ دام آ گیا ہے

میں جا رہا ہوں کفالت کا حق ادا کرنے
یتیم دشت کا مجھ کو پیام آ گیا ہے

الاؤ، قیدی، دھواں اور چیختی ہوئی شام
یہ میری راہ میں کیسا مقام آ گیا ہے

نوید فرض سمجھ کر ہجوم گریہ کرے
مری کہانی کا اب اختتام آ گیا ہے

میاں آفتاب احمد

آیا ہوں کہاں سے مجھے جانا ہے کہاں تک
فی الحال تو پھیلا ہوں حدِ کون و مکاں تک

گریہ ہوں مگر کھل کے نہیں رویا گیا میں
شاید میں ابھی پہنچا نہیں غمِ زرگاں تک

تا عمر یہی گردِ سفر ساتھ رہے گی
رستہ تو چلے گا اُسے جانا ہے جہاں تک

صاحب تجھے ہے فکرِ خدوخال، تو ہوگی
مجھ کو تو پہنچنا ہے نہ ہونے کے نشان تک

یہ زخم فقط تیر کی سازش نہیں لگتا
جانا تو پڑے گا مجھے کردارِ کماں تک

دیکھو تو زرا آ کے کبھی میرا الاؤ
میں آگ ہوں وہ آگ کہ روشن ہے دھواں تک

کچھ ایسے عناصر کا تسلط ہے فضا پہ
کیا رنگ نظر آئیں کہ اوجھل ہے سماں تک

دروازہ مرا دیکھتا رہ جاتا ہے احمد
دستک بھی پہنچتی ہے برابر کے مکاں تک

طاہر شیرازی

مثالِ دشت کوئی بے شمار ہوتے ہوئے
ہے پانیوں پہ رواں، ریگزار ہوتے ہوئے

کچھ ایسے پنچھیوں کو روز دیکھتے ہیں شجر
اڑان بھرتے ہوئے اور شکار ہوتے ہوئے

ہوں اپنے آپ کو پانے کی جستجو میں مگن
میں اپنی وحشتوں کے آرپار ہوتے ہوئے

شعورِ ذات بھی دیوانگی بھی ہے مجھ میں
میں اک خمار میں ہوں ہوشیار ہوتے ہوئے

کچھ اس طرح سے ہوں آزاد اپنے شہر میں آج
بندھے ہیں ہاتھ پر اک اختیار ہوتے ہوئے

ہے ماورائے نظر کوئی اس طرح طاہرؔ

کہ جو کہیں بھی نہیں آشکار ہوتے ہوئے

☆☆☆☆

شاہد ذکی

دشت جلتے ہوئے جنگل سے کہیں اچھا ہے
ہاں مرا آج مرے کل سے کہیں اچھا ہے

اِکتفا کیجیے کنویں پہ کہ یہ کھارا ہی سہی
بے یقینی بھرے بادل سے کہیں اچھا ہے

زندگی بخش ہیں یاں پیڑ، پرندے، پانی
باغ چھوٹا ہی سہی تھل سے کہیں اچھا ہے

یہ مِرا ٹاٹ، یہ چوپال کا تختِ انصاف
مخملیں مسندِ مقتل سے کہیں اچھا ہے

پیاس بھڑکا کے بجھاتا بھی ہے آخر کسی دن
ابر پارہ ترے آنچل سے کہیں اچھا ہے

تجھ ادھورے میں نکل آئی مری گنجائش
تُو مجھے حسنِ مکمل سے کہیں اچھا ہے

رکھ ابھی رکھ مرے دل پہ کہ ترا پائے فنا
دستِ امیدِ مسلسل سے کہیں اچھا ہے

روز افزوں ہے جو تنہائی سے رشتہ شاہد
یار کے ربطِ معطل سے کہیں اچھا ہے

شہزادعادل

یہ شورِ نالہ و آہ و فغاں یوں ہی نہیں تھا
تخیلِ غم پہ اپنا آشیاں یوں ہی نہیں تھا

اسے کرنی پڑی جذبات کی شیرازہ بندی
حضورِ حسن میں دل بے زباں یوں ہی نہیں تھا

نگاہِ ناز مجھ کو مسکرا کے دیکھتی تھی
سنو! میں عہدِ پیری میں جواں یوں ہی نہیں تھا

بنا رکھا تھا گرویدہ کسی کی سادگی نے
غزل میں یہ مرا رنگِ بیاں یوں ہی نہیں تھا

بہت بے چین تھے بزم غزل کے کرتا دھرتا
بلایا تھا کسی نے میں وہاں یوں ہی نہیں تھا

مری میت بھی گھر کے وسط میں رکھی ہوئی تھی
مرے گھر پر ہجوم دوستاں یوں ہی نہیں تھا

دلوں کی آگ باہر آ گئی تھی رفتہ رفتہ
ہمارا شہر عادل بے اماں یوں ہی نہیں تھا

جنید آزر

موسم کو ترس باغ کے افلاس پہ آیا
تب پھول کہیں شاخِ املتاس پہ آیا
کچھ اور جہاں بھی تھے مرے زادِ سفر میں
دنیا کی طرف میں ترے وشواس پہ آیا
حیرت وہیں، حیرت سے کھڑی دیکھ رہی تھی
جب عکس اتر کر دلِ عکاس پہ آیا
پہلے بھی کسی آنکھ میں--- مَیں دیکھ چکا ہوں
یہ رنگ بہت بعد میں الماس پہ آیا
جل تھل ہوں بڑی دیر سے خود اپنی طلب میں
یہ ابر کہاں سے مرے احساس پہ آیا
صحرا کی طرح جھیلا ہے جلتا ہوا سورج
لیکن نہ کبھی حرف مری پیاس پہ آیا
رویا ہوں بہت سبزۂ خواہش کی نمو پر
جب پاؤں مرا سوکھی ہوئی گھاس پہ آیا
دم توڑنے لگتی ہے وہیں لے کی روانی

جب وجد کہیں سایۂ رقاص پہ آیا
کچھ پھول اگھتے ہیں اسی بات پہ مجھ سے
خوشبو کا بدن کیوں مرے قرطاس پہ آیا
اس میں بھی کہیں تیری عنایت کا ہنر ہے
میں عام سا ہو کر جو درِ خاص پہ آیا

عنبرین صلاح الدین

خالی گونج میں ڈھل کر لوٹی ایک صدا کی سان
مانو تو پورے کمرے میں اگ آئے ہیں کان

ہاتھ کے نیچے دستک ہے پر قفل ہیں بند کواڑ
اور تھکن کے پیروں میں دہلیز بھی ہوئی چٹان

ڈھیر سی بن کر پڑی ہوئی ہے صحن میں ایک دوپہر
ساتواں رنگ نجانے کب پھونکے کرنوں میں جان

جگ کی چھت سے جھومر بن کر لٹکے ہوئے ستارے
میری اوڑھنی میں چمکیں تو دے دوں جان بھی دان

اپنے پتھر، اپنے ہاتھ، اور اپنا سر، اور پھر بھی
رستے کیوں گنجان ہیں صاحب، خلقت کیوں حیران

مجھ سے پوچھ کے کب رکھے تھے آنکھ میں میرے خواب
مجھ سے مت مانگیں میری بے خبری کا تاوان

میں نے سوچا ہے تب میں اس سے ملنے جاؤں گی
جب بارش میں چُھپ جائے گی پیڑوں کی مسکان

پتوں میں دَم سادھے ہو گا چڑیوں کا سر گیت
رستوں میں بہتی جائے گی قدموں کی پہچان

شمشیر حیدر

قریۂ شب سے نمودار مجھے ہونا ہے
تجھ ستارے کا مددگار مجھے ہونا ہے

پہلے خود کو کسی بازار میں لانا ہے مجھے
اور پھر اپنا خریدار مجھے ہونا ہے

کیوں محبت میں بہت شاد ہوا پھرتا ہوں
ایک دن خود سے بھی بیزار مجھے ہونا ہے

میرے اندر بھی چھپا بیٹھا ہے دشمن میرا
خود سے بھی بر سرِ پیکار مجھے ہونا ہے

تیرے دریا کو بھی حد سے نہیں بڑھنے دینا
اپنے رستے میں بھی دیوار مجھے ہونا ہے

جانے کب تجھ پہ کھلے میری محبت کا فسوں
جانے کب جا کے ثمر بار مجھے ہونا ہے

لاکھ تو مجھ سے گریزاں ہو گلِ دشت نشیں
تیری خوشبو کا گرفتار مجھے ہونا ہے

مجھ میں جو آئے کرے سیر نئی دنیا کی
تیری آنکھوں سا پُراسرار مجھے ہونا ہے

علی یاسرؔ

ہر گام پہ حیرت کا نیا باب کُھلا ہے
تعبیر پریشان ہے کیا خواب کُھلا ہے
اوجھل ہوئے آنکھوں سے تو پوچھا نہ کسی نے
اندازِ رخِ پرسشِ احباب کُھلا ہے
ہم لوگ محبت کے روادار نہ ہوتے
تاخیر سے ہم پر دلِ بے تاب کُھلا ہے
ہونٹوں پہ لگا قفلِ خموشی نہیں ٹوٹا
سنتے ہیں یہ موسمِ ایجاب کُھلا ہے
بستی سے گزرتا ہے تو بستی نہیں رہتی
کِن آنکھوں سے یہ چشمۂ سیلاب کُھلا ہے
ہے مرگِ سبک سار پلائے جو نہ ساقی
انجام طلبگارِ مئے ناب کُھلا ہے
پہچان کے سینے سے لگایا اسے ہم نے
قاتل کی طرح چہرۂ گرداب کُھلا ہے
لگتا ہے چھلک جائے گا اب جام تمنا

اس بار جو پیمانۂ اعصاب کھُلا ہے
جیسا بھی ہے وقت اب نہ رکیں گے علی یاسرؔ
چلتے ہیں کہ دروازۂ مہتاب کھُلا ہے

☆☆☆☆

دانیال طریر

پلٹ کر داستانوں تک پہنچنا چاہتا ہے
زمانہ، کن زمانوں تک پہنچنا چاہتا ہے
جنونی ہو گیا ہے میرے دریاؤں کا پانی
پہاڑوں کے گھرانوں تک پہنچنا چاہتا ہے
گزرنا چاہتی ہے بادلوں سے میری حیرت
مرا شک آسمانوں تک پہنچنا چاہتا ہے
پریشان ہو گئی ہے بادشاہی، ایک نعرہ
سدا کے بے زبانوں تک پہنچنا چاہتا ہے
نجانے کیا ہوا ہے میرے دل کو پَر لگا کر
فرشتوں کی اڑانوں تک پہنچنا چاہتا ہے
کثافت ختم کر کے جسم کی، مٹی کا پُتلا
خدا کے کارخانوں تک پہنچنا چاہتا ہے
نِگل کر آسمانوں کے ستارے اب وہ اژدر
زمینوں کے خزانوں تک پہنچنا چاہتا ہے
جہاں پیڑوں کو آتا ہو ہمیشہ سبز رہنا

پرندہ اُن جہانوں تک پہنچنا چاہتا ہے
بشر کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں اب درندے
گھنا جنگل مکانوں تک پہنچنا چاہتا ہے

☆☆☆☆

قاسم یعقوب

پھول شاخِ خاک پہ آیا ہُوا رہ جاتا ہے
خواہشیں جب مرتی ہیں تو سب دھرا رہ جاتا ہے

خستگی دیوار و در کو منہدم کر جاتی ہے
باپ گھر کے جھگڑے نپٹاتا ہُوا رہ جاتا ہے

گاڑیاں سڑکوں پہ آتی جاتی رہتی ہیں مگر
دل ہجوم شہر میں کچھ سوچتا رہ جاتا ہے

ایڑیاں بچے رگڑتے ہیں تو آنکھوں سے مری
چشمۂ اشکِ ندامت پھوٹتا رہ جاتا ہے

آنکھ اُڑ کر دیکھنے آ جاتی ہے دروازے پہ
دل مگر قیدِ بدن میں ہی پڑا رہ جاتا ہے

شہرِ بارونق کی شاخِ زندگی میں خم نہیں
گاؤں کے کھیتوں پہ رنگ آیا ہُوا رہ جاتا ہے

تب ہماری دسترس میں آ ہی جاتا ہے خدا
جب ہمارے ہاتھ میں دستِ دعا رہ جاتا ہے

ہم اتر جاتے ہیں اپنی خاک لے کے خاک میں
شعرِ مرقد پہ پڑا لیکن دیا رہ جاتا ہے

نداعلی

دل بھی سنبھل ہی جائے گا کچھ درد کم تو ہو
جیون کے راستے میں کوئی ہم قدم تو ہو

کیسے یہ مان لوں کہ ہے دل اس کا بے قرار
بے وجہ ہی سہی کبھی وہ آنکھ نم تو ہو

اپنی جبیں کو ناز سے در پہ جھکائیں گے
وہ آستاں ہمارے لیے محترم تو ہو

آنچل میں ٹانک لیں گے ستارے جگہ جگہ
تسکینِ دل کے واسطے ساماں بہم تو ہو

میں بھی سناؤں حال ، دلِ زار کا انھیں
عنوان کچھ بھی ہو، کوئی قصہ رقم تو ہو

☆☆☆☆

سرفراز زاہد

خود اپنی میزبانی میں دل لگ نہیں رہا
کچھ دن سے میہمانی میں دل لگ نہیں رہا

اے بے نشان! اپنا نشاں دے کہ اب مرا
تیری کسی نشانی میں دل لگ نہیں رہا

ہجرت کروں گا خال سے اب خواب کی طرف
اس بار لن ترانی میں دل لگ نہیں رہا

کچھ دن سے کھِل رہا ہے مرے صحنِ خواب میں
شاید کنول کا پانی میں دل لگ نہیں رہا

جلتا ہوا الاؤ ہے، بجھنے کی فکر میں
لفظوں کا بھی کہانی میں دل لگ نہیں رہا

پھولوں سے گفتگو، نہ ستاروں سے چھیڑ چھاڑ
یعنی کہ خوش گمانی میں دل لگ نہیں رہا

دلچسپی لے نہیں رہی دھڑکن بھی آج کل
سانسوں کا بھی روانی میں دل لگ نہیں رہا

فخرشناس

شعر کے دیپ یوں جلائیے گا
آپ اپنی فضا بنائیے گا

عشق ہے یار یہ بلا تو نہیں
جان کب تک بھلا بچائیے گا

خود سے لڑ جاؤں میں تو ایسے میں
آپ بھی درمیاں نہ آئیے گا

مجھ سے ہر شخص آ کے کہتا ہے
میری قیمت ذرا لگائیے گا

کتنا لہروں کا شور ہوتا ہے
اب نہ ساحل پہ گھر بنائیے گا

میں بھی آزاد ہوں !!!!

ایسی تہمت نہ پھر لگائیے گا

ہیبتِ رہبراں خدا معلوم
آپ ہی کارواں بچائیے گا

میں جو مشکل سے یاد آ نہ سکوں
پھر سہولت سے بھول جائیے گا

سجاد بلوچ

دریدہ ایسے ہوئے عمر بھر سلے نہیں ہم
یہ کیا ہوا کہ تجھے مل کے بھی ملے نہیں ہم

گلاب تھے کسی صحرا مزاج موسم کے
تمہارے خواب کے اطراف میں کھلے نہیں ہم

ملے ہیں ورثے میں کچھ خواب کچھ جلے خیمے
کسی محل کی روایت کے سلسلے نہیں ہم

یہ کیا ہوا تجھے تُو تو پہاڑ جیسا تھا
ہمیں بھی دیکھ جڑوں سے ذرا ہلے نہیں ہم

زمیں کی تہہ میں کہیں دور دفن ہو گئے تھے
سو تیرے عہدِ خرابات میں ملے نہیں ہم

☆☆☆☆

فیصل ساغر

میں گراں بار تھا اس واسطے کم مایا تھا
تجھ کو کیوں روندا گیا تُو تو فقط سایا تھا

پھر مرے ہاتھ میں اک روشنی در آئی تھی
میں نے کچھ دیر کسی ہاتھ کو سہلایا تھا

کل کُھلا کتنے دنوں بعد یہ دروازۂ دل
کل کوئی کتنے دنوں بعد یہاں آیا تھا

اس لیے بھی نہیں شکوہ کوئی پیارے تجھ سے
مجھ کو تُو نے نہیں حالات نے جھٹلایا تھا

بار بار اٹھتی تھیں آنکھیں مری خنجر کی طرف

کتنی مشکل سے میں کل خود کو بچا پایا تھا

پھر مری بات سُنی ان سُنی کرنے لگے لوگ
میں نے اک روز کسی بات کو دُہرایا تھا

کل مرے کمرے میں مہکار تھی کیا کیا فیصل
کل مرے کمرے میں پھولوں کا خدا آیا تھا

حماد نیازی

دل کی گلیوں میں گونجتی آواز
دھیمی دھیمی، ڈری ڈری آواز
میں نے رختِ سفر میں رکھی ہے
لفظ، خوشبو، دعا، تری آواز
لمس کی دوپہر میں گھل جائے
ہجر کی دھوپ تاپتی آواز
کتنی آنکھوں میں بجھ گئیں شمعیں
کتنے سینوں میں مر گئی آواز
رات کی گود میں گرے آنسو
صبح کی تھال میں کھلی آواز
آبِ تقدیس سے دھلی آنکھیں
لحنِ معبود میں گندھی آواز
اولیں سر میں کیوں نہیں ہوتے

آخری گیت، آخری آواز
کوئی آیا تھا کیا؟ بتائیے نا
کوئی آواز تھی، وہی آواز
آئنے، باغ، خواب، حیرانی!
بانسری، دشت، شاعری، آواز

☆☆☆☆

دلاور علی آزر

یوں دیدۂ خوں بار کے منظر سے اٹھا مَیں
طوفان اٹھا مجھ میں سمندر سے اٹھا مَیں

اُٹھنے کے لیے قصد کیا مَیں نے بلا کا
اب لوگ یہ کہتے ہیں مقدر سے اٹھا مَیں

ہے تیری مری ذات کی یکتائی برابر
غائب سے تو اُبھرا تو میسر سے اٹھا مَیں

اُٹھنے نہیں دیتے مجھے دیوار و در و بام
کیا گزرے گی اس گھر پہ اگر گھر سے اٹھا مَیں

پہلے تو خدوخال بنائے سرِ قرطاس
پھر اپنے خدوخال کے اندر سے اٹھا مَیں

کیا جانے کہاں جانے کی جلدی تھی دمِ فجر
سورج سے ذرا پہلے ہی بستر سے اٹھا مَیں

گویا کہ مرا دھیان کسی اور طرف تھا
محفل میں مگر وقتِ مقرر سے اٹھا مَیں

وہ روشنی میرے لیے مخصوص تھی آزر
اِک اور تجلی کے برابر سے اٹھا مَیں

اخلاق احمد اعوان

غم زدہ شہر کو وہ آب و ہوا دی گئی تھی
لوگ تو لوگ تھے تاریخ رلا دی گئی تھی

روز ان تازہ گلابوں کی ندی میں آمد
جانے کس شہر کو خوشبوئے دعا دی گئی تھی

لامکانوں سے اُدھر بھی نظر آتا ہے مجھے
مرے اندر کوئی دیوار گرا دی گئی تھی

جانتا ہوں کہ یہ احساس کی خوشبو دمِ خلق
مری گوندھی ہوئی مٹی میں ملا دی گئی تھی

خاک زادوں کو تو بس خاک سے نسبت تھی میاں
خلق کہتی ہے انھیں خوئے خدا دی گئی تھی

اک ترے نام کو بس ورد کیا تھا میں نے
ایک امید پے روزِ جزا دی گئی تھی

ہائے اُن سوختہ جانوں کے شب و روز جنہیں
عرصۂ عمر کی معیاد بتا دی گئی تھی

جانے کیوں رات اندھیرے نے پکارا تھا مجھے
جانے کیوں کر تری آواز بجھا دی گی تھی

تہذیب حافی

مری طرف مرا خیال کیا گیا
کہ پھر میں خود کو سوچتا چلا گیا

یہ وصل ساری عمر پہ محیط ہے
یہ ہجر ایک رات میں سما گیا

یہ شہر بن رہا تھا میرے سامنے
یہ گیت میرے سامنے لکھا گیا

مجھے کسی کی آس تھی نہ پیاس تھی
یہ پھول مجھ کو بھول کر دیا گیا

بچھڑ کے سانس کھینچنا محال تھا

میں زندگی سے ہاتھ کھینچتا گیا

میں ایک روز دشت کیا گیا کہ پھر
وہ باغ میرے ہاتھ سے چلا گیا

☆☆☆☆

اسداللہ اسد

پیٹھ پہ وار کیے جاتے ہو بزدل دشمن
تم کسی روز تو آ جاؤ مقابل دشمن

تیری ہر جیت مری ہار نہ سمجھی جائے
اس لیے زور سے کہتا ہوں گلے مِل دشمن

پار اترا تو سمندر کا کہا یاد آیا
مجھ سے بچھڑو گے تو ہو جاؤ گا ساحل دشمن

خود سے لڑتا ہوں مجھے جب سے یہ احساس ہوا
یہ مری آنکھ بھی باغی ہے مرا دل دشمن

اس لیے روز تجھے خوفزدہ ملتا ہوں

روز ملتا ہے مجھے راہ میں حائل دشمن

بعض خنجر بڑے مانوس سے لگتے ہیں اسد
یہ ضروری نہیں ہر بار ہو قاتل دشمن
☆☆☆☆

سید شہناز گردیزی

دنیا نے مجھ کو زہر پلانے کی ٹھان لی
میں نے بھی اپنی پیاس بجھانے کی ٹھان لی

میں روشنی کے ضبط میں ایسا تھا مبتلا
اپنے ہی گھر کو آگ لگانے کی ٹھان لی

کھلنے ہی والا تھا ابھی حسنِ طلب کا باب
اور ایسے وقت یار نے جانے کی ٹھان لی

جب خوب دیکھنے لگیں آنکھیں وصال کو
دل نے تمھارا ہجر منانے کی ٹھان لی

درپیش اک جہاں تھا میرے اور اس کے بیچ
میں نے خلا میں پیر جمانے کی ٹھان لی

☆☆☆☆

حمیدہ معین رضوی (برطانیہ)

کون سوچے گا

بچھڑتے وقت سوچا تھا۔۔۔ بچھڑ کر مل بھی جاتے ہیں
کہ ہم سب ہی سفر میں ہیں
سفر میں زندگی کے موڑ اک ایسا بھی آئے گا،
جہاں پر چند ساعت کو، نگاہیں چار تو ہوں گی
ٹھٹھک کر دیکھ تو لیں گے۔
ادھوری سی کہانی، سرا اک نامہربانی کا
مداوا تو نہیں ممکن/ مگر احوال ان لمحوں کے کہہ لیں گے
جو خوابوں کے عذابوں میں بہت تنہا گذارے ہیں
وفا نا آشنا ماحول سے ہم کیسے ہارے ہیں
کہا کرتے تھے ہم دونوں/ محبت اور استحصال میں بس فرق ہے اتنا،

محبت وہ خزانہ ہے لٹا کر بھی جو بڑھتا ہے، ۔۔جو مالا مال کرتا ہے ۔
اور استحصال ۔۔۔ایسا سود ہے ۔۔جو اصل کو بھی کھاتا جائے ہے ۔
اگر ثابت غلط کر دے کوئی تو، مل کے سوچیں گے
میں قرنوں کی مسافت میں ۔۔ہر اک رستے پہ۔۔۔ہر اک موڑ پر ۔گاڑ آئی تھی آنکھیں ۔
یہ ممکن ہے ۔۔بہت ممکن ہے ۔وہ ساعت بشارت کی،
ہجومِ حادثاتِ زندگی کے بوجھ سے دب کر،/کبھی کی مر چکی ہوگی ۔کبھی کی مٹ چکی ہوگی ۔
اور احمق دیدہ و دل منتظر ہیں ۔
میں آنسو درد کے اب پی رہی ہوں ۔۔۔میں اس نا مہرباں ساعت کو بیٹھی ۔رو رہی ہوں ۔

ڈاکٹر خالد سہیل (کینیڈا)

انکشاف

انکشاف کا لمحہ
اک حسین لمحہ تھا
بادلوں کے پیچھے سے
جیسے چاند ابھرا تھا
خامشی کے آنگن میں
جیسے شعر اترا تھا
انکشاف کا لمحہ
اک حسین لمحہ تھا
اور وہ حسیں لمحہ

ڈھل گیا ہے رازوں میں
بیسیوں سوالوں میں
سینکڑوں جوابوں میں
ان گنت کتابوں میں
بے شمار خوابوں میں
انکشاف کا لمحہ
اک حسین لمحہ تھا

☆☆☆☆

جمیل الرحمن (برطانیہ)

المیے کی رائیگانی

سنو دشت زیاں میں
رائگانی ہی اگر آباد ہے
سب رائگاں ہے!
عجب ہوا المیہ ہے
ہمیشہ کی طرح ہر بار
سب کا رائگاں جانا
یقیناً المیہ ہے!
مگر
جب خواہشیں گدلی ہوں
اور سارے ارادے بے ہنر ہوں
لہو میں دوڑتے کچھ خواب کیوں

سپنوں میں اک منزل کی نادیدہ مسافت کو
کہیں تہہ کر کے رکھتے ہیں؟
وہ نادیدہ وہ تہہ کردہ مسافت
جسے بادِ جنوں جب کھولتی ہے
نجانے کیوں غنودہ قافلے
اس میں سفر آغاز کرتے ہیں
اگر تاریخ کے قدموں کی ٹھوکر میں پڑے
افقی، عمودی اور ترچھے راستے
بخت آزما، نطّاق میر کارواں پہ بین کرتے
چاہِ بابل میں اترتے ہیں؟؟!!!

اقبال احمد قمر (سعودی عرب)

جو حقیقت ہے مرے وہم و گماں سے کم ہے
تپشِ اشک مرے سوزِ نہاں سے کم ہے

یہ جو قدموں میں ستاروں کا جہاں دیکھتے ہو
یہ جہاں بھی مرے خوابوں کے جہاں سے کم ہے

آج کل نیند کہیں آتی ہے شب بھر مجھ کو
جو زیاں ہے مرے احساسِ زیاں سے کم ہے

یہ بھرم کھونے کا ماتم ہے جو تم دیکھتے ہو
جو خسارہ ہے مرے اشکِ رواں سے کم ہے

تم مرے جذبوں کی شدّت کو کہاں جانتے ہو
جو عیاں ہے میری بے تابیِ جاں سے کم ہے

اب کسی کی کوئی خوبی نہیں دیکھی جاتی
لوگ یہ دیکھتے ہیں کون کہاں سے کم ہے

☆☆☆☆

ثاقب ندیم (برطانیہ)

خیال آ گیا ترا

خیال آ گیا ترا
لمحہ لمحہ سہہ رہی تھی
زندگی ترے بنا جو غم
محیط ہو گیا
بوند بوند بہہ رہی تھی
درد کے بہاؤ میں
جو خامشی ترے بنا
وہیں پہ برف ہو گئی
خیال آ گیا ترا
خمار سب ہوا ہوئے

شمار میں لا حاصلی
دن خزاں کے بوج سے تھکے تھکے
رات بے قرار سی
ترا خیال بے حد و حساب
بے شمار تھا، شمار میں نہ آ سکا
یہ دل کبھی بھی حالتِ قرار میں نہ آ سکا
یہ کیا ہوا
خیال آ گیا ترا

امتیاز علی گوہر (سکاٹ لینڈ)

دُور تک کوئی مہرباں نہیں تھا
یہ جہاں کیا مرا جہاں نہیں تھا
میں وہاں دھوپ میں نکل آیا
جس جگہ کوئی سائباں نہیں تھا
جسم میں وہ الاؤ تھا میرے
جس کا باہر کوئی دھواں نہیں تھا
گم ہُوا ایسے بزمِ یار میں دل
میں وہاں ہو کے بھی وہاں نہیں تھا
پاؤں سے تب زمیں نکلی ہے
جب مرے سر پہ آسماں نہیں تھا
سب سے چُھپ کر جو آ گیا دل میں
وہ نہاں ہو کے بھی نہاں نہیں تھا

مجھ کو ہی ڈھونڈنا نہیں آیا
تو بھی ورنہ کہاں کہاں نہیں تھا
ہجر میں امتیاز گوہر کے
آنکھ سے اشک بھی رواں نہیں تھا

☆☆☆☆

محمد مختار علی (سعودی عرب)

خامشی میں ہیں مبتلا سب جی
اذنِ اظہار چاہیے، رب جی

گھر کے سارے چراغ تو گل ہیں
ڈھونڈتی ہے ہوا کسے، اب جی

وقت ٹھہرے تو ہم کریں کوئی بات
ہو اِشارہ تو کچھ ہلیں، لب جی

کان اُس کا ہٹا تھا سینے سے
اور پھر جانے رُک گیا کب، جی

دن گزارو گے کس طرح آخر
وصل کی جب گزر گئی شب جی

کانپتی ہے دیے کی لو مختار
دوستوں کی جو بات ہو اب جی

☆☆☆☆

ندیم اجمل عدیم (برطانیہ)

زخم کھاؤں، تجھے تلوار بھی میں لا کر دوں
پست قامت ہو تو دستار بھی میں لا کر دوں

میں نے اظہار کی کنجی تو تجھے لا دی تھی
اب تجھے جرأتِ اظہار بھی میں لا کر دوں

کیا ترے حسن پہ میں پہلے فدا ہو جاؤں
اور پھر خود سا پرستار بھی میں لا کر دوں

کوئی بازار سجا بھی تو یہ ناممکن ہے
تجھ کو گفتار بھی کردار بھی میں لا کر دوں

یہ محبت میں مرے دوست کہاں لکھا ہے
تجھ کو انکار پہ اقرار بھی میں لا کر دوں

جب کوئی شعر نہ ہو پائے تو وہ کہتا ہے
اس کو یکتا ہوا فن کار بھی میں لا کر دوں

کاتبِ وقت نے کچھ سوچ کے لکھا ہوگا
بے خبر شخص کو اخبار بھی میں لا کر دوں

ذیشان حیدر (آسٹریلیا)

عجیب خواب تھا چہرے کو دھو رہا تھا میں
کھلی جو آنکھ حقیقت میں رو رہا تھا میں

مجھے قضا نے جگایا تو یہ کھلا مجھ پر
مسافروں کی سرائے میں سو رہا تھا میں

غبارِ جسم سے باہر نکل کے دیکھا تو
میں وہ نہیں تھا، زمانے میں جو رہا تھا میں

ابھی تو فصلِ گزشتہ پہ بور آیا تھا
کہ کشتِ دل میں نیا بیج بو رہا تھا میں

وہ زندگی بھی کوئی زندگی تھی کیا حیدرؔ
عبث ہی اتنا پریشان ہو رہا تھا میں

☆☆☆☆

ارشدؔ سعید (آسٹریلیا)

خود پسندی سانحہ تھی فیصلوں کے درمیاں
شرم آتی ہے مجھے اب مُنصفوں کے درمیاں

شہرِ دل خاموش ہے احساس ہو کیسے بیاں
ہونٹ سِل جاتے ہیں اکثر چاہتوں کے درمیاں

گفتگوئے یار میں اب طنز بھی آنے لگا
دُشمنی کا ذکر کیا ہو دوستوں کے درمیاں

اضطرابی عہد ہے رہزن بنے ہیں رہنما
اتفاقِ فکر ہے بس مجرموں کے درمیاں

خواب ہی ساری مسافت خواب ساری منزلیں
خواہشیں ہی خواہشیں ہیں، خواہشوں کے درمیاں

صرف آنکھوں نے کہا یہ ماجرائے دردِ دل
خامشی نے گفتگو کی بندشوں کے درمیاں

صاحبانِ فکر کو ارشدؔ نظر آتا نہیں
عقل والے کھو گئے ہیں مشوروں کے درمیاں

اقبال نوید (برطانیہ)

اگرچہ پار کاغذ کی کبھی کشتی نہیں جاتی
مگر اپنی یہ مجبوری کہ خوش فہمی نہیں جاتی

خدا جانے گریباں کس کے ہیں اور ہاتھ کس کے ہیں
اندھیرے میں کسی کی شکل پہچانی نہیں جاتی

مری خواہش ہے دنیا کو بھی اپنے ساتھ لے آؤں
بلندی کی طرف لیکن کبھی پستی نہیں جاتی

خیالوں میں ہمیشہ اس غزل کو گنگناتا ہوں
کہ جو کاغذ کے چہرے پہ کبھی لکھی نہیں جاتی

وہی رستے، وہی رونق، وہی ہیں عام سے چہرے
نوید آنکھوں کی لیکن پھر بھی حیرانی نہیں جاتی

☆☆☆☆

حسین عابد (جرمنی)

ایک لمحہ کافی ہے

ایک لمحہ کافی ہے
کسی اجنبی، نیم وا دریچے سے
کھنکتی ہنسی پر ٹھٹھکتے
محبوب آنکھوں میں جھانکتے
ہلکی خوشبو
اور معصوم آوازوں کے شور میں
بدن سے دن کی مشقت دھوتے
یا کھلے، وسیع میدان میں بہتی
ندی کے ساتھ چلتے
جس کے کناروں کی گھاس
پانی میں ڈوب رہی ہو

وقت کی دھڑکتی ہتھیلی میں پڑا
ابدی مسرت کا لمحہ
جو سارے مساموں سے پھوٹ نکلے

ایک گہرے دوست جیسا
جو کبھی جدا نہ ہو
ایک جگنو جیسا
جو گمبھیر رات میں چلتے
اچانک تمہارے سامنے آ نکلے
ایک لمحہ کافی ہے

رضی عابدی

خوف ۔ جدید ناول کا ایک اہم عنصر

آج کا انسان خوف کے حصار میں زندگی گزار رہا ہے ۔ آج کا انسان ڈرا ہوا انسان ہے ۔ تمام فنون لطیفہ میں اور خصوصاً ادب میں ناول وہ صنف ہے جو زندگی سے قریب ترین ہے ۔ جدید ناول کا Motif، اس کا سب سے نمایاں پہلو خوف ہے ۔ اور یہ خوف دوسری اصناف اور دوسرے فنونِ لطیفہ میں بھی واضح طور پر نظر آتا ہے ۔ شاعری میں ٹی ایس ایلیٹ کے ہاں یہ نمایاں ہے :

A woman drew her long black hair tight
And fiddled whisper music on these strings
And bat with baby faces in the violet light
Whistled and beat their wings
And crawled head downword down a blackened wall
And upside down were towers
Tolling remimiscent bells, that kept the hours

And voices ringing out of empty cisterns and
exhausted wells
In this decayed hole among the mountains
In the faint moon light, the grass is singing
Over the tumbled graves, about the chapel
There is the empty chapel, only the wind's home

(The Wasteland)

کتنا سحر انگیز اور ڈراؤنا منظر ہے۔ اس میں جنگ عظیم کے اثرات کے اشارے بھی ملتے ہیں اور قرب قیامت کی نشانیاں بھی جو پادریوں کے کتا بچوں میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً موت کا منظر، مرنے کے بعد کیا ہوگا۔

اسی طرح کے دل دہلا دینے والے مناظر ہمیں Yeats کی نظم The Second Coming میں بھی ملتے ہیں۔

A shape with lion body and the head of a man
A gaze blank and pitiless as the sun
Is moving its slow thighs, while all about it
Reel shadows of the indignant desert birds
……….
And what rough beast, its hour come round at last
Slouches towards Bethelehem to be born?

اسی طرح کے ڈراؤنے منظر کافکا کی کہانیوں میں بھی ملتے ہیں جہاں آدمی ایک کیڑا بن جاتا ہے۔ جہاں ایک ملزم کو سزا ملتی ہے مگر پتہ نہیں چلتا کہ اس کا جرم کیا ہے۔ جہاں راستے بھول بھلیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ جیمز جوائس کی کہانیوں میں خوف کا یہ عنصر غالب ہے۔ وہاں جھوٹ بولنے والے بچوں کی آنکھیں چیلیں نوچ لیتی ہیں۔ اور گنہگاروں کو عذاب کے ڈراؤنے منظر دکھائے جاتے ہیں۔

غرض یہ پوری صدی پہلی جنگ عظیم سے ہی خوف اور دہشت کی صدی رہی ہے۔ البتہ اس خوف کے ماحول میں اس خوف کا علاج بھی تھا۔ کافکا پکا یہودی تھا۔ ٹی ایس ایلیٹ پروٹسٹنٹ مسلک کو چھوڑ کر رومن کیتھولک ہوگیا تھا اور مذہب میں شانتی کی تلاش کر رہا تھا۔ اسی طرح جیمز جوائس کو کسی بشارت کا انتظار تھا۔

ہمارے اپنے ناول نگار خوف اور دہشت سے سہمے ہوئے ہیں۔ مگر اس کے علاج سے بے خبر ہیں

ایک ایسا روپ انتظار حسین کے ہاں نظر آتا ہے۔ جو داستانوں اور دیومالائی کہانیوں سے گزر کر ناول کی طرف آتے ہیں۔ یہ اور ہی دنیا ہے۔ داستانوں اور دیومالائی قصوں میں مہیب وارداتیں تو تھیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کا علاج بھی تھا۔ جن تھے، پریاں تھیں، جادو ٹونے تھے، معجزے تھے۔ مگر آج کے انسان کے پاس ایسے کوئی سہارے نہیں ہیں۔ وہ اپنے آپ کو تنہا اور مجبور محسوس کرتا ہے۔ اس کیفیت میں ذہن لاشعور کی ان اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے جہاں وہ وحشت کے پرہول ماحول میں رہتا تھا۔ البتہ اس نے کچھ منتر اور کچھ عمل اس آفت کا مقابلہ کرنے کے لیے دریافت کر لیے تھے۔ قربانی، دعا اور عملیات میں اس نے اس دہشت کا حل تلاش کر لیا تھا۔ مگر آج کا انسان اب ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ اور انہیں توہمات کہہ کر رد کر دیتا ہے۔ شاید مذہبی ہونا اب دقیانوسیت، جہالت اور توہم پرستی سمجھا جاتا ہے۔ چناں چا سے ہر طرف سے خوفناک چیخیں سنائی دیتی ہیں مہیب شکلیں نظر آتی ہیں۔ لوگوں کے ہجوم دکھائی دیتے ہیں۔ مگر لوگوں کے سر نہیں ہیں۔

کیا وجہ ہے کہ ٹی ایس ایلیٹ کافکا اور جیمز جوائس مذہب کی طرف لوٹ گئے مگر ہمارے دانشور ایسا نہیں کر سکے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مغرب کے یہ دانشور عقل کی کامیابیوں کو دیکھ چکے تھے اور اس کے "معجزات" کو سمجھ چکے تھے۔ انہیں عقل کی نارسائی کا علم ہو گیا تھا۔ وہ جان گئے تھے کہ عقل کے پاس تمام سوالوں کے جواب نہیں ہیں۔ جبکہ مذہب میں ہر سوال کا جواب ہے۔ اس وجہ سے وہ عقیدے کی طرف لوٹ گئے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں سائنس حیران کن تو ہے مگر ابھی ہم اس کی دنیا میں داخل ہی نہیں ہوئے ہیں۔ مغرب کے لوگ سمجھتے ہیں کہ سائنس بھی ایک طرح سے مذہب ہی بن گئی ہے اور لاہوت تک جانے کے لیے پر تول رہی ہے۔ چنانچہ وہ اصل کی طرف لوٹنے میں ہی نجات دیکھتے ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارا اعتقاد کمزور ہوتا جا رہا ہے اور سائنسی شعور ہم میں بیدار نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ خوف اور دہشت وہیں کے وہیں ہیں۔ لیکن اب کوئی نقاب پوش، کوئی مولا علی مدد کو نہیں آتا۔ مختصر یہ کہ ایمان چلا گیا اور سائنس آئی نہیں۔ اس خلاء میں وہی ہوا جو کہ ہونا تھا۔ آج کا ناول داستانوں کی طرف تو لوٹا ہے مگر معجزوں کی طرف نہیں۔ وہی عالم وحشت ہے جو وحشی انسانوں کا مقدر تھا مگر اس کا وہ توڑ نہیں جو ان کے پاس تھا۔ چنانچہ انتظار حسین کے ہاں:

> سہی ہوئی فضا، چپ چاپ، بلند و بالا مکان ان میں پر اسرار روحیں چل پھر رہی تھیں۔ پھر اچانک کسی دور کی گلی سے ایک قد آور سایہ نکلتا نظر آیا۔ سایہ ڈگ بھرتا ہوا دور نکل جاتا اور یوں لگتا کہ فضا کی گھگی بندھ گئی ہے۔ ایکا ایکی نامعلوم سمت سے ایک عقاب آہستہ آہستہ اترتا ہوا آیا۔ ایک مخدوش پرچھائیں پھر اونچی اونچی چھتوں اور

> مسجد کے گنبد پر کانپتی دکھائی دی۔ اتنے میں کسی دور کی گلی سے کسی کے نوحہ کرنے کی پر اسرار آوازیں آئیں۔ جو مکان سنسان ویران پڑے تھے وہ ایکا ایکی ایک خوفناک قسم کے شور سے گونج اٹھے عورتیں، بچے اور مرد چھتوں پر چڑھ گئے اور شور مچا رہے تھے اور چیخیں مار رہے تھے۔ پھر ننگ دھڑنگ فقیروں کا ایک گروہ سرپٹ آتا دکھائی دیا۔ میلے کچیلے سیاہ توا جسم، ڈراونے چہرے لال لال آنکھیں، گردنوں کی رگیں پھولی ہوئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں مکروہ صورت عورتوں کا جلوس نمودار ہوا اور خون سے لت پت بے سر کے جسموں پر وہ سوار تھیں۔ ان کے لمبے لمبے خشک بالوں سے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔۔۔ زمین ہلنے لگی۔ عمارتیں اڑڑ دھم گرنے لگیں۔ لوگ گھروں کو چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ مسجد کے مینار سرنگوں ہو گئے اور فضا میں ایک گرجدار آواز گونجی---- گر پڑا---بڑا شہر گر پڑا۔

(چاند گہن)

مغرب میں صورت حال مختلف تھی۔ دور عقل(Enlightenment) کے ایک سرے پر شیکسپیئر کا ہیملٹ تھا۔ اور دوسرے سرے پر جارج ایلیٹ کی میگی Maggie، ہیملٹ کو ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے سامنے اس کا حریف اس کا اپنا چچا کلاڈئس ہے جو اسے تخت وتاج سے محروم کرنا چاہتا ہے۔ ہیملٹ بڑے جتن کرتا ہے، بہت ترکیبیں لڑاتا ہے اور سازشوں کے جال پھیلاتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔ آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ماورائی قوتیں اس کے خلاف کام کر رہی ہیں اور وہ کہتا ہے کہ ایک چڑیا بھی گرے تو اس کے پیچھے کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اس کے دوسرے سرے پر جارج ایلیٹ کی مل آن دی فلاس کی میگی ہے جو زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے اور ناکام رہتی ہے اور آخر اس تذبذب کے سیلاب میں ڈوب جاتی ہے۔ وہ ماورائی قوتوں کو اپنی ناکامیوں کا سبب نہیں سمجھتی۔ ہیملٹ کے زمانے میں ابھی عقیدہ مضبوط تھا۔ ہیملٹ اس کی طرف لوٹ سکتا تھا۔ سائنس ابھی اتنی مضبوط نہیں تھی کہ اعتقاد کو ہلا سکے۔ اس لیے وہ اس طرف نہیں آ سکتا تھا۔ جارج ایلیٹ تک آتے آتے مذہب بہت کمزور ہو چکا تھا۔ اس کی ایک واضح صورت چوسر کے "کینٹربری ٹیلز" میں نظر آتی ہے۔ جہاں راہبات اور پادری، مادہ پرست، لالچی اور اخلاق باختہ ہو گئے تھے۔ اور ان پر سے عوام کا اعتماد اٹھ گیا تھا۔ پادری بننا اب مشن نہیں تھا بلکہ پیشہ بن گیا تھا۔ جارج ایلیٹ کے زمانہ تک یہ چرچ میں صرف ایک پیشہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس میں سے روحانیت نکل گئی تھی۔ دوسری طرف سائنس تیزی سے ترقی کر رہی

تھی۔ ٹیکنا لوجی نے سائنس کی حقیقت اور قوت کو ثابت کر دیا تھا۔ صنعتی انقلاب آ چکا تھا۔ اب سائنس پر اعتماد بڑھتا چلا جارہا تھا۔ اور مذہب پس منظر میں چلا گیا تھا۔ چنانچہ جارج ایلیٹ کے لیے ہملٹ کی طرح مذہب کی طرف لوٹنا ممکن نہیں تھا۔ اسے سائنس پر اعتماد تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ سائنس ابھی اس مقام تک نہیں پہنچی جہاں وہ زندگی کے سب مسائل کا حل بتا سکے۔ سائنس نا کافی تھی مگر اس پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ اس کے برعکس ہمارے دانشور تھے جو مذہب کھو چکے تھے لیکن سائنس کی طرف نہیں آئے تھے۔ یہ صورت حال انتظار حسین کے ہاں نظر آتی ہے۔ ان کی کہانیوں میں داستانوں کا ماحول ہے لیکن داستانوں کا عقیدہ نہیں۔

اس کے بعد ہم ذہن کی دوسری سطح پر آتے ہیں جو ہمیں قرۃ العین حیدر کے ہاں نظر آتی ہے۔ وہ دیو مالائی سطح سے ہٹ کر ادراک کی سطح پر مسائل حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کا انداز فکر تجرباتی Empirical ہے۔ وہ اپنی شناخت کی تلاش مین زمانوں اور ملکوں کی خاک چھانتی ہے۔ وہ تجربہ، مشاہدہ اور استدلال کے ذریعہ مسائل کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کرتی ہے:

> انسانی دماغ دیومالا کی تخلیق مدتیں ہوئیں کر کے ختم کر چکا تھا۔ خیال کے صنم خانے آباد ہو کر پرانے بھی ہو گئے تھے۔ دماغ اب دقیق مسئلوں کا حل تلاش کرنے میں مصروف تھا۔ مذہب اب کمزور درجہ کا علم سمجھا جاتا تھا، اصلی چیز فلسفہ تھا اور مابعد الطبیعات ، سارے ملک میں خیالات کیف راوانی تھی اور آزادیِ افکار اور مذہبی روا داری، ایک ہی کنبہ کے افراد برہما کے مختلف مظاہر کی پرستش کرتے تھے اور متضاد نظریوں پر یقین رکھتے تھے۔

(آگ کا دریا)

قرۃ العین کا دور استدلالی دور ہے۔ لیکن فلسفہ اور مابعد الطبیعات بھی زیادہ دور تک ساتھ نہیں دیتے:

> ازل سے باتیں دہرائی جارہی ہیں۔ میں نے اسے فارسٹ آف آرڈن میں دیکھا تھا۔ یعنی اب ، انفرادی دکھ، انفرادی سوچ اور انفرادی کوشش اتنی اہم نہیں رہی۔ ہر مصنف کا یہی خیال تھا کہ وہی صحیح ہے۔ لیکن خیالات اور نظریے موسم کے کے ساتھ برسوں، قرنوں اور صدیوں کے ساتھ تیزی سے بدل گئے تھے۔

(سفینۂ غمِ دل)

اور اس طرح فلسفہ کے راستے پر چلتے ہوئے انسان خود اپنے اندر سمٹتا چلا جاتا ہے اور آخر میں بالکل تنہارہ جاتا ہے اور آخرکار:

> جذبات اور خیالات کی سب سے اونچی چوٹی پر ہمیشہ وہی اکیلا کھڑا رہ جاتا۔ تنہا، ازلی اور ابدی جس کا نام گوتم ہے اور مائکل ہے اور ہیری اور سرل، اور کمال اور رضا، اس کی تنہائی امٹ ہے۔

چناں چہ اب دیومالا اور فلسفہ سب بے معنی نظر آتے ہیں۔ یہی رویہ ہمیں جازف کانرڈ کے ہاں نظر آتا ہے۔ وہ خود نوآبادیاتی ماحول کی پیداوار تھا اور پولینڈ سے، جو روس کی نوآبادی تھا بھاگ کر انگلستان آیا تھا۔ اس نے نوآبادیاتی نظام کو قریب سے دیکھا اور اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے دیکھا کہ کس طرح نوآبادیاتی نظام ایک طرف تو نوآبادیوں کے کلچر اور اقدار کو مسخ کر رہا تھا اور دوسری طرف وہ خود استعماری قوموں کے کردار کو بگاڑ رہا تھا۔ اگر پسماندہ ممالک کے لوگ توہمات میں گرفتار تھے تو یہی توہمات کرٹز Kurtz Kartner کی شکل میں مغرب کے ذہن کو گندہ کر رہے تھے۔ ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد۔ یہاں بھی کوئی ماورائی قوتیں نہیں بلکہ انسانی عقل کی عیاریاں کارفرما ہیں۔ جھوٹ اور فریب آدمی کی ضرورت بن گئے ہیں۔ ڈی ایچ لارنس نے بھی مسائل کو سماجی اور نفسیاتی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی جو سفر دیومالا سے شروع ہوا تھا اب نفسیات تک پہنچ گیا تھا۔

لیکن ذہن انسانی اب اس مقام تک پہنچ گیا ہے۔ جہاں مسئلوں کا حل وہ نہ دیومالائی پس منظر میں دیکھتا ہے نہ سماجی اور نفسیاتی الجھنوں میں بلکہ اب زمینی حقائق کو براہ راست دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

پاکستان میں اب کچھ عرصہ سے اردو اور انگریزی میں خاصی تعداد میں ناول لکھے جا رہے ہیں۔ مثلاً مستنصر حسین تارڑ کا "بہاؤ" اور مرزا اطہر بیگ کا "غلام باغ" اس نئی سوچ کو ظاہر کرتے ہیں۔

انگریزی میں طارق علی کا Under the Pomegranate Tree، محسن حمید کے Reluctant Fundamentalist اور Moth Smoke، جمیل احمد کا Wandering Falcon، خدیجہ گوہر کا The next season's yield اور نورالامین ملک کا Sciamachy اس کی مثالیں ہیں۔

"بہاؤ" موہن جوڈارو کی کہانی ہے۔ بھٹہ مزدوروں کو قید میں رکھ کر ان سے زبردستی مشقت کرائی جاتی تھی۔ پورے کے پورے خاندان قید ہوتے تھے۔ یہ ظلم آج کے پاکستان میں بھی جاری ہے۔ دوسری طرف آسمان سے بلائیں بھی نازل ہو رہی ہیں۔

گھاگھرا ندی کا پانی سوکھتا جا رہا ہے۔ لوگ اپنے کاروبار اور گھر بار چھوڑ کر دوسری جگہوں پر تحفظ اور روزگار کی تلاش میں ہجرت کر رہے ہیں۔ ایک پروشنی ہے جو کسی صورت وہاں سے جانے کو تیار نہیں ہے۔ وہ زندگی کی بیدار روح کی علامت ہے۔ اس کے متعلق روایت ہے کہ وہ دریا کی بیٹی ہے۔ وہ اپنی جگہ

چھوڑنے کو تیار نہیں۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ اس کا اپنا بانجھ پن اور اس زمین کا بانجھ پن بیرونی قوتوں کی وجہ سے نہیں ہے۔ اس کی بنیاد خود ان کے اپنے اندر ہے اور اسے اس کے خلاف آخر دم تک لڑنا ہے۔ ہجرت کوئی حل نہیں ہے۔ تمثیل مکمل ہے۔ یہی آج کی ہماری صورت حال ہے۔ آج بھی مزدوروں سے جبری مشقت کروائی جاتی ہے۔ راوی سوکھ رہا ہے۔ دہشت گردی عام ہے۔ لوگ ہجرتیں کر رہے ہیں۔ آہ و بکا کر رہے ہیں۔ مگر یہ مسائل کا حل نہیں ہے۔ درگاہ بستی کا ایک بزرگ ہے۔ وہ زور دے کر کہتا ہے کہ آہیں بھرنے اور واویلا کرنے سے مصیبتیں آتی ہیں۔ وہ انہیں اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ مصیبتیں ان کا مقابلہ کرنے سے دور ہوتی ہیں۔ آہ و بکا کرنے اور کراہنے سے نہیں۔

چناں چہ ناول کا سفر دیومالائی ماحول، فلسفیانہ موشگافیوں اور سماجی و نفسیاتی الجھنوں سے گزر کر اب خوف کو زمینی حقائق کے تناظر میں دیکھنے لگا ہے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

ہم ترجمہ، کیسے نہ کریں

یہ طے ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام (1936) سے قبل تراجم کے زیر اثر ہمارے تخلیقی ادب کو مخصوص نوع کی مغربی روش کا سامنا رہا، جس کے باعث ہمارے افسانوی ادب کا بیشتر حصہ ایسا ہے کہ جسے بڑی آسانی سے ''اینگلو انڈین ادب'' کے کھاتے میں ڈالا جا سکتا ہے۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ ہمارے تخلیق کاروں کو اوائل بیسویں صدی کی قومی تحریکوں کا ہمنوا ہو کر ہی تراجم کی طرف آنا چاہیے تھا۔ مقصد یہ ہے کہ ہمیں ادبیات کا مطالعہ مخصوص معاشرتی حوالوں، ذہنی رویّوں اور ضرورتوں کی مناسبت سے کرنا چاہیے تھا اور کرنا چاہیے بالخصوص، اردو زبان کی نئے عہد سے مطابقت رکھنے والی لسانی تشکیلات اور اسلوبیاتی دائرہ عمل کے بارے میں منصوبہ بندی کی ضرورت تھی اور ہے۔

محمد حسن عسکری نے ان عوامل کا تجزیہ کرتے ہوئے اردو میں ترجمے کی روایت کو کھنگال ڈالا۔ اور اُس کا ردِ عمل، خود ان کے کیے ہوئے تراجم ہیں۔

ماضی کی بات کریں، یا زمانہ حال کی، ہمارے بیشتر مترجمین ترجمے کی اہمیت سے ناواقفیت کی بنا پر اُسے تخلیقی مسئلہ نہیں سمجھتے۔ جبکہ ترجمے کا جواز محض موضوع کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا نہیں اصل بات تو ترجمہ کے ذریعے ترقی یافتہ زبانوں کے اسالیب کو اپنی زبان میں ڈھالنے سے پیدا ہوتی ہے۔ بے شک، دوسری زبانوں کے ناول نگاروں خصوصاً وکٹر ہیوگو، الگزینڈر ڈوما، ٹالسٹائی، تورگنیف، زولا، بالزاک، اناطول فرانس اور اسکاٹ کے تتبع میں شاد عظیم آبادی، سجاد عظیم آبادی، عبدالحلیم شرر لکھنوی، راشد الخیری دہلوی اور مرزا ہادی رُسوا لکھنوی نے اردو میں ناول نگاری کا فن متعارف کروایا۔۔۔ یا اُن سے قبل نذیر احمد دہلوی کے تمثیلی قصوں کی کردار نگاری میں پائی جانے والی کردار نگاری میں نفسیاتی تجزیہ کاری جارج ایلیٹ سے مخصوص ہے۔ بےشک مرزا ہادی رُسوا نے میری کوریلی کے متعدد ناولوں کے تراجم کے ذریعے جاسوسی ادب کو اردو دنیا سے متعارف کروایا اور یہ فن ظفر عمر کے ہاں باقاعدہ سُراغ رسانی کے ادب میں ڈھل گیا۔ تیرتھ رام فیروز پوری کے طبع زاد جاسوسی ناول اُس سے اگلا قدم تھے اور پھر اپنے ابنِ صفی۔ لیکن، اسالیب بیان تک رسائی کا جتن بھی تو کرنا تھا۔

ہم نے ‘رہس’ اور ‘نوٹنکی’ کو ناکافی خیال کرتے ہوئے ممبئی کے پارسی تھیٹر کی معرفت مغربی دنیا سے رشتہ جوڑنے کی سعی کی۔ ولیم شیکسپیئر کی عالمگیر شہرت سے باکس آفس پر کامیابی کا تصور بندھا اور آغا حشر، اُردو ڈراما کے شیکسپیئر کہلائے۔ لیکن اِس خراج تحسین کی خرابی اُس وقت تک محسوس نہ کی جاسکتی، جب تک شیکسپیئر کو انگلش ڈراما کا آغا حشر تصور کر کے نہ دیکھ لیا جائے۔

یہی سبب ہے کہ بہت ہوا تو رفیع پیر، اشفاق احمد، فاطمہ ثریا، بانو قدسیہ، کمال احمد رضوی اور حسینہ معین ہاتھ آئے۔ اب ان کا موازنہ مغرب کے بڑے ڈراما نگاروں سے کر کے دیکھ لیجیے۔ ہم پیٹے ہی دکھائی دیں گے۔ اُن ڈراما نگاروں کا کیا ذکر کریں، جو کان پر قلم دھرے ٹیلی وژن کے چکر لگاتے ہیں۔

مختصر افسانے کی سطح پر ہمارے ہاں ابتداء میں تین نام بہت ترجمہ ہوئے رابندرناتھ ٹیگور، گورکی اور موپاساں۔ جن سے اسلوبیاتی سطح پر ہم قابل ذکر استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔ یا پھر سمرسٹ ماہام ترجمہ ہوا، جس سے اثر پذیری کی سب سے اہم مثال کرشن چندر تھے۔ آج بڑے افسانہ نگاروں کا ذکر کریں تو اکثر کرشن چندر کا نام یاد نہیں رہتا۔

کیسی عجیب بات ہے کہ ہمارے ہاں مغرب سے بہت کم طنز و مزاح ترجمہ ہوا، پھر بھی ہم محمد خالد

اختر اور مشتاق احمد یوسفی کے کام کے ساتھ ثروت مند دکھائی دیتے ہیں اور وزیر آغا کے انشائیے چارلس لیمب ، ہیزلٹ، ڈی کوئنسی، جسٹرٹن اور اسٹیونسن کے تراجم کے مرہونِ منت نہیں۔ دیگر اصناف کی تفصیل میں جائیں گے تو یہ قصہ طولانی ہے۔

ضرورت ہے تو اس بات کی کہ فنِ ترجمہ ناضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے مترجم کی راہ کی اَڑچنوں کو زیرِ بحث لایا جائے تو چند سوالوں کا ذہن میں پیدا ہونا لازمی امر ہے۔ وہ سوال کچھ یوں ہوں گے :

۱۔ کیا ایک اچھا ترجمہ ہمیشہ تخلیقی ہوتا ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو تخلیق اور ترجمے کی حد بندی کیوں؟
۲۔ اگر ایسا ہی ہے تو علمی کُتب اور صحافت سے متعلق تراجم کے معیار کو پرکھنے کا کیا پیمانہ ہوگا؟
۳۔ کیا ترجمہ سے مراد متبادل اور مترادف الفاظ کی تلاش ہی ہے؟
۴۔ کیا ترجمہ سے محض قاری کی رہنمائی مقصود ہوتی ہے، جو دوسری زبان کو نہیں جانتا ؟
۵۔ ڈاکٹر لاشٹر نے کہا تھا کہ ہمیں ترجمے پر انحصار نہیں کرنا چاہیے اور محض اصل مفہوم سمجھ کر اُسے اپنی زبان میں بیان کر دینا چاہیے؟ کیا ایسا کچھ ہی ہونا چاہیے؟

ان تمام سوالات کے جواب نامور مترجمین نے ترجموں کے ذریعے عملی طور پر فراہم کیے ہیں۔ ارنسٹ فلینولوسا، ایزرا پاؤنڈ اور آرتھر ویلی ترجمے کی دنیا کے تین نہایت اہم نام ہیں، اُن کے ترجمے کے ضمن میں ان سوالات کا مجمل جواب دینے کے لیے سُود مند ہوگا۔

اَرنسٹ فینولوسا، بوسٹن کا پہلا ادیب اور محقق تھا جس نے کلاسیکی جاپانی ڈرامے کو مغرب سے متعارف کروایا۔ یہ کام ترجمے کی معرفت ہوا۔ 1910ء کے بعد ایزرا پاؤنڈ کا جُھکاؤ مشرق کی سمت ہوا اور اُس نے مشرقی تہذیبی روایات سے گہرے اثرات قبول کیے۔ اِس کا سبب بھی تراجم تھے۔ مشرق کی شعری روایت سے پاؤنڈ کا اوّلین تعارف عمر خیام کے تراجم کی معرفت ہوا۔ یہ فٹز جیرالڈ کی شہرت کی ابتداء تھی۔ پاؤنڈ نے عمر خیام سے جیرالڈ کی معرفت متعارف ہونے کے بعد ہندی، چینی، جاپانی اور بنگلہ زبانوں اور تہذیبوں کی قدیم دستاویزات میں دلچسپی لی۔ ایزرا پاؤنڈ کے اس کام کی ابتداء مجموعہ "CATHY" کی طباعت سے ہوئی تھی۔ پھر اُس نے چینی شاعری کے تین مجموعے شائع کروائے۔

یہ تراجم ہی کا اثر تھا کہ پاؤنڈ نے بھگت کبیر کے چند دوہوں کا ترجمہ کرنے کے بعد جب کینٹوز لکھنے شروع کیے تو ان میں کبیر کا مشرقی لحن بھی شامل ہوگیا اور ”کہت کبیر“ کی گونج صاف پہچانی گئی۔

اَرنسٹ فینولوسا کی بیوہ رسالہ ”پوئٹری“ میں پاؤنڈ کی تحریریں پڑھ کر اُس سے حد درجہ متاثر تھی۔ یہی سبب ہے کہ سروجنی نائیڈو کی قیام گاہ پر پاؤنڈ سے ایک اتفاقی ملاقات پر اُس نے اپنے مرحوم شوہر کا غیر

مرتب کام پاؤنڈ کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد پاؤنڈ چینی شاعری کے ترجموں کی طرف کچھ ایسا آیا کہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کو کہنا پڑا کہ : ”پاؤنڈ نے ہمارے زمانے کے لیے چینی شاعری کو دریافت کیا ہے“۔

پاؤنڈ کی اس ”دریافت“ کو نئے زمانے میں مشرق اور مغرب کے درمیان اوّلین مضبوط رابطہ شمار کیا جاتا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ پاؤنڈ ترجمہ برائے ترجمہ کا قائل نہیں تھا بلکہ اس نے ترجمے کے وسیلے سے ہر دو اطراف کی تہذیبوں کے بطون کا مطالعہ پیش کیا۔ اس طرح جب اس نے جاپانی ڈرامائی روایت کو انگریزی میں منتقل کرنے کا کام کیا تو اس کے فوراً بعد ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس کے منظوم ڈرامے سامنے آئے۔ یہ ترجمے کے حوالے سے پاؤنڈ ہی کے طفیل ممکن ہو سکا۔ ایزرا پاؤنڈ کے خیال میں جو دَور تخلیقی ادب کے لحاظ سے عظیم ہوتا ہے وہ ترجموں کے لحاظ سے بھی عظیم ہوتا ہے یا تخلیقی دَور ترجمے کے دَور کے بعد آتا ہے۔ پاؤنڈ کی رائے میں ”اووِڈ“ کا مترجم گولڈنگ اتنا بڑا شاعر ہے کہ اس کا مقابلہ ملٹن سے کیا جا سکتا ہے۔ پاؤنڈ نے آخری دَور میں ”اووِڈ“ کی یوں مدح کی ہے :

> ”اووِڈ کے ہاں عظیم حکمت ملتی ہے“۔

1934ء میں راپالو سے ایک مراسلہ نگار کو پڑھنے کے لیے کتابوں کے نام بتاتے ہوئے پاؤنڈ نے لکھا:

> ”انگریزی زبان و ادب کا کوئی شعبہ بھی ’اووِڈ‘ کے بغیر ایک پاکھنڈ ہے“۔

بقول ولیم وِین اوکونر :

”پاؤنڈ، گولڈنگ کے ترجمے کو ملٹن کی تحقیر کے لیے استعمال کرتا ہے۔ وہ گولڈنگ کے ”ہمعصر روزمرہ“ کا مقابلہ ملٹن کے ”مُبہم اور پُرشکوہ الفاظ‘ سے کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک ترجمے کا معیار اس لیے گر گیا کہ مترجمین نے اصل کتب کے نفسِ مضمون میں دلچسپی لینا چھوڑ دی“۔ (1)

جبکہ خود ولیم وین اوکونر کے خیال میں گولڈنگ کے ترجمے میں اگر کوئی کشش ہے تو وہ اس کے بھولپن اور سادگی کی بدولت ہے۔ اگر گولڈنگ عظمت سے محروم رہتا ہے، جیسا کہ ہے، تو وہ پھر بھی جہاں تک ممکن ہو سکا ایک مُشکل بحر سے بڑی عمدگی کے ساتھ عہدہ برا ہوا۔

ولیم وین اوکونر نے پاؤنڈ کے تراجم پر بات کرتے ہوئے بلیکمر کا حوالہ دیا ہے۔ بلیکمر کے نزدیک پاؤنڈ، پراپرٹیس کا ترجمہ نہیں کرتا، وہ اس کی باتوں کے انگریزی مترادفات پیش کرتا ہے مثال کے طور پر جب پراپرٹیس لکھتا ہے کہ ”شعر کو یوں رواں ہونا چاہیے جیسے اُسے ایک نازک جھانوے سے ملائم کیا گیا ہو“ تو پاؤنڈ لکھتا ہے :

"ہمارے جھانووں کو مستعد رہنا چاہیے"۔ یا جب پراپرٹیئس کہتا ہے کہ:

"فنونِ لطیفہ کی دیویوں کے معبد تک جانے والا راستہ تنگ ہے"۔ تو پاؤنڈ اسے یوں ترجمہ کرتا ہے:

"فنونِ لطیفہ کی دیویوں کے معبد کو کوئی شاہراہ نہیں جاتی"۔

ایسا کیوں ہے؟ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ایزرا پاؤنڈ فینولوسا کی کتاب: "Chinese Written Character as Medium of Poety" کا پروردہ مترجم تھا۔ پاؤنڈ کے ترجمے امریکی ناقد اور مترجم ییپ (YEP) کو ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ اس نے "Cathy" کی مذمت میں ایک کتاب لکھ ماری اور کہتا ہے کہ پاؤنڈ بد دیانت مترجم تھا۔ ییپ نے پاؤنڈ کو چینی زبان سے نابلد قرار دیا ہے۔ پروفیسر ییپ نے انہی نظموں کو دوبارہ ترجمہ بھی کیا، جنہیں پاؤنڈ ترجمہ کر چکا تھا۔ بہت ممکن ہے ییپ کے ترجمے پاؤنڈ کے تراجم کی نسبت متن سے زیادہ قریب ہوں، لیکن یہ بات سب مانتے ہیں کہ ییپ کے ترجمے پھسپھسے اور شعریّت سے یکسر عاری ہیں۔ اور اسی میں پاؤنڈ کی عظمت کا راز ہے۔

آرتھر ویلی (1966-1889) کا نام بھی مشرقی ادب (خصوصاً چینی اور جاپانی ادب) کو مغربی دنیا سے متعارف کروانے والوں میں نمایاں ہے۔ اس نے چینی شاعر Chu Yuan کے علاوہ لاتعداد چینی شعراء کے تراجم کیے۔ (2) Chu Yuan کی طویل نظم "THE GREAT SUMMONS" کے ترجمہ کو آج بھی اہم مانا جاتا ہے۔

نثری تراجم کی دنیا میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ ۱۰۰۰ء کی مادام موراساکی (LADY MURASAKI SHIKIBU) کے جاپانی قصے "THE TALE OF GENJI" کا ترجمہ (تقریباً ایک ہزار صفحات) ہے، جو بقول سائیڈن سٹیکر (EDWARD G. SEIDENSTICKER):

'جاپانی ادب کا عالی رُومانی نثری کارنامہ ہے' جو آرتھر ویلی کی معرفت مغربی دنیا تک پہنچا۔

سائیڈن سٹیکر نے آرتھر ویلی کے ترجمے کی خرابیاں بھی گنوائی ہیں، اس کے بقول ویلی نے بعض ابواب خصوصاً 38 ویں باب کا ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ تخلیص کر دی ہے۔ لہٰذا سائیڈن سٹیکر نے "The Tale of Genji" کو از سرِ نو ترجمہ کیا۔

سائیڈن سٹیکر کے الفاظ میں: "حقیقت یہ ہے کہ آرتھر ویلی کے تراجم از حد ڈھیلے ڈھالے ہیں۔ وہ ترجمہ کرتے ہوئے انتہائی دیدہ دلیری سے اصل متن میں کانٹ چھانٹ کرتا چلا جاتا ہے"۔ (سائیڈن سٹیکر کی ترجمہ کردہ "The Tale of Genji" کے دیباچہ سے اقتباس)

یوں سائیڈن سٹیکر کے خیال میں آرتھر ویلی کی حیثیت برطانوی مترجم خاتون کونسٹنن گارنٹ {CONSTANCE GARNETT) کی طرح ہے جس نے تقریباً سارا رُوسی ادب انگریزی دنیا سے متعارف کروایا لیکن اس کے ترجمے غلط سلط تھے اور اب اُس کے کام کی حیثیت بھی محض تاریخی ہے ۔

لیکن کیا کیجئے کہ ولیم وین او کونر نے جب ان تین عظیم مترجمین فینولوسا، ایزرا پاؤنڈ اور آرتھر ویلی کا موازنہ کیا تو لکھا ہے کہ :

”مائنیر کا یہ کہنا درست ہے کہ آرتھر ویلی کے ” جاپان کے نوہ ڈرامے“ مستند اور عالمانہ ترجمے ہیں، جبکہ پاؤنڈ اور فینولوسا کی تالیف (مُراد "CATHY") اکثر مقامات پر عالمانہ نظر نہیں آتی اور تاریخی سیاق وسباق کی غلط تفہیم پر مبنی ہے، البتہ اس میں کبھی کبھار خوبصورت اقتباسات بھی آ جاتے ہیں“ ۔(3)

سوچتا چلا کہ اپنی مخصوص حد بندیوں میں ترجمہ تخلیق بھی ہے اور اُس سے جداگانہ طریقۂ کار کا حامل عمل بھی۔ اُس میں متبادل اور مترادف الفاظ کی تلاش بھی کی جاتی ہے اور اصل متن کے بطون کی غوّاصی بھی ۔ یُوں وہ انجان زبان اور تہذیب کے منطقوں میں قاری کی راہنمائی بھی کرتا ہے اور اس کی انگلی تھام کر بھی چلتا ہے ۔

لیکن دقتیں کئی ایک ہیں ۔ مثال کے طور پر اردو زبان میں لفظی سطح پر حرف دو جنسیں ہیں ۔

(۱) مذکّر (۲) موٴنّث ۔ ہمارے ہاں کوئی جنس نہیں ہے جسے 'مخنث' کہا جائے اور جسے مُردہ یا بے جان چیزوں کے اظہار میں برتا جا سکے ۔ جبکہ انگریزی میں ایسا ہے ۔ سو اُردو میں اس کے نہ ہونے سے ہمارے مترجمین کو اس قدر دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ توبہ ہی بھلی۔

پھر اس باب میں خود اُردو زبان کی سطح پر اس قدر اختلاف ہیں کہ اتحاد و اتفاق کسی طور ممکن ہی نہیں ۔ ایک لفظ دلّی میں مذکرّ اور لکھنو میں موٴنّث بولا جاتا ہے ۔ کچھ الفاظ لکھنؤ میں مذکرّ ہیں اور دلّی میں موٴنث ۔ دلی اور لکھنؤ دونوں اُردو زبان کے مرکز ہیں ۔ دُور افتادہ لوگ حیران ہیں کہ کس کی تقلید کریں اور کس کی نہ کریں ۔

ان حالات میں مترجم کی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ زبان کے مراکز کی حتی الامکان تقلید کریں اور انگریزی کی تقلید میں مزید غلطیوں کا اضافہ نہ کریں ۔

بسا اوقات انگریزی زبان میں بے جان چیزوں سے اس طرح خطاب کیا جاتا ہے گویا وہ زندہ ہوں اور اس حالت میں انگلستان کے فُصحا نے یہاں تک کیا ہے کہ انہیں مخنّث نہیں رہنے دیا بلکہ حسب موقع مذکرّ یا موٴنّث بنا دیا ہے ۔ جیسے ولیم شیکسپیئر نے موت اور خواب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے : ”اے

موت!'' ، ''اے خواب!'' وغیرہ۔

اگر یہ اندازِ بیان اُردو کے اصولوں کے خلاف ہے تو انگریزی کی نہیں اُردو کی تقلید فرض ہے پھر یہ کہ انگریزی میں موت مذکّر ہے اور اُس کے افعال و صفات سب مذکّر ہیں مگر اُردو میں موت مؤنّث ہے اور اس کے متعلقات بھی مؤنّث رہیں گے۔

اسی طرح اندازِ بیان کا فرق، بعض اوقات الجھن میں ڈال دیتا ہے۔

انگریزی زبان کے اندازِ بیان کو دیکھیں تو اس کی دو صورتیں ہیں:

DIRECTاور INDIRECT

جبکہ اُردو میں صرف ایک اندازِ بیان (DIRECT) ہی مروّج ہے۔ اس ضمن میں اجتہاد کی ضرورت محسوس کی گئی۔ لیکن یہ ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ ستاں دال کے ناول 'سُرخ و سیاہ' اور فلابیر کے ناول 'مادام بواری' کو ترجمہ کرتے وقت محمد حسن عسکری صاحب نے نئے اسلوبی سانچے وضع کرنے کی کوشش کی جو قابلِ ستائش ہے لیکن اس نوع کا کام ہوا بہت کم ہے۔

بہت ہوا تو محمد سلیم الرحمن نے ہومر کے رزمیہ 'اوڈیسی' کو ترجمہ کرتے ہوئے ایسا کچھ کیا، لیکن 'جہاں گرد کی واپسی' کے عنوان سے شاعری کا منثور ترجمہ ہی کر پائے۔

ترجمہ نگاری میں بندشیں اَن گنت ہیں۔

مُترادفات و مُرادفات کے معاملات۔ اسمائے معرفہ، اسمائے مقامات، اسمائے نکرہ، اسمائے مادہ، اسمائے مجموعہ، نیز واحد جمع کی اُڑچنیں۔

ان سب سے نبرد آزما ہونے کے باوجود ضروری نہیں کہ ہم لازماً بہترین ترجمہ کر پائیں۔ ہمیں اکثر مقامات پر چند ایک بہت ٹیڑھے سوالات کا سامنا رہے گا۔

مثال کے طور پر: جہاں اصل عبارت کا مفہوم صاف نہ ہو، اصل متن کی عبارت اُلجھی ہوئی ہو اور ایک کی بجائے کئی معنی دے رہی ہو تو مترجمین کا کیا فرض بنتا ہے؟ کیا وہ بھی اس نوع کی بُنت کرے کہ ترجمہ کئی معنی دے؟ کیا مترجم کو حق حاصل ہے کہ اپنی طرف سے چند اضافوں کے ساتھ مطلب کو صاف کر دے؟ ایسی صورتوں میں مختلف مترجمین نے ایک سے زائد طریقہ ہائے کار برتے ہیں اور ان میں سے کوئی ایک صورت مسئلے کا آخری حل نہیں۔

ایسی صورت کا حل بڑی حد تک اس موضوع پر، موضوع کے اُس حصے پر اور اصل مصنف کے بیان پر منحصر ہے۔ ڈ۔ انصاری کہتے ہیں:

’’ممکن ہے عبارت کا اصل مفہولم اس لیے صاف نہ ہو کہ مصنف کی بیانیہ کمزوری سے وہ اُلجھا رہ گیا ہو۔ اگر مصنف کو قدرت ہوتی یا اسے معلوم ہوتا کہ فلاں جگہ اُس کی عبارت گنجلک ہے تو وہ اُسے زیادہ وضاحت اور سلاست کے ساتھ بیان کرتا۔ اگر یہ صورت نظر آئے تو ترجمہ کرنے والے کی قابلیت اس میں ہے کہ ترجمے میں اپنی طرف سے کچھ الفاظ کا یا انداز بیان میں اضافہ کر کے انھیں ایسے لکھے کہ عبارت سُلجھ جائے۔

ممکن ہے اُس مقام پر عبارت کو گنجلک رکھنے کا کوئی مقصد ہو۔ بعض موقعوں پر یہ بات ضروری ہوتی ہے۔ خاص طور پر شاعری میں ایسے مقامات آتے ہیں جہاں سر بستہ نکتے کو سُلجھانا ضروری نہیں ہوتا۔ آرٹ میں بعض جگہ تاریک گوشے اصل مقصود کو نمایاں کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں یا بعض جگہ ہلکے سے پردے کسی مجبوری کی وجہ سے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ صاف بات اگر کہی جائے تو اسے پڑھنے والوں کی سُوجھ بُوجھ برداشت نہیں کرے گی، یا حکومت برداشت نہیں کرے گی یا مذہبی اور اخلاقی ادارے چراغ پا ہو جائیں گے یا بیان کے حُسن میں فرق آ جائے گا اور لذت کم ہو جائے گی، ان وجہوں سے بھی یہ ہو سکتا ہے کہ اصل مصنف نے اپنی عبارت کو کسی قدر ڈھکا چھپا رہنے دیا ہو۔ ایسے مقامات کا اور مصنف کے مقصد کا اندازہ لگا لینا ترجمہ کرنے والے کے دل و دماغ اور اچھی صلاحیت پر منحصر ہے۔ اگر وہ اسے پا لیتا ہے کہ یہاں عبارت کو زیادہ واضح کرنے اور عام فہم بنا دینے سے اصل عبارت کی وہ ادائے حجاب جاتی رہے گی جو مصنف کا منشاء ہے تو اسے مصنف کے منشاء کی پابندی کرنی چاہیے اور عبارت کو جوں کا توں اپنی زبان میں منتقل کرنا چاہیے۔

اب اگر کہیں مترجم دیکھتا ہے کہ دراصل عبارت میں فلاں حصہ ایسا ہے کہ اس کے کئی معانی نکل سکتے ہیں تو اسے سوچنا ہوگا کہ مصنف خود اس مقام پر کئی معانی پیدا کرنا چاہتا تھا، وہ ایک رنگ میں کئی ہلکے ہلکے رنگوں کی آمیزش رکھنا چاہتا تھا یا اس کے ذہن میں اپنا ایک مفہوم تھا اور وہ لفظ یا جملہ ایسا لکھ گیا جس سے بیک وقت کئی شعاعیں پھوٹتی ہیں اور بیان کی یک رنگی یا وضاحت میں حائل ہوتی ہیں۔ یہاں پر مصنف کے منشاء کی پابندی کرنا ہوگی۔ اگر پہلی صورت ہے تو اسے اپنی زبان میں ترجمے کے لیے ویسا ہی لفظ یا ویسا ہی محاورہ ڈھونڈنا ہوگا جو کئی کئی معانی کی طرف اشارہ کرتا ہو اور اگر دوسری صورت ہے تو اُسے اصل عبارت کی حدود سے آگے بڑھ کر ایسا لفظ تراشنا ہوگا جو چاہے لفظی ترجمہ ہو یا نہ ہو، لیکن اس ایک مفہوم کے لیے سب سے زیادہ جامع اور مانع وہی ہو۔ اُسے اپنے ترجمے میں اصل کی عبارت یا جملے سے باقی تمام مفاہیم کو راستے سے ہٹانا ہوگا اور صرف ایک کو آگے بڑھانا ہوگا‘‘۔(4)

آخری بات یہ کہ ---- یہ تمام تر مترجم کے سلیقے پر موقوف ہے کہ وہ اصل متن کو کس طرح

اپنائے۔ بعض اوقات صورت، معنی سے دست و گریباں ہوتی ہے اور معنی، رُوح، ذوق یا لب و لہجہ سے اُلجھ پڑتے ہیں۔ ایسے میں مترجم کو تخلیقی سطح کی سُوجھ بُوجھ سے کام لینا پڑتا ہے، مجبوراً ذاتی عناصر کو شامل کرنا ہی پڑتا ہے۔ جیسا کہ فینولوسا، ایزرا پاؤنڈ اور آرتھر ویلی نے کیا۔

ایسی صورت میں ممکن ہے کہ مترجم کی اپنی طرزِ ادا اور اسلوبِ تحریر نمایاں ہونے لگے، اس میں احتیاط لازم ہے۔ لیکن جہاں تک اُس نے سرِ تسلیم خم کیا ہے اور مندرجہ بالا مجبوریوں کی بناء پر اس کی اپنی اہمیت یا شخصیت ترجمے میں جاگی ہے تو یہ اس کا حق ہے۔ اس لیے کہ وہ محض نقال نہیں بلکہ اصل مصنف کا ہمنوا ہمزاج داں، ہم مشرب اور حریف بھی ہے۔

☆☆☆☆

1. Ezra Pound, University of Minnesota, Minneapolis, 1953, U.S.A.
2. More Translations from Chinese, by Arthur Waley, Messrs George Allen and Unwin ltd.
3. Ezra Pound, University of Minnesota Press, Minneapolis, 1953, U.S.A.
4. ’ترجمے کے بنیادی اصول‘، (مضمون) از ڈاکٹر ظ۔ انصاری، مطبوعہ: ’ادبِ لطیف‘ لاہور، اگست 1953

ڈاکٹر اقبال آفاقی

تصوف : تہذیبِ اسلام کی دلآویز دنیا

پس منظر

تصوف کی تحریک کو بجا طور پر تہذیبِ اسلام کی ایک دل آویز جہت قرار دیا گیا ہے۔ اس کی شروعات بنو امیہ کے زمانہ اقتدار میں ہوئیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اسلام میں ملوکیت و استعماریت کی بنیاد رکھی جا رہی تھی اور درباداری اور شاہی پشت پناہی کے زیر اثر فکری اجارہ داری مستحکم ہو رہی تھی۔ سیاسی اغراض و مقاصد کو فوقیت دینے کے نتیجے میں گھٹن کی وہ فضا کو جنم لے رہی تھی جس میں حریتِ فکر و نظر کو زندیقیت اور جرأت اختلاف کو کفر و الحاد کا نام دے کر حلقۂ اسلام سے خارج قرار دے دیا گیا۔ لوگوں کو اندھی تقلید اور تقدیر پرستی کا درس دیا جانے لگا۔ اس قبیح روایت کا آغاز خلافت راشدہ کے بعد، بالخصوص سانحۂ کربلا کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سیاسی حکمت عملی سے ہوا۔ عالم اسلام میں قضاء و قدر کے نظریہ کو مذہب کا اصلِ اصول بنا دیا گیا۔

اس حکمت عملی کے بہت سے فوائد تھے۔ ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ سوفسطائی استدلال سے روح اسلام کی نفی کر کے تغلب اور حکمرانی کا الہیاتی جواز فراہم کر لیا گیا۔ بنیادی طور پر یہ دلیل پیش کی گئی کہ چونکہ دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی منشا و مرضی سے ہوتا ہے اس لیے خاندان امیہ کا اقتدار بھی خدا کی مرضی اور منشا سے قائم ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کاموں میں کسی کو دم مارنے کی اجازت نہیں۔ اس سوفسطائی جواز نے انھیں سیاسی مخالفین کے سر قلم کرنے، دنیا میں لوٹ مار کرنے، سلطنت کو وسعت دینے اور دنیا بھر کی مفتوحہ اقوام سے مال غنیمت اکٹھا کرنے کا پروانہ مہیا کر دیا۔ اسی جواز کی بنا پر نہ صرف محکوم اقوام کے لوگ بلکہ عرب عوام اور شرفاء بھی استحصال سے محفوظ نہ رہ سکے۔ یہ حیلہ و جواز زیر نگین اقوام کو نسلی اور نظریاتی احساس کمتری میں مسلسل مبتلا رکھنے کے لیے ایک کامیاب ہتھکنڈہ ثابت ہوا۔ اس نے عجمی و عربی عصبیت اور شیعہ و سنی کی تفرقہ بازی کو بھی جنم دیا۔ یہ چنداں حیران کن بات نہیں کہ جبر و استحصال کی سیاست نے فراعین کے دور سے اب تک ہمیشہ نظریاتی جواز تلاش کیے ہیں۔ ہر عہد کا عالمی استعمار کسی نہ کسی مہابیانیے کے گرد گھومتا ہے۔

اموی ملوکیت (1) کے ان ہتھکنڈوں کی وجہ سے جب تابعین کے سرخیل اور صوفیا کے پیشوا خواجہ

حسن بصری (سوائے نقشبندی صوفیاء کے تقریباً ہر سلسلۂ طریقت میں ان کا نام آیا ہے) سے پوچھا گیا کہ اُمیہ حکمران نظریہ قضاء وقدر کی جو توضیح کرتے ہیں وہ کہاں تک برحق ہے تو آپ نے جواب دیا۔ یہ خدا کے دشمن ہیں۔ قرآنی آیات کی غلط تشریح مطلب براری کے لیے کرتے ہیں۔ اس جواب سے جہاں قدر واختیار کے نظریے کی حمایت مقصود تھی وہاں ظلم وستم اور جبر واکراہ کا استرداد پیشِ نظر تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ حسن بصری ہوس اقتدار اور جلب منفعت کی مذمت بھی کر رہے تھے جس نے دور ملوکیت میں عرب اشرافیہ کے عادات واطوار کو بگاڑنے اور اعمال وکردار کو برباد کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے ان نظریات کی وجہ سے حجاج بن یوسف کے سپاہی ہمیشہ ان کے تعاقب میں رہے۔ ان کے بعد پہلا منظم نظریاتی ردّعمل معتزلہ کی طرف سے سامنے آیا۔

معتزلہ کی تحریک کا بانی واصل بن عطا حضرت حسن بصری کا دور پار سے شاگرد تھا۔ معتزلہ خود کو اہل التوحید والعدل کہلاتے، انسان کی آزادیٔ ارادہ اور اعمال وافعال کی جزا وسزا کے سختی سے قائل تھے۔ انہوں نے فسق وفجور اور گناہ وشر کے خلاف قرآن وسنت کی سند فراہم کرنے کے علاوہ ان کو عقلی دلائل سے بھی ردّ کیا اور انسان کی خود مختاری کو عدل وانصاف کا اصول اوّل بنا کر پیش کیا۔ دوسرا ردّعمل تابعین اور تبع تابعین کی طرف سے سامنے آیا جنہوں نے دنیوی مفادات پر زہد وتقویٰ اور توحید وعدل کو ہر چیز پر ترجیح دی۔ حق اور سچ کو اپنا کر خدا کی راہ میں ہر قسم کے امتحان کو قبول کر لیا۔

خواجہ حسن بصری اور حبیب عجمی اور مالک بن دینار وغیرہ ان زہاد میں سے تھے جن کے کردار وعمل نے آگے چل کر تصوف کی تحریک کی صورت گری میں اہم کردار ادا کیا۔ صوفیاء نے رسولِ اکرمؐ کی ذات مبارک کو ہمیشہ انسانِ کامل کا درجے پر رکھا۔ وہ حضور کی ان باطنی تعلیمات پر زور دیتے جو انہوں نے حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ اور اصحابِ صفہؓ کو دی تھیں۔ چناں چہ یہاں نشان خاطر رہے کہ تصوف کی تحریک کو محض ردّعمل تصور کرنا تصوف کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اس کا ظہور دراصل اسلام کے اس باطنی حسن کی ایک واضح صورت میں رونمائی تھا جس کی شاندار مثالیں انبیاء کرام کے احوالِ زندگی بالخصوص حضور اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ سے جا بجا ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا میں صوفیاء نے عقلی اور نقلی مسائل کی بجائے حسن اخلاق پر زور دیا۔ ان کے نزدیک توحید کا مطلب غرورِ نفس سے پرہیز اور عجز وانکسار اور زہد وتقویٰ کی راہ پر چلنا تھا جسے انہوں نے راہِ سلوک کے نام سے موسوم کیا اور عدل کی بھی نئی روحانی تشریح پیش کی۔ اسے ریاضتِ نفس اور اخلاق بد سے طہارت کے معنوں میں لیا۔

اس طرح وہ ایک ایسے اخلاق فاضلہ کے دستور العمل کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوئے جس

میں مرکزیت محبت، احسان، رواداری اور توقیرِ آدمیت کو حاصل تھی۔ صوفیاء کا مطمحِ نظر نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کے عین مطابق مذہبی تنگ نظری اور نسلی منافرتوں کی نفی کے ذریعے مجبور و مقہور لوگوں کے شخصی وقار کو بحال کرنا تھا جس سے انھیں ملوکیت کی سیاست نے محروم کر دیا تھا۔ صوفیاء نے دنیا پرستی، جاہ پسندی پر لعنت ملامت کی اور فقر کو فخر کا درجہ دے کرا سے طرزِ زیست بنالیا۔ انھیں کسی دنیوی انعام واکرام کی خواہش تھی نہ کسی ماورائی بدلے کی آرزو۔ وہ یہ سب کچھ صرف خدائے بزرگ و برتر کی خوشنودی اور رضا کے لیے سرانجام دیتے۔

ابوعبداللہ خفیف کا قول ہے صوفی فقر کے ذریعے خود کو پاک کرتا ہے، تا کہ قربِ خداوندی حاصل کر سکے۔ (۲) حضرت جنید بغدادیؒ ان صوفیاء میں سے ہیں جنھوں نے تصوف کو ایک مربوط صورت میں پیش کیا۔ اسے عمومی مقبولیت عطا کی، اس لیے سردار طائفہ کہلائے اور اربابِ قلوب میں مقبول ہوئے۔ آپ کا کلام بلند پایہ اور احوال کام کے ہیں۔ (۳) جنید نے قربِ خداوندی کے لیے جن شرائط کا ذکر کیا ہے ان میں سے فقر، سخاوت، صبر، سفر، جلاوطنی اور اطمینانِ قلب کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

تصوف کی ابتدا

تصوف اسلامی تمدن کی وہ تخلیقی جہت ہے جس نے اسلام کو داخلی وسعت اور باطنی عمق اور روحانی حسن عطا کیا۔ توحید کی خشک بدوی تعبیر کی جگہ بلال زرخیز کی تمدنی تشریح سے روشناس کرایا۔ توحید اور سنتِ رسولؐ کی آفاقی تشریح نے اسلام کو دنیا کی ایک اہم تہذیبی اکائی کے طور پر سامنے آنے میں مدد دی۔ ایران، عراق، مصر اور بازنطینی سلطنت کی فتح اور انضمام کے بعد بالخصوص تہذیب سازی کی ضروریات واشگاف ہوتی چلی گئیں۔ تصوف کا ظہور اسی سلسلے کی کڑی تھا۔ یقیناً بہت سے خارجی محرکات بھی تھے جن پر آر سی زائنر سے جولین بالڈک تک مغرب و مشرق کے اربابِ علم و فضیلت نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس پر مزید گفتگو کرنا عبث ہے۔

ہمسایہ تہذیبوں سے اخذ و وصول کوئی حیرانی کی بات نہیں۔ اگر یورپی محققین اسلامی تصوف کی تشکیل میں ایرانی، یونانی، ہندی اور مسیحی سرّی (Mystical) تصورات کے کردار کی نشاندہی کرتے ہیں تو اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں لیکن جب وہ خارجی محرکات کے نام پر یہ استنباط کرتے ہیں کہ تصوف اسلام سے بالکل باہر کی چیز ہے، تو وہ جان بوجھ کر مغالطہ خیزی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اسی طرح عرب قومیت (Nationalism) کا یہ پراپیگنڈہ کہ تصوف عجمی بدعت کے سوا کچھ نہیں، محض لغویت کا شاخسانہ ہے، اسلامی تہذیب کے ارتقاء سے نابلد ہونے اور عرب بدویت سے چمٹے رہنے کی دلیل ہے۔ رسول اکرم کا پیغام

صرف نجد وحجاز کے لیے نہیں تھا، پوری دنیا کے لیے تھا۔ نبی اکرم زبانوں کا فرق بھی جانتے تھے اور تہذیبوں کے مسائل سے بھی واقف تھے اور بدویت کے تعصّبات کے بارے میں بھی ان کا ایک واضح مؤقف تھا، جس کی تائید احادیث کے مجموعوں مثلاً 'مسلم' اور 'بخاری' میں بہ آسانی تلاش کی جاسکتی ہے۔

تمام ماہرین تاریخ اس بات پر متفق ہیں کہ آج تک کوئی تہذیب خلاء میں پروان نہیں چڑھی۔ یہ جادوگر کی خالی زنبیل نہیں ہے کہ جس میں سے خرگوش برآمد ہو سکے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سوکھے درختوں سے نہ پھل ملتا ہے اور نہ ہی بھڑوں کے چھتے سے شہد۔ جب کوئی نئی تہذیب آنکھ کھولتی ہے تو گردوپیش میں پہلے سے موجود تہذیبوں سے بہت کچھ سیکھتی ہے، تاریخ کے حرکی سلسلے میں پروان چڑھتی ہے۔ ٹائن بی نے اس حرکیت کو Challenge and Response کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ جوں جوں حرکت تیز ہوتی چلی جاتی ہے، فکر ونظر میں بلوغت آتی ہے۔ خارجی اور باطنی ثروت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ بالآخر اسے دنیا میں ایک الگ شناخت مل جاتی ہے۔ یہ ایک لمبا سفر ہے۔

نظریاتی اور فکری لین دین کا پیمانہ یہ ثابت کرتا ہے کہ خود نئی تہذیب میں کتنی لچک اور زندہ رہنے کی سکت ہے۔ اس میں مطابقت پذیری کا جوہر موجود ہے یا یہ جلد ہی فنا کے گھاٹ اُتر جائے گی۔ کسی بھی تہذیب کے زندہ رہنے کا انحصار اس بات پر بھی ہے کہ اس تہذیب کی داخلی زرخیزی کی کیا صورت حال ہے۔ کیا اس تہذیب کی ساخت میں اس قدر زرخیزی موجود ہے کہ خارجی اثرات (چیلنج) کو اپنے بطن میں سمو کر بارآور ہو سکے اور زیادہ پرشکوہ انداز میں اپنے وجود کو منوا سکے۔

یہ وہ سوالات ہیں جو دنیا میں اس تہذیب کی بقا کے بارے میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ ان سوالات کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کرنا ناممکن نہیں کہ تمام تر اخذ و وصول کے باوجود تصوف کا ظہور درحقیقت اسلام کی داخلی ترفع، زرخیزی اور مطابقت پذیری کا ہی نتیجہ تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اسلامی تہذیب اس عمق سے محروم ہوتی جو تصوف کی عطا ہے۔ تصوف کا راستہ روکنے کے لیے ایک طرف سیکولرازم کی یلغار تھی اور دوسری طرف سلفی بنیاد پرستی کی یورش بے پناہ اور تیسری طرف مسلمان سوویت ریاستوں میں کیمونسٹ پروپیگنڈہ۔ اسلام کو ان ریاستوں میں زندہ رکھنے میں صوفی شیوخ اور خانقاہوں نے جو کردار ادا کیا وہ ناقابل فراموش ہے۔ گزشتہ دو صدیوں کی ان مشکلات کے باجود تصوف کا سلسلہ اب بھی آب وتاب سے چل رہا ہے۔ دنیا میں اب بھی مستند صوفی اور شیوخ موجود ہیں اور بقول وکٹر ڈیز مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس مذہبی فضا میں زندگی کر رہی ہے جسے صوفیاء اور ان کے سلسلوں نے متعارف کرایا۔ توحید، خدا کا ذکر اور احسان۔(4)

اسلامی تاریخ میں تہذیبی جمالیات اور آفاقیت اور جامعیت کے واضح نقوش عباسی خلفاء ہارون الرشید اور مامون الرشید کے عہد میں منظر عام پر آئے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب دجلہ کے کنارے نوآباد شہر بغداد دنیا کے منظر نامے پر عروس البلاد بن کر سامنے آ چکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بھر کے فلسفی، علماء اور ماہرین لسانیات وفنون وہاں کھنچتے چلے آئے۔ پرندے ہمیشہ اس طرف کا رُخ کرتے ہیں جہاں گل وگلزار ہوتا ہے۔ ندیاں بہتی ہیں اور کھانے کو پھل ملتے ہیں۔ تلاش بہاراں ہر راہی کو ہوتی ہے، خواہ وہ چوب خشک کی طرح رواقی فیلسوف ہی کیوں نہ ہو۔ خلیفہ مامون کا سب سے بڑا کارنامہ بغداد میں بیت الحکمہ کا قیام تھا۔ اس کارنامے میں اسے اپنے عہد کے نابغہ روزگار ماہرین علم وہنر کا تعاون حاصل تھا جو دور دراز کے ملکوں سے آ کر اس کے دربار سے وابستہ ہو چکے تھے۔ اس میں مذہب ونسل کی تمیز نہیں تھی۔ علم وہنر کی سرپرستی صرف خلیفہ وقت تک ہی محدود نہیں تھی۔

اس شہر بے مثال کے صاحب ثروت لوگ بھی اس کار خیر میں شریک ہوتے۔ بہت سے علم وہنر کے قدر دان اور مربی تھے۔ چنانچہ ہر وہ شخص جو علمی کمالات سے لیس ہوتا، اس کے لیے وہاں پذیرائی حاصل کرنا مشکل نہ ہوتا۔ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر متمکن ہو سکتا تھا۔ اس سلسلے میں مذہب ونسل کے امتیاز کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس شہر کا ہر ایک فرد خواہ وہ بزاز، خیاط تھا یا قصاب وتاجر، علاف تھا یا وزیر باتدبیر سب علم وحکمت کی قدر دانی میں پیش پیش ہوتے تھے۔ تاریخ سے زیادہ الف لیلہ ولیلہ کی کہانیاں اس حقیقت کو زیادہ خوبصورتی سے پیش کرتی ہیں۔ اسی علم وحکمت کی فضا میں سنی اسلام میں چار معروف فقہی مکاتیب کی تشکیل ہوئی۔ یہ مکاتیب تھے۔ مالکی، شافعی، حنفی اور حنبلی۔ یوں کہہ لیجئے کہ اسلام صرف باہر سے ہی پھیل نہیں رہا تھا، اندر سے بھی وسعت پذیر تھا۔ یہ وسعت پذیری بغداد تک ہی محدود نہیں تھی۔ یہ بخارا، ترمذ اور بغداد سے لے کر مراکش وقرطبہ کی جامعات تک میں اپنے کمالات دکھا رہی تھی۔

یہاں یہ دعویٰ غلط نہیں ہوگا کہ صدر اسلام میں پہلے سے ہی لچک اور آفاقیت کے وہ عناصر اور سانچے موجود تھے جنہوں نے تہذیبی اسلام کو پھلنے پھولنے اور ان کے نقوش واضح کرنے کے علاوہ تاریخ عالم میں ان کو ممتاز مقام (N1:h1=) بنانے میں مدد دی۔ اس لچک اور وسعت کی تصدیق اس دور کے علمی حلقوں میں اخوان الصفاء کے نظریات، معتزلی الٰہیات اور مسلم فلاسفہ کی نو فلاطونی اور مشائی مابعد الطبیعیات کی مقبولیت سے کی جا سکتی ہے۔ یہ سب کچھ خلاء سے برآمد نہیں ہوا تھا۔ زمین پہلے سے ہموار اور زرخیز نہ ہوتی تو یہ سب کچھ کیسے ظہور میں آتا؟ صحرا میں پھول کھلتے ہیں نہ درخت اُگتے ہیں۔ یہی صورت حال کچھ صاحبان تسلیم ورضا کی تھی جو زہاد کے نام سے پہلے ہی موجود تھے۔ یہ لوگ مدینے کی معطر فضاؤں کے پھول تھے۔ رسول

پاکؐ کے نقوش قدم پر چلنے والے۔ یہ لوگ جو اسلامی تعلیمات میں علم وحکمت اور زہد وتقویٰ کی اہمیت بخوبی جانتے تھے بد سے بدتر سیاسی اور سماجی حالات میں بھی عبادت اور ذکر وفکر کی دنیا سے وابستہ رہے۔

قرآن مجید کی مکی سورتیں جس تہذیبی ماحول کی تشکیل کرتی نظر آتی ہیں، ان سورتوں میں زندگی کے ارفع اور عمیق مسائل پر توجہ مرکوز ہے۔ یہ درست ہے کہ اسلام میں روحانی اور مادی زندگی میں توازن و تناسب پر زور دیا گیا ہے۔ رہبانیت کی نفی کی گئی ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان ہر قسم کی عینیت یا جوہری اشتراک سے انکار کیا گیا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ اسلام میں عقائد وعبادات اور شریعت کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ خدا کی وحدانیت کا معیار محدود اور لامحدود کے درمیان ناقابل مفاہمت فرق پر قائم ہے۔ یہ وہ خلیج ہے جسے پاٹا نہیں جاسکتا۔ قرآن توریت کی طرح خدا کی ذات کی مکمل دوئی پر اصرار کرتا ہے۔ سورۃ اخلاص کی چوتھی آیت میں واضح کر دیا گیا ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں اور نہ ہی کوئی ہوگا۔ (112 4)

لیکن تصویر کا ایک اور رخ بھی ہے۔ قرآن اور حدیث میں انسان اور خدا کے تعلق کے بارے میں ایک ایسی تصویر بھی ملتی ہے جس میں خدا اور بندے کے درمیان تعلق ایک مختلف انداز میں بیان ہوا ہے۔ اس بیانیہ کے مطابق خدا مومن کے اتنا قریب ہے جتنا کہ اس کی شاہ رگ (قرآن مجید، 15 50)۔ وہ اس قدر سمیع وبصیر اور حاضر ناظر ہے کہ انسان کے ہر عمل کو دیکھتا اور اس کے ہر خیال کو جانتا ہے (37 33)۔ قرآن مجید میں آخرت یعنی حیات بعد الممات کا نقشہ اس طرح بیان ہوا کہ انسان کو اس کے مقابلے دنیوی زندگی حقیر لگنے لگتی ہے۔ مکی سورتوں میں اس دنیا کی زندگی کو خسارے اور ذلت کی دنیا کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ بقول ماجد فخری اس درپیش صورت حال میں انسان کے پاس کوئی راستہ نہیں رہتا سوائے اس کے کہ تقویٰ وتفکر اور طہارت کو اختیار کرے اور راضی بہ رضا ہو کر قرب الٰہی کے لیے جد وجہد کرے۔ یہی وہ طریقہ ہے جو منشائے خداوندی اور بندے کی مرضی کے درمیان حائل فاصلے کو مٹا سکتا ہے۔ (5)

خوف وتقویٰ وصبر ورضا اور فقر وزہد کی سب سے عظیم مثال رسول اکرمؐ کا اسوہ حسنہ ہے۔ صحابہ کرامؓ اور تابعین وتبع تابعین نے آں حضرتؐ کی فقر وزہد اور تقویٰ وتشکر کی تعلیمات کو صدق دل سے نہ صرف قبول کیا بلکہ اسے مشعل راہ بنا کر آنے والی نسلوں کا سفر تابناک بنا دیا۔ صحابہ کا ایک گروہ جنہیں اصحاب صفہؓ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ رسول اکرمؐ کی زندگی میں ہی مسجد نبوی کے ایک چبوترے پر مقیم دن رات اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتا۔ اس گروہ نے (حضرت بلال حبشیؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ۔ ابوعبیدہ بن جراحؓ اس گروہ کے سرخیل ہیں۔) دنیاداری کو اپنی عملی زندگی سے

تقریباً خارج کر دیا تھا۔ اگرچہ ایک موقع پر رسول اکرمؐ نے ان کی دنیا سے قطع تعلق کو ناپسند فرمایا۔ لیکن جلد ہی وحی کا نزول ہوا جس میں حکم ہوا۔ ”دور مت کرو ان لوگوں کو جو صبح و شام اپنے رب کو یاد کرتے ہیں اور اسی کے طلب گار ہیں“ (الانعام، 7 52)۔ اس آیت کے نزول کے بعد حضورؐ ان اصحاب کی قدر فرماتے۔ آپؐ نے ان کو جنت کی بشارت دی اور ان کو بھی جو ان کے نقش قدم پر چلنے والے تھے۔ تاریخ اسلام میں اصحاب صفہ کی درویشی اور بلند ہمتی کو ہمیشہ تحسین کی نظر سے دیکھا گیا۔ یہاں بلند ہمتی اور درویشی کی ایک اہم مثال حضرت سلمان فارسیؓ ہیں۔ جب وصال کا وقت قریب آیا تو رونے لگے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ آپؓ کیوں روتے ہیں؟ فرمایا

> ”مجھے موت کا خوف ہے نہ دنیا کی خواہش۔ بلکہ رسول اکرمؐ نے مجھ سے عہد لیا تھا کہ اگر قیامت کے دن مجھ سے ملنا چاہتے ہو تو دنیا جمع نہ کرنا اور دنیا سے اس طرح جانا جس طرح میں جاتا ہوں لیکن اب مصیبت یہ ہے کہ میرے پاس اسباب جمع ہو گیا ہے۔ ڈر لگتا ہے کہ کہیں آپ کے دیدار سے محروم نہ ہو جاؤں۔“ سلیمان فارسیؓ جسے اسباب کہہ رہے تھے، اس میں لوٹا، پالان، پوستین اور کمبل تھا۔“(۶)

اسی طرح خلفائے راشدین کی پرہیز گاری اور زہد و تقویٰ تاریخ اسلام کا ایک روشن ترین باب ہے۔ خلفائے راشدین نے دنیوی عیش و عشرت کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ مفلسی یا ادبار کا شکار رہتے تھے بلکہ اس لیے کہ وہ آخرت کے محاسبہ سے ڈرتے تھے۔ زہد و تقویٰ ان کو عزیز تھا اور اس کے علاوہ وہ خود کو رعایا کے برابر رکھنا چاہتے تھے۔ سید علی ہجویری کشف المحجوب میں بالخصوص حضرت ابوبکر صدیقؓ کے کردار کو صوفیا کے لیے مثالی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں

> ”اگر تم حق و صداقت کی راہ میں صوفی بننا چاہو تو جان لو کہ صوفی ہونا صدیق کی صفت ہے۔“(۷)

ابتدائی عہد کے مسلمان صوفی نہیں تھے، تاہم اُن کا سینہ توحید، تقویٰ اور زہد سے منور تھا۔ انہوں نے ہمیشہ موت کے بعد کی زندگی کو ترجیح دی اور اس طمانیت قلب کے متلاشی رہے جو رسول اکرمؐ کی صفت خاص تھی۔ اس لیے انھیں صوفیا کا پیش رو قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ صوفی کی اصطلاح آٹھویں صدی ہجری میں اسلامی تہذیب کا حصہ بنی لیکن ولی اور ولایت کی اصطلاحات تو قرآن میں پہلے سے موجود تھیں، اسی طرح علم اور حکمت و عرفان کے درمیان فرق و امتیاز بھی پہلے سے موجود تھا۔ حضرت علیؓ کے خطبات، شاعری اور خطوط علم و حکمت اور ظاہر و باطن کی تفریق سے لبریز ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو جو نبی

پاک کی زندگی میں ڈال دیا گیا تھا، اس کی کونپلیں تابعین اور تبع تابعین کے دور میں پھوٹیں اور آٹھویں صدی عیسوی میں یہ پودا ایک قدآور درخت بن گیا۔ سب سے پہلے اس درخت کی آبیاری کا کام حارث محاسبی اور حکیم ترمذی نے اپنے سر لیا۔ اور بعد میں ابوطالب مکی اور ابوحامد غزالی نے یہ فریضہ سرانجام دیا۔ ان سب حضرات نے طریقت کی تشریح قرآن وحدیث کی روشنی میں کی۔ ان کا مقصد تصوف کی حقانیت کی تصدیق کرنے کے ساتھ ساتھ شریعت اور طریقت میں موافقت ثابت کرنا تھا تا کہ جعلی صوفیوں اور ظاہر پرست مولویوں کے شر سے تصوف کو بچایا جا سکے۔

معروف صوفی مصنف ابوالقاسم القشیری نے رسالہ قشیریہ میں صحابہ کرام اور تابعین کے زہد وتقویٰ کا ذکر کرنے کے بعد ان زاہدوں اور پرہیز گاروں کا ذکر کیا ہے جو اپنے زمانے کے منتخب لوگ تھے۔ رسالہ کے آخر میں ان صوفیا کا احوال آیا ہے جو بعد کے زمانے کے برگزیدہ افراد قرار پائے۔ قشیری کے نزدیک ”یہ وہ افراد ہیں جن کے نفوس خدا سے وابستہ ہیں اور یہ کہ جنہوں نے اپنے قلوب کو ہلاکتوں سے بچا لیا۔ قرآن مجید اور سنتِ رسول کے مطابق کلمہ، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کو اوّل حیثیت حاصل ہے۔ ان پر عمل کرنا فرائض میں شامل ہے۔ دوم یہ ضروری ہے کہ قرآن وسنت کی حکمت اور بصیرت تک رسائی حاصل کی جائے۔ ان قرآنی اصطلاحات مثلاً اخلاص، توحید، احسان، سخاوت، توکل، خوف اور شوق وغیرہ کے داخلی اور باطنی مطالب تک رسائی حاصل کی جائے۔ باطنی مطالب کا ذکر قرآن کی ایک آیت میں اس طرح آیا ہے۔ سورۃ لقمان میں ہے۔ ’اس نے اپنی نعمتیں تمہارے اوپر پوری کیں۔ ظاہری بھی اور باطنی بھی۔‘‘ (21 20)

اسلامی تعلیمات میں واضح ہے کہ نماز مومن پر فرض ہے۔ نماز مومن کی معراج ہے۔ صوفیاء نماز کو ایک بڑے تناظر میں دیکھتے اور اِسے احسان سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کی سند احادیث سے لاتے ہیں۔ ایک متفق علیہ حدیث میں احسان کا تصور اس طرح واضح ہوا ہے۔ حضرت عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن ایک اجنبی شخص رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ کے بالکل سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے حضور اکرمؐ سے سوال کیا کہ اسلام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کلمۂ شہادت، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج بہ شرط قدرت۔ اجنبی نے کہا۔ آپؐ نے سچ فرمایا پھر اس نے پوچھا۔ ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا۔ خدا، اس کے ملائکہ، اس کی کتاب، اس کے رسل اور یوم قیامت پر ایمان اور یہ کہ خیر وشر تقدیر الٰہی سے ہے۔ اس نے کہا۔ آپؐ نے سچ فرمایا۔ پھر سوال کیا۔ احسان کیا ہے؟ آپؐ نے جواب دیا۔ احسان یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرے جیسے کہ اسے دیکھ رہا ہے اور اگر یوں نہ کر سکے تو یہ جان کر عبادت کرے کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ ([illegible]) خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کے بارے میں روایت ہے کہ ان کے پاؤں میں تیر پیوست ہو

گیا۔ آپ اس کی تکلیف برداشت کرتے۔ باوجودیہ کہ صحابہؓ تیر نکالنا چاہتے تھے لیکن آپؓ تیر نکالنے نہ دیتے۔ حضرت حسنؓ نے کہا میں تیر نکال لوں گا۔ چنانچہ جب وہ نماز کے دوران سجدہ ریز ہوئے تو امام حسنؓ نے تیر بغیر تردد کے نکال لیا۔ درآں حال یہ کہ حضرت علیؓ کو خبر تک نہ ہوئی۔ نماز سے فارغ ہوئے تو حقیقت معلوم ہوئی۔ (9) حضرت حسن بصری کا قول فیصل ہے۔ ہر وہ عبادت جس میں قلب حاضر نہ ہو وہ جزا کی بجائے سزا کا موجب بن سکتی ہے۔ (10)

خلفائے راشدہؓ کے علاوہ ان لوگوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو اسلام کی شروعات میں رسول اکرمؐ کے شانہ بشانہ جدّ و جہد میں شامل ہوئے تھے۔ انتہائی نامساعد حالات سے گزر کر ان اصحاب کبار نے براہ راست نبی مکرمؐ سے فقر و فاقہ اور زہد و تقویٰ کی زندگی گزارنے کی تربیت حاصل کی اور کندن بن گئے۔ ان کو (عشرہ مبشرہ) حضورؐ نے زندگی میں ہی جنت کی بشارت دے دی تھی۔ یہاں حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ کو بھی ان لوگوں کی فہرست میں شامل کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ بارگاہِ نبوتؐ میں خدمت و جاں نثاری کے باعث سیدنا بلال حبشیؓ اور سیدنا زیدؓ بن حارث بھی بارگاہِ نبوتؐ کے منظور و مقبول انفاس میں سے تھے۔ انصار میں بھی بہت سی شخصیات موجود تھیں جو عہد رسالت میں نشو و نما پا کر درجہ کمال کو پہنچیں۔ ابو ایوب انصاریؓ کا نام انصار کی فہرست میں سب سے اوپر ہے۔ ان حضرات کے کردار و گفتار سے وہ نمونے تلاش کیے جا سکتے ہیں جو یقیناً صوفیاء کے لیے ہمیشہ باعث رشک قرار پائے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل تصوف کے یہاں رسول اکرمؐ کی ذات والاصفات کے بعد ان میں سے بہت سے حضرات کو روحانی پیشوا تسلیم کیا جاتا ہے۔

تصوف کی وجہ تسمیہ

امام ابو القاسم القشیری نے لکھا ہے کہ رسول اکرمؐ کے عہد تک صحابہؓ کے لقب کے سوا کوئی اور لقب ایجاد نہیں ہوا تھا۔ صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین، ایسے القاب رائج ہوئے۔ بعد میں بزرگان دین عابد و زاہد کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اسی دوران اہل سنت والجماعت میں سے جو اہلِ دل تھے وہ صوفی کہلائے۔ یہ لقب دوسری صدی ہجری کے اختتام تک مقبول عام ہو چکا تھا۔ (رسالہ قشیریہ، امام ابو القاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری، ادارہ تحقیقات اسلامیہ، اسلام آباد، ص 21) حاجی نے کشف الظنون میں بیان کیا ہے کہ سب سے پہلے ابو ہاشم عراقی صوفی (وفات، 775ھ) کے لقب سے مشہور ہوئے۔ (11) لفظ صوفی کے بارے میں تین آراء سامنے آئی ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کی نسبت اہل صفہ سے ہے۔ کچھ لوگ 'صفا' کو اس کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔

تیسری رائے یہ ہے کہ یہ لفظ 'صف' سے مشتق ہے۔ لیکن اصول اشتقاق ان تینوں آراء کی نفی کرتا

ہے ۔ کچھ مستشرقین کا خیال ہے کہ لفظ صوفی یونانی زبان کے لفظ Sophos سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے حکمت اور دانائی ۔ لیکن ڈاکٹر جولین بالڈک (12) اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے ۔ اس کا خیال یہ ہے کہ بہتر یہی ہے کہ صوفی کو اونی کپڑے پہننے والے کے معنوں میں لیا جائے ۔ ابتدا میں یہ لفظ روزمرہ کی زبان میں مستعمل ہوا اور پھر عربی میں ادبی زبان کا حصہ بن گیا ۔ یہ الگ بات ہے کہ اس اصطلاح کی مناسب انداز میں تشکیل نہیں ہوسکی ۔ (13)

اس خیال کی تائید حدیث لٹریچر سے بھی ہوتی ہے ۔ بخاری شریف میں آیا ہے کہ رسول مقبولؐ نے اونی کپڑے شوق سے زیب تن کیے ۔ ترمذی نے لکھا ہے کہ آپؐ کا جب وصال ہوا تو آپؐ اونی لباس میں تھے ۔ قرین قیاس یہی ہے کہ صوفی کی اصطلاح اپنے مادہ صوف کی صوتی خوبیوں اور علم الحروف سے مطابقت کی وجہ سے اہل تصوف میں مقبول ہوئی ۔ لیکن نشان خاطر ہے کہ بقول سید علی ہجویری صوف یا گدڑی اہل حق کے یہاں وجہ فقر و صفوت نہیں جیسا کہ ریاکار سمجھتے ہیں ۔ یہ تو وجہ انکسار اور ذریعہ تزکیہ نفس ہے ۔ موصوف فرماتے ہیں ”تزکیہ نفس اور باطنی صفائی اللہ تعالٰی کی جانب سے بندے پر فضل و کرم ہے ۔ ورنہ صوف یعنی اون تو چوپاؤں کا لباس ہے ۔“ (14)

صوف سے بہت سے الفاظ مشتق ہیں جو تصوف کے بنیادی مطالب کی نشاندہی کرتے ہیں ۔ مثلاً ’صفا‘ کا مطلب پاکیزگی ہے ۔ صفو کا مطلب برگزیدہ شخصیت ہے ۔ اسی طرح لفظ صفی خالص دوست کے معنی میں استعمال ہوا ہے ۔ کشف المحجوب کے باب تصوف میں سید علی ہجویری نے مشائخین میں سے کسی ایک کا قول نقل کیا ہے کہ جو انسان محبت کی پاکیزگی کے ساتھ مصفا ہو وہ صافی ہے جو شخص عشقِ دوست میں مستغرق ہوکر دوسروں سے علیحدہ ہوجائے وہ صوفی کہلاتا ہے ۔ ہجویری فرماتے ہیں کہ صفا ولایت کی منزل ہے اور اس کی نشانیاں اور تصوف صفا کی ایسی حکایت و تعبیر ہے جس میں شکوہ شکایت نہ ہو ۔ صفا کے ظاہری معنی روشن اور تاباں کے ہیں ۔ تصوف کے ماننے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں کی تین قسمیں ہیں ۔ ایک کو صوفی، دوسرے کو متصوف اور تیسرے کو مستصوف کہتے ہیں ۔

1) صوفی وہ ہے جو خود کو فنا کرکے حق کے ساتھ مل جائے اور خواہشات نفسانیہ کو مار کر حقیقت سے پیوستہ ہوجائے ۔

2) متصوف وہ ہے جو ریاضت و مجاہدے کے ذریعہ اس مقام کو طلب کرے اور اس مقام کی طلب کے حصول میں صادق و راست باز رہے ۔

3) متصوف وہ ہے جو دنیاوی عزت ومنزلت اور مال دولت کی خاطر خود کو ایسا بنا لے اور اسے مذکورہ مقامات ومنازل کی کچھ خبر نہ ہو۔ صوفیا کرام کے نزدیک نقلی صوفی مکھی کی مانند ذلیل وخوار ہے۔ (15)

تصوف کی ماہیت کے بارے میں صوفیا کے یہاں مختلف آرا ملتی ہیں۔ ڈاکٹر جواد نوربخش نے اپنی کتاب Sufism Meaning, Knowledge and Unity میں ایک سو آٹھ آراء بیان کی ہیں۔ حضرت جنیدؒ سے پوچھا گیا۔ یا حضرت تصوف کی تعریف کیا ہے؟ آپؒ نے فرمایا۔ تصوف یہ ہے کہ بندہ خدا کے ساتھ اس طرح ہو جائے کہ غیر اس کی ذات سے بالکل منہا ہو جائے۔ (کتاب اُلمع') ۔ سید علی ہجویری کے مطابق حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ تصوف کی بنیاد آٹھ خصلتوں پر ہے۔ سخاوت، رضا، صبر، اشارہ، غربت، سیاحت وہجرت، اور فقر۔ یہ آٹھ خصلتیں آٹھ نبیوں کا اختصاص ہیں۔ سخاوت، حضرت خلیلؑ سے کیونکہ اپنے فرزند کو فدا کیا۔ رضا، حضرت اسمٰعیلؑ سے کیونکہ بوقت ذبح اپنی رضا دی اور اپنی جان عزیز کو بارگاہ خداوندی پیش کردیا۔ صبر، حضرت ایوبؑ سے کہ آپؑ نے بے حد وغایت مصائب پر صبر فرمایا۔ خدا کی فرستادہ ابتلا وآزمائش پر ثابت قدم رہے۔ اشارہ، حضرت ذکریاؑ سے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تین دن تک لوگوں سے اشارہ کے سوا کلام نہ کرنا اور اپنے رب کو خفیہ انداز میں پکارنا۔ غربت، حضرت یحییٰؑ سے کہ وہ اپنے وطن میں مسافروں کی مانند رہے اور خاندان میں رہ کر بیگانہ رہے۔ سیاحت، حضرت عیسیٰؑ سے کہ آپ نے یکہ وتنہا مجرد زندی گزار دی۔ بجز ایک پیالہ اور کنگھی کے کچھ پاس نہ رکھا۔ جب انہوںؑ نے دیکھا کہ کسی نے اپنے دونوں ہاتھ ملا کر پانی پیا ہے تو انہوں نے پیالہ ہی توڑ دیا۔ اور پھر جب کسی کو دیکھا کہ انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کر رہا ہے تو کنگھی بھی توڑ دی۔ گدڑی، یعنی صوفی کا لباس حضرت موسیٰؑ سے کہ انہوں نے پشمینی کپڑے پہنے اور فقر سید عالمؐ سے کہ جنہیں روئے زمین کے تمام خزانوں کی کنجیاں عنایت فرما دی گئی تھیں اور ارشاد ہوا کہ آپ خود کو مشقت میں نہ ڈالیں بلکہ ان خزانوں کو استعمال کریں اور آرائش اختیار کریں لیکن آپؐ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا۔ اے خدا مجھے اس کی حاجت نہیں ہے۔ میری خواہش تو یہ کہ ایک روز شکم سیر ہوں اور دو روز فاقہ کروں۔ (16)

تصوف کی تعریف کرتے ہوئے ابوعلی رودباری فرماتے ہیں۔ صوفی صفا میں صوف کا لباس پہنتا ہے اور اپنی انا کو ظلم برداشت کرنے (نظر انداز کیے جانے) پر مجبور کرتا ہے۔ وہ دنیا کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے اور حضرت محمدؐ کے راستے پر روانہ ہو جاتا ہے۔ (شرح تعرف) حضرت ذوالنون مصریؒ کا کہنا ہے کہ صوفی وہ شخص ہے جس نے سب کچھ چھوڑ دیا اور خدا کو پا لیا۔ مزید فرماتے ہیں صوفیاء نے خدا کو چن لیا ہے اور خدا

نے ان کو سب پر ترجیح دے کر منتخب کر لیا ہے (اللمع) ابو بکر شبلی کے نزدیک تصوف دنیا کو بھول کر خدا کی معیت میں بیٹھنے کا نام ہے۔ مزید فرماتے ہیں، تصوف وہ برق ہے جو دنیا کی ہر چیز کو جلا ڈالتی ہے (رسالہ قشیریہ)۔ تذکرۃ اولیاء میں ان کا قول درج ہے کہ تصوف یہ ہے کہ تم اس طرح ہو جاؤ جس طرح کہ تم پیدائش سے پہلے تھے۔ ابوعمر دمشقی کہتے ہیں کہ متصوف وہ کہلاتا ہے جو مخلوقات کو نہ دیکھے بجز اس کے کہ وہ ان میں نقص پائے۔ تمام دنیوی علائق کو فراموش کر کے اس پر نظریں مرتکز کر دے جو ہر شے سے ماورا ہے (نفحات الانس)۔ تذکروں میں آیا ہے کہ ایک صوفی بزرگ نے تصوف کی تین جہتی تشریح کرتے ہوئے بیان کیا کہ بطور علم یہ قلب کی تطہیر کا ذریعہ ہے۔ اس کا مطلب دوسروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا اور رسول مقبولؐ کی شریعت کے راستے پر چلنا ہے۔ تصوف کی دوسری جہت روحانی زبان کے حوالے سے ہے۔ یہ جہت ہر طرح کے علائق کی نفی کرتی ہے، انسانی مجبوریوں کے چنگل سے آزادی دلاتی ہے اور یہ آزادی آسمانوں کے خالق کے جود و کرم سے حاصل ہوتی ہے۔ خدائے قدوس کی زبان میں بقول دمشقی واقعہ کچھ اس طرح ہے، "خدا نے ان کو چن لیا (صفا) ان کے بشری خصائص کی تطہیر (صفا) کے لیے اور پھر ان کو پاک کیا (صفا) ان کی اپنی پاکیزگی سے۔ جب یہ ہو چکا تو وہ صوفی کہلائے۔" (اللمع)۔

تصوف کی اصطلاحات

مذہب کی باطنی جہت کے بارے میں مختلف مذاہب میں واضح اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً حضرت عیسیٰ نے اپنے پیروکاروں سے مخاطب ہو کر فرمایا "تمھیں عنایت ہوا کہ تم آسمان کی بادشاہت کے بھید جانو پر انھیں عنایت نہیں ہوا۔" قرآن مجید میں یہی بات ایک مختلف انداز میں آئی ہے۔ ہم جس کو چاہتے ہیں اس کے درجات بلند کر دیتے ہیں اور ایک دانا سے بڑھ کر دانا ہے۔ (13، 76) رسول اکرمؐ نے دوسرے انبیاء کی طرح خواص کو بعض اوقات ایسی تعلیم دی جو عام مومنین کے لیے مقصود نہ تھی۔ حضرت علیؓ نے ایسی تعلیمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ لوگوں کو ان کے فہم کے مطابق احادیث سنایا کرو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلائیں (بخاری شریف) یاد رہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہ کو بالعموم اسلامی تصوف اور علوم باطنیہ کا امام سمجھا جاتا ہے۔

ابتدا میں تصوف **کلمات قصار** میں (Aphorism Formulation) بیان کیا جاتا رہا جس میں صوفیاء اظہار کی محدودیت نسبتاً کم محسوس کرتے تھے۔ وہ معرفت، توحید، ایمان، طہارت، توبہ، فقر اور رضا و محبت ایسے الفاظ کی تشریح شریعت کی حدود میں رہ کر باطنی انداز میں کرتے۔ لیکن بعد میں تصوف کی اپنی لغت وجود میں آ گئی۔ صوفی حکماء نے متکلمانہ اصطلاحات کو نئے معنوں میں پیش کیا۔ معتقدات و عبادات کی باطنی

جہت کو اجاگر کرنا شروع کر دیا۔ یہ شاید شیعیت کے اثرات کا نتیجہ بھی تھا۔ بہت سی نئی اصطلاحات رائج کیں۔ مثلاً شفیق نے توکل کو۔ ذوالنون مصری نے معرفت کو اور بسطامی نے فنا کو اور ترمذی نے ولایت کو تصوف میں نئی معنویت کے ساتھ متعارف کرایا۔ ساتھ یہ بھی کہا کہ تمام روحانی حقائق کو ہر کس و ناکس پر ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے راہ سلوک میں تربیت، تزکیہ نفس اور سالک کے ظرف اور عارف حقیقی کی رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان دعوؤں کو طریقت کا نام دیا گیا۔ یوں شریعت کے متوازی طریقت کی اصطلاح بھی استعمال ہونے لگی۔ اس پر خالص مذہبی حلقوں کی طرف سے اعتراضات بھی سامنے آئے۔ رسالہ قشیریہ، کشف المحجوب اور کیمیائے سعادت کے مصنفین ان اعتراضات سے بخوبی واقف تھے۔ اپنے اپنے انداز میں انہوں نے ان اعتراضات کے جواب دینے کی بھی بھرپور کوشش لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عالم اسلام میں علماء کا ایک بڑا طبقہ ہمیشہ ان کا مخالف رہا۔ اس سلسلے میں حنبلی فقہا سب سے آگے رہے۔ مخالفین میں سے ابن تیمیہ، ابن قیّم، علامہ جوزی اور عبدالوہاب وغیرہ کے نام پیش پیش ہیں۔ ہندوستان میں دیوبند کے علماء کے بڑے حصے نے بالخصوص اس مکتب فکر کو فروغ دیا۔

بہر حال کتاب 'التعرف' میں آیا ہے کہ ایک متکلم نے ابوالعباس بن عطا سے سوال کیا کہ تم صوفی لوگوں نے ایسے الفاظ گھڑ رکھے ہیں جن کے معانی لوگوں کو انوکھے معلوم ہوتے ہیں۔ تم نے مستعمل اور محتاط زبان کو ترک کر دیا ہے۔ یا تو تم ملمّع سازی کرتے ہو یا اپنے عیوب چھپاتے ہو۔ اس پر ابن عطا نے جواب دیا کہ ہم نے ان معانی کو انوکھے الفاظ اس لیے دیئے ہیں کہ ہم کو غیرت آتی ہے کہ کہیں نااہل لوگ انھیں جان نہ لیں۔ اسی طرح امام قشیری فرماتے ہیں۔ ان الفاظ کے حقائق نہ تو کسی قسم کے تکلف سے جمع کیے گئے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کا تصرف کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ وہ معانی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کے دلوں پر القاء کر دیا ہے۔ اور ان کے اسرار کو ان کے حقائق کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ یہاں سر سے مراد مشاہدے کا محل ہے۔ وہ راز ہے جو بندے اور حق تعالیٰ کے درمیان بہر حال محفوظ و مستور ہے۔

پہلے صوفی بزرگ جنہوں نے تصوف کے عقائد کو کسی قدر مدون صورت میں پیش کیا وہ حضرت محاسبیؒ تھے۔ حضرت محاسبی کے کام کا محور نفس امارہ کا محاسبہ اور خوف خدا کی یاددہانی ہے۔ ان کے شاگرد حضرت جنید بغدادیؒ نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ اور فنا اور توحید کے عقائد کی صوفیانہ تشریح کو مرتب کیا اور اپنے افکار میں میثاق اوّل اور فنا میں بقا کے تصور کو مرکزیت دی۔ صوفیا انہیں سردارِ طائفہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے دوران زیادہ تر عقیدۂ تصوف کی تدوین اور اصطلاحات کی تعریفوں پر کام ہوا۔ اِمتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ تصوف کے میدان میں معرکۃ آلاراء تصانیف منظر عام پر

آ ئیں۔ ابو نصر سراج طوسی کی کتاب 'اللمع' منظر عام پر آئی۔ الکلا بادی نے 'التعارف' بخارا میں تحریر کی۔ ابوطالب مکی نے 'قوت القلوب' بغداد میں تالیف کی۔ سلمی نے 'طبقات الصوفیہ' نیشا پور میں اور ابو نعیم نے 'حلیۃ الاولیا' اصفہان میں، قشیری نے 'رسالہ قشیریہ' نیشا پور میں اور علی ہجویری نے 'کشف المحجوب' لاہور میں قلم بند کی۔ پانچویں صدی کے اواخر میں امام غزالی کی تصوف پر کتابیں 'کیمیائے سعادت' اور 'مشکوۃ الانوار' شائع ہوئیں۔ ان کے علاوہ منصور حلاج کی کتاب 'الطواسین'، شیخ شہاب الدین سہر وردی کی 'عوارف المعارف' اور شیخ عبدالقادر جیلانی کی 'فتوح الغیب' کا شمار بھی ضروری ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کی قریبی روحانی اولاد میں سے ابن عربی اہم ترین ہیں جنھیں صوفیا شیخ اکبر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وحدت الوجود کا عقیدہ انہی سے منسوب ہے۔ ابن عربی نے معارف تصوف کو اپنی کتابوں 'فصوص الحکم' اور 'فتوحات مکیہ' میں مدون کیا۔ شیخ شہاب الدین سہر وردی مقتول کی 'حکمۃ الاشراق' کا شمار بھی حکیمانہ تصوف کی کتابوں میں ہوتا ہے۔

صوفیاء کا نظریہ معرفت

تصوف کے عقائد میں 'معرفت' (Gnosis) کو مرکزیت حاصل ہے۔ محولہ بالا تمام کتب کا مقصود طریقت کے کسی نظام کی تشکیل سے زیادہ سالکین کو معرفت کی پہچان اور حصول کے لیے رہنمائی فراہم کرنا تھا۔ حضرت علی ہجویری نے اپنی کتاب میں معرفتِ الٰہی کو پہلا کشف قرار دیا ہے۔ معرفت کا لغوی مطلب علم ہے۔ تصوف میں بھی اس سے یہی مراد ہے لیکن معنویت اس سے بڑھ کر ہے۔ معرفت غور و فکر اور عقلی استدلال کا نتیجہ نہیں ہوتی، جیسا کہ معتزلی کہتے ہیں کہ خدا کی معرفت عقلی ہے۔ عاقل کے سوا اس کی معرفت جائز نہیں۔ حضرت ہجویری کے نزدیک یہ قول باطل ہے۔

> ''اس لیے کہ وہ دیوانے جو دارالسلام میں ہوں، ان کے لیے حکمی معرفت ہے۔ اسی طرح وہ بچے جو عاقل نہیں، ان کے لیے حکمی ایمان ہے۔ اگر حکم معرفت میں عقل شرط ہوتی تو جنھیں عقل نہیں وہ معرفت کے حکم میں نہ ہوتے اور کافروں میں چونکہ عقل ہے تو ان پر کفر نہ ہوتا اور اگر معرفت کے لیے عقل علت ہوتی تو ہر عاقل عارف کہا جاتا اور ہر بے عقل کو جاہل، یہ کھلا مکابرہ ہے۔'' (17)

ہجویری مزید فرماتے ہیں۔

> ''ایک گروہ کہتا ہے کہ حق تعالیٰ کی معرفت کی علت استدلال ہے اور جس میں استدلال کی استعداد نہ ہو اس کے لیے یہ جائز نہیں۔ یہ قول بھی باطل ٹھہرتا ہے۔ اس لیے کہ ابلیس نے بکثرت نشانیاں اور آیات الٰہیہ دیکھیں۔ مثلاً جنت، دوزخ، عرش و

کرسی وغیرہ لیکن اس کے لیے ان کی دید بھی معرفت کی علت نہ بنی۔" (18)

ہجویری کے نزدیک "معرفت کی علت بجز عنایت الٰہی اور اس کی مشیت کے کچھ نہیں۔ کیونکہ بغیر عنایت الٰہی عقل اندھی ہوتی ہے کہ عقل بجائے خود جاہل ہے۔ بکثرت عقلاء نے حق تعالیٰ کی حقیقت کو نہ جانا۔ وہ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں۔ "یہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ حقیقت میں بندے کے دل کو کھولنے والا اور اس کی رہنمائی کرنے والا حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔ محض عقل و دلائل ہدایت کی قدرت نہیں رکھتے۔" (19)

معرفت کے سلسلے میں صوفیاء کے یہاں عقل و استدلال کی نفی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کا ماخذ یہ حادث دنیا ہے اور جس چیز کا تعلق صرف حادث دنیا سے ہو اور خود عارضی اور محدود ہو اس کے اندر ابدی دنیا تک رسائی کیونکر ہو سکتی ہے۔ عقل کا شعبہ اس دنیا کے مسائل تک محدود ہے۔ اس کا دائرہ کار اشیاء کے علم کو محیط ہے۔ اس کے علاوہ، وہ علم بھی جو انبیاء کے ذریعے خدا انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجتا ہے تا کہ وہ اس کو جانیں جس کو وہ نہیں جانتے۔ نظریاتی علم اسی کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ ہم عقلی علم اپنی جد و جہد سے مدرسہ و مکتب کے توسط سے حاصل کرتے ہیں۔ عقلی علم کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ اس علم کو ہم شواہد و استدلال اور ثبوت کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔ یہ علم عاقل کی صفت اور عالم کی ملک ہے۔ لیکن معرفت میں علم اس طریق سے حاصل نہیں ہوتا۔ تصوف میں جس ذات حق کے علم و معرفت کی بات کی جاتی ہے وہ ایک حدیث کے مطابق ستر ہزار پردوں میں مستور ہے۔ امام غزالیؒ نے عرفانی علم کے بارے میں لکھا ہے

> "اِس سلسلے میں اپنی اوقات سے بڑھ کر کوشش کرنے کے باوجود بھی انسان کچھ نہیں کر سکتا جو اسے لازمی طور پر کرنا چاہیے۔ کیونکہ جس کے بارے میں ہم نے جاننا ہے وہ بحر نا پیدا کنار ہے۔ اس کی گہرائی ناپی نہیں جا سکتی۔ انسان صرف اس کے ساحل کا جائزہ لے سکتا ہے۔ اس کے قرب و جوار کو دیکھ سکتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔" (20)

اِمام غزالیؒ جب ذات حق تعالیٰ کو بحر نا پیدا کنار کہتے ہیں تو اس سے مراد یہاں نہ صرف خدائے بزرگ کی برتری اور ماورائیت کی نشاندہی کرنا ہے بلکہ عقل و برہان کی نارسائی اور بے بسی کو بھی ثابت کرنا ہے۔ غزالی چونکہ فلسفی بھی تھے اس لیے انہوں نے ذات حق کی ماورائیت اور افتراق کے سلسلے میں عقل و برہان کی نارسائی کو واضح کرتے ہوئے استدلال کیا ہے کہ

1) وہ تمام رشتوں اور نسبتوں سے ماوراء اور پاک ہے۔ اس کی نہ جنس نہ

فصل۔ جس کا کسی سے جنس میں اشتراک نہیں اس کی فصل نہیں ہوتی
جو اسے دوسروں سے مختلف و ممتاز کر سکے۔ (21)

2) وہ کسی چیز جیسا نہیں اور نہ ہی کوئی چیز اس جیسی ہے۔ (22)

3) اس کے ساتھ ہر قسم کے تقابل سے مکمل گریز کرنا چاہیے۔ (23)

4) وہ انسانوں کے معیارِ استعمال کی مشمولہ صفات سے بلندتر ہے۔ جس طرح
کہ وہ ان کے صفاتی نقائص سے منزا ہے۔ ہر وہ صفت یا صفت جیسی
کوئی
چیز یا اس کی مماثل صفت جس کا تصور انسان کر سکتا ہے۔ وہ ان سب سے
ماورا ہے۔ (24)

غزالیؒ جس بات پر اصرار کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی یکتائیت ہر طرح کے تقابل اور مماثلت یا عینیت سے بلندتر ہے۔ تقابل، مماثلت یا عینیت طبیعیاتی ہو یا مابعدالطبیعیاتی وہ ان سب سے منزّا ہے۔ مشکوۃ الانوار میں لکھتے ہیں

> ”خالص علم عقیدہ سے بلندتر ہے اور اسی طرح مشاہدہ حق کا تجربہ خالص علم سے ماوراء ہے۔“ (25)

خدا کی تنزیہہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں

> ”خدا کو خالص علم کے ساتھ کوئی نہیں جانتا۔ وہ صرف خود کو جانتا ہے۔ اس کو جاننا اس لیے ناممکن ہے کہ شے معلومہ لازمی طور پر جاننے والے کی حدود کے اندر ہوتی ہے۔ (چونکہ وہ لامحدود ہے) یہ وہ صورت حال ہے جو خداوند تعالیٰ کے کبر و شکوہ کی نفی کرتی ہے۔“ (26)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہم خدا کو عقل و استدلال سے جان نہیں سکتے تو کیا اس کے وجود کا کوئی ثبوت دیا جا سکتا ہے۔ شیخ تصوف ابوالحسن نوری سے جب یہ سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ خدا کا ثبوت خود خدا ہے۔ پھر پوچھا گیا کہ پھر اس سلسلہ میں عقل کا کیا کردار ہے۔ آپ نے فرمایا۔ عقل بانجھ اور ناتواں ہے۔ صرف اس کا ثبوت دے سکتی ہے جو اس جیسا ہے یعنی اس کی طرح بانجھ اور ناتواں ہے۔ (الکلابادی، شرح تعرف)

آئمہ تصوف کے نزدیک خدا کا علم عقل سے نہیں معرفت سے حاصل ہوتا ہے۔ معرفت کیا ہے؟

معرفت وہ روحانی کیفیت ہے جو حق تعالیٰ کی عنایت اور اعانت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ علم کا اکتساب کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس معرفت تحفہ خداوندی ہے۔ معرفت الٰہی عقل کے لیے ہمیشہ کی حیرانی کے سوا کچھ نہیں۔ صوفیاء کے نزدیک عقل کے استدلال سے معرفت الٰہی کو ثابت کرنا تشبیہ ہے۔ عقل کے استدلال کی نفی کرنا تعطیل ہے کہ عقل کی جولاں گاہ ان حدود کی پابند ہے۔ دونوں معرفت الٰہی سے ناآشنا ہیں۔ کیونکہ مشبہ اور معطل ایک نہیں ہو سکتے۔ معرفت کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کی پہچان اور عرفان کے سفر میں ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب راہ سلوک میں ہر طرح کے نشانات راہ اور شیخ طریقت کی پیروی بھی بے کار ہو جاتی ہے۔ بس ذات حق کی عنایات ہی منزل کی طرف رہبری کرتی ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ سے لوگوں نے معرفت الٰہی کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے اللہ کو اس کی عنایت کی وجہ سے پہچانا اور غیر اللہ کو اللہ کے نور سے جانا۔ ابوالحسن نوری نے کہا کہ معرفت الٰہی کے حصول کی راہ میں اللہ کے سوا کوئی رہنما نہیں۔

طریقت کے قواعد میں ابتدا کسی شیخ طریقت کی رہنمائی میں ہوتی ہے۔ اس کے بغیر راہ سلوک پر چلنا ناممکن ہے۔ لیکن اس سے بھی پہلے نفسیاتی طور پر یہ ضروری ہے کہ مبتدی میں ایک مخصوص قسم کا رجحان / جھکاؤ یا قابلیت موجود ہو۔ امام غزالیؒ نے اس کے لیے ذوق کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس لفظ میں بہت زیادہ علمیاتی عمق اور وسعت موجود ہے۔ لغوی طور پر اس لفظ کا مطلب ذائقہ یا وہ طرز احساس ہے جو سب کو نصیب نہیں ہوتا۔ امام غزالیؒ کے محقق فضلہ شہادی کے نقطہ نظر سے لفظ ذوق دو طرح کے معانی کا حامل ہے۔ اس کا ایک مطلب ہے وجدان یا وجدانی علم۔ دوسرا مطلب ایک مخصوص انداز میں ڈھل جانا یا کسی تجربے سے گزرنا۔ (27)

شہادی کے خیال میں دوسرا مطلب مذہبی تجربے کے حوالے سے نہ صرف لفظ ذوق کا بہتر انداز میں احاطہ کرتا ہے بلکہ علمیاتی لحاظ سے بھی پہلے معنی پر فوقیت کا حامل ہے۔ کیونکہ خود تجربے میں سے گزر کر معلوم کرنا دوسروں یا کتابوں سے سیکھنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ مثلاً جب ہم کسی چوٹ یا گھاؤ کے نتیجے میں درد کی کیفیت سے گزرتے ہیں تو بہتر طور سے بتا سکتے ہیں کہ درد کیا ہوتا ہے بہ نسبت اس شخص کے جس کے پاس درد کے بارے میں کچھ معلومات تو ہیں لیکن وہ ذاتی طور پر اس تجربے سے نہیں گزرا۔

ذوق روحانی تجربے کا ابتدائی زینہ ہے۔ یہ اس در کو وا کرتا ہے جو ورائیت کی طرف لے جاتا ہے اور جس سے کشف و شہود اور مکاشفوں کا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ غزالی کے یہاں ذوق نفسِ امارہ کو شکست دینے اور سالک کو روحانی تجربے کے اعلیٰ مدارج سے گزرنے میں مدد و استعانت کا باعث بنتا ہے۔ یوں

کہہ لیجئے کہ ذوق معرفت حق تک رسائی کا نقطۂ آغاز ہے۔

معرفت حق کی کیفیت کا ظہور بقول جنید بغدادی اس وقت ہوتا ہے جب بندہ اپنی جہالت کی دلدل سے باہر نکل آتا ہے۔ کشف المحجوب میں آیا ہے

> ”ایک دن میرے مرشد برحق نے بیت الجن سے دمشق جانے کا ارادہ فرمایا۔ بارش ہو رہی تھی۔ مجھے کیچڑ میں چلنے سے دشواری ہو رہی تھی مگر جب میں نے اپنے مرشد کی طرف دیکھا تو ان کے کپڑے اور جوتیاں خشک تھیں۔ میں نے عرض کیا تو فرمایا جب سے میں نے توکل کی راہ میں اپنے قصد و ارادہ کو ختم کر کے باطن کو لالچ کی وحشت سے محفوظ کر لیا ہے۔ اس وقت سے اللہ تعالیٰ نے مجھے کیچڑ سے بچا لیا ہے۔“ (28)

چنانچہ جو کیچڑ سے پاک ہو جاتا ہے اور غیر اللہ کو چھوڑ کر حق کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ اسے معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ معرفت کا مطلب یہ ہے کہ عقل و ذہانت اور متخیلہ کے پردے چاک ہو جاتے ہیں۔ موضوع اور محمول، شاہد و مشہود اور ناظر و منظور کی تقسیم مٹ جاتی ہے۔ معرفت کے تجربے میں خود خدا ہی موضوع اور محمول ہوتا ہے یعنی اس شعوری کیفیت میں خود صرف خود کو جانتا ہے۔ کوئی دوسرا اسے نہیں جان سکتا۔ (29)

مارٹن بیوبر کے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ معرفت کی ابتدا ایک طرح سے I Though قسم کا تعلق ہوتا ہے۔ انتہائی ذاتی قسم کا تعلق جو بندے اور خدا کے درمیان تجرباتی اور مشاہداتی سطح پر استوار رہوتا ہے۔ لیکن اس تعلق میں دوئیت موجود ہو تو وصال اور اتصال کی کیفیت وجود میں نہیں آتی۔ بندہ عالم تصرف و اسباب تک ہی محدود رہتا ہے۔ عارفانہ تجربے کی اگلی منزل وہ ہے جس میں عارف کی انانیت اور دوئیت مکمل طور پر فنا ہو جاتی ہے۔ وہ نسیان سے پاک ہو جاتا ہے اور اس کا حال تقصیر سے معرا۔ اس کی معرفت حال ہوتی ہے نہ کہ گفتار۔ ابن عربی کے نزدیک فنا کی اس حالت میں دوئیت کا ہر عنصر مفقود ہو جاتا ہے حتیٰ کہ سالک فنا کی منزل کو بھی پیچھے چھوڑ کر فنا الفنا کی منزل کو پا لیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ابتدا ہوتی ہے نہ انتہا۔ بس ابدیت کا راج ہوتا ہے۔ سالک کا گیان دھیان رہتا ہے نہ شعور۔ بندے کی اس حالت فنا میں اللہ تعالیٰ کو ہی بقا ہوتی ہے۔ اس Encounter میں وہ خود ہی ناظر ہوتا ہے اور خود ہی منظور۔ خود ہی شاہد ہوتا ہے اور خود ہی مشہود۔ غیر نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ لا انتَ اِلا انت۔ حضرت ہجویری فرماتے ہیں

> ”حقیقت یہ ہے کہ بندہ کے لیے فنا جلال حق کی دید اور اس کی عظمت کے کشف اور مشاہدہ دل سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے جلال کے غلبہ میں اس

> کے دل سے دنیا و آخرت فراموش ہو جاتی ہے اور اس کی ہمت کی نظر میں احوال و مقام حقیر معلوم ہونے لگتے ہیں اور اس کی حالت میں ظہور و کرامت پراگندہ اور عقل و نفس سے فانی ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ فنا سے بھی فانی ہو جاتا ہے اور عین فنا میں گم ہو کر اس کی زبان حق کے ساتھ گویا ہو جاتی ہے اور اس کے دل میں خشیت اور جسم میں عاجزی پیدا ہو جاتی ہے۔“ (50)

حوالہ جات

(1) دیکھیے مولانا مودودی کی معروف تصنیف خلافت و ملوکیت۔

(2) Cf. Sufism: Meaning, Knowledge and Unity, Dr Javad Nurbakhsh, p. 14

(3) علی ہجویری، صفحہ 207

(4) Victor Danner, The Islamic Tradition, p. 109

(5) A History of Islamic Philosophy, 1983, p. 236

(6) محمد عبدالرسول للّٰہی، صفحہ 114

(7) سید علی ہجویری، کشف المحجوب ترجمہ غلام معین الدین نعیمی، ص 58

(8) صاحبزادہ عبدالرسول، تاریخ مشائخ نقشبندیہ، ص 18

(9) بحوالہ ڈاکٹر اقبال آفاقی، مسلم فلسفہ، ص 32

(10) W. Montgomery Watt, The Faith and Practice of Al-Ghazali, p. 123

(11) See Goran Ogen, Did the term "Sufi" exist before the Sufis, Acta Orientalia 43, p. 33-48

(12) کنگز کالج کے میرے ایک استاد

(13) Julian Baldick, p. 31

(14) سید علی ہجویری، کشف المحجوب ترجمہ غلام معین الدین نعیمی، ص 77

(15) علی ہجویری، کشف المحجوب، ص 63

(16) کشف المحجوب، ص 68

(17) غلام معین الدین صفحہ 381

(18) کشف المحجوب ترجمہ معین الدین نعیمی، ص 381

(19) ص 382

(20) احیاء العلوم الدین

(21) معارج القدس، ص 193

(22) احیاء العلوم، ص 95

(23) مقاصد الفلسفہ، ص 21

(24) مقاصد الفلسفہ، ص 29

(25) Gaudener, Four Sufi Classics, p 145

(26) Ibid, 121

(27) Fadluo Shehadi, Gazzali's Unknowable God p 44

(28) ترجمہ غلام معین الدین نعیمی، صفحہ 7، 336

(29) A. J Arbery, The Doctrine of the Sifis, p 50

(30) ترجمہ غلام معین الدین نعیمی، صفحہ 342

☆☆☆☆

ظفر سپل

تصورِ زماں پر ایک نوٹ

لگتا ہے تصورِ زماں کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود زماں کی۔ یہ فلسفے کے نصاب کا انوکھا موضوع ہے۔ دور سے اور سطحی طور پر دیکھنے میں بے حد سادہ کہ ”پہلے“ اور ”بعد“ کے شعور سے مربوط ہے۔ مگر جوں جوں اس کو فکر کی ٹیلی سکوپ میں قریب سے لا کر فوکس کرنے کی کوشش کی جائے یہ اتنا ہی پیچیدہ اور مبہم ہوتا جاتا ہے۔ سینٹ اگسٹائن (St. Augustine) نے صحیح کہا ہے کہ: ”وقت کیا ہے؟ اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو میں جانتا ہوں کہ وقت کیا ہے اور اگر میں چاہوں کہ اس کی وضاحت بھی کروں، تو پھر میں نہیں جانتا“۔ فینمین (Richard Feynman) نے اسی حوالے سے کہا ہے کہ شاید یہی بہتر ہو کہ اگر ہم اس حقیقت کا اعتراف کر لیں کہ وقت ان چیزوں میں سے ایک ہے، جس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ اسی تناظر میں اینگلو امریکن وائٹ ہیڈ (A. N. Whitehead) کا یہ اعتراف بہت با معنی لگتا ہے ”وقت ایک ایسی مابعدالطبیعیاتی حقیقت ہے جو صرف غیر سائنسی کشف کے ذریعے قابلِ گرفت ہے“۔

تاہم ایک بات نہایت سادگی سے کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ دنیا میں یا تو اشیاء و اشخاص ہیں یا افعال و حادث۔ وقت نہ کوئی شے ہے، نہ کوئی شخص، نہ کوئی فعل ہے اور نہ کوئی حادثہ۔ سب کچھ وقت میں واقع ہوتا ہے، لیکن وقت کوئی واقعہ نہیں۔ اور پھر سب پیچیدگیوں کے باوجود ایک اور بات بھی طے ہے اور

وہ یہ کہ وقت کا بہاؤ ایک سیلِ خودرو کی طرح ہے، جو صرف ایک ہی سمت میں ممکن ہے یعنی ماضی سے مستقبل کی طرف۔ اس میں روانی تو ہے، مگر تواتر نہیں۔ اور قسمین ہی کے مطابق اہم بات یہ نہیں کہ ہم وقت کی تعریف کیسے کرتے ہیں، بل کہ یہ کہ ہم اس کی پیمائش کیسے کرتے ہیں۔ مصری دن اور رات کو بارہ حصوں میں تقسیم کرتے تھے۔ سمیریوں کے ہاں ساٹھ کی بنیاد پر قائم عددی نظام رائج تھا۔ اس طرح وہ گھنٹے کو ساٹھ منٹوں میں اور منٹ کو ساٹھ سیکنڈوں میں تقسیم کرتے تھے۔

بہاؤ اور تبدیلی کا ایک ایسا تصور جیسا کہ وقت کے گذرنے کے ساتھ وابستہ ہے، اس نے ساری انسانی زندگی اور سارے عالمی ادب میں اداسی کا منظر نامہ پینٹ کیا ہے۔ مسرت اور شادمانی کے وہ لمحات جو ہم ایک بار گزار چکے ہوتے ہیں، چونکہ دوبارہ ہماری زندگی میں واپس نہیں آتے، اس لیے ہمیں اُداس کر دیتے ہیں۔ گزرے ہوئے وقت کی سہانی یادوں نے جانے کتنے شاعروں سے آفاقی نظمیں تخلیق کرائی ہیں۔

"زمانہ خدا ہے۔ اُسے تم بُرا مت کہو
مگر تم نہیں دیکھتے۔ زمانہ فقط ریسمانِ خیال
سبک مایہ، نازک، طویل
جدائی کی ارزاں سبیل!
وہ صبحیں جو لاکھوں برس پیشتر تھیں
وہ شامیں جو لاکھوں برس بعد ہوں گی
انہیں تم نہیں دیکھتے، دیکھ سکتے نہیں
کہ موجود ہیں، اب بھی، موجود ہیں وہ کہیں
مگر یہ نگاہوں کے آگے جو رسی تنی ہے
یہ رسی نہ ہو تو کہاں ہم میں تم میں
ہو پیدا یہ راہِ وصال؟"

زمانہ خدا ہے۔ لا=انسان ن م راشد

وقت یا زماں {TIME) پر پہلی قابلِ قدر یادداشتیں قدیم یونانی فلسفیوں کے ہاں ملتی ہیں۔ ہیراقلیطوس {Heraclitus)، پرمینڈائز {Parmenides) اور زینو {Zeno) نے زماں پر باقاعدہ سائنسی سوچ وبچار کی اور وہ مارکسی فلسفیوں کے لیے خاص طور پر نشانِ راہ ہیں۔ اس لیے کہ وہ وقت اور تخلیق

کائنات کو ازلی وابدی مانتے ہیں۔ ہیراقلیطوس نے وقت کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا ”ہر شے ہے بھی اور نہیں بھی۔ کیونکہ ہر شے بہاؤ میں ہے“ اور ”ہم ایک ہی ندی میں پاؤں دھرتے بھی ہیں اور نہیں بھی دھرتے۔ ہم ہیں بھی اور نہیں بھی“۔ ارسطو نے جہاں ہر شے میں فکر ونظر کے چراغ روشن کیے ہیں، ناممکن تھا کہ وقت کے بارے میں کچھ نہ کہتا۔ اس کے نزدیک کائنات میں صرف وقت اور تبدیلی (حرکت) انمٹ ہیں۔ اور وہ ان دونوں کو مماثل قرار دیتا ہے۔ اور کہتا ہے نہ ہی وقت اور نہ ہی حرکت وجود میں لائے جاسکتے ہیں۔ اور نہ ختم کیے جاسکتے ہیں۔

عہد حاضر کے عظیم مارکسی دانش ور ایلن وڈز اور ٹیڈ گرانٹ {Alan Woods & Ted Grant) یہ بات پڑھ کر خوشی بھری مسکان سے ان دانش وروں کی طرف طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ جو ”وقت اور کائنات کے آغاز“ کے بارے میں رائے رکھتے ہیں۔

سترویں صدی میں پیدا ہونے والے نیوٹن {Newton) {1642-1727) کی کلاسیکی میکانیات نے جہاں پوری اٹھارویں صدی کو ہر حوالے سے شدید متاثر کیا، وہاں وقت کے بارے میں بھی اس کا نظریہ نہایت واضح اور متاثر کن ہے۔ دراصل پہلی بار کسی نے وقت کے بارے میں مکمل سائنسی شعور اور فلسفیانہ گہرائی سے گفتگو کی۔

نیوٹن زمانِ مطلق {Absolute Time) کے وجود پہ یقین رکھتا ہے، جو بالائے حوادث اپنا وجود رکھتا ہے اور کائنات سے بغیر کسی خارجی تعلق کے رواں دواں ہے اور اگر کائنات یا مادہ ختم بھی ہو جائے، تو بھی وقت کا وجود ہوگا۔ دراصل نیوٹن کے مطابق وقت خطِ مستقیم میں رواں ہے۔ اگر مادہ موجود نہ بھی ہو، تب بھی مکاں {Space) کا ایک فریم {Frame) موجود ہوگا۔ اور وقت اس کے اندر سے بہے گا۔ اس نظریے کی روح یہ ہے کہ زمان، مکان، مادہ اور حرکت علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں اور انھیں علیحدہ علیحدہ ہی مطالعہ میں لانا چاہیے۔

1724ء میں جرمنی میں پیدا ہونے والے حکیم کبیر عمانویل کانٹ {Emanuel Kant) نے وقت کے بارے میں متوازن رویہ اپنایا اور کہا کہ زمان ایک قبل از تجربی ادراک ہے۔ کانٹ زمان اور مکان دونوں کو ہمارے وجدان کی دو صورتیں قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہمارے دماغ میں یہ دونوں صورتیں تجربے {Experience) سے پہلے آتی ہیں۔ کانٹ کے نزدیک زمان و مکان طبیعی دنیا کی صفات ہی نہیں، بلکہ حقیقی مابعدالطبیعاتی وجود کی حامل Entities ہیں۔ اس نے دعویٰ کیا کہ زمان و مکان مظہری طور

پر حقیقی (Phenomenally Real) ہیں۔ مگر ان کو بالذات (In themselves) نہیں جانا جا سکتا۔ اپنی کتاب ”تنقید برعقلِ محض“ (Critique of Pure Reason) میں اس نے پر زور اصرار کیا کہ زمان و مکان معروضی تصورات نہیں، بلکہ جبلی (In Born) ہیں۔

مارکسی دانش اپنے مخصوص فلسفیانہ نظام کے تحت، وقت کے بارے میں ایک مختلف سمت میں بہتی نظر آتی ہے۔ جدلیاتی مادیت کے نقطۂ نظر سے وقت، حرکت اور حالت کی تبدیلی کا اظہار ہے۔ جو مادے کی ناقابلِ علیحدہ خاصیتیں ہیں۔ مادہ اور حرکت کیوں کہ ازلی و ابدی ہیں اس لیے وقت بھی مادے کی صفت کے طور پر ازلی و ابدی ہے۔ انھیں نہ پیدا کیا جا سکتا ہے اور نہ فنا۔ ہاں اگر بالفرض مادہ اور حرکت ختم کر دیے جائیں تو وقت بھی ختم ہو جائے گا۔ مگر مارکسی فلسفی یہ ”فرض کرنے“ کے لیے بھی تیار نہیں۔ وہ تو بگ بینگ (Big Bang) کے نظریے پر بھی شدید تنقید کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس سے بلاواسطہ طور پر ہی سہی ایک مافوق الفطرت خارجی ہستی، مادے کی تخلیق اور خصوصاً ”وقت“ کے ”آغاز“ کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ جبکہ نیوٹن کے تصورِ زماں کے مطابق اگر مادہ نہ بھی ہو تو تب بھی وقت کا وجود ہوگا۔ جس کی اپنی ایک ”مطلق حیثیت“ ہے۔ اسی وجہ سے ٹیٹ گرانٹ اور ایلن وڈز نے اپنی حال (1995 میں شائع ہونے والی معرکتہ الآرا کتاب (Reason in Revolt) میں بگ بینگ اور نیوٹن پر شدید تنقید کی ہے۔ بگ بینگ تھیوری پر وہ یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:۔

”بگ بینگ تھیوری دراصل ایک دیومالائی تخلیقی کہانی ہے۔ بالکل ”کتابِ تخلیق“ بائبل کی پہلی کتاب کی مانند۔ اس کی رو سے کائنات صرف پندرہ ارب سال پہلے وجود میں آئی۔ اس نظریے کی رو سے اس سے قبل نہ تو کوئی کائنات تھی، نہ مادہ، نہ مکان اور نہ ہی وقت۔ اس وقت تمام تر مادہ ایک نقطے پر مرکوز تھا“۔

ہیگل کے حوالے سے نیوٹن پر تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

”ہیگل نے نیوٹن کی میکانیات کی مبینہ مطلق سچائیوں کے بارے میں حقارت سے لکھا تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے اٹھارویں صدی کے میکانکی طرزِ فکر کو سیر حاصل تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ ہیگل کے نزدیک ہر محدود شے ”درمیانی“ تھی۔ یعنی کسی دوسری شے کے حوالے سے اضافی تھی۔ اس سے قبل ہر شے ہر دوسری شے کو محدود، متاثر اور متعین کرتی تھی۔ لہٰذا علت و معلول محض جداگانہ تعلقات کی حد تک درست تھے (جیسا کہ ہمیں کلاسیکی میکانیات میں نظر آتا ہے) لیکن اس صورت میں نہیں اگر ہم چیزوں کو عوامل تصور

کریں“۔

اور یہ کہ:

”مکمل طور پر خالی جگہ کا تصور محض کلاسیکی جیومیٹری ہی میں ممکن ہے۔ یہ ایک ریاضیاتی تجرید ہے۔ جو حقیقت کو محض اندازاً پیش کرتی ہے۔۔۔ ریاضی کی تجریدات فطری اور مسلم اصول نہیں ہے بلکہ مادی دنیا کے مشاہدات سے ماخوذ ہیں“۔

اگرچہ ٹیڈ گرانٹ اور ایلن وڈز نیوٹن کی زمانی اہمیت اور کارناموں سے انکار نہیں کرتے، مگر یہ کہے بغیر بھی نہیں رہتے کہ نیوٹن کا نظریہ پرانا اور رچ باسی ہو گیا، اسی طرح جس طرح باقی اقدار عہد کے ساتھ پرانی اور باسی ہو جاتی ہیں۔ آئن سٹائن بھی دونوں عظیم فلسفیوں کے نزدیک اس لیے عظیم تھا کہ اس نے وقت (اور سچائی) کے اضافی ہونے کی بات کی۔ وہ لکھتے ہیں:۔

”آئن سٹائن کی عظمت یہ تھی کہ اس نے ان تجریدات سے آگے بڑھ کر ان کے اضافی کردار کو ظاہر کیا(کہتے ہیں کہ آئن سٹائن نے ریل گاڑی میں سفر کرتے ہوئے ایک حیرت زدہ انسپکٹر سے پوچھا کہ ”آکسفورڈ اسٹیشن اس ٹرین پر کتنے بجے رکتا ہے) تاہم وقت کی اضافیت کا پہلو نیا نہیں تھا۔ اس کا مکمل تجزیہ ہیگل کر چکا تھا۔ اپنی تحریر ”ذہن کی مفروضیت“(The Phenomenology of Mind)میں اس نے ”یہاں“ اور ”ابھی“ جیسے لفظوں کی اضافیت کی وضاحت کی ہے۔ یہ تصورات جو بظاہر سادہ معلوم ہوتے ہیں، کھوجنے پر پیچ دار اور متضاد نکلتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس سوال کے جواب میں کہ ”ابھی“ کیا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ ”ابھی“ رات کا وقت ہے۔ اس سچائی کو پرکھنے کے لیے ہمیں صرف ایک سادہ تجربہ درکار ہے کہ اس سچائی کو لکھ لیا جائے۔ سچائی کو اگر لکھ لیا جائے تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اگر ہم اس سچائی کو دوبارہ دیکھیں جو ہم نے لکھ چھوڑی تھی۔ اسے ”ابھی، دوپہر کے وقت“ دیکھیں تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ وہ سچائی باسی ہو چکی ہے اور اس کا وقت گذر چکا ہے“۔

ہاں تو کیا سچائی بھی اضافی ہے۔ اور وہ باسی اور ناکارہ ہو جاتی ہے اور نیوٹن کا سچ واقعی باسی ہو گیا؟ اور اگر ایسا ہی ہے تو پھر قدیم یونانی فلسفیوں (ہیراقلیطوس، پرمینڈائز اور زینو) کے سچ کا چراغ کس طرح روشن رہا۔ جس سے مارکسی فلسفیوں کے نزدیک آج بھی سچ کی روشنی حاصل کی جاتی ہے؟

یہ ایسے سوال ہیں جو کائناتی سچائی کی ایک اور بڑی کھڑکی کھول دیتے ہیں۔ کہ جس میں سے دیکھنے سے پہلا سچ ناکارہ نظر نہیں آتا مزید واضح اور روشن ہو جاتا ہے۔ اس تناظر میں پہلا تازہ ہوا کا جھونکا

اسٹیفن ہاکنگ کی کتاب ”وقت کی مختصر تاریخ“ (A Brief History of Time) ہے۔ جس میں ہاکنگ نے ریاضیاتی طور پر ثابت کیا ہے کہ کائنات کا یقیناً کوئی آغاز ہوگا اور ممکنہ طور پر اختتام بھی۔ انہوں نے محض اسی پر قناعت نہیں کی کہ کائنات کے لیے وقت کا آغاز اور انجام فراہم کیا۔ بلکہ کائنات میں بے شمار ایسے حصے بھی دریافت کر ڈالے جہاں وقت ختم ہو چکا ہے۔

ہاکنگ اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں:۔

”ہمارے کام کی بہت زیادہ مخالفت ہوئی۔ جزوی طور پر ان لوگوں کی طرف سے جن کا سائنسی جبریت کے مارکسی نظریے پر ایمان تھا اور جزوی طور پر ان لوگوں کی طرف سے جو یہ محسوس کرتے تھے کہ ہمارا نظریہ آئن سٹائن کی تھیوری کی خوبصورتی کو تباہ کرتا ہے۔ تاہم کوئی بھی ریاضی کے کسی مسئلہ سے بحث نہیں کر سکتا۔ لہٰذا آخر کار ہمارے کام کو مجموعی طور پر قبول کر لیا گیا۔ اور آج کل تقریباً ہر کوئی یہ فرض کرتا ہے کہ کائنات کا آغاز ایک غرابت (Big Bang Singularity) سے ہوا تھا“۔

ایک حدیثِ قدسی ہے ”زمانے کو بُرا مت کہو کیونکہ میں خود زمانہ ہوں“۔ ڈاکٹر علامہ اقبال نے تصورِ زماں کو اس کائناتی سچ کی روشنی میں ایک مختلف زاویے سے واضح کیا ہے۔ اگرچہ اقبال نیوٹن کے اس زمان کو مسترد کرتے ہیں جو ایک لامتناہی لکیر کی مانند ہے، جو ازل تا ابد کھنچی ہے۔ مگر وہ اس ”مادی زمان“ کو بھی سطحی، بے معنی اور غیر حقیقی سمجھتے ہیں، جو گردشِ لیل و نہار یا سائنسی ریفرنس میں حرکت مادہ سے متصل ہے۔

ان کے نزدیک وقت ایک تخلیقی اور ارتقائی قوت ہے۔ وہ اِسے ”حقیقی زمان“ کہتے ہیں۔ اس تناظر میں زندگی وقت میں نہیں گذرتی بلکہ وقت زندگی کی تخلیقی قوت ہے۔ یہ وہی تخلیقی قوت ہے۔ جسے برگساں (Bergson) جوشِ حیات یا (Elan Vital) کہتا ہے۔ اور جو تخلیقی عمل میں محرک کا کردار ادا کرتی ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم اپنی کتاب ”فکرِ اقبال“ میں لکھتے ہیں:۔

”اقبال نے جو اشعار (تصورِ زماں کے حوالے سے) لکھے ہیں، ان کا لبِ لباب یہ ہے کہ زمان کوئی مجرد یا ساکن حقیقت نہیں، بلکہ ایک تخلیقی قوت ہے۔ اس زمان حقیقی میں دوش و فردا نہیں ہے، نہ انقلابِ روز و شب ہے۔ لوگوں نے زمان کو مکان پر قیاس کر لیا ہے۔ اور یوں سمجھ لیا ہے کہ ایک لامتناہی لکیر ہے جو ازل سے ابد تک کھنچی ہوئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی قوتوں کو وسعت دینے والا وقت ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم شدہ کوئی مکانی انداز کی چیز نہیں“۔

ڈاکٹر محمد اقبال کے مطابق انہوں نے برگساں کو دوران ملاقات حقیقت زمان پر گفتگو کرتے ہوئے جب محمد رسول اللہ کا یہ قول قدسی سنایا کہ ”زمانے کو بُرا مت کہو، کیونکہ میں زمانہ ہوں“ تو برگساں ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس کی روح بے پایاں مسرت سے لبریز ہو گئی۔ کیوں کہ یہ وہی کائناتی سچ تھا جو اس نے استدلال اور ذاتی وجدان سے حاصل کیا تھا۔

نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ (اقبال)

☆☆☆☆

کتابیات

۔ فکر اقبال، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، (جون)

عامر سہیل

ہزارہ میں اُردو نعت کی روایت

ہزارہ میں اُردو ادب کی روایت خاصی مستحکم ہے اور اس میں قابلِ قدر اضافوں کا سلسلہ تواتر سے جاری ہے۔ اُردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ اسی خطے میں ہندکو اور پشتو ادب بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نشو و نما پاتے رہے ہیں جس کی وجہ سے ہزارہ میں علم و ادب کی رنگا رنگ بہار اپنا جادو جگاتی نظر آتی ہے۔ اگر ہزارہ کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو علم ہوتا ہے کہ اسے زمانہ قبل از مسیح میں ہی علم و ادب کا گہوارہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ مانسہرہ میں شہنشاہ اشوکا نے اپنے عہد میں پتھر پر جو فرامین کندہ کرائے تھے وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یہاں قدیم زمانے سے علم کی روایت موجود رہی ہے، کیوں کہ اشوکا نے صرف انہی علاقوں میں اس نوع کے فرامین کندہ کرائے جہاں کے باشندے پڑھے لکھے اور باشعور تھے، اور علم کے انہی مراکز سے علم و ادب کی باتیں سفر کرتے کرتے دور دور تک پہنچ جایا کرتی تھیں۔ موجوہ عہد میں بھی ہزارہ کے لکھاری علم و ادب کی ترویج و اشاعت میں اہم اور مرکزی کردار ادا کر رہے ہیں۔ ہزارہ کے شعرا اور اُدبا کی

اہمیت کا اندازہ یہاں سے لگتا ہے کہ اُردو ادب کی کوئی تاریخ ہزارہ کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی اور دنیائے اُردو کا ایسا کوئی علمی ادبی جریدہ نہیں جس میں ہزارہ کی لکھاری شامل نہ ہوں۔

ہزارہ کے ادیبوں نے جس طرح ادب کی دیگر اصناف میں نام پیدا کیا اُسی طرح نعت گوئی میں بھی کامیابی و کامرانی کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ نعت گوئی کے حوالے سے ہمارے شاعروں نے جو خدمات انجام دیں اُن کی ایک مفصل تاریخ پروفیسر بشیر احمد سوزؔ مرتب کر چکے ہیں جس کا نام ’’ہزارہ میں نعت‘‘ ہے۔ اس کتاب سے قبل کوئی اور جامع کتاب اس موضوع پر نظر نہیں آتی۔ ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان کی کتاب ’’عہدِ رسالت میں نعت‘‘ ہمارے اُردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہے اور علمی حلقوں میں اس وقیع کتاب کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ لائق توجہ ہے۔ یوں اگر دیکھا جائے تو ہزارہ میں نعت کی تخلیقی اور تحقیقی رفتار خاصی حوصلہ افزا ہے۔ پھر بھی اگر کوئی اس ضمن میں کمی کا گلہ کرے تو یہ کمی کسی حد تک تنقیدی اور تحقیقی حوالے سے مقدار کی کمی تو ہو سکتی ہے لیکن تخلیقی سطح پر معیار اور وقار کی کوئی کمی دور دور تک نظر نہیں آئے گی۔

’’ہزارہ میں نعت‘‘ کی فہرست سے استفادہ کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ گوہر امان خان اگرور (وفات ۱۸۹۴ء) یہاں کے پہلے نعت گو شاعر گزرے ہیں اس کے بعد کا سلسلہ آگے بڑھانے والوں میں سید محمود شاہ محدث ہزاروی، عمر خان عمر، میر ولی اللہ، محمد اعظم، سید بشیر حیدر کنول، محمد عجب خان نقشبندی، گل زمان عاجز بفوی، محمد افضل خان مائل، الطاف پرواز، حفیظ اثر، محمد اسرائیل مہجور، اسلم ناز خواجگانی، ڈاکٹر مبارک احمد قمر، شعلہ بجنوری، ایوب ساقی سواتی، قاضی محمد قاسم مسلم، قاضی محب الرحمٰن، مقرب آفندی، عبدالرشید ہزاروی، دلاور خان دل، سید زبیر مشہدی، عبداللطیف راہی، سلطان سکون، پروفیسر صوفی عبدالرشید، ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، عمر خطاب ارم، داود کوثر، پروفیسر مرتضےٰ سید، آصف ثاقب، محمد عظیم عظیم۔ سعید ناز، ڈاکٹر ایوب صابر، فضل اکبر کمال، محمد اسماعیل سوز، نیاز سواتی، پروفیسر جعفر سید، پروفیسر یحییٰ خالد، غلام مجتبیٰ جدون، محمد زمان مضطر، عبدالخالق شاطر ہزاروی، قاضی سیف الرحمن سیف، شاہ نواز سواتی، ڈاکٹر محمد رفیق، قاضی محمد اشفاق جلوی، قاضی عبدالدائم دائم، تاج محمد تاج، اسحاق احمد اسحاق صدیقی، اورنگ زیبؔ زیبؔ، قاضی جمیل الرحمن، پروفیسر بشیر احمد سوزؔ، سید عبداللہ شاہ مظہر، خالد خواجہ، تاج الاسلام عاجز، سجاد احمد رمز، نسیم عباسی، طاہر پرواز، امان اللہ امان، رومیل قمر، محبوب الٰہی عطا، پرفیسر یونس شاہ، محمد حنیف، محمد بشیر گل، پروفیسر محمد بشیر، سید ماجد شاہ، پروین سیف، ہارون الرشید، رستم نامی، احمد حسین مجاہد، سید ابرار سالک، جان عالم، ڈاکٹر محمد سفیان صفی، امتیاز الحق امتیاز، تاج الدین تاج، اجمل نذیر، محمد عرفان تبسم، پرویز ساحر اور مسرت کنول بطور خاص شامل ہیں۔ یہ فہرست ادھوری ہے لیکن یہ اندازہ لگانے کے لیے کافی و شافی ہے کہ ہزارہ کا خطہ فنِ نعت

گوئی میں اہم مقام رکھتا ہے۔ ویسے تو ہزارہ کے تقریباً ہر شاعر نے نعت لکھنے کی سعادت حاصل کی ہے لیکن کچھ شاعروں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور مکمل نعتیہ مجموعے منظر عام پر لانے کا شرف حاصل کیا۔ اس لڑی میں الطاف پرواز، قتیل شفائی عبدالغفور ملک، عرفان رضوی اور محبوب الٰہی عطؔا کے نام چمکتے ہوئے نظر آئیں گے۔ الطاف پرواؔز (۱۹۲۰ء۔۱۹۹۲ء) کا نعتیہ مجموعہ ''نورِ حرا'' اگست ۲۰۰۱ میں طبع ہوا۔ یہ نابغہ روز گار شخصیت صحیح معنوں میں ہزارہ کا کوہ نور ہیرا ہے۔ اُردو، پنجابی، فارسی، ہندکو اور پشتو زبان پر کامل عبور تھا اور روایتی تعلیم حاصل نہ کرنے کے باوجود تقریباً ستر (۷۰) سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی کتاب ''نورِ حرا'' سے چند نعتیہ موتی پیش کیے جاتے ہیں:

؎ سرکارِ دوعالم میری حالت پہ نظر ہو
مجھ بے سروساماں کو بھی اب اذنِ سفر ہو
کس کس کو نوازہ نہ گیا لطف و کرم سے
اب تو مرے جلتے ہوئے اشکوں میں اثر ہو

؎ خداوند! عطا مجھ کو بہارِ زندگی کر
مری ہر اک تمنا کو مدینے کی گلی کر

ہزارہ کی دھرتی کا ایک اور انمول شاعر قتیل شفائی ہے۔ بشیر احمد سوؔز لکھتے ہیں:

''قتیل بے شک لذائذ حیات سے بہرہ مندر ہے اور زندگی کی رنگینیوں میں کھوئے رہے لیکن اُن کی سرشت میں ایسے رنگ بھر دیے گئے تھے جو کبھی کبھی اُن کے عقائد اور رسول اللہ سے اُن کی محبت کو آشکارا کرتے رہتے تھے۔۔۔ اُنھیں جب کبھی معاشی اُلجھنوں سے فرصت ملی وہ حمد و نعت اور سلام کہتے رہے۔۔۔ قتیل لاکھ مادّیت کی دلدل میں اُترے ہوں وہ اپنے خدا اور رسول سے کبھی کسی طرح بھی غافل نہیں رہے۔۔۔ قتیل کی آرزو ہے کہ اگر خدا انھیں مہلتِ زندگی عطا کرے تو وہ اپنے محبوب محمدؐ کے نام کو برگ و بار پر بھی رقم کر سکیں، یہ کاغذ قلم محمدؐ کے نام اور صفات کے لیے کافی نہیں'' (ہزارہ میں نعت ص ۶۲۔۶۳)

قتیل شفائی کے مجموعہ نعت ''نذرانہ'' سے کچھ اشعار دیکھیے:

؎ سب سے بڑے حسین ہیں جب وہ خدا کے بعد
پھر کیوں کسی کو چاہیں گے ہم مصطفیٰؐ کے بعد
کُل کائنات کے لیے جب وہ ہوئے طلوع
سب چاند ماند پڑ گئے اُن کی ضیاء کے بعد

ایک اور نعت میں آپ اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

؎ میری تمام شاعری، پھول ہی پھول ہوگئی
میں نے کہی تھی جو غزل نعتِ رسول ہوگئی
داد مرے ضمیر نے دی مری نعت پر مجھے
یوں مری قیمتِ سخن، مجھ کو وصول ہوگئی

عبدالغفور ملک کا مجموعہ ”مئے طور“ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جنابِ سوز کی تحقیقی رائے کا مطابق ”مئے طور، ہزارہ سے شائع ہونے والا پہلا مجموعہ ہے۔ پروفیسر صوفی عبدالرشید اس کتاب کے فنی محاسن کو موضوع بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اردو حمد و نعت کے مجموعے میں ملک صاحب کی قدرتِ کلام کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ بندش کی چستی ترکیب کی پختگی، الفاظ کا انتخاب اور ان میں تناسبِ ترتیب، رواں دواں بحروں کا استعمال اور اصوات کا باہمی تال میل اور اس سے پیدا ہونے والی خوش آہنگی وہ خصائص ہیں جنہیں ذوقِ سلیم بآسانی محسوس کرسکتا ہے۔“ (بحوالہ ہزارہ میں نعت ص ۷۴)

اِن کی نعتیہ غزل کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

؎ مری زبان سے نکلا ہے جب سلام و درود
ہوا ہے عرشِ معظّم سے رحمتوں کا نزول
وہ جس نے قیصر و کسریٰ کے تخت اُلٹائے
وہ جس نے کفر و ضلالت کو کر دیا مفقود
نہ کیوں سلام و درود اُن پہ میں ملکؔ بھیجوں
خدا اور اُس کے فرشتے بھی بھیجتے ہیں درود

عرفان رضوی کا شمار بھی ہزارہ کے صفِ اول نعت گویان میں ہوتا ہے۔ اُن کی تین مجموعے نعتیہ شاعری پر مشتمل ہیں، گہرہائے فروزاں، نغمہ زیبا اور عرفانِ نعت۔ اِن کا اُسلوبِ نگارش عالمانہ اور فارسی تراکیب و بندش میں پرو دیا ہوا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

؎ بزمِ ہستی میں ہے ہر سو جلوہ آرائی تری
تیرے جلووں کی ہے تابش عالمِ کُن کی ضیا

ہزارہ میں نعت گوئی کا ایک اور حوالہ محبوب الٰہی عطاؔ کا ہے۔ ان کی شاعری کا مجموعی رنگ صوفیانہ

ہے۔ سرورِ کائناتؐ سے بے پناہ عقیدت کی وجہ سے اُن کی شاعری میں صنفِ نعت کا برتاؤ اور رچاؤ حاوی ہے۔ اُن کے نعتیہ مجموعوں میں ''انوارِ سرورش'' اور ''چرخِ اطلس'' کا خاصا شہرہ ہے، بلکہ ''چرخِ اطلس'' کا خاص الخاص اعزاز یہ بھی ہے کہ اس کو اُردو ادب میں پہلا نعتیہ رباعی کا مجموعہ تسلیم کیا گیا ہے۔ عطاؔ کے رگ و پے میں رباعی کی صنف دوڑتی پھرتی ہے۔ اُنہوں نے نعتیہ رباعیاں اتنی کثیر تعداد میں لکھی ہیں کہ اُردو دنیا میں کوئی اور اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر محمد سفیان صفی، ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، سلطان سکون، پروفیسر محمد ارشاد، آصف ثاقب اور پروفیسر بشیر احمد سوزؔ ان کے فکر و فن کو خراجِ تحسین پیش کر چکے ہیں۔ عطاؔ کا نمونۂ کلام دیکھیے:

بن جاؤں میں گلزارِ ارم کی تصویر
آؤں میں نظر لطف و کرم کی تصویر
اے کاش مرے شیشۂ الفت میں عطاؔ
ہو جائے امر شاہِ اُمم کی تصویر

ہزارہ میں ایسے شعرا کی کثرت ہے جو شاعری کی باقی اصناف کے ساتھ نعت کی طرف بھی متوجہ رہے ہے۔ مثلاً پروفیسر صوفی عبدالرشید اور ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان کے ہاں نعت کا کلاسیکی انداز قاری کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ یہ دونوں ادیب تحقیق و تنقید میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں اور نعت گوئی کے حوالے سے بھی اِن کی منفرد شناخت قائم ہے۔ ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان کا نعتیہ اُسلوب دیکھیے، نظم کا عنوان ہے:

''صلِ علیٰ محمدؐ''

بقا قطرے کی دریا میں ہے یا
قطرے ہی دریا ہیں
یہی وحدت کی اُلجھن
اور کثرت کا تماشا
شرک کو توحید کرتا ہے
اگر تخلیق کو تفریق کہنا ہے
تو اس اُلجھن میں رہنا ہے
مرے خالق! مجھے تفریق سے نفرت ہے
مجھ کو متصل کر دے

(بشکریہ: فنون شمارہ ۱۱۶، ص ۱۸)

ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان ہزارہ کی علمی ادبی روایت کا اہم ستون ہیں۔ ان کی با مقصد زندگی کا بیشتر حصہ درس وتدریس میں صرف ہو رہا ہے۔ آپ ایک مسلّم ادیب، عمدہ نقاد، معروف محقق، عمدہ شاعر اور ثقہ اقبال شناس ہیں اور آج کل ہزارہ یونیورسٹی کے شعبہء اُردو سے بطور صدر نشین منسلک ہیں۔ یوں تو اُن کی علمی تصانیف کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن سرِ دست اُن کی اُس تصنیف پر بات کی جا رہی ہے جو اپنے موضوع کے حوالے سے اُردو ادب میں منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ میں تو اس کتاب کو اُردو زبان میں ایک منفرد نعتیہ تاریخ سمجھتا ہوں۔ اس اہم کتاب کا نام ''عہدِ رسالت میں نعت'' ہے، جس کا موضوع اور اُسلوب اپنی مثال آپ ہے۔ یہ کتاب مجلس ترقی ادب لاہور نے ۱۹۹۳ء میں شائع کی تھی اور تا حال اس جیسی کوئی اور کتاب اُردو منظرنامے پر نظر نہیں آتی۔ ڈاکٹر صاحب نے کتاب کو کُل چھے ابواب میں تقسیم کیا ہے جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ باب اول: کچھ لفظ یا اصطلاح نعت کے بارے میں، باب دوم :النبی المتخلق، باب سوم: صاحب القرآن فی القرآن، باب چہارم :النبی المویدُ، باب پنجم : حرکتِ اسلام کی تعلیم اور باب ششم ممدوحِ کائناتؐ پر مشتمل ہے۔

نعت سُنتِ ربانی ہے اور جس مقتدر ہستی کی تعریف وتوصیف خود خالقِ کائنات نے فرما دی ہو اُس سے بڑھ کر کوئی اور کیا مدح سرائی کر سکتا ہے، لیکن اس کے باوجود شعرائے کرام نے اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کی خاطر شعر گوئی کا سہارا لیا اور ''نعت'' کو ایک مستقل فن بنا دیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت محمدؐ کے عہد سے ہی اس کا آغاز ہو گیا تھا اور اب یہ سلسلہ تا قیامت جاری وساری رہے گا۔ اُردو زبان میں ایسی کتابیں کمیاب ونایاب ہیں جن میں عہدِ رسالت کو موضوع بنایا گیا ہو، کیوں کہ اس ضمن میں جس پائے کی تحقیق درکار ہے وہ ہمارے ہاں عنقا ہے۔ ڈاکٹر ارشاد شاکر ایک طرف تو عربی اور فارسی زبان وادبیات پر عبور رکھتے ہیں اور دوسری طرف تحقیق کا ایسا سلجھا ہوا ذوق پایا ہے کہ اس نازک موضوع کے لیے اُنھیں مناسب ترین محقق قرار دیا جا سکتا ہے۔

اگرچہ یہ علمی کتاب خالص تحقیقی پیمانوں کے مطابق مرتب کی گئی ہے لیکن اس کا اُسلوب عام فہم اور زبان سادہ وسلیس ہے۔ فاضل محقق نے کتاب کی ترتیب کچھ یوں رکھی ہے کہ پہلے نعت گو شعرا کا تعارف آتا ہے، پھر اُن کے عربی کلام کا اصل متن اور ساتھ آسان اُردو زبان میں ترجمہ کر دیا گیا ہے اس طرح قاری کتاب کی صوری ومعنوی خوبیوں سے بہر ممکن استفادہ کر سکتا ہے۔ اُردو نعتیہ ادب میں یہ عمدہ کتاب شائقین کے لیے من وسلویٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب معلومات کا انمول خزینہ ہے۔ کتاب پڑھ کر علم ہوتا ہے کہ آپؐ کی مدح سرائی میں دینِ اسلام کی مقتدر اور برگزیدہ ہستیوں نے حصہ لیا ہے مثلاً عبداللہ بن

حارثؓ، سیدالشہدا، حضرت امیر حمزہؓ، حضرت عمرِ فاروقؓ، حضرت علی ابن طالبؓ، حضرت کعب ابن مالکؓ اور روحِ عصر کے ترجمان حضرت حسّان ابن ثابتؓ شامل ہیں۔ ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان نے ہر باب کے آخر میں حواشی و تعلیقات کا اہتمام کر کے کتاب کی افادیت دوچند کر دی ہے۔

ہزارہ کے نمائندہ شاعروں میں ایک منفرد آواز سید ابرار سالک کی ہے۔ جو اب ہمارے درمیان موجود تو نہیں ہیں لیکن اُن کی خوبصورت شاعری ہمیشہ ہمارے قلب و نظر کو معطر کرتی رہے گی۔ اُن کی نعتیں بھی احمد ندیم قاسمی کے مقبول و معروف ادبی جریدے ''فنون'' میں اشاعت پذیر ہوتی تھیں۔ اُن کے دو شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں: '' اک دشت کی کہانی'' اور ''مسافت کم نہیں ہوتی''۔

سالکؔ کی نعت کا اپنا ہی ایک خاص آہنگ ہے، ان کی نعت پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ دل سے نکلی ہوئی بات دل پر اثر کر رہی ہے۔

وہ کہتے ہیں:

؎ سروں پہ سایہ فگن ہے تُو سائباں کی طرح
زمیں کو تیری ضرورت ہے آسماں کی طرح

ترے ہی دم سے سلامت ہے یہ جہانِ وجود
تُو زندگی کی طرح ہے، تُو قلب و جاں کی طرح

مرے وجود کا موسم ترا ہی موسم ہے
تری نظر سے ہے محکم مرے جہاں کی طرح

عجب دیار ہے سالکؔ مدینۂ احمد
کوئی جگہ نہیں اُس شہرِ مہرباں کی طرح

ہزارہ کی ایک اور ادبی شخصیت پروفیسر مرتضیٰ سیّد کی ہے۔ اِن کی نستعلیق شخصیت ادبی حلقوں اور شاگردوں میں بہت مقبول ہے۔ شعر کم کم کہتے ہیں لیکن اُن کی شاعری مضامین کی ندرت کے باعث قبولِ عام کی سند رکھتی ہے۔ جنابِ مرتضیٰ ہر سال بڑی باقاعدگی سے اپنے دولت خانے پر محفلِ نعت و میلاد کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں جس میں ہزارہ بھر کے نمائندہ شاعر اپنا اپنا نعتیہ کلام پیش کرتے ہیں۔ اس خیر و برکت کی محفل میں راقم کو بھی کئی بار شریک ہونے کا موقع ملا۔ اہلِ علم حضرات اس سالانہ محفل کا شدت سے انتظار کرتے ہیں۔ سیّد صاحب کی نعت کے چند اشعار:

؎ جو بے نیازِ خزاں ہو وہ پھول ہو جاؤں

اگر میں آپ کے در پر قبول ہو جاؤں
میرا بھی عرش نشینوں میں نام ہو جائے
اگر حضور کے قدموں کی دھول ہو جاؤں
مسرتوں کا خزانہ ہے دل میں یاد ان کی
کبھی یہ ہو نہیں سکتا ملول ہو جاؤں

ہزارہ میں لکھی جانے والی نعت کا ایک نمایاں وصف یہ بھی ہے کہ ہمارے شعرا حضرات نے اپنے ذاتی مسالک سے بلند ہو کر حضورؐ کی مدح سرائی کی ہے۔ ورنہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسلک کا رنگ اپنا جادو جگا جاتا ہے۔ اس احتیاط کی وجہ سے ہزارہ میں لکھی جانے والی نعت کو پوری اردو دنیا میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہزارہ میں لکھی جانے والی نعت کی تاریخ کم از کم دو سو سال پرانی ہے اور یہ صنف ہمیں ہندکو، اردو، فارسی اور پشتو چاروں زبانوں میں ملتی ہے۔ ہزارہ کے قدیم علمی مراکز تین شہروں کا نام سرِ فہرست ہے یعنی مانسہرہ، بفہ اور ہری پور، ان علاقوں میں اب بھی ایسے بزرگ موجود ہیں جو فارسی زبان پر خاصی دسترس رکھتے ہیں اور اس زبان میں شاعری بھی کر رہے ہیں۔ عہدِ حاضر میں اگر دیکھا جائے تو ہری پور ہزارہ میں پروفیسر صوفی عبدالرشید اور محمد ارشاد جبکہ بفہ میں ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان اور کرنل فضلِ اکبر کمال اور مانسہرہ میں محمد زمان مضطر فارسی زبان کی قدیم علمی روایت کے امین ہیں۔ ان فاضل حضرات سے قبل گوہر امان خان (وفات ۱۸۹۴ء)، پیر سید محدّث ہزاروی (پیدائش ۱۸۷۲ء) میر ولی اللہ اور سیّد بشیر حیدر کنول نے اسی روایت کی آبیاری کی تھی۔ گوہر امان خان کی اردو نعت سے تین شعر ملاحظہ کیجیے:

؎ ساقی شراب عشقِ محمد پلا دے آج
سرشار کر کے پردہ دوئی کا اٹھا دے آج
یارب! اگر نصیب زیارت نبی کی ہو
لے جا نہیں تو آتشِ ہجراں جلا دے آج
گوہر اماں میدانِ محبت میں رکھ قدم
کچھ کچھ تو عشقِ یار کے جوہر دکھا دے آج

انہی شاعر کا ایک فارسی شعر بھی دیکھ لیجیے:

؎ در ہر زماں و ہر دم صلوٰ علیٰ محمدؐ

ہر جہانیاں شُد رحم خدا محمدؐ

سیّد یونس شاہ ہماری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :

”ہمارے ہاں یہ روایت رہی ہے کہ ہر شاعر اپنے دیوان کا آغاز حمد و نعت سے کرتا ہے۔ اُردو کی یہ روایت اتنی مستحکم رہی ہے کہ غیر مسلم شعرا نے بھی اس روایت کو پوری طرح نبھایا ہے۔ اس روایت کو دکنی ادب اور بعد میں شمالی ہند کے اردو شہ پاروں میں دیکھا جا سکتا ہے، تاہم فنی اعتبار سے ان حمدوں اور نعتوں کا معیار دوسری اصنافِ سخن سے زیادہ بہتر نہیں ہے مگر اب دورِ حاضر میں یہ رسمی انداز فکر و فن کی کئی منزلیں کرنے کے بعد ادب کا اعلیٰ نمونہ بن گیا ہے۔“ (خیابان، اصنافِ سخن نمبر، ص ۷)

نعت ایک ایسی صنف ہے جو کسی بھی ہیئت {Form} میں لکھی جا سکتی ہے۔ ہزارہ کی نعت کا ہیئتی مطالعہ بھی دل چسپ ہے۔ ہمارے اکثر شعرا نے غزل کی ہیئت کو پسند کیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ نعتیہ رباعیوں کا سلسلہ بھی نظر آتا ہے۔ ہندکو اور اردو نعتیہ ماہیے بھی سامنے آ چکے ہیں۔ آزاد نظم اور مثنوی کی ہیئت ہمارے شعرا کی پسندیدہ رہی ہے، محمد فرید نے ایک نئی ہیئت ترکے میں بھی نعتیں لکھ کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ البتہ میر ولی اللہ نے مسدس کی ہیئت میں کامیاب نعتیں لکھی ہیں :

ایک مثال دیکھیے :

؎ تیرے اخلاق نے دی دہر کو تعلیم نئی
تیری حکمت سے ہوئی دہر کی تنظیم نئی
تیری عظمت سے ہوئی دین کی تعظیم نئی
تیری شوکت سے زمیں کی ہوئی تقسیم نئی
سارے ادیان سے بہتر تیرا دین عربی
دل و جاں با دفدایت چہ عجب خوش لقبی

نعت کو سنتِ ربانی کہا گیا ہے اور اس فن میں جگہ جگہ پر احتیاط برتی جاتی ہے۔ نعت صرف ایک ادبی صنف نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ دینی تقاضے بھی ہیں جو توجہ کے متقاضی ہیں۔ نعت میں برتی جانے والی ہر ترکیب، علامت، تشبیہ، تلمیح، استعارہ، صنعت اور دیگر شعری قرینے خواہ وہ جدید ہوں یا قدیم اُن سب کو اصول شریعت کے تحت دیکھ کر برتا جائے گا۔ اگر وہ شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے مدحت کی شرائط پر پورے اُتر رہے ہیں تو اُسے کامیاب نعت تصور کیا جائے گا، ورنہ بسا اوقات ایک آنچ کی کسر سے

خالص سونا، تانبے میں تبدیل ہو سکتا ہے۔

نعت کو معنوی، صوری اور جمالیاتی ساخت کے لحاظ سے ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: (۱) وہ نعت جو روایت سے چل کر عقیدت پر ختم ہوتی ہے (۲) وہ نعت جو عشق سے شروع ہو کر ایمان پر ختم ہوتی ہے۔ یہ تقسیم بلاوجہ نہیں ہے اور اگر نعت کے تخلیقی عمل اور موضوعاتی تنوع کو دیکھا جائے تو نعت کا مواد بھی اس تقسیم کے مطابق ڈھلا نظر آئے گا۔ نعت گوئی بہت باریک فن ہے اور حکما نے اس کے جو اصول و قواعد مقرر کیے ہیں اُن کا خیال رکھنا بھی ہر نعت گو پر فرض ہے۔ نعت ادب کی واحد صنف ہے جو جدید ہونے کے باوجود روایت سے بغاوت نہیں کر سکتی۔ نعتیہ ادب کے مورخین نے موضوعاتی تقسیم کے تحت جن چار مراحل کی نشاندہی کی ہے وہ سب کسی نہ کسی حوالے سے ہمارے ہزارے وال شاعروں کے پاس موجود رہی ہے۔ یہ تقسیم کچھ اس طرح ہے۔ (۱) نعتِ اعتقادی (۲) نعتِ عملی (۳) نعتِ علمی (۴) مولادنامہ یا میلادنامہ۔ ہزارہ کے شعراء نے نعت میں جو قابلِ قدر اضافے کیے اُن میں یہ تمام عناصر اپنی جھلک دکھا رہے ہیں، درج ذیل انتخاب میں میلادنامے کو چھوڑ کر باقی موضوعات کو نمایاں کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کی گئی ہے:

میر ولی اللہ

مشعلِ راہِ جہاں میں ہوئی حکمت تیری
راہ دکھلاتی ہے ہر اک کو ہدایت تیری
شانِ مومن کو بڑھا دیتی ہے شوکت تیری
باشاہوں سے زیادہ ہوئی عزت تیری
جاں بنامِ تو فدا باد چہ شیریں لقبی
مرحبا سید مکی مدنی العربی

(یہ نعتیہ نظم مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی ہے)

نیاز سواتی

بس ایک کام یہی لا جواب کرتے ہیں
جو ہم ثنائے رسالت مآب کرتے ہیں
جو لوگ کرتے نہیں پیروی سرورِ دیں
وہ لوگ اپنی قیامت خراب کرتے ہیں

آصف ثاقب

نبی جی! دل، جگر، آنکھوں کا تارہ آپ کا ہے
مری اولاد کیا، گھر بار سارا آپ کا ہے
نظر ہو اس پہ رحمت کی، محبت کی ہمیشہ
مرے پیارے نبی! صوبہ ہزارہ آپ کا ہے
محمدؐ نام لکھا ہے ہر اک پردے پہ دل کے
ہر اک پردہ لکھائی میں شمارہ آپ کا ہے

ڈاکٹر محمد سفیان صفی

ہے گرداب کی زد میں میرا سفینہ
کرم کیجیے تاجِ دارِ مدینہ
نمازِ محبت ہے معراجِ مومن
سوئے عرش جاتا ہے الفت کا زینہ

نسیم عباسی

دنگ حسنِ کائنات پہ عقلِ سلیم ہے
آئینۂ جمالِ رسولِ کریم ہے
امن و امانِ عہدِ رسالت ہو چاہیے
عہدِ جدید کی بھی ضرورت قدیم ہے

محمد حنیف

کتنا کہیں تھا دشت کا رستہ ترے بغیر
پہنچا کہیں کوئی لبِ دریا ترے بغیر

ہارون الرشید

ساکت عقیدتوں کی سلامی قبول ہو
آنکھوں کے پانیوں کی سلامی قبول ہو

اختر رضا سلیمی

کوئی آپ سا نہیں
کیا یہ معجزہ نہیں
وقت آڑے آ گیا
ان سے مل سکا نہیں
آپ نے وہ سُن لیا
جو ابھی ہوا نہیں

احمد حسین مجاہد

گناہ گار ہوں دہلیز پہ بٹھا دیجئے
مگر حضور میری حاضری لگا دیجئے
جو مانگتے ہیں عطا کیجیے اُنھیں جنت
مہار ناقہ میرے ہاتھ میں تھما دیجئے

امتیاز الحق امتیاز

آخری منزل کو جنت کر رہا ہوں
میں محمدؐ سے محبت کر رہا ہوں
میرے دل میں نور بھرتا جا رہا ہے
اُن کے روضے کی زیارت کر رہا ہوں
اُڑ رہا ہوں امتیاز اب آسمان پہ
اُن کی قدموں میں سکونت کر رہا ہوں

جان عالم

تیرا گزر نہیں ہے کوئی پل صراط سے
اُس کی گلی ہے دیکھ ذرا احتیاط سے

اشفاق احمد آشفتہ

خدایا نہیں کوئی میرا جہاں میں
اثر بھی نہیں میری آہ و فغاں میں

میں نعتِ نبی کہہ نہیں پا رہا ہوں
روانی قلم میں نہ طاقت زباں میں
مسرت کنول

بے شک حوالہ اُس کا بڑا معتبر ہوا
سر کار کی گلی جس کا گزر ہوا
میں عاشقانِ راہِ مدینہ کی دھول ہوں
میرا نصیب دیکھو کیا اوج پر ہوا
رستم نامی

انتہائے مدعا تک آئے ہیں
آپ سے ہو کر خدا تک آئے ہیں
تا ابد روشن رہیں گے وہ چراغ
جو مدینے کی ہوا تک آئے ہیں
تاج الدین تاج

میں اُن کا پیکرِ جمال حسن و جمال کیا کھینچوں
کہ جن کو سامنے سورج بھی کم چمکتا ہے
قاضی ناصر بختیار

وہ کریں جس پر کرم سارے عطا کہتے رہے
وہ غنی سب سے بڑے ہیں بادشاہ کہتے رہے
ذاکر رحمن

یہ عطائے دستِ صنم نہیں یہ عطائے دستِ کریم ہے
کہ جو کائنات کا رہنما ہے وہ اک عرب کا یتیم ہے
کاشف بٹ

ذکرِ رسولِ پاکؐ کی محفل سجائیں ہم
آؤ کہ دل میں شمعِ محبت جلائیں ہم

درج بالا اشعار اور مضمون کا یہ حصہ محض اجمالی سا خاکہ ہے ورنہ ہزارہ میں نعتیہ روایت کو قلم بند

کرنے کے لیے ہزار ہا صفحات درکار ہیں۔ سنا ہے کہ ہزارہ یونیورسٹی کا شعبہ اردو اسی موضوع پر تحقیقی کام کرانے کا سوچ رہا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس سے زیادہ اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے! اور یہ بات میں پورے وثوق اور ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں کہ اس موضوع پر کام کرنے والے محقق کے لیے مواد کی کوئی کمی نہیں ہوگی بلکہ اُس کے لیے یہ مسئلہ ضرور بن سکتا ہے کہ اتنے زیادہ مواد کو کیونکر سمیٹا جا سکتا ہے۔ اپنے مضمون کے اختتام پر یاد آیا کہ ہزارہ کے معروف قانون دان، وکیل اور دانشور محترم مفتی ادریس صاحب اکثر و بیشتر تقاریب میں ایک مختصر نعتیہ نظم پڑھا کرتے تھے اور پھر وجد میں آ کر جھومتے بھی تھے، اُس وقت میں اُس نظم کے شاعر سے واقف نہیں تھا، بہت بعد میں جب جانِ عالم کا مجموعہ شائع ہوا تو مجھے علم ہوا کہ یہ وجد آفریں نظم تو جناب جان عالم کی ہے، ملاحظہ ہو:

مقامِ عرش سے تحت الثریٰ تک
خدائی
پھیلتے ہی پھیلتے
سمٹ کر آ گئی
غارِ حرا تک

ڈاکٹر عابد سیال

پاکستانی اردو ادب کا معاصر منظر نامہ: چند باتیں

پاکستانی اردو ادب کی داستان چھے دہائیوں سے کچھ زائد عرصے کو محیط ہے۔ ان میں سے پہلی دو تین دہائیوں کے ادب کو ناقدین نے کچھ ادوار میں تقسیم کر کے ان کی مجموعی صورت حال پر تواتر سے لکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ان ادوار اور ان کے غالب رجحانات کو دیکھنے اور پرکھنے میں بہت حد تک اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ مثلاً قیام پاکستان کے فوراً بعد کے ادب کا سب سے بڑا موضوع فسادات اور ہجرت ہیں۔ فسادات میں انسانی جانوں کے ضیاع پر اور ہجرت کے تجربے کے مختلف پہلوؤں پر ادیبوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق لکھا۔ اس رجحان کا اظہار شعر و نثر میں یکساں طور پر ہوا۔ افسانے میں منٹو، کرشن چندر،

احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین وغیرہ اور شاعری میں ناصر کاظمی، منیر نیازی وغیرہ کے ہاں اس کٹھنائی سے گزرنے کے آثار اور اس پر ردِ عمل بہت واضح اور متنوع ہیں۔ یہ رجحان تقریباً ایک دہائی تک چلا اور ابھی لکھنے والے اس کے ہنگامی اثرات سے نکل کر تقسیمِ برصغیر کو کسی قدر تفکر اور فلسفیانہ نگاہ سے دیکھنے کے قابل ہوئے ہی تھے کہ سیاسی صورت حال نے یک لخت پلٹا کھایا اور ملک میں پہلا مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ یہی وہ وقت ہے جب بیانیہ افسانہ تقریباً نصف صدی کا سفر طے کر کے اپنا عروج دیکھ چکا تھا؛ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر لکھی جانے والی مقصدی شاعری میں اپنی یکسانیت کے باعث وہ کشش باقی نہ رہی تھی؛ آزاد نظم اختر الایمان، میراجی اور راشد سے ہوتی ہوئی اپنی ہیئت اور اسلوب کو منوا چکی تھی؛ لہٰذا یہ وہ دور تھا جب لکھنے والے اس بدلی ہوئی سیاسی صورت حال کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پیچیدگی کے بیان کے لیے کسی نئے اسلوبیاتی تجربے کی راہ دیکھ رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں جب افتخار جالب اور ان کے ساتھیوں نے نئی لسانی تشکیلات کا نعرہ بلند کیا تو ان کی آواز میں آواز ملانے والے کم نہ تھے۔ نئی نظم کی تحریک شروع ہوئی، غزل میں نئے لسانی اور اسلوبیاتی پیرایوں نے راہ بنائی، اور ساتھ ہی سیاسی اور ادبی ہر دو نوع کی ضرورتوں کے اتصال سے افسانے میں علامتی اور تجریدی رجحان در آیا۔ اس اسلوب سے ابہام اور عدم ابلاغ کے مسائل پیدا ہوئے جن پر لے دے ابھی جاری تھی کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے واقعے نے ادبی مسائل کو وقتی طور پر بھلا کر قومی تشخص کی پہچان کو پہلی ترجیح بنا دیا۔ اس جنگ کے دوران ہر نقطۂ نظر رکھنے والے ادیبوں نے اپنے پاکستانی تشخص کا نہ صرف ادراک کیا بلکہ اس کا برملا اظہار بھی کیا۔ ہماری قومی ادبی زندگی میں یہ عرصہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ رجحان پاکستانی ادب کی شناخت اور اس کے خد و خال کے تعین کے سلسلے میں بہت سے مثبت ثمرات کا حامل ہو سکتا تھا اگر چند سال بعد ہی وہ المیہ پیش نہ آ جاتا جس میں ہم اپنا آدھا ملک گنوا بیٹھے۔

یہاں تک کا منظر نامہ وہ ہے جو اردو ادب کے ایک معمولی طالب علم پر بھی واضح ہے۔ لیکن اس کے بعد کے ادوار پر لکھا تو گیا تاہم اس میں نظریہ سازی کا عمل اس طرح کا نہیں رہا جیسا اس سے پہلے کے ادوار کے بارے میں تھا۔ مثلاً جو رجحانات اوپر بیان کیے گئے ہیں، ان کے علاوہ اگر تحریکوں کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی جائے تو ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق کی تحریک قیامِ پاکستان سے فوراً پہلے کی تحریکیں ہیں اور بعد کے دور میں پاکستانی ادب کی تحریک، تحریکِ ادبِ اسلامی اور جدیدیت کی تحریک کے

بارے میں وضاحت کے ساتھ لکھا ہوا ملتا ہے۔ لیکن بعد کے ادب کے بارے میں اس طرح کی نظریہ سازی کا فقدان ہے۔

ستر کی دہائی کے ادب کے بارے میں یہ شکایت بھی سننے میں آتی ہے کہ اس نے سقوطِ ڈھاکہ کے المیے پر اس طرح سے نہیں لکھا جس طرح لکھا جانا چاہیے تھا۔ یہ جتنا بڑا واقعہ تھا اس کے مقابلے میں اس کے بارے میں لکھا جانے والا ادب مقدار میں بھی کم ہے اور عظمت میں بھی۔ کسی حد تک یہ بات ٹھیک ہے۔ میرے خیال میں اس المیے کو اپنے وسیع اور گمبھیر تاثر کے ساتھ پیش کرنے والی صنف صرف ناول ہی ہو سکتا تھا۔ اور ہماری کم نصیبی کہ اس وقت تک ہمارے ہاں بعض اچھے ناولوں اور ناول نگاروں کی موجودگی کے باوجود ناول بطور صنف مرکزی دھارے کے ادب کی مقبول صنف نہیں تھا۔ فکشن کی ذیل میں ہمارے ادبی رجحانات کی نمائندگی افسانے کے سپرد تھی اور افسانے نے مقدور بھر اسے نبھایا۔ افسانے میں واقعات سے زیادہ تاثرات کا بیان ہوتا ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے نتیجے میں جغرافیائی سرحدوں کے سکڑنے سے زیادہ بڑا المیہ یہ تھا کہ اس قومی تشخص پر گہرا زخم آیا، جسے مسلمان ہونے کی حیثیت سے تقریباً ایک صدی سے اور پاکستانی ہونے کی حیثیت سے ربع صدی سے ہم سینچتے چلے آرہے تھے۔ قومی، ثقافتی اور تہذیبی شناخت کے گم ہونے کے اندیشے سر اٹھانے لگے۔ اس صورت حال کو ہمارے اس دور کے افسانے نے کمال خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ کبھی بے نام اور بے چہرہ کرداروں کے ذریعے، اور کبھی دھند اور جھٹپٹے کے استعاروں کے ذریعے۔ یہ سوالات ذہن میں کلبلا رہے تھے کہ پھر مارشل لا کا دور آگیا اور پہلے سے کہیں زیادہ سخت۔ لہٰذا جبر کے ماحول نے صورت حال کو اور بھی گمبھیر کر دیا اور اہلِ فکر و ادب کو شناخت کے اس بحران کے کسی مدبّرانہ حل کی طرف پیش قدمی کرنے کی بجائے جھنجلاہٹ اور بے یقینی کی کھائیوں کی طرف دھکیل دیا۔ لہٰذا افسانے میں عدم تکمیلیت اور عدم وضاحت کا رجحان فکری اور اسلوبیاتی دونوں حوالوں سے معاصر سماجی صورت حال کی غمازی کرتا ہے۔ اس عرصے کی نظم اور افسانہ اپنے پیرایۂ اظہار میں حیرت انگیز طور پر ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ نظم نگاری میں ایک رویہ ترقی پسند فکر کو نئے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کا ہے جسے نو ترقی پسندی کا نام دیا گیا۔ دوسرا رویہ اسلوبیاتی ندرت کی ترجیح کا ہے جس میں مصرعوں کی ساخت اور نظم کی بُنت پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس دور کی غزل خصوصی توجہ کی متقاضی ہے۔ غزل نے تہذیبی شناخت کے اس بحران کو اپنی فکری اور جذباتی وابستگیوں کے واشگاف اظہار کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی۔ لہٰذا ایک طرف

اسلامی تاریخ میں سفر کرتے ہوئے عرب و عجم سے وابستہ استعارے تخلیقات کا حصہ بنے اور دوسری طرف مقامی سورماؤں کی بہادری اور مٹی کی محبت سے خود کو وابستہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ مزاحمت اور پیکار اس دور کے ادب کی تمام اصناف میں لازمی عنصر کے طور پر موجود ہیں۔

اسّی کی دہائی کے آغاز میں انھی رجحانات کا تسلسل جاری نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاسی اور اس کے زیرِ اثر سماجی صورت حال میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی اور چیزیں ’سٹیٹس کو کی حالت میں رہیں۔ اس دہائی میں ادب کا مجموعی عمل اسلوبیاتی تجربات کو مصفّا کرنے (refinement) کا عمل ہے۔ افسانے میں علامت اور کہانی کے درمیان توازن پیدا ہوا۔ نظم میں ساٹھ کی دہائی کے بعد جو نامانوس یا کم مانوس تمثالوں کے استعمال کا رجحان در آیا تھا اس کی کھردراہٹ میں کمی آئی اور نظم کا رنگ روپ نکھرا۔ نظم کے شاعروں نے انگریزی کے توسط سے عالمی ادب سے تخلیقی استفادہ کیا اور مختلف زبانوں کی اعلیٰ شاعری کے اسلوبیاتی اور اساطیری عناصر کو اردو کے مزاج کے ساتھ گھلا ملا کر نظم کی گمبھیرتا میں اضافہ کیا۔ غزل نے گذشتہ دہائی میں استعارہ سازی کے عمل میں جو ایک میکانکی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، اس کو کم کر کے اسے غزل کی روایت میں کھپانے کی کوشش کی۔ فکشن کے حوالے سے اسّی اور نوّے کی دہائی اس لحاظ سے خاص اہمیت کی حامل ہیں کہ ان میں ناول کی تخلیق اور تنقید کی طرف خاص توجہ دی گئی اور ان دو دہائیوں میں پے در پے اچھے ناول سامنے آئے جنھوں نے اردو ادب میں اس صنف کے وقار میں اضافہ کیا۔

نوّے کی دہائی کے آغاز میں مقامی سیاسی صورت حال میں تو تبدیلی آ چکی تھی۔ لیکن اس دہائی سے عالمی سیاسی کشمکش ایک نئے دور میں داخل ہوتی ہے۔ اس دہائی سے عالمی طاقتوں کا عمل دخل، جو اس خطے میں اس سے پہلے بہت حد تک زیرِ سطح تھا، ابھر کر سطح پر آ گیا۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا تک رسائی کی آسانی نے اس عمل دخل کی تفہیم عام آدمی کے لیے ممکن بنا دی۔ فرد خود کو اپنی مملکت کا شہری سمجھنے سے زیادہ خود کو عالمی گاؤں کا باشندہ سمجھنے لگا۔ اس میں مقامی سیاسی صورت حال کی تبدیلی کے پیچھے عالمی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا ادراک ہونے لگا۔ اس کے نتائج کئی طرح سے سامنے آئے۔ مقامی سیاسی اقدامات سے عوام کا اعتبار اٹھنے لگا۔ اقتصادی صورت حال جسے ستّر اور خاص کر اسّی کی دہائی میں مصنوعی طور پر استحکام کی حالت میں رکھا گیا تھا، یک لخت اس کا توازن بگڑنے لگا اور معاشی بے یقینی نے فرد کو حال اور مستقبل کے اندیشوں میں مبتلا کر دیا۔ اس کے علاوہ اس دور میں جدید ٹیکنالوجی کی یلغار کے مضمرات پر بھی

غور کرنا چاہیے۔ یاد رہے کہ یہ ٹیکنالوجی مکینیکل نہیں بلکہ الیکٹرونکس کی ہے۔ مشین کی آمد اور صنعتی معاشرے کے قیام سے جو صورت حال پیدا ہوئی تھی، الیکٹرونکس کے نتیجے میں اس سے کہیں زیادہ گمبھیر صورت حال ہمارے سامنے ہے۔ مثال کے طور پر ایک موضوع 'تنہائی' کو لے لیجیے۔ ہمارے کلاسیکی ادب میں تنہائی کا تصور کیا ہے۔ سماجی اور معاشی کسمپرسی کی حالت، یا عشقِ مجازی کے نتیجے میں بے یارومددگار ہونے کی کیفیت جس میں کوئی پرسانِ حال نہیں، یا اس سے بلند تر سطح پر تصوف کے طفیل کائناتی تنہائی کا ماورائی تصور وغیرہ۔ صنعتی دور نے اس تصور کو بدل دیا۔ اب انسان مشین کے سامنے ہے۔ جو ساتھی ہے مگر محرم نہیں ہے۔ آپ مشین سے کام لیں مگر دل کی بات نہیں کر سکتے۔ یہ اور طرح کی تنہائی ہے۔ بیسویں صدی میں اس تنہائی پر بہت کچھ لکھا گیا۔ لیکن الیکٹرونک دور کی تنہائی اس سے کئی گنا پیچیدہ ہے۔ تصور کریں کہ ایک گھر ہے جس میں کئی کمرے ہیں۔ ہر کمرے میں ایک فرد ہے جو کمپیوٹر پر بیٹھا ہے۔ اسے خبر نہیں کہ ساتھ کے کمرے والا فرد کس حال میں ہے۔ لیکن انٹرنیٹ اور فیس بک جیسی سوشل نیٹ ورکنگ کے ذریعے وہ سینکڑوں افراد کے دکھ درد کا شریک ہے۔ اب بھی اس کا سابقہ مشین کے ساتھ ہے لیکن یہ مشین ساتھی بھی ہے اور محرم بھی۔ اپنے کمرے میں وہ تنہا ہے لیکن کمپیوٹر کے ذریعے ایک فعال محفل کا شریک ہے۔ تو کیا وہ تنہا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب اتنا سادہ نہیں۔ اسی طرح دیگر موضوعات میں بھی بدلی ہوئی سماجی صورت حال میں پیچیدگی کی ایسی سطحیں پیدا ہوئی ہیں جنھیں سمجھنا اور ان سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ آج کے ادب پر اس صورت حال کے بیان کی ذمہ داری ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے اظہار کے لیے پہلے سے موجود سانچے اور اسالیب کم پڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ اکیسویں صدی میں لکھنے والوں نے اپنی انفرادی کوششوں سے جابجا ایسے اسالیب کے ٹکڑے تلاش کیے ہیں جو اس صورت حال کے بیان میں مددگار ہیں۔ اسی الیکٹرونی ٹیکنالوجی کا ایک مثبت فیضان یہ ہے کہ اس نے دنیا بھر کے علوم وفنون پر کسی شخص یا کسی گروہ کی اجارہ داری ختم کر دی ہے۔ ہر علم کا ہر پہلو ہر آدمی کی دسترس میں ہے۔ اسے خود میں اس سے استفادے کی اہلیت پیدا کرنی ہے۔

اکیسویں صدی میں اردو ادب کے موضوعات میں بہت وسعت آئی ہے۔ اردو کے تخلیق کاروں نے نائن الیون کے بعد کی عالمی صورت حال کے اس خطے پر اثرات کے مختلف پہلوؤں کو بڑی توجہ سے دیکھا ہے۔ اپنی سیاسی اور نظریاتی وابستگیوں کا قومی اور علاقائی مفاد کے تناظر میں از سر نو جائزہ لیا ہے۔ فرد اور اجتماع دونوں کو درپیش مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ساتھ ہی شدت کے ساتھ ایک تاثر یہ

بھی ابھرتا ہے کہ فکری اور اسلوبیاتی دونوں حوالوں سے معاصر ادب انتشار کا شکار ہے۔ اس کے اجزا گراں قدر ہونے کے باوجود یک جہتی کے فقدان کا شکار ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ سمت نمائی کی یہ ذمہ داری نقاد کی ہے۔

نقاد کی بات آئی ہے تو آخر میں ایک بات نئے تنقیدی مباحث سے متعلق بھی کر لینی چاہیے۔ لیکن اس آخری بات سے پہلے یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ مندرجہ بالا سطور میں سہ دہائی کے حوالے سے جو بات کی گئی ہے وہ زیادہ تر اس دہائی کے نئے لکھنے والوں کے حوالے سے ہے۔ ہمارے بڑے لکھنے والے جو قیام پاکستان سے لے کر تا دم مرگ سہ دہائی کے ادب میں اپنا گراں قدر حصہ شامل کرتے رہے اور جن کا سایہ اب تک ہمارے سروں پر قائم ہے وہ اب تک کر رہے ہیں، ان سب کی خدمات قابلِ قدر ہیں جن کا احاطہ کرنا اس اجمالی جائزے میں ممکن نہیں۔

پچھلی تین چار دہائیوں میں کئی نظریات مغربی ادب سے اردو ادب میں آئے جن پر کئی ناقدین نے تسلسل کے ساتھ لکھا لیکن مجموعی طور پر ان کی حیثیت تنقیدی مباحث کی سطح سے بلند ہو کر کسی ایسی تحریک کی شکل میں سامنے نہیں آ سکی جس نے تخلیقی ادب کو مہمیز کیا ہو۔ ساختیات، پسِ ساختیات، ردِ تشکیل، مابعد جدیدیت اور ڈسکورس اور تھیوری کی بحثیں، انھیں پڑھیں تو مجھ جیسا کم فہم قاری محترم ناقدین کے اصرار پر ادب کی تفہیم کے سلسلے میں ان کی افادیت کا قائل ہو جانے کے باوجود کوئی ایسا نشان تلاش نہیں کر پاتا جو ادب کے تخلیقی عمل کو انگیخت کرنے یا فکری یا اسلوبیاتی کسی حوالے سے تخلیق کار کے دل میں کوئی شعلہ نہ سہی کوئی چنگاری ہی روشن کرنے کی اطلاع دیتا ہو۔ کیا تخلیق کار کو ایسی کسی تحریک یا تنقیدی بحث سے کوئی سنجیدہ دلچسپی ہو سکتی ہے جو اس کے تخلیقی عمل میں اس کی فعال رفاقت سے معذرت خواہ ہو۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے، اور ممکن ہے کہ یہ جدید ادبی نظریات کے ضمن میں میری کم علمی کا نتیجہ ہو، کہ تنقید کے یہ وسائل (tools) تخلیق کار کے بجائے قاری کی خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں تا کہ وہ پہلے سے سمجھی ہوئی باتوں کو ایک اور طریقے سے بھی سمجھ لے خواہ اس سے کوئی نیا نتیجہ برآمد نہ بھی ہو۔ شاید نیا نقاد اپنے افکار کے انتشار سے اس دور کے انتشار کا احساس دلانا چاہتا ہو۔ لیکن اس مفکر کی بات بھی یاد رکھنی چاہیے جس نے کہا تھا کہ ”لغویت پرستی اچھی چیز ہے، مگر لغویت نہیں۔“

☆☆☆☆

گفتگو وحید احمد، ڈاکٹر صلاح الدین درویش، رحمان حفیظ

مکالمہ

سوال: آپ نے اگرچہ مختلف شعری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن نظم کو آپ کا بنیادی حوالہ قرار دیا جاتا ہے یہ بتائیے کہ بطور صنف نظم کی اہمیت اور حیثیت کیا ہے۔

جواب : دیکھیے میں تو نظم کو شاعری کی سب سے بڑی اور بنیادی صنف مانتا ہوں بلکہ یہ بھی سمجھتا ہوں کہ شاعری اور نظم نے ایک ساتھ جنم لیا یعنی شاعری نے جب اپنا اظہار لفظوں میں کیا، تو جو پہلی ہیئت بنی وہ نظم

تھی، دوسری بات یہ ہے کہ نظم عالمی ادب کی سب سے اہم صنف ہے اور پوری دنیا کا مشترک سرمایہ بھی۔ تیسری بات یہ ہے کہ جتنی بھی اصنافِ سخن ہیں ان کا ماخذ بھی نظم ہے چنانچہ اہلِ فن نے بعد میں نظم کو مختلف شکلیں دے کر اصناف وضع کی ہیں لیکن ابتدائی اور بنیادی صنف نظم ہی تھی۔

سوال: غزل کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ انسان کے اندرون کی آئینہ دار ہے جب کہ نظم کے بارے میں خیال یہ ہے کہ نظم اپنا مواد خارج سے لیتی ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

جواب: مطلب یہ کہ آپ نظم اور غزل کے فرق پر گفتگو کر رہے ہیں۔ یقیناً غزل زیادہ سبجکٹیو ہوتی ہے اور نظم زیادہ آبجیکٹیو۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے، غزل ایک مخصوص تہذیبی روایت کے ساتھ جڑی ہوئی ہے، اور اساتذہ نے غزل میں سبجیکٹیوٹی کو زیادہ اہمیت دی اور یہی سبجیکٹیوٹی ہم تک پہنچی، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آج کے دور میں جو غزل لکھی جا رہی ہے اس میں شاعروں نے اپنے آپ کو سبجکٹیوٹی سے بچایا ہے اور ڈکشن کے نئے تجربے بھی کیے ہیں، نئے سے نئے مضامین باندھے ہیں اور عصری مسائل کو بھی غزل میں پیش کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ غزل کے بھی بہت سے امکانات ہیں۔ اگر یہ سمجھا جاتا ہے کہ غزل محض دروں بینی تک محدود ہے تو ایسی کوئی بات نہیں، متقدمین نے غزل کو ایک سپوکن برانڈ آف پوئٹری بنا دیا تو وہ بھی ویسی کی ویسی رہ گئی لیکن آج کے دور غزل کو ایک نئے ڈھنگ سے اور ایک بڑے تسلسل کے ساتھ زندگی کے بارے میں اور وقت کے بارے میں ایک نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے لکھا گیا ہے۔ جہاں تک نظم کا تعلق ہے، اب نظم میں بھی اتنے تجربات ہو چکے ہیں کہ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس میں عقلیت پر مبنی مضامین زیادہ شامل ہوتے ہیں، مثلاً آپ اپنی داخلی زندگی کے بارے میں، اپنی ذات کے بارے میں اور اپنی خود کلامی میں جن مسائل سے دوچار ہوتے ہیں ان سب کو نظم میں ڈھال سکتے ہیں کیونکہ نظم بہت وسعت رکھتی ہے اور اس کا کینوس بہت بڑا ہے اس میں ہر طرح کے مضامین چاہے سبجکٹیو ہوں یا آبجیکٹو سب آ جاتے ہیں۔

سوال: احمد فراز کا کہنا تھا کہ غزل لکھنا نسبتاً باسہولت ہے، چلتے پھرتے بھی کچھ نہ کچھ موزوں ہوتا ہی رہتا ہے لیکن نظم میں اپنے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی موضوعات لانے کے لیے بہت کچھ پڑھنا پڑتا ہے، اس سلسلے میں کچھ فرمائیے۔

جواب: میرا خیال ہے ایسا بھی نہیں ہے، علم و فضل اور مطالعے کی اہمیت اپنی جگہ لیکن نظم، فکر اور متخیلہ کا ایک امتزاج ہے۔ جب شاعر کسی واردات کے زیرِ اثر نظم لکھتا ہے تو ضروری نہیں کہ اس کے لیے اضافی علم

اور فضل کی ضرورت ہو۔ بسا اوقات کوئی ذاتی یا نجی واردات بھی نظموں میں در آتی ہے۔

سوال: جب آپ اپنے لیے نظم کو بطور وسیلہ اظہار منتخب کرتے ہیں تو اس ترجیح کا باعث کیا ہے۔

جواب: یہ تو میں آپ کو ٹھیک طرح سے نہیں بتا سکتا لیکن اس کا جواب شاید ڈاکٹر وحید احمد دے پائیں کیوں کہ ان کی کتاب "نظم نامہ" کی پہلی نظم کا موضوع ہی یہی ہے۔ جو پابلو نرودا کی ایک نظم کا ترجمہ ہے۔ بقول شاعر؛ نظم نے مجھے چھوا اور اس کے بعد میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا، اور تب سے چل رہا ہوں۔

سوال: آپ مجید امجد اور چند دوسری استثنائی مثالوں کی طرح نظم اور غزل دونوں پر برابر دسترس رکھتے ہیں۔ سو بتایئے گا وہ کیا رو ہوتی ہے جس میں بہتے بہتے کبھی آپ غزل لکھنا شروع کر دیتے ہیں تو کبھی نظم، یہ کیفیت کس طرح در آتی ہے؟

جواب: نظمیں میں نے کثرت سے لکھی ہیں اور غزلیں کم کم کہیں ہیں۔ زیادہ غزلیں میں نے اس زمانے میں لکھیں جب میں چین میں تھا، وہاں بڑی فراغت تھی اور وہ ایک کلچر سراؤنڈنگ مسنک تھی، جس میں، مَیں نے پوری زندگی گزاری تھی، تو جب وہاں پر میں غزل کہتا تھا تو مجھے ایک طمانیت ملتی تھی جیسے میں اپنے کلچر میں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ غزل تو میں اس طرح کہتا رہا اب کتنی اچھی غزل میں نے کہی اس کا مجھے کچھ پتہ نہیں لیکن میں نے کہی؛ اور نظم تو یوں سمجھیں کہ مجھ پر طاری رہتی ہے۔ عجیب بات ہے کہ میں نے اس نظم کا حوالہ دیا کہ جس میں شاعر کہتا ہے کہ "نظم نے مجھے چھولیا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا" تو یوں ہی مَیں بھی ایک خود کلامی میں چلا گیا اور پوری زندگی گزر گئی میں اس خود کلامی سے باہر نہیں نکلا اور اسی خود کلامی میں بہت سے مسائل، میرا اپنی ذات سے تعلق، فرد کے مسائل، فرد کا اجتماع سے تعلق، عقل و عقیدہ کے درمیان تصادم اور بے شمار دوسرے معاملات اسی خود کلامی میں چلتے رہتے ہیں، میں اپنے آپ سے مکالمہ کرتا رہتا ہوں اور کبھی کوئی غزل، کبھی کوئی نظم تخلیق ہوتی رہتی ہے۔

سوال: مشرقی اور مغربی نظم میں کیا فرق ہے؟

جواب: آج کل تو ہم عالمگیریت کے دور میں رہ رہے ہیں اور میرا خیال ہے کہ مشرقی نظم جو مشرق میں لکھی گئی اس پر مغربی نظم نے بھی اثر ڈالا ہے اور مغربی نظم نثر کے زیر اثر ہے۔ اس کے علاوہ ہم مانیں یا نہ مانیں مگر گلوبلائزیشن کے دور میں رہ رہے ہیں اس لیے مغرب کا فلسفہ، مغرب کے خیالات، اس کی ادبی تحریکیں ہم پہ زیادہ اثر انداز ہوئی ہیں۔ نظم میں جو نئے تجربے مغرب نے کیے ہیں وہ تجربے ہم نے بھی اپنی

نظم میں کسی حد تک کیے ہیں۔ مغرب کا شاعر ایک پوسٹ انڈسٹریل سٹیٹ میں رہ رہا ہے اور ایک کارپوریٹ کلچر کا حصہ ہے۔ ہم ابھی ان سے مختلف ہیں۔ اس مرحلے تک نہیں پہنچے چنانچہ ہم جو نظم لکھتے ہیں اس میں مغرب کے اثرات تو ہوتے ہیں لیکن وہ نظم ہماری زمین سے جڑی ہوئی ہے۔ مستقبل میں اگر وہ کلچر یہاں در آئے تو دونوں نظمیں ایک جیسی ہو جائیں گی۔

سوال : آپ کی نظم کا بنیادی موضوع کیا ہے؟ شاید انسان اور کائنات کا آپسی تعلق؟ یہ بھی بتایئے کہ بے شمار علمی، فکری اور تحقیقی مساعی اور صلاحیتوں اور توانائیوں کے استعمال کے باوجود کائنات کے بارے میں انسان کا تفکر ابھی ایسی سطح پر نہیں پہنچا جو اس دنیا اور خاص طور پر انسان کی بقاء کے لیے کارآمد ہو۔

جواب : اس سلسلے میں یہ کہوں گا کہ آدمی کا سفر ابھی محض چند سو صدیوں کا سفر ہے اور کائنات اتنی وسیع، قدیم پھیلی ہوئی اور پر اسرار ہے کہ ابھی انسان کو کئی ہزار صدیوں کے سفر میں سے گزرنا پڑے گا۔ اگر آدمی وہاں تک جا سکے تو شاید کائنات کے کچھ اسرار اس پر عیاں ہوں۔ دراصل آدمی کو جہاں تک پہنچنا چاہیے تھا وہ ابھی وہاں تک نہیں پہنچا اور اسے طرح طرح کے خطرات درپیش ہیں۔ یہی نارسائی نظموں کا حصہ ہے۔ انسان جس طرح ان خطرات سے نبرد آزما ہو رہا ہے، اس سے مایوسی کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے اس سلسلے میں میری کئی نظمیں ہیں، ایک نظم ہے "میں مایوس نہیں" اس کا ایک مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ میں کہیں نہ کہیں مایوس ضرور ہوں اسی لیے اس کی تردید کر رہا ہوں، اسی سلسلے میں، میں آپ کو بتاؤں کہ میرا چین کا سفر میری اس مایوسی کو ختم کرنے کے لیے کافی مددگار رہا ہے۔ میں نے وہاں پر دیکھا کہ غریب چینی اس زمانے میں (1972) چاول اور گوبھی کھاتے تھے اور اس پر مطمئن رہتے تھے۔ وہ اپنے لیے ایک نئی دنیا بنانے کا آغاز کر رہے تھے اور یہ خیال میرے ذہن میں بار بار آتا تھا کہ چین کے عوام پچھلے پانچ ہزار سال غم کے پہاڑ اٹھا کر چلتے رہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ 1912ء کے جمہوری انقلاب سے پہلے جب وہ لوگ بادشاہت یا شہنشاہیت کے زیر اثر تھے تو جب کوئی آفیشل جس کا دربار سے کوئی تعلق ہو وہ کسی قصبے یا گاؤں میں جاتا تھا تو چینی اس کے سامنے سربسجود ہو جاتے تھے اور وہ یہ عمل پانچ ہزار سال سے کر رہے تھے بعد ازاں انہی چینیوں کو دیکھ کر مجھے بار بار خیال آیا کہ آدمی میں بہت حوصلہ ہے، آدمی کے اندر آزادی کی جو چنگاری ہے وہ اسے ہارنے نہیں دیتی۔ یہ نہ بجھنے والی چنگاری ہے چنانچہ میں نے مایوس ہونا چھوڑ دیا۔

سوال : آپ کی نظم کا ایک خاص تناظر مغرب کا کارپوریٹ کلچر بھی ہے اور کیپٹل ازم بھی۔ فکری اعتبار سے

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پسماندہ اور غریب ممالک یا اقوام پر اس کے بہت برے اور منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو آپ اس کی کیا جسٹیفکیشن دیں گے۔ وہ لوگ اپنے لیے تو ٹھیک ہیں، اگر وہ یہ سب نہ کرتے تو ترقیات کی یہ سطح جو آج وہاں پر ہے جو کارپوریٹ کلچر تک پہنچ چکی ہے، وہ وہاں پر کبھی نہ ہو پاتی۔

جواب : دیکھئے میں اسے اس طرح دیکھتا ہوں کہ مغربی سامراج خصوصاً برطانیہ جس نے آدھی سے زیادہ دنیا پہ قبضہ کر رکھا تھا جب وہ پسپا ہوا تو پھر سامراج کا کیپیٹل لندن سے واشنگٹن شفٹ ہو گیا۔ اب وہ اپنے طور پر جو تجربے کر رہے ہیں، جیسے جمہوریت کا تجربہ اور لوگوں میں ایک ویلفیئر قائم کرنے کا تجربہ، وہ اپنی جگہ پر ان کے لیے درست ہے لیکن دوسری طرف انھوں نے ایک طرح کا مافیا بنایا ہے اور اسلحہ سازی کر رہے ہیں یہ اسلحہ پسماندہ ممالک میں بیچا جا رہا ہے اور اس کا ایک ہی مقصد ہے کہ وہ ان ممالک کی منڈیوں کو اپنے قبضے میں رکھیں اور ان ممالک کے کلچر پر بھی اپنی برتری قائم رکھیں اور اس طریقے سے دنیا پر حکومت کریں۔

سوال : ایسا کیوں نہیں ہو سکا کہ ہماری شاعری میں، ہماری نظم میں، آپ کی نظم میں ان مظلوم، مشہور، مقہور طبقات کے تہذیبی زوال کو چیلنج کیا جا سکے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری ابتری کی بنیادی وجہ تہذیبی و تمدنی ابتری ہے۔ ایک مثال دیتا ہوں کہ فیض کی پوری شاعری ایک طرف ہے اور اس کی ایک نظم ”کتے“ ایک طرف ہے۔ پہلی مرتبہ اس نظم میں علامتی طور پر اور فکری طور پر بھی سب کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی گئی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ پریشانیاں اور مسائل خود ہمارے پیدا کردہ ہوں، سو مغرب کو موردالزام ٹھہرانے کے بجائے مسائل کی جڑ خود اپنے اندر تلاش کریں جیسے چینیوں نے کیا۔ ہمارا یہ مطالبہ بلا جواز تو نہیں کہ مغرب اپنے آپ کو بدل لے؟ ہم کیوں نہ بدلیں، اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب : ہر کوئی چینی نہیں ہو سکتا، اور چینیوں کا اپنا ایک کلچر ہے جو دنیا سے مختلف ہی رہا ہے۔ یہ ایک الگ تھلگ تہذیب رہی ہے، اور ان کا جو ماسٹر ٹیچر ہے وہ کنفیوشس ہے جس کی پیروی بھی یہ لوگ اچھی طرح کرتے ہیں۔ تو انہوں نے جیسے ری ایکٹ کیا اور جیسے اپنے آپ کو زمین سے اٹھا کر کھڑا کیا، یہ قابل ستائش ہے۔ انھوں نے اپنا سفر چاول گوبھی سے شروع کیا لیکن اب دنیا کی بڑی معاشی قوتوں میں ان کا شمار ہونے لگا ہے۔ یہ مادی سطح پر ان کی فتوحات ہیں۔ اب آتے ہیں آپ کے سوال کے دوسرے حصے کی طرف۔ آپ نے درست کہا ہے کہ ہم ایک طرف تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے ذمہ دار ہم ہیں لیکن دوسری طرف صورت یہ ہے کہ یہ دنیا کئی صدیوں سے عقلیت پسندی کے دور میں داخل ہو چکی ہے۔ عقلیت پسندی کے اس دور میں

مغربی اقوام نے بے حد ترقی کی ہے اور بہت آگے نکل گئے ہیں۔ انہوں نے ایسے طریقے یا وسیلے بھی ڈھونڈے ہیں جن کے ذریعے وہ ان پسماندہ ممالک کو جو کہ ابھی عقلیت پسندی کے دور میں داخل بھی نہیں ہوئے اپنے زیرِ اثر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا کوئی پروگرام کامیاب ہو ہی نہیں سکا۔ یہ ایک جبریت کی قسم ہے یعنی تاریخ کا جبر۔

سوال : اچھا آپ کے مجوزہ انکار کی کیا نوعیت ہے؟ اس کے مقابلے میں کیا انحراف ممکن ہے؟

جواب : میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس جبریت کا ایک ہی علاج ہے کہ ہم خود اس عقلیت پسندی کے دور میں داخل ہوں اور اس مقام تک پہنچنے کی کوشش کریں، جہاں مغربی اقوام پہلے سے پہنچ چکی ہیں، جیسے چینی کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ باوجود اس حقیقت کے کہ ان کے پاس اتنے پیچ موجود ہیں کہ وہ ہمیں کبھی اس فریب کی صورتِ حال سے نکلنے ہی نہیں دیں گے۔

سوال : ہمارے پاس قدرتی ذخائر موجود ہیں، تیل ہے گیس ہے کوئلہ ہے، لیکن ہمارے پاس ان کے حصول اور استعمال کی ٹیکنالوجی نہیں ہے۔ ہم مغرب سے ٹیکنالوجی لے کر ہی یہ چیزیں نکال کر استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ بھی ایک جبریّت ہے؟

جواب: جب ٹیکنالوجی آتی ہے تو اس کے ساتھ بہت کچھ اور بھی آتا ہے۔ اس لیے ہم اس چنگل سے نکل ہی نہیں سکتے۔ جب تک کہ ہم خود اس دور میں داخل نہیں ہوتے۔

سوال: لیکن اس کے لیے درکار وسائل کی دستیابی ہی تو اصل مسئلہ ہے؟

جواب : درست۔ لیکن اگر ہم یہ کوشش شروع ہی نہیں کرتے تو ہم وہیں پر کھڑے رہیں گے جہاں پر اب ہیں۔

سوال : اب آتے ہیں آپ کی تخلیقات کی طرف۔ آپ کی نظم "زید سے مکالمہ" میں آپ کچھ انتہاؤں کو سمجھنے کی کوشش میں دکھائی دیتے ہیں۔ نظم کے پس منظر میں ایک طرف تعقلات کا، سائنسی حاصلات کا اور اس کے نتیجے میں ایک عالمی تمدن میں تبدیلی کا معاملہ ہے۔ دوسری طرف ہمارے عقائد ہیں، ہماری تہذیبی نسلی اور قومی شناختیں ہیں۔ ان سب کے تناظر میں آپ زید سے کچھ پوچھنا چاہ رہے ہیں۔ اس سے سوالات کر رہے ہیں لیکن جوابات میں میرا خیال ہے کہ تشکیک ابھرتی ہے! کیا آپ کے نزدیک اتنا کافی نہیں تھا کہ آپ خالصتاً ایک سیکولر انسان کے طور پر چیزوں کو دیکھتے اور ان کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتے، عقائد

کے ایک ریفرنس یا ڈومین میں آپ نے جانا کیوں ضروری سمجھا، کیا تعقلات کی دنیا کافی نہیں تھی؟

جواب : ابھی میں ناصر عباس نیرّ کا فیض کے بارے میں ایک مضمون پڑھ رہا تھا، اس میں مجھے کچھ اچھی باتیں ملیں۔ مثلاً یہ کہ فیض نے مولانا حالی کی اس نظم کو قبول نہیں کیا جو مغربی تہذیب سے مطابقت رکھتی تھی بلکہ فیض نے اپنی کلاسیکی شعری روایات سے استفادہ کیا اور وحدت الوجودی سطح پر ایک نئے انداز میں ایک نئے اسلوب کے ساتھ پیش کیا، تو یہ فیض کا ایک ایسا رویہ تھا جو اسے اس شاعری سے بالاتر کرتا ہے، جس میں سمجھوتے کی شکل ملتی ہے۔ میرا بھی معاملہ اس سے ملتا جلتا ہے آپ ایک ایسے کلچر میں رہ رہے ہیں جس میں عقل کی کلیشے بھی موجود ہے۔ آپ ایک طویل سفر سے گزر رہے ہیں جس میں بہت سی چیزیں آپ کو اپنی تہذیب، اپنے تمدن اور اپنے ماضی سے بھی جوڑتی ہیں اور بہت سی چیزیں آپ کو ترغیب دیتی ہیں کہ آپ ان سے بغاوت کریں۔ تخلیقی سفر میں ان سوالات کا سامنا کرنا ایک فطری سی بات ہے اور اس عمل میں سے آپ کو گزرنا پڑتا ہے، یہ ایک ایسا تجربہ ہوتا ہے کہ جس میں آپ اپنے آپ کو ایک نفسیاتی تناظر میں چیزوں کو دیکھتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں۔ یہاں شاعری بہر حال فیصلہ کُن عمل نہیں ہوتی۔

سوال : آپ کی زندگی میں ہی ادب کی کئی مقامی تحریکیں سامنے آئیں اور ختم ہوئیں۔ ایک آدھا ابھی تک چل رہی ہے۔ انہی میں سے ایک لسانی تشکیلات کی بھی ہے جس کا بہت چرچا ہوا۔ اس زمانے میں، اس میں ہمارے کچھ لوگوں نے بہت محنت کی، آپ کے سامنے اس پر بہت لکھا۔ اس وقت بھی آپ ایک اہم شاعر تھے، اس کے بعد ابھی بہت وقت گزر چکا ہے، زبان کی تھوڑ پھوڑ یا اس میں کچھ تحریفات یا تفریقات کے کچھ نئے انداز بھی سامنے آ گئے ہیں، اب تو گزشتہ عشرے دو عشرے میں نئے کلچر اور عالمگیریت کا بھی چرچا ہے۔ کیا یہ تاثر درست ہے کہ آپ اس تمام مہم جوئی سے علیحدہ رہے ہیں۔ کیا یہ آپ کا شعوری عمل تھا، اس کے نقصانات یا فوائد کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب : میرا خیال ہے کہ لسانی تشکیلات کا دور اگرچہ اس پر بہت کم بات کی جاتی ہے، ایک اہم دور تھا اور اسی دور میں مغرب کی تحریکیں ہمارے ادیبوں پر اثر انداز ہوئیں اور ان ادبی تحریکوں کے زیر اثر انہوں نے نیا ادب تخلیق کیا۔ ایک طرف یہ ترقی پسندی کا دور تھا اور دوسری طرف اس کے خلاف ایک ردعمل بھی تھا۔ پہلے تو میں ترقی پسند ادب سے متاثر ہوا۔ یہ میری جوانی کا دور تھا اور میں ابھی کالج میں پڑھتا تھا اور ترقی پسند شاعری اپنے عروج پر تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ میں خود ترقی پسند شاعری کر نہیں سکا، میں شاید اگلی جنریشن

کا نہیں تھا اور جب لسانی تشکیلات کا دور شروع ہوا تو میں اس دور سے بھی متاثر ہوا، اور مغربی ادب کی تحریکوں کے بارے میں توجہ سے پڑھا، انھیں غور سے سمجھا لیکن میرا اپنے دور کی چلتی ہوئی زندگی کے ساتھ ایک مضبوط رابطہ رہا، اگر کوئی بھی تحریک آپ کے مقامی، سماجی اور تخلیقی مسائل کا حل نہیں دے پاتی تو وہ شاعر کے لیے بے کار ہے، اگر کوئی زبردستی اس تحریک کو اپنی تخلیق میں لے کر آتا ہے تو یہ ایک طرح کی صنعت کاری ہوگی۔ تو وہی تحریکیں کامیاب ہوتی ہیں جو آپ کے زمینی مسائل کے ساتھ جڑی ہوتی ہوں یا ان کا اظہار کر سکتی ہوں، میں انہی تحریکوں کا حصہ ضرور رہا مگر محدود سطح تک۔ مثلاً جب مابعد جدیدیت کے تجربے کیے گئے، میں نے اپنے آپ کو صرف جدیدیت کی حد تک محدود رکھا۔

سوال : اب پھر زبانوں میں تحریف کا عمل شروع ہے، سٹرکچر کی سطح پر بھی اور لغت کی سطح پر بھی اس کی بڑی وجہ بہت زیادہ بین الاقوامی تعامل ہے۔ شاید آپ کے نوٹس میں ہوگا کہ گزشتہ عشرے دو عشرے میں جو ہماری نئی نسل ابھی 20 سے 30 سال کے درمیان ہے، وہ بہت زیادہ عمل کے لیے بھی اور تفریح کے لیے بھی ویب اور انٹرنیٹ پر انحصار کرنے لگی ہے۔ لائبریری کلچر اور کتاب سے تعلق تو ویسے ہی ختم ہو رہا تھا لیکن یہ علم کی تحصیل کی ایک نئی صورت سامنے آ گئی ہے کہ وہی کتابیں اب انٹرنیٹ پر آپ کو بصورت ٹیکسٹ دستیاب ہیں اور نئے لوگ ان سے ایک نئے انداز میں استفادہ کرنے لگے ہیں، کتاب تو زندہ ہے لیکن تعامل کی وجہ سے مقامی یا چھوٹی زبانوں کو خطرات درپیش آ گئے ہیں، ساقی فاروقی صاحب نے لندن میں بی بی سی کے ایک پروگرام میں کہا تھا کہ میں اسی پروگرام میں اردو کے لیے تعزیت بھی کر دیتا ہوں کہ یہ ختم ہی ہو جائے گی باقی دنیا کو دیکھیں تو فرانسیسی جو انگریزی سے نفرت کرتے تھے اب آپس میں بھی انگریزی میں بات کرنے لگے ہیں تو کیا یہ ایک علامت ہے کہ باقی زبانیں ختم ہو جائیں گی؟ اس نظریے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب : دیکھیے یہ باہمی میل جول کا عمل ہے جو مسلسل جاری ہے اور ہم اسے روک نہیں سکتے، انٹرنیٹ کی طرف پوری انسانی آبادی رجوع کر رہی ہے اور پوری انسانی آبادی عالمگیریت کا حصہ بھی بنتی جا رہی ہے، ہم اس کی کوئی پیش بندی نہیں کر سکتے کہ کون سی زبان مٹ جائے گی اور کون سی زباں رہے گی، ہم اس کی بھی کوئی پیش بندی نہیں کر سکتے کہ کون سا میوزک رہ جائے گا اور کونسا میوزک ختم ہو جائے گا۔ باہمی میل جول کے اس عمل کے بعد شاید ایک نیا معاشرہ وجود میں آئے گا اور یہ دنیا جو بہت قریب آ چکی ہے، شاید اور زیادہ قریب آ

جائے۔

سوال : عالم گیریت سے مفر تو ممکن نہیں مگر آپ کے ہاں اس کے خلاف مزاحمت اور ردِعمل کا پیغام ملتا ہے، اس کی وضاحت کیجیے۔

جواب : میرا خیال ہے کہ آپ کا ریفرنس ایک خاص نظم کی طرف ہے، تو اس میں اگر میں نے ردِعمل یا مزاحمت کی دعوت دی ہے تو یہ اس لیے کہ نئی تہذیب انسانوں کو نا انسان بنانے کے راستے پر چل رہی ہے، میڈیا خاص طور پر مغربی میڈیا جو بہت ہی زیادہ مضبوط ہے اس کی باقاعدہ پلاننگ ہوتی ہے کہ وہ مخصوص کلچر کو پروموٹ کرے، اپنے نظریات کی تشہیر کرے گویا انسانی ذہنوں کو ٹیکنالوجی کے ذریعے روبوٹ بنانے کی شعوری کوشش کی جارہی ہے۔ میرا احتجاج اس کے خلاف ہے۔ شخصی آزادی کے نام پر جو کچھ فراہم کیا جارہا ہے اس کے پیچھے کارفرما ڈیٹا ایکول ہے، مطلب انسانوں کو روبوٹ بنایا جارہا ہے۔

سوال : ہیلمن ٹاکر کی ایک کتاب آئی تھی " جنگ اور صرف جنگ" جو امریکی جنگی حکمتِ عملی کی آئینہ دار ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑے بڑے ہتھیاروں سے لے کر کیمیاوی اور جینیاتی جنگ تک ان کا ایک پورا پروگرام ہے، اور اس نے بتایا ہے کہ کس طریقے سے امریکہ کی سالمیت کے لیے دنیا کو بعض خطوط پر چلانے کی کوشش کی جارہی ہے، آپ کی نظموں کا موضوع یہ بھی ہے سو یہ بتائیے کہ اس کے بچاؤ کا راستہ کیا ہے؟ اُن کے پاس تو بہت ہائی فائٹ ٹیکنالوجی ہے جسے وہ بروئے کار لارہے ہیں اور دوسرے طرف ہم ہیں جو تیسری دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔

جواب : ابتدائی طور پر تو میں یہی کہوں گا کہ ہم اگر اور کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم احتجاج تو کر ہی سکتے ہیں۔ دیکھیے یہ ایک بہت بڑی سازش ہے کہ تمام انسانوں کو روبوٹس بنا دیا جائے اور پھر جس طرح چاہے ان پر حکومت کی جائے اور ان کو استعمال کیا جائے۔ اس کا حتمی علاج تو بہر حال وہی ہے کہ ہمیں بھی ایج آف ریجن میں داخل ہونا ہوگا۔

سوال : ہمارے یہاں مراجعت کی بات بھی ہوتی رہتی ہے، اپنی تہذیب وتمدن، اخلاق اور مذہبی تعلیمات کی طرف مراجعت، اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب : مسئلہ یہاں پر فارمل ازم کا بھی ہے، کہ ہم صرف شخصی سطح پر نمائشی طور پر مذہب کا پرچار کرتے ہیں، ہم مذہب کی روح کو سمجھتے ہی نہیں ہیں، اگر مذہب کا مرکز وانسان ہے اور ایک انسان کو جب اس طرح

کے مسائل درپیش ہو جائیں تو وہ کیا کرے گا۔ یہ بنیادی سوال ہے۔

سوال : مذہب بہر حال شناخت فراہم کرتا ہے، شناخت بہر حال اتفاق پیدا کرتی ہے، اتفاق بہر حال آپ کو دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اب بھی مذہب کا کوئی مثبت کردار ہو سکتا ہے؟ میں مزید آسان کر دیتا ہوں کہ ایکسٹریا زم، بیالوجی، ٹپالوجی وغیرہ وغیرہ، ان سے کسی کی شناخت نہیں ہے، یہ ساری دنیا کے لیے قابل قبول ہیں، ساری دنیا ان سے فیض پا رہی ہے، لیکن جب ایک مخصوص مذہب کی، مسلک کی بات کرتا ہوں تو آخر کار وہی شناخت آپ کو متشدد انسان بنانے میں بھی کامیاب ہو سکتی ہے۔

جواب : یہ سوال خاصا نازک بھی ہے اور پیچیدہ بھی ہے، میرا خیال ہے کہ یہ متشددانہ رویہ جو ہے، یہ مذہبی رسوم و قیود کی بالادستی کی شکل ہے، اگر مذہب کی روح کو اجاگر کیا جا سکے تو پھر شاید یہ تشدد روا داری میں بدل سکتا ہے، تشدد مذہب کی روح نہیں ہے، تو اب اس کا ایک ہی علاج ہے کہ ہم وقت کے بارے میں اپنا تصور بدلیں، ہم اتنے متشدد نہ ہو جائیں کہ ہم کہیں کہ آج ہی کے وقت میں، آج ہی کے سال میں ہم اپنا نظام یہاں پر قائم کر سکیں گے، پوری دنیا میں جو ایک نظام چل رہا ہے آپ کو اس کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔

سوال : پوری دنیا میں جگہ جگہ پوشیدہ اور ظاہری جنگیں جاری ہیں، ان جنگوں میں ایک فریق ہر جگہ ایک ہی ہے، وہی استحصال کرنے والا، وہی سامراج! ایسی صورت حال بھی ہے کہ پسماندہ علاقے میں پانی کے پمپوں کے لیے پیسے بھی بھجوائے جاتے ہیں اور اسی گاؤں میں بمباری کر کے ایک دہشت گرد کو مارنے کے لیے کئی عام بندوں کو بھی مار دیا جاتا ہے۔ یورپ میں تو مذہب کا عمل دخل بھی بہت کم ہے، تو یہ جو مذہب کو نہ ماننے والے بھی ہیں ان کا رویہ بھی کوئی کم متشددانہ نہیں ہے، بلکہ وہ کچھ زیادہ ہی متشددانہ ہیں۔

جواب : ہم تو کمزور لوگ ہیں، ناتواں لوگ ہیں اور ہمیں تو نام کی آزادی ملی ہے۔ اب بھی وہ لوگ ہی بالادست ہیں، جن کا ذکر آپ نے کیا ہے۔ آپ اگر ان کے جرائم گننا شروع کر دیں تو اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ اب تشدد کا رویہ جو ہمارے ہاں جنم لیتا ہے اس کی بنیادی وجہ ایک آدمی کی فردیت ہے، کہ میں ایک فرد کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتا ہوں، میں ایک فرد ہوں اور میری اپنی آزادیاں ہیں، آپ میری آزادیوں کو چھین رہے ہیں، اور پھر وہی بات کہ آپ مجھے روبوٹ بنانا چاہتے ہیں، اس سے پہلے کہ میں روبوٹ بنوں، میرے تشدد کا رویہ اختیار کرنے کے امکانات تو رہیں گے۔ میرا خیال ہے کہ ہم ایک ایسے تاریخی موڑ پر پہنچے ہوئے ہیں جہاں پر ہم خود یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ ہمیں کیا کرنا ہے، بلکہ دوسروں نے جو فیصلے کر رکھے ہیں

ہم انھیں ماننے پر مجبور ہیں ہم نہ تو اتحاد ہے، نہ ہماری کوئی پالیسی ہے اور نہ کوئی پروگرام۔ بس ایک ردعمل ہے جس کا ہم اظہار کرتے رہتے ہیں۔

سوال : لینن ازم (تھیوری)، مارکسزم (پریکٹس) اور زرعی اطلاق (ماؤ) کے حوالے سے بتایئے کہ مارکسزم کو نظریے اور عمل کے حوالے سے کیسا پاتے ہیں؟

جواب : ترقی پسندی ایک اہم تحریک تھی جو مارکسی فکر کے زیرِ اثر سامنے آئی، میں نے اِسے خوش خبری جانا کیونکہ یہ ایک خواب، ایک آدرش لے کر آئی تھی۔ یعنی ظلم سہنے والوں سے ہمدردی۔ یہ 1955 سے 1965 کا دور تھا، جب مارکسزم کو ایک عملی تھیوری کے طور پر اپنایا گیا۔ افسانہ نگاروں، نقادوں اور شاعروں نے اس کا استعمال کیا۔ مگر جب میں عملی زندگی میں آگے بڑھا تو اور سوال درپیش ہوئے جو کہ معاشرتی یا تاریخی سوالات کے علاوہ تھے۔ ایک سطح پر مغرب کی وجودیت کی تحریک نے مجھے بہت متاثر کیا کیونکہ اس نے عقلیت پسندی کے بارے میں تحفظات کا اظہار کیا کہ یہ پورے آدمی کو بیان کرتی ہے۔ اس کے علاوہ وجودیت نے بھی مجھے متاثر کیا۔ شخصی آزادی مجھے ہمیشہ متاثر کرتی آئی ہے شاید اس کی وجہ گھریلو ماحول کی سختی تھی تاہم جب میں گھر کی محدودیت اور پھر نظریے کی محدودیت سے باہر آیا تو مجھے سمجھ آئی کہ لامحدود آزادی بھی بُری ہے۔ مارکسی تھیوری میں خرابی یہ تھی کہ اس کے تصورات کے مطابق جہاں سرمایہ داریت آئے گی وہاں انقلاب آئے گا مگر حقیقتاً ایسا نہ ہو سکا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مارکسزم سامراج کے خلاف ایک ردِعمل تھا۔ اس تحریک کا بڑا محرک شعور کی بیداری ہے۔

سوال : کیا شاعر بنیادی طور پر وجودی ہے؟

جواب : میں بعض لمحات میں بہ یک وقت مذہبی بھی ہوتا ہوں اور مارکسی بھی۔ پوری کمٹمنٹ ممکن نہیں ہے۔

سوال : ”فرداژاد“ کے حوالے سے بتایئے کہ سوالات کے یہ بے انت سلسلے کیا نتائج کی طرف جانے سے روکتے ہیں؟ اور نظریات کی یہ رنگارنگی کیا ہے؟

جواب : میں نے جیسا سمجھا ویسا لکھ دیا۔ اسے کسی ایک نظریے سے سمجھنا مشکل ہے۔ اس میں سوالات بھی ہیں اور کئی سوالات اب تک تشنۂ جواب ہیں۔ میری تاریخ مختصر بھی ہے اور جبر کا شکار بھی۔ آگے کا پھیلاؤ

سوال : تعلیمی نظام کی مختلف سطحیں کیوں ہیں؟ کیا ایک سطح ممکن ہے؟

جواب : بالکل ممکن ہے۔ جیسے چین میں ایک مساوی نظامِ تعلیم ہے۔ ہمارے ہاں انگریزی کی بالادستی کا

مسئلہ ہے۔ مادری زبان میں تعلیم دی جائے تو سب مسائل حل ہو جائیں۔

سوال : نظریات اور سوچوں کے تنوع کے اس دور میں یکساں نظامِ تعلیم چل سکے گا؟

جواب : نظامِ تعلیم کی یکسانی قومی مفاد میں ہے۔

سوال : دورِ حاضر میں دنیا کو صرف فکشن متاثر کر رہا ہے۔ یہ جو اتنی زیادہ شاعری ہو رہی ہے اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب : ایسا نہیں ہے۔ شاعری نے نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر دور، ہر وقت کا ادب Waste Land کی طرح عظیم نہیں ہوتا۔ فکشن کی ضرورت اپنی جگہ پر ہے اور شاعری کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے۔

سوال : آپ نے کتابوں پر بے شمار تقریظات لکھیں، اِکا دُکا تنقیدی مضامین بھی لکھے مگر آپ باقاعدہ تنقیدی میدان کی طرف نہیں آئے۔ اس کی وجہ؟

جواب : صرف تساہل ____ اور کچھ نہیں۔

سوال : آپ کے ادبی سفر کی ابتدا کیسی تھی؟

جواب : میں نے میٹرک جہلم سے کیا۔ بعد ازیں 1952-53 میں اصغر مال کالج راولپنڈی میں آ گیا۔ یہاں نثر لکھنے کی جانب راغب ہوا۔ ایک بار میرا ایک مضمون میرے استاد ڈاکٹر صفدر حسین کو بہت پسند آ گیا۔ انھوں نے اسے اخبار میں چھپوا دیا۔ مضمون کا عنوان تھا ''اقبال کا مردِ مومن''۔ پھر مجلہ کوہسار کا پہلا طالب علم مدیر بنا دیا گیا۔ ان دنوں ہم اقبال کو بہت پڑھتے تھے۔ پڑھتے تو اختر شیرانی کو بھی تھے مگر چھپ چھپ کر۔ بعد ازیں پروفیسر رفیق محمود اور پروفیسر اکرام الحق کے ذریعے ''ماورا'' اور ''دستِ صبا'' پڑھیں تو ادب کے نئے زاویوں کی جانب متوجہ ہوئے۔ تب سے یہ سفر جاری ہے۔

سوال : راولپنڈی اسلام آباد کو شہرِ نظم کہا جانے لگا ہے؟ کیا یہ صحیح ہے؟

جواب : بالکل۔ یہاں بہت عمدہ نظم کہنے والے کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ سب نام تو مجھے یاد نہیں آ سکتے تاہم فوری طور پر نصیر احمد ناصر، انوار فطرت، علی محمد فرشی، وحید احمد کے نام ذہن میں آتے ہیں۔ اس کے بعد سعید احمد، ارشد معراج، روش ندیم اور کتنے ہی دوسرے نوجوان اس سلسلے سے وابستہ ہیں۔ بلا شبہ یہ شہرِ نظم ہے۔

سوال : کیا آپ نظم نگاروں کے لیے کوئی پیغام دیں گے؟

جواب : نظم خود شاعر کو اپنا پیغام دیتی ہے۔ ایذرا پاؤنڈ نے کہا تھا کہ ایک جدید شاعر کو ہم چاہیں بھی تو مابعد جدیدت نہیں بنا سکتے۔ ہم نے اپنے دور میں جو لکھا سو لکھا۔ آنے والا خود اپنا لکھے گا۔ عصری حسیت زندہ رہے گی تو نئی شاعری وجود میں آتی رہے گی۔ ہماری نظم نے حالی اور نظیر سے لے کے ایک طویل سفر طے کیا ہے اور اس کی منزل بہت آگے ہے۔ ماضی کی ایک موضوعی منظومات کے مقابلے میں آج کی نظم مضامین کی بوقلمونی کا شاہکار بنتی جا رہی ہیں اور جلد عالمی ادب کا حصہ بھی بن جائیں گی۔

سوال : اس کی وجہ لیڈر شپ کی کمی تو نہیں ہے؟

جواب : نہیں۔ میرا خیال ہے کہ لیڈر شپ کی کمی نہیں ہے۔

سوال : آپ نے آج کے ادب میں بڑے سوال کی عدم موجودگی کا معاملہ بھی اٹھایا تھا۔ اس کی کچھ وضاحت کرنا پسند کریں گے۔

جواب : جی، اس سلسلے میں مَیں یہ کہوں گا کہ ہم نے آج بڑے موضوعات کو عاق کر دیا ہے۔ ہم کہانی میں بھی نفسیاتی کیفیات پر لکھ رہے ہیں۔ دوسری جانب شاعری میں سیاسی مداخلت ہونے کا ڈر پیدا ہو گیا ہے۔ اسی سے ادب مجروح ہو رہا ہے۔ خصوصاً شاعری ایک ہی ڈگر پر چل نکلی ہے۔ اس میں موضوعیت بہت زیادہ ہے۔ اس میں کہیں نہ کہیں معروضیت کو بھی شامل ہونا چاہیے۔ ہمیں بطور ادیب معاشرے اور انسانیت کے ساتھ منسلک ہو کر رہنا چاہیے۔ ادب زندگی سے کٹ کر اپنی حیثیت کھو دیتا ہے۔ دانشور اور لکھاری معاشرے سے نہ کٹیں تب ہی مرو یا مارو قسم کی صورت حال میں ایک ادبی گواہی یا شہادت فراہم کر سکتے ہیں۔

☆☆☆☆

آفتاب اقبال شمیم

نظم کے ساتھ

ابتدائی تعلیم کے مرحلے سے گزرنے کے بعد جب میں اپنے آبائی قصبے سے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے راولپنڈی شہر میں وارد ہوا تو میرے لیے یہ ایک بڑا شہر تھا۔ اگر آج کے راولپنڈی شہر سے اس شہر کا موازنہ کروں تو وہ شہر اِس آج کے شہر کے ایک قصبے سے بڑا نہیں تھا۔ اصغر مال سے لے کر لال کڑتی اور ۲۲ نمبر چونگی تک پھیلا ہوا۔ ہم یار دوست آوارہ گردی کی موج میں آ کر یہی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اسے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک پیدل یا سائیکلوں پر پار کر لیا کرتے تھے۔ اب تو بس ایک یاد ہی رہ گئی ہے اُن اوراقِ مصور کی، اُن آراستہ اور رنگین تانگوں کی گھنٹیوں اور ٹاپوں کی، امان اور دوست داری کی فضا کی ایک یاد ہی رہ گئی ہے۔ کثرت سے اکائی کی نمود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ یہاں مارگلہ کی پہاڑیوں کے دامن میں دیہاتوں کا ایک جھرمٹ ہوا کرتا تھا۔ گاؤں ہی گاؤں، کھیت ہی کھیت، فصلیں ہی فصلیں۔ ہمارا میٹرو پولیٹن سٹی اسلام آباد انہی دیہاتوں کی کثرت سے اکائی بن کر ابھرا ہے۔ یہ شہروں کا شہر جو کچھ عرصہ پہلے تک ایک نا شہر تھا اور جو ٹیکسلا کی قدیم راجدھانی کے بالکل متوازی خطے میں بسایا گیا ہے، کبھی کبھی مجھے سوچنے پر اکساتا ہے کہ کیا تمام بڑے شہر عارضی نمود کی ایک ہی فالٹ لائن پر واقع ہوتے ہیں؟

میں اصغر مال کالج میں سالِ دوم کا طالب علم تھا جب پروفیسر ڈاکٹر صفدر حسین نے مجھے کالج میگزین 'کوہسار' کا پہلا اسٹوڈنٹ ایڈیٹر نامزد کیا۔ یوں میں اپنے اساتذہ کی توجہ میں آ گیا۔ میرے دو اساتذہ پروفیسر رفیق محمود اور پروفیسر اکرام الحق نے مجھے دو کتابیں دیں اور خواہش ظاہر کی کہ میں پڑھ کر بتاؤں اور اُن سے بحث کروں کہ اِن میں سے کون سی کتاب کی شاعری بہتر ہے۔ ان میں سے ایک 'دستِ صبا' اور دوسری 'ماورا' تھی۔ اب میں سوچتا ہوں کہ میرے ادبی اور تخلیقی سفر کا آغاز اسی دن سے ہوا تھا۔ میں اپنے آبائی گھر سے علامہ اقبال کے مردِ مومن کا دھندلا سا تصور اور اختر شیرانی کی عذرا و سلمیٰ، ریحانہ کی رومانیت کی خوشبو لے کر چلا تھا۔ اُس وقت میری عمر یہی کوئی سولہ سترہ برس کی تھی۔ دستِ صبا اور ماورا کے مطالعے کے دوران میں اپنے مساموں تک ایک بالکل مختلف اور نئے شعری تجربے سے شرابور ہو گیا۔

ان دو شاعروں کے ساتھ ایک فطری اور فوری رابطہ اور ریلے وینس کا احساس ہوا اور میں اقبال اور اختر شیرانی کے حصار سے نکل آیا۔ پیشرؤں کا تقدم اور ادبی مقام اپنی جگہ لیکن ہر نئے آنے والے شاعر کو اپنے عصر کی رائجہ شعریات کے حوالے سے ہی اپنی تخلیقی جہتیں دریافت کرنی پڑتی ہیں۔ مجھے فیض اور راشد اپنے ہم عصر لگے۔ اُن کی فکریات، داخلی و خارجی مسائل اور طرزِ احساس نے مجھے باور کرایا کہ ایک ہی عصر میں رہنے

والے شاعر ایک ہی ایج گروپ کے ہوتے ہیں۔ ان کا تخلیقی عمل اور داخلی مکالمہ ان کی عصریت اور عصری طرزِ حسیت کا محتاج ہوتا ہے۔ اور عصریت ہی وہ لازمہ ہے جو روایت کے تسلسل کو برقرار رکھتا ہے۔ راشد کی شاعری میں فکری سطح پر اپنے عہد کی ناآسودگیوں کا ادراک، اچانک کوئی سوال پیدا کر کے قاری کو مضطرب کر دینے کا رجحان (خدا کا جنازہ لیے جا رہے ہیں فرشتے) اور تاریخ کی جبریت کا احساس (اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے)۔ اسی طرح فیض کی شاعری میں مظلوم و محکوم کے ساتھ یک جہتی، عالمی سطح پر استعمار سے آزادی کی جدوجہد کرنے والے ایشیائی، افریقی اور لاطینی امریکی ممالک کی حمایت اور حُسن و انقلاب کو ایک ہی شعری مرقعے میں سمونے کی جمالیاتی کاوش۔۔۔ ان دو کتابوں یعنی ’دستِ صبا‘ اور ’ماورا‘ نے ایک ہی لپیٹ میں مجھے اوائل عمر میں ہی ایک جدید اور باشعور عالمی شہری بنا دیا اور میں پوری سنجیدگی کے ساتھ نظم لکھنے کی طرف مائل ہو گیا۔ میں ان دونوں شاعروں کا ممنون ہوں کہ مجھے اپنی پہچان کے سفر میں انہوں نے اپنی اپنی نوع کا زادِ سفر بہم پہنچایا۔ میں اپنے آغاز میں ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوا۔ اس اعتبار سے اب بھی ترقی پسند ہوں کہ عام لوگوں کو زندگی کا اصل نمائندہ سمجھتا ہوں اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اُن کے دکھوں کا مداوا ہو سکتا ہے۔ لیکن میں ایسا ترقی پسند ہوں جو ادب میں جمال پسندی یا ادب برائے ادب (آرٹ فار آرٹس سیک) کی اہمیت کو بھی سمجھتا ہے۔ اگر ادب یا شاعری میں سے احساسِ جمال کا یہ عنصر خارج کر دیا جائے تو گنجینۂ معنی بے طلسم ہو جائے اور شاعری نثر کے ملبے کا ڈھیر بن جائے۔ ریاستی اقتدار میں آئی ہوئی ایسی شاعری میں نے بہت پڑھی ہے۔ جسے پڑھ کر میرا بار میرے اندر کا فرد زخمی ہوا ہے۔

جب میں نے نظم لکھنی شروع کی تو اُس وقت اور اُس سے پہلے بھی نظم عام طور پر یک موضوعی ہوا کرتی تھی۔ اپنے عنوانات کی اطاعت کرتے ہوئے اُس کی سیدھ میں چلتی تھی، اختصار کے بجائے تفصیل پسند تھی، اِبہام سے قصداً گریز کرتی تھی، تشبیہ و استعارہ و تمثال سے زیباوارتی آرائش کا کام لیتی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس پر غزل کے ڈکشن اور طریقۂ واردات کی چھاپ صاف دکھائی دیتی تھی۔ یہاں تک کہ خود راشد کی پہلی تین کتابوں میں غزل کی گونج بہت نمایاں ہے۔ لیکن اب یہ سینا ریو یکسر بدل گیا ہے۔ نئی نظم اپنے ایک جداگانہ تشخص کے ساتھ ابھر کر سامنے آ رہی ہے۔ نظم نے اپنی روش بدلی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ نظم نے اپنی روایت سے انحراف کر کے کوئی یوٹرن لے لیا ہے۔ اگرچہ لسانی تشکیلات کے دور میں ایسا کرنے کی کوشش ضرور کی گئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس تحریک نے نئے نظم نگاروں میں نیا تجربہ کرنے کی

جرأت ضرور پیدا کی۔ یہ بھی ہوا کہ ہم شاعری کی عالمی تحریکوں سے روشناس ہوئے۔ اور نظم ایک نئے دم خم کے ساتھ نئے تجربوں کے مراحل میں داخل ہوئی۔ نئے لکھنے والوں کو خیال آیا کہ نظم ورسی فیکیشن کا آئیڈیاز نہیں یعنی نثر میں برتی جانے والی منطق کو وزن اور بحر میں لا کر غزل کا شعر تو ہو جاتا ہے لیکن نظم نہیں بنتی۔ نظم آدمی کی سائیکی کے گم نام گوشوں سے لے کر کائناتوں کی وسعت تک کی سفر گیری میں رہتی ہے۔ آدھا آدمی پورے آدمی کی جستجو میں نکلتا ہے، تلازمے کی راہوں سے نکلتی ہوئی راہوں میں تادیر سرگرداں رہتا ہے، سایوں سے تمثالیں بناتا ہے، معنی کے سراغ میں لفظ سراب بن کر اُس کے آگے آگے چلتے ہیں اور وہ اور ادھورا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی اُس کے غم کا نکاس ہو بھی جاتا ہے اور غم کے اصل کو پہچاننے کی امید اگلی نظم تک ملتوی ہو جاتی ہے۔ نظم ہمارے وجودی مسئلے کی مساحت گر بھی ہے، جو ہم سے وسعتِ بیان نہیں بیان کی گہرائی کا تقاضا کرتی ہے۔ جب ہم چاہِ معنی میں ایک دو ہاتھ نیچے اترتے ہیں یا پھر شعور کی عبارت سے لاشعور کے حاشیے میں اترتے ہیں تو ابہام پیدا ہو جاتا ہے اور ہم قاری سے اپنا فاصلہ بڑھا لیتے ہیں۔ نظم کی یہ خود شناسی عام قاری کی داد سے محروم ہی رہتی ہے۔ بہر طور ایسا ابہام اچھی شاعری کا وصف ہے۔ یہ ابہام شاعری کو کثیر المعنی بناتا ہے اور شاعر کے فیصلہ کن ارشادات سے قاری کو محفوظ رکھتا ہے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر توصیف تبسم

آفتاب اقبال شمیم کسی فردِ واحد کا نام نہیں بلکہ یہ اُس محبت کا آئینہ ہے جو آفتاب کا اپنے دو دوستوں، اقبال کوثر اور احمد شمیم سے ہے، جس نے ان کے نام کو اپنے نام کا حصہ بنا کر اردو شاعری کی تاریخ میں غالباً دوسری مثال اس نوعیت کی قائم کی۔ اس سے پہلے ثنا اللہ ڈار اسی خاص جذبے کے تحت، میرا جی کے نام سے شہرت پا چکے ہیں۔ اس انتخاب میں ایک طویل نظم ”شہرستانِ ہجر کا مسافر“ شامل ہے جو احمد شمیم کی موت پر لکھی گئی ہے۔ دوستوں نے جب آفتاب سے اس نظم کی تعریف کی تو اس نے کہا کہ یہ نظم میں نے نہیں لکھی بلکہ خود احمد شمیم نے لکھی ہے۔ میں اگر پہلے مرجاتا تو یہی نظم وہ میری موت پر لکھتا۔ بھلے دنوں کی بات ہے کہ کسی ملک میں ایک شہزادہ رہتا تھا۔ بڑا ہی فراخ حوصلہ، رحم دل اور دوسروں کے کام آنے والا۔ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو شہر والوں نے جو اس سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے، اُس کا ایک خوبصورت مجسمہ بنوایا اور شہر کے سب سے اونچے مینار پر نصب کر دیا۔ مجسمے پر سونے کے پترے منڈھے ہوئے تھے۔ اُس کی آنکھیں نیلم کی تھیں اور تلوار کے دستے پر سرخ یاقوت لگا ہوا تھا۔ شام گئے جب کھلے بارے پرندے بسیرے کی تلاش میں تھے، ایک ننھے ابابیل نے اس مجسمے کے قدموں میں رات بسر کرنے کی ٹھان لی۔ تھکا ہوا تو تھا ہی، نیند سے اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ ارے یہ کیا! سر پر بادلوں کا نام و نشان تک نہیں، پھر یہ بارش کا قطرہ کہاں سے آیا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ دوسرا پھر تیسرا قطرہ اس کے اوپر آ گرا۔ نظریں اُٹھا کر دیکھا تو شہزادے کی نیلی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ ابابیل نے رونے کا سبب پوچھا تو شہزادے نے کہا: ”دُور، بہت دُور، ایک تنگ وتاریک مکان میں ایک کمزور عورت رہتی ہے۔ اُس کا بیٹا بخار میں جل رہا ہے، مگر بڑھیا غریب کے پاس کچھ بھی نہیں۔ اچھے ابابیل! تم میری تلوار کا سرخ یاقوت اکھیڑ کر اسے پہنچا دو۔“ آسکر وائلڈ کی یہ کہانی آپ نے بھی پڑھی ہوگی کہ کس طرح شہزادے نے ایک ایک کر کے اپنی دونوں نیلی آنکھیں اور جسم کا سارا سونا غریبوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا۔ آفتاب اقبال شمیم جو کہیں کا شہزادہ نہیں مگر اس کہانی میں اس کی اپنی زندگی کی پوری تمثیل موجود ہے۔ دردوغم سے کراہتے ہوئے کروڑوں محروم انسانوں سے اُس کی یک جہتی بہت گہری اور پرانی ہے۔ وہ خود کو رحم دل شہزادے کی طرح مسلسل بانٹتا رہتا ہے۔ اُس کی آنکھ میں زندگی کا ہنستا بستا پورا شہر آباد ہے۔ اُس کے شعر وہ اڑتے ہوئے پرندے ہیں جو لمحے لمحے کی خبر اس کو پہنچاتے رہتے ہیں۔ یہ طائرِ حیات کے رِستے ہوئے زخموں کا مداوا نہ سہی، ان کو جلن کو کم کرنے کا وسیلہ ضرور ہیں۔

☆☆☆☆

وحید احمد

لفظوں کی روشنائی

اردو ادب میں نظمِ عالیہ میراجی سے سفر کرتی کرتی آفتاب اقبال شمیم تک آ گئی، جو عہدِ حاضر کے میر

کاروانِ نظم نگاراں ہیں۔ نظم کے پُل کے نیچے بہت پانی بہہ چکا۔ سنسکرت، ہندی اور اردو کی آب جوئیں، فارسی کے ریلے ملے۔ ڈینیوب اور دریائے ٹیمز کے دھارے ملے، دریائے زرد کا خاکستری رنگ ملا۔ مشرق اور مغرب کے پانیوں کا سنجوگ نہ جانے کیسے ہوتا رہا۔ نظم اپنے تیور بدلتی رہی۔ آبجو سے دریا اور دریا سے سمندر جیسی ہوگئی۔ پانی کے اوپر بنا ہوا پُل بھی اسی تناسب سے دراز ہوتا گیا۔ نظم نے زمام، آفتاب اقبال شمیم کے ہاتھوں میں دی۔ اور اب وہ گذشتہ کئی دہائیوں سے ست رنگی بگھی پر سوار اس پُل سے گذر رہے ہیں۔

بڑی بڑی کتابیں اور شہ پارے عموماً ماضی کی تفہیم کرتے ہیں۔ گذشتہ کی تشریح کرتے ہیں۔ مگر بڑی شاعری ایسی آفت ہے جو مستقبل کی پیش گوئی بھی کرتی ہے۔ اسی لیے بڑی شاعری کائناتی ہوا کرتی ہے۔ اور ثابت کرتی ہے کہ شاعر کون و مکان کی اس منزل میں نہیں رہتا جہاں وقت کو ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ آفتاب اقبال شمیم کی تقریباً چار دہائیاں پہلے لکھی گئی ایک نظم دیکھئے۔ عنوان ہے ”نارسیس“۔

اُسے عکسوں سے بھیگی آنکھ میں وہ ڈھونڈتا ہے
جو
لہو کی سرزمینوں میں
ابھی نایافتہ ہیں۔۔۔۔ کون ہے وہ؟
کوئی لڑکی ہے کہ عریانی کا لمحہ ہے؟
عجب کیا
ہوا سے شوقِ سماعت پانیوں کے شور کا
جس پر کسی گزرے زمانے میں
کسی نے بند باندھا تھا
وہ پشتہ اس کے آدم جسم سے اونچا۔۔۔
محیط اندر محیط
اس سے بلند ہونے سے پہلے گر گیا ہوگا
وہ اپنی زرد پرچھائیں کی خندق میں
کسی کو ڈھونڈتا ہے

کون سی آواز ہے، جس کا تعاقب کر رہا ہے
اور کیسی شام کے حلقے میں آ کر
ڈوبتا جاتا ہے
کتنی دوریوں سے تک رہا ہے اپنے مشرق کو
مگر وسعت
نظر کی راہداری سے اسے کیسے دکھائی دے
کسی لے کی آزادی
کبھی شاید اسے اپنے تشدد سے رہائی دے----

نارسیس کا مطلب نرگس ہے۔ شعر و ادب میں یہ پھول اتنا چھیتا ہے کہ باقی تمام پھولوں کو اس پر رشک آتا ہے۔ Narcis یونان سے آیا ہے۔ لغوی مطلب نیند ہے اور بے حس و حرکت یا سُن ہونا بھی ہے۔ یہ لفظ Narcissus یا Narkissos سے نکلا ہے۔ رومن شاعر Ovid، 47ق م۔ 17 عیسوی) نے قریب 8 عیسوی میں Metamorphosis کہانی میں Narcissus اور Echo کی داستان لکھی۔ Narcissus جو حواس باختہ کر دینے والے حُسن کا مالک تھا، جنگل میں جا رہا تھا کہ ایک کوہستانی دیوی Echo نے اسے دیکھا اور اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو گئی اور اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ نارسیس نے جب محسوس کیا کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے تو پکارا ”کون ہے؟“ Echo نے بھی اسی کی طرح پکارا ”کون ہے-----؟“ وارفتگی میں Echo نے بے اختیار نارسیس سے لپٹنا چاہا تو اس نے حقارت سے روک دیا۔ وہ ساری عمر ویرانوں میں بھٹکتی رہی حتیٰ کہ وہ صرف بازگشت بن کر رہ گئی۔ یعنی Echo۔ انتقام کی دیوی Nemesis کو جب اس المیے کا علم ہوا تو مکافاتِ عمل کے لیے وہ نارسیس کو بہکا کر ایک تالاب پر لے گئی۔ جب اس نے اپنا عکس پانی میں دیکھا تو دیوانہ وار اپنے عکس پر عاشق ہو گیا۔ وہیں بیٹھا رہا اور مر گیا۔ کچھ کہتے ہیں نرگس کے پھول میں تبدیل ہو گیا۔ اور دلبستان کا حصہ بن گیا۔ کسی نے نرگس بیمار باندھا تو کسی نے نرگس رنجور کہا تو کسی نے نرگسِ طناز۔ کسی نے نرگسِ مخمور کہا تو کسی نے نرگسِ نیم خواب۔ Ovid سے Keats، Oscarwilde اور آفتاب اقبال شمیم تک، Hermen Hesse سے پالو کوئیلو تک، Moby Dick کے کردار سے Harry Potter تک فنونِ لطیفہ کے تمام شعبوں میں بقول اقبال نرگس ہزاروں سال روتی ہے، کبھی شعر میں، کبھی سمفنی میں، کبھی رقص میں اور کبھی تصویر میں۔

فلسفیوں اور تحلیلِ نفسی کے ماہرین نے بھی نرگسیّت کو اپنا موضوع بنایا۔ سگمنڈ فرائڈ، کارل جُنگ

اور ایڈلر ان میں شامل ہیں ۔ نرگسیت مثبت ہے ۔ جب انسان اپنے اندر کی اُتّم سچائی کا سچا ادراک کرتا ہے ۔ نرگسیت منفی ہے ۔ جب معاملہ اس کے الٹ ہو اسے Psychopathological Narcissism کہا جاتا ہے اور آفتاب اقبال شمیم کی یہ نظم انگشتِ شہادت سے اسی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ یہ نظم Horror ہے ۔ انتہائی سفاک اور خوفناک ہے ۔ حیرت انگیز حد تک سچی ہے ۔ چار دہائیوں پہلے لکھی گئی مگر آج کی بات کرتی ہے ۔ نظم کا لبِ لباب یوں ہے :

نرگسیت یا خود پسندی آسیب کا روپ دھار چکی ہے ۔ جس جھیل میں وہ اپنا عکس دیکھتا تھا، اس کا بند ٹوٹ چکا ہے ۔ اور اب وہ اپنی زرد پرچھائیں کی خندق میں کسی کو ڈھونڈتا ہے ۔ مگر نظر کی راہداری سے وسعت کیسے دکھائی دے؟ شاید کوئی آزادی کا لمحہ آئے اور اسے اپنے تشدد سے رہائی دے ۔ مگر وہ ابھی تک عکسوں سے بھیگی آنکھ میں لہو کی نایافتہ سرزمینیں ڈھونڈتا ہے ۔

میں اس نظم کو موجودہ سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی صورت حال کا آئینہ سمجھتا ہوں ۔ ہمارے ہاں جھیلوں اور تالابوں کی کمی نہیں اور ان کے کنارے بیٹھ کر اپنا گھناؤنا عکس دیکھنے والے ان نارسیس نما کرداروں کی کمی بھی نہیں جو ذہنی بیمار ہیں ۔ جو اپنے عکس میں لہو کی نایافتہ سرزمینیں تلاشتے ہیں ۔ وہ اپنا عکس کبھی پانی میں دیکھتے ہیں، کبھی سراب میں اور کبھی اپنی زرد پرچھائیں کی خندق میں ۔ وہ Sadomasochist ہیں ۔ قومی اور بین الاقوامی دہشت گردی کی جو تصویر اس نظم میں کھینچی گئی وہ بقول غالب تصویر کے پردے میں بھی عریاں ہے ۔

یہ نظم آفتاب اقبال شمیم کی کتاب فردا نژاد میں شائع ہوئی ۔ جس کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں :

”میرا وجدان اور شعور اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ میں ایک نیم آفریدہ دنیا میں پیدا ہوا ہوں ۔۔۔ ایک نامکمل منظر کی نامکمل شناخت کے لیے ۔ میری روشنی کے علاقے، میرے وجود کے اندر، باہر اور اس کے مضافات میں کہیں کہیں واقع ہیں اور میں دیکھتا ہوں کہ ان کے بیچ میں خلا ہی خلا ہے“ ۔

وہ بجا کہتے ہیں ۔ ان کی اکثر نظمیں دھیرے دھیرے کھلتی ہیں ۔ ”روشنی کے علاقے“ ان کے الفاظ ہیں اور ”خلا“ بین السطور پھیلی ہوئی وہ معنویت ہے جس کے پانی میں قاری اپنا عکس دیکھتا ہے ۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر توصیف تبسم

انتخاب کلام آفتاب اقبال شمیم

زمین اور میں

پھر مجھے ماں نے
پلّو میں باندھی ہوئی وقت کی ریزگاری کے
دو چار سکے تھما کر
عجب پیار سے تھپتھپاتے ہوئے یوں کہا
جاؤ نا! جا کے عمروں کے میلے سے ہو آؤ نا!
دیکھنا!
دُور پچھم میں جب شام کا جامنی بادلہ لہلہانے لگے
اولیں گرم بوسے کی خوشبو سے مہکی ہوئی
نیم پختہ گلی یاد آنے لگے
لوٹ آنا، یہاں جس جگہ
بے پتا اور بے نام کرتی ہوئی ایک لوری کی لے
اور اک مشت پھولوں کا زادِ شبِ خواب
دے کے سُلا دوں تمھیں
اپنی کایا کی آغوش میں
یہ بچھڑنا، یہ ملنا قضا ہے کہ میں خود تمہاری طرح
واقعے کی جُھلک، چُپ کا بولا ہوا شبد ہوں
اپنے بدلے ہوئے اصل کے روپ میں
شہرِ خاک پہ
وقت کے مستقر سے اترائی ہوئی
مہر و ماہ و ستارا کے میلے سے آئی ہوئی

میں بیک بنچر ہوں

میں بیک بنچر ہوں
آتے جاتے معلّموں، ہم جماعتوں کی نظر سے بچ کر

لگا ہوں اک نظم کھینچنے میں
میں ایک تصویر لکھ رہا ہوں
نہ کوئی شاباش کی تمنا نہ خود نمائی کی کوئی خواہش
نہ دفترِ روزِ چند میں درج ہونے والوں
کے ساتھ چھپنے کی کوئی حسرت
عجیب سا خبط ہو گیا ہے کہ نارسائی کے فاصلے سے
اُسے میں لمس و شام، دید و شنید کی
قربتوں میں لاؤں
مجھے تو اب یاد بھی نہیں ہے، کہاں ملی تھی
وہ زندگی جیسی ایک لڑکی
میں جس کے رخسار و چشم و لب کی
مٹی مٹی سی شباہتیں اُن گلاب چہروں میں
دیکھتا ہوں
مجھے جو اس سامنے کے منظر میں
ایک آئینہ دار لمحہ دکھا رہا ہے

ہجر زاد

میرے دکھ کا عہد طویل ہے
میرا نام لوحِ فراق پر ہے لکھا ہوا
میں جنم جنم سے کسی میں عکسِ مشابہت کی تلاش میں
پھرا اپنے خواب سراب ساتھ لیے ہوئے
گیا شہر شہر نگر نگر
تھیں عجیب بستیاں راہ میں، میری جیت، میری شکست کی
کسی دوسرے کی صداقتیں ____ میری رہبر، میری رہزن
لیے ساتھ ساتھ، قدم قدم

کبھی پیشِ خلوتِ آئینہ،
کبھی صبح و شام کی خلقتوں کے جلوس میں،
کئی ظاہروں، کئی باطنوں کے بدلتے روپ میں منقسم مجھے کر گئیں
میں دھواں سا آتشِ اصل کا
اُڑا اور خود سے بچھڑ گیا
مجھے ہر قدم پہ لگا کہ میں
سفر آزما ہوں ___ مگر مجھے مری سمت کی بھی خبر نہیں
میں حلیف اپنے غنیم کا
ہوں جہاں بھی راہِ زیاں میں ہوں
میں خیال پرورِ شوق، شہرِ مثال کا
مجھے ہر مقام پہ یوں لگا
کہ حقیقتوں کے سگانِ کوچہ نورد مجھ پہ جھپٹ پڑیں گے یہیں کہیں
مجھے دنیادار پچھاڑ دیں گے مفاہمت کی زمین پر
میرے ہاتھ بھیگے ہوئے صداؤں کے خوف سے
میری سانس لرزی ہوئی ہوا کی مچان پر
یہ فرار تھا----
کہ انا کا سایہ و سائباں
لیا جس نے اپنے بچاؤ میں
میں رواں رہا کسی بے نمودی روشنی کے بہاؤ میں
میرا پائے شوق سزا کہیں پہ رکا نہیں
یہ نشیب شام ہے اور میں ہوں رواں دواں
یہ نہیں کہ مجھ کو اماں ملے گی شب ابد کے پڑاؤ میں
ذرا انتظار ----- کہ جب وجود کا کوزہ گر مجھے پھر سے خاک بنا چکے
تو یہ دیکھنا
کہ شبیہِ شخصِ دگر میں لوٹ کے آؤں گا----

اسی شہر میں
میرا نام لوحِ فراق پر ہے لکھا ہوا
میرے دکھ کا عہد طویل ہے

گلی

یہاں پر روشنی
ہر روز مقدارِ مقرّر میں اترتی ہے
یہاں پر زندگی کو نالیوں کے تعفّن پانی کی نمی
سیراب کرتی ہے
دھوئیں کے شامیانے میں
یہاں لڑکے غروبِ شام سے ہی کرنے لگتے ہیں
تھکن کی دھول میں تیاریاں سپنوں کے میلوں کی----
ابھی چلتے ہوئے ہوگا
اُسے احساس سانسوں کے ذرا سے گرم ہونے کا
کسی در پر لٹکتے ٹاٹ کے اُدھڑے کنارے پہ
گلابی انگلیوں کا پھول مہکے گا
سکینہ مسکرائے گی
فضائے دل میں جینے کی تمنا گنگنائے گی----
ابھی دہلیز تک آ کر
اُسے ماں اپنی ناداری
کے عالم میں دعا دے گی
وہ گھر سے رزق کے کھلیان کی جانب
ہوا میں تیرتا----ہریالیاں چُھپے نکل جائے گا
ڈھلتی دھوپ کے آنگن میں آ کر
مژدۂ فردا سنائے گا

سنو ماں! سبز خوشحالی کا موسم آنے والا ہے ----
یہاں خشتِ شکستہ کی کسی دہلیز پر بیٹھے
وہ ہم عمروں کی سنگت میں
سناتا اور سنتا ہے
کہانی اُس دلاور شاہزادے کی
جو دیوِ جبر کو تسخیر کرتا ہے
یہاں وہ بچپنے سے نیم عمری تک
ہزیمت کے سفر میں
رفتہ رفتہ پوگی اپنے بدن کی خاک میں تعمیر کرتا ہے
اچانک خواب سے اٹھ کر
وہ اپنے خوں میں پلتی زرد بیزاری میں کہتا ہے
میں مرنا چاہتا ہوں ----

پیاسوں کے لیے ایک نظم

ہم وارثِ تختِ تمنّا کے
ٹھہرے منظر کے سائے سے کب نکلیں گے
دُکھ کی دیروز سرائے سے کب نکلیں گے
ہم آبِ سراب کے دریا کو
دریا، کیسے تسلیم کریں
اے دل والو!
کچھ چھینٹے شوقِ تغیّر کے ہم پر ڈالو
دھڑ پتھر کے متحرک ہوں
ہم وارثِ تختِ تمنّا کے
سانسوں کی حبس حویلی میں، جیسا اپنا معمول کریں
آ تہمتِ کفر قبول کریں

آبر سیں ٹوٹ کے آنکھوں سے
مرجھائے وقت کی ظلمت کو، سیراب کریں
پھر نشوونما کا شجر اُگے
اِمکان کے فردا زاروں میں
پھر موسم کے میخانے کا در کھل جائے
میخواروں پر، دروازۂ منظر کھل جائے
پھر عرش، زمیں کی باہوں میں
باہیں ڈالے
اس بستی کی، دہلیز پہ آ کے رقص کرے
ہر لمحے کی پھلواری میں
طاؤسِ تغیّر رقص کرے

ٹھہرا ہوا منظر

دل کے اک متروک گوشے میں وفا کی
خوبصورت راہبہ بیٹھی ہوئی
اپنے گرداگرد
بے برکت دعا کا نور پھیلائے ہوئے
مدتوں سے ---- جانے کس کی منتظر

اور باہر
شہر کی دہلیز پر
رات کے نوزائیدہ بچے کے جشنِ تہنیت میں
رقص کرتے ہیجڑے
درد کی فرہنگ کے سارے ورق بکھرے ہوئے
لفظِ نابینا کے آگے درج معنی کا خلا
عشرتِ یک شب کے دلدادہ تماشا ہیں

بہک کر
جمگھٹوں میں بامِ ثروت کی طرف جاتے ہوئے
نغمۂ بے سوز بننے کے لیے
اور کم میعاد کی مانگی ہوئی خوشحالیوں کے پیرہن سے
شوخ، کچا رنگ----ناپختہ چمک اڑتی ہوئی
ایک گوشے میں اکیلا
معرکہ زارِ شکستِ پے بہ پے میں ایستادہ نوجواں
بے بس و مجبور، بے دست و کماں

یہی وہ دن ہے
(۱۴ اگست)

یہی وہ دن ہے
کہ آسماں، چاند اور ستارا لیے ہوئے
خود زمیں پہ اترا تھا
شب گزاروں کو پیش کرنے قمرِ مقدّر کی روشنی کا
یہی وہ دن ہے
کہ لعل و یاقوت جرأتوں کے
درونِ دل کی تپش سے سیّال ہو کے ٹپکے تھے
اور اس صفحۂ زمیں پہ
ہرے ہرے لفظ بن گئے تھے
یہی وہ دن ہے
کہ دشت و میدان و کوہ و وادی
رُکی ہوئی سانس کھل کے لینے لگے تھے
دریاؤں اور جھیلوں میں عکس سرسبز ہو گئے تھے
یہی وہ دن ہے

کہ ہم نے جز دانِ فیصلہ میں
رکھا تھا لکھ کر وفا کا پیمان اِس زمیں سے
چلو کہ اس دن کے فیصلے نے
ہمیں جو نورِ شعور بخشا
ہمیں جو نقدِ ضمیر سونپا
اُسے ہم اپنی وفا کا شاہد بنا کے دیکھیں
کہ ہم امینوں سے یہ زمیں کتنی مطمئن ہے
یہی وہ دن ہے

ایک آنسو، ایک تبسم

مت کہو ان مہ وشوں کو فاحشہ
یہ تو وہ ہیں جن کے آگے میں ہمیشہ
نیم سجدے میں رہا
میرے سپنوں کو بنفشی شال کی مانند جو بُنتی رہیں
جس کے لمسِ گرم کو کاندھوں سے لپٹائے ہوئے
کاٹ لی ہے میں نے یہ سرما کی لمبی رات جیسی زندگی
جن کی آنکھوں کی تپش اور روشنی سے عمر بھر
میرے صحراؤں میں ہریالی رہی
مت کہو ان مہ وشوں کو فاحشہ
یہ تو وہ ہیں
جو جنم کی قیدِ بے میعاد میں
جی رہی ہیں بھید اندر بھید خود اپنے لہو کی بے وفائی کی سزا
سہتے ہوئے
برتر و بالا ہو جو چاہو کہو
میں تو رو دوں فاحشہ کو فاحشہ کہتے ہوئے

زمانہ بازار بن گیا ہے

(۱)

حشیش و بارود کی کثافت
لہو کی بدرَو میں بہہ رہی ہے
ہوس کا لاکر اٹا ہوا ہے زرسیہ ہے
اِسی کی آتش پہ پکنے والی ضیافتوں پر
خدائے واحد کے ساتھ اس کے چنیدہ بندے
ہجوم کرتے ہیں شام ہوتے ہی
پانچ تارا عشائیوں میں
کہ بار کاروں کی دوڑ عشرت سرائے یک شب
کی منزلوں تک لگی ہوئی ہے
یہ شہرِ سوداگراں ہے جس میں
معاش کے لنگروں پہ پلتی ہوئی رعایا
انا کی قِلّت سے اپنے باطن میں مر چکی ہے
وگرنہ اٹھ کر
دکانِ زرگر سے، قصرِ قیصر سے
اپنے سرقہ شدہ لہو کا حساب لیتی
یہی ہے موجود کی حقیقت
نشیب ہے تو فراز ہوگا
فراز جس پر
تمام اخوان نعمتوں کے
بدن کا خوانچہ فروش دن رات بیچتا ہے
یہ جشنِ سر روز و شب تو جیسے یہاں کا تہوار بن گیا ہے

زمانہ بازار بن گیا ہے

(۲)

عجیب دہشت میں آسماں ہے
جگہ جگہ خاک کے بدن سے لہو رواں ہے
تو کیا یہی ہے خدا کی بستی
جہاں معیشت کی بیڑیوں میں بندھی ہوئی
خلقتوں کی منڈی لگی ہوئی ہے
جگہ جگہ اسلحے کی نسلیں فروغ میں ہیں
وہی جو فتحِ عظیم کا خواب لے کے نکلا تھا
زور زور اور اپنی ایجاد کے ہنر سے
زمیں کا فرمانروائے مطلق بنا ہوا ہے
نہیں سمجھتا کہ وقت کے ماورائے منطق
تضاد و اضداد کے سفر میں
ہماری فتحیں
ہماری ناکامیاں ہیں یا کامرانیاں ہیں!
نہیں سمجھتا کہ علم کی بے کرانیوں میں
ابھی تو اس نے قدم رکھا ہے
نہیں سمجھتا کہ اس کی دریافت کردہ منطق
کلید بھی اور قفل بھی ہے
یہ خاک و افلاک، نیست و ہست کے مظاہر
کسی ترازوئے عدل و میزانِ امن میں
یوں تُلے ہوئے ہیں
کہ وقت کے بے کراں زمانوں میں
ایک ذرے کی دل سرائے میں قافلے شب بہ شب

ٹھہرتے ہیں، کوچ کرتے ہیں
بھید کی خردہ کائناتوں کو کھوجتی آنکھ آدمی کی
قضا کے منشائے غیب کا آئینہ ہے
یہ آئینہ چور ہو گیا تو بڑی ہزیمت کی بات ہوگی
یہی کہ شیشہ گرِ ازل کو
ہزار صدیوں کی مات ہوگی
مگر یہ تخلیق کرنے والے کی بے نصیبی نہیں تو کیا ہے
کہ آج کے دور کا سکندر
نہیں سمجھتا کہ آدمی غیب کا صحیفہ ہے
جنسِ سوداگری نہیں ہے
نہیں سمجھتا کہ ہاتھ اس کا فنا کی تلوار بن گیا ہے
زمانہ بازار بن گیا ہے

(۳)

یہی سمجھ لو کہ اک ضرورت ہے زندگی کی
منافقت کا پیاس کلچر
ہماری بیٹھک میں دُور منظر کا طاق شیشہ
عجیب نیرنگیاں دکھائے
فروغِ رنگِ شفق سے مہکی ہوئی فضائیں
مچلتی آواز راگنی کی
صدا کے کانوں میں مُرکیوں کے تھرکتے حلقے
سماعتیں جھوم جھوم جائیں
تمام بستی کے سب مکانوں میں جیسے
مُجرا سا ہو رہا ہو

یہ دھوپ آنکھیں، یہ ابر گیسو
یہ خوش نما اشتہار چہرے
بجھا کے جو پیاس خواہشوں کی بڑھا رہے ہیں
یہ قہرِ یک ثانیہ خریدی ہوئی ادا کا
اور اس کے فوراً ہی بعد تفریح اپنا چہرہ بدل کے
حمد و ثنا سنائے
عجیب رِقّت سی سنسناتی ہے تن بدن میں
بزرگ و برتر کا ذکر جاری ہے،
سر جھکا کر میں سوچتا ہوں
مزاح و سنجیدگی کا یہ کاک ٹیل پی کر
امیرِ تہذیب کی رعایا سرور میں ہے
حواس کو بے حواس رکھنا
نئی ثقافت کا جیسے معیار بن گیا ہے
زمانہ بازار بن گیا ہے

شجرستانِ ہجر کا مسافر
(احمد ہمیش کی موت پر)

جب سہ پہر کی ڈھلوانوں سے روشنیاں بہہ جاتی تھیں
جب انگشت۔ ستارے کی
تھرّانے لگتی تھی شام کے بربط پر
اور معطّر سی گمبھیر اداسی کے ویرانے میں
شاخِ شجر سے اڑتی تھیں
لرزاں لرزاں پیلی تانیں پتّوں کی
اُس دم جانے کون صدا دیتا تھا____ آؤ

بجھتے رنگوں کے یہ تحفے
آؤ! اپنے کل کے سپنوں کی قیمت میں
لیتے جاؤ
اس آواز کے راتوں لمبے رستے پر
دو رویہ خاموشی میں
ہجر کے شجرستاں کی جانب ہم دونوں چل پڑتے تھے
یاد ہے؟ تو کہتا تھا اپنی خوشبو کی سرگوشی میں
ہجر مسافتِ جان سے جان کے ملنے کی
کس نے کب طے کی ہے پیارے
ہجر فنا کا رستہ ہے
شوق تحیر سے گزرے تو وقت کی سرحد سے آگے نا وقت ملے
اور تحیّر صدیوں کے پھیلاؤ میں
جانے کون سی نادیدہ منزل کی سمت اشارہ ہے
اس سے پہلے ____ روز سفارت لفظوں کی
بے آواز چلی آتی ہے وعدے کی اسناد لیے
خالی آنکھ کے ایواں میں
یعنی ایک کبھی نہ آنے والے کل کے آنے تک
بس اک خواب کے درشن کرنا، کرتے رہنا
جیتے رہنا، مرتے رہنا
تیشے سے
کوہِ مقدّر سر کر کے
آخر میں اپنے ہی خون کی ندی پر
اپنی پیاس بجھانا ہے
ہجر زدہ صحرا زادے

نا اُمید نہیں ہیں جان لٹا کر بھی
اب تو جاتے ہیں لیکن پھر آئیں گے
(جیسا خون بہا ہے شاید مرنے کا)
جب سانسوں کے امبر پہ
ٹوٹ رہے ہوتے ہیں تارے پہلی رُت کے آنگن میں
دل پہ دستک ہوتی ہے
اور دریچے کی چلمن سے ساحر آنکھیں
کیسے شوخ اشاروں میں
پھولوں کے آدرش کا مژدہ دیتی ہیں
دل کا بحر
شناور جذبے اور تصوّر ان ہونی سی باتوں کا____
آس کے دراک لمحے پروا ہوتے ہیں
لہروں کی خواصیں کندھوں پہ تھال اُٹھائے آتی ہیں
اور الٹتی جاتی ہیں
ریزہ ریزہ روشنیوں کے گوہر ریت کی جھولی میں
دیکھا تھا نا! ہم نے ہجر کے شجرستاں میں
وہ برگد کے سائے میں
صبح وشام کے خاکستر سے کرنیں چنتا رہتا تھا
دھیان سے اڑتی خوشبو کے مرغولوں سے
سپنے بُنتا رہتا تھا
جانے اس کے نُور کا کس پہ کشف ہُوا
وہ شہزادہ عمروں کے بَن باس میں اب بھی
تنہا پھرتا رہتا ہے
خبروں کے انبار میں اک نادیدہ حرف و محبت کا

ڈھونڈیں پر کیسے ڈھونڈیں
دکھ کے معرکہ زاروں میں
ہونے والی جنگوں کے طے ہونے کا امکان تمہیں
روز تچھیرا نا معلوم تعاقب میں
رنگ و بُو کا جال اُٹھائے آتا ہے
اور خلیجِ شام سے آگے
بے تکمیل سفر کے لمبے سایوں میں کھو جاتا ہے
لیکن آ تسلیم کریں
یہ سوچیں کم معنی ہیں
لفظ ذرا سے گونگے بھی ہیں بہرے بھی
ہوش مساحت گر ٹھہری اندازے کی، اندیشے کی
ہم کیا جانیں کون تماشا گر ہے ان دنیاؤں کا
جن کے سناٹے میں وقت کا ٹپکاؤ
ہستی کے گلزار کھلاتا رہتا ہے
ہم اس ہونے، نہ ہونے کے عالم گیر تماشے میں
ناظر بھی ہیں، منظر بھی تمثیلوں کے
ہم کیا جانیں ہم کیا ہیں!
……یاد تمہیں کیا؟
کیسے جشن کی کیفیت تھی دن کے چڑھتے منظر میں
آئینہ در آئینہ
عکسوں کی گہما گہمی سی رہتی تھی
تازہ زخموں کی مہکاریں
ہم دونوں کو
آوارہ رکھتی تھیں دل کے قریے میں

اوّل اوّل

جب میں موج کی چپّل پہنے
اور بسنتی خواب کی چھتری سر پہ تانے
برفوں کے اونچے پربت سے اُترا تھا
تم بستی سے باہر دھوپ کی سنگت میں
مجھ کو لینے آئے تھے
تم نے میرے لمبے بالوں، نسواری پیراہن کو،
کتنے غور سے دیکھا تھا
پھر جیسے تم نے مجھ کو، میں نے تم کو پہچان لیا
یاد ہے نا! وہ بے چینی سی
دل کی ممنوعہ گلیوں میں جانے کی
دُور کہیں بُرجوں پر جلتی قندیلیں
چاندنیوں کے گیت، تھرکتے پاؤں سے اُڑتی چاندی کے چھینٹوں میں
رقص کی لہروں پر ہلکورے کھاتی آنکھیں
دن کی بارہ دریوں میں
شہرِ صبا آبادِ خرامِ لالہ رخاں
ہر نفسے ہم رنگِ پیامِ لالہ رخاں
کِھل کِھل جانا نیم شگفتہ زخموں کا
اور بہت چاہت دل میں مر جانے کی
گرم لہو کی لوریاں سنتے سنتے ہم
اونگھنے لگتے تھے رنگیں افسانوں کے گہوارے میں
پھر ہم دونوں
ٹھہرے لمحے کی جنت سے، اپنے ہی اُکسانے پر
مٹی کے دکھ کا بے نام ثمر چکھ کے

ہونے کا، نہ ہونے کا تاوان ادا کرنے نکلے
باہر ایک تماشا ہر سُو بے چہرہ انبوہوں کا
سایہ سایہ زلفیں کھولے
دھوپ پرانی دہلیزوں پر بیٹھی تھی
گھر کے کو آنگن میں
بے شکوہ آنکھوں سے قطرہ قطرہ گرتی بینائی کی آہٹ سی
بوڑھے ہاتھوں میں رعشہ ناداری کا
زینہ کے ماتھے کی تختی پہ لکھا تھا
یہ مٹی، یہ آل اولاد ستاروں کی
قحط کی فصلیں کیوں ہر سال اُگاتی ہے
اے داتا! ان ناحق مرنے والوں کو
اپنی بخشش سے تو لمبی عمریں دے
آئندہ کی دنیا میں
قصر بہت اونچے تھے عشرت گاہوں کے
جن کے شب زاروں میں پھول مہکتے تھے
بوٹے جیسے قد و قامت کی نوخیز کنیزوں کے
جن کے زینے سے خلقت پر جینے کا انعام اترتا رہتا تھا
آتے جاتے موسم سہر صلیبیوں کے
خاک کا دامن بھر جاتے تھے سرخ سجیلے جسموں سے
جبر کے ظلمت خانے میں
خوف، اندھیرے اور دھوئیں کے سناٹے
زندگی پہرے داروں کی چنگاڑیں رات کے جنگل میں
گرتے خون کی موسیقی پر رقص برہنہ شعلوں کا
کیا دیکھا؟____ بے چشم مصنف بستی کی دیواروں پر

سہ پہروں کے سائے لکھتا رہتا تھا
طاقت کے شاہی قلعے ماخذ ساری تہذیبوں کے
جس کے دانش زادوں نے تعمیر کیے
زر کے بیجوں سے اُگتی بدحالی کے پس منظر میں
چمنستانِ ثقافت کے
یاد ہے؟ ہم دونوں نے اپنے سارے خون کی شدّت سے
نفرت، نفرت کا اقرار کیا
اے شاعر! آ
عمروں کے فاقے سے برفائے ہاتھوں کو بوسہ دیں
روشنیاں اُنڈیلیں ٹھنڈے سینوں میں
اتنی کہ صبحوں کے گھاؤ پڑ جائیں
ربِّ جبر کی نازل کردہ ظلمت کی پیشانی پر
خواب پرندے اور نشیمن آنکھوں کے
آدم زادے شہرِ ازل کی گم کردہ جنت کی دھن میں یوں نکلے
جوں عشاق نکلتے ہیں
اے ایام کی مٹی یاد گواہی دے
ہم فردا کی زرد اندھیری راتوں میں
روشنیوں کے نعرے دیواروں پہ لکھتے رہتے تھے
لگتا تھا کہ دل نورستہ جذبوں کی طغیانی میں بہہ جائے گا
لیکن کیسے قدآور سالاروں نے
ڈھلتی عمروں کی ٹھنڈی آسائش کے خس خانے میں
منصوبے تیار کیے پسپائی کے
دام بچھائے نافہمیدہ سچائی کی منطق نے
پھر ـــــ ہم بھی بچھا لیے تھے

ناآموز شناورِ بحرِ ہمت کے
ڈوبے حیلے اور حوالے کے گدلے گردابوں میں
ہم کیا کرتے
(ہم نے سوچا) بہتر ہے سمجھوتے سے
ہم ابہام کے پیچ و خم میں کھو جائیں
ورنہ یہ جابر سلطان زمانے کا
ہم آزادوں سے مانگے گا جزیہ باج گزاری کا
بہتر ہے کہ سر پہ لے لیں تہمت کم کم جینے کی
کیا ہے؟ غور سے دیکھو تو
زردبگولے کی مٹھی میں نیک کمائی تنکوں کی
سارے جذبے لاحاصل
اس سے آگے منظر شام سرائے کا
چائے کے مٹیالے گھونٹوں سے گرمائے لہجے میں
پہروں خود سے چھپ کر خود سے باتیں کرنا
باہم افراتفری ٹوٹے آئینوں کے عکسوں کی
خالی کمروں میں مجمع آوازوں کا
بے پیغام، تہی تمثیلیں معنی اور حوالے کی
ایک تمسخر ہونٹوں پہ
لایعنی فعلوں کی زرّیں فصلیں بونے والوں کا
بس ایسے ہی کاٹ دیا
اکتا دینے والے روز و شب کے آنے جانے میں
ہم نے رہتی عمروں کو
اے شاعر آ
ہجر کے اندر ہجر کے اس دوراہے پہ

موڑ مڑیں ایسے کہ کوئی منظر پچھلی یادوں کا
نظروں سے روپوش نہ ہو
بچھڑیں لیکن اگلی رت میں پھر ملنے کے وعدے پر
ہم کہ پیوستہ ہیں خون کے رشتے میں
دکھ کے زرد قبیلے سے
دیکھ! یہاں پر
ہجر کے شجرستاں میں کیسے لمبے لمبے سائے ہیں
اے جنموں کے آوارہ! اے ازلوں کے سیلانی آ
دل کے عرش پہ چل کے تارے چنتے ہیں
لہرے ملتے سایوں کی بستی میں
پیارے! کل پھر آنا ہے

☆☆☆☆

کھوئے ہوؤں کی جستجو

گورنمنٹ کالج کے زمانے میں شعر و ادب سے تعلق رکھنے والے اتنی تعداد میں موجود تھے کہ ان کی موجودگی با قاعدہ محسوس ہوتی تھی۔ لیکن افسوس ناک امر یہ ہے کہ اب شاید ہی کہیں ان کا ذکر اذکار ملتا ہو۔ صوفی تبسم، انجم رومانی، قیوم نظر، صفدر میر، شاد امرتسری اور امجد الطاف وغیرہ ادبی محفلوں کی جان ہوا کرتے تھے۔ صوفی صاحب تو خیر استاد آدمی تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فیض ان سے اپنے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ بلکہ یہ بھی کہ صوفی صاحب کے انتقال کے بعد فیض صاحب کے کلام میں فنی نقائص صاف نظر آنے لگے تھے۔ چنانچہ صوفی صاحب کی وفات کے بعد بھی انتظار حسین، غالب احمد، احمد مشتاق، شیخ صلاح الدین، ناصر کاظمی اور حنیف رامے وغیرہ اپنی محفلیں پاک ٹی ہاؤس میں جمائے رکھتے۔

قیوم نظر ہمیں اردو شاعری پڑھاتے تھے۔ انہی دنوں، انہوں نے امجد الطاف کے ساتھ مل کر ایک ادبی پرچے ”نئی تحریریں“ کا آغاز کیا جس کے پہلے ہی شمارے میں میری پانچ چھ غزلیں مختصر تعارف کے ساتھ شائع ہوئیں۔ ان میں سے ایک غزل کا ایک شعر اس طرح سے تھا:۔

پھر جا رُکے گی بجھتے خرابوں کے دیس میں
سونی سلگتی سوچ کی سنسان سی سڑک

قیوم صاحب نے اس کا دوسرا مصرعہ اس طرح تبدیل کر دیا۔

سُونی سلگتی سوچتی سنسان سی سڑک

اس سے Alleteration بھی مکمل ہو گئی اور مصرعہ بہتر بھی ہو گیا۔ یہ غزل بعد میں ”آبِ رواں“ میں شامل ہوئی۔ انہی دنوں ان کا شعری مجموعہ ”قندیل“ شائع ہوا۔ یادداشت میں ان کے یہ دو شعر رہ گئے ہیں۔

اور لگا اور لگا قہقہے
دیکھ، ادھر دیکھ یہ آنسو بہے
سیکھ گیا تجھ سے وفا دشمنی
چاند جسے سحر کوئی اپنا کہے

ضیا جالندھری ان میں سینئر تھے اور انہوں نے اپنی الگ دنیا بسا رکھی تھی۔ حفیظ ہوشیار پوری کا مجموعہ غزل ”زیرِ لب“ کے نام سے انہی دنوں شائع ہوا تھا جس کے یہ دو شعر زبان زدِ عام تھے۔

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے
دلوں کی رنجشیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

ناصر کاظمی کی نشست انتظار حسین وغیرہ کے ساتھ ہی رہی۔ کشور ناہید اور یوسف کامران بھی ان سب میں شامل تھے جبکہ شہرت بخاری اور زاہد ڈار بھی ان سے علیحدہ نہ تھے۔ مبارک احمد (باسائیکل فیم) ٹی ہاؤس کے باقاعدہ حاضرین میں شامل تھے۔ الف الحراث اپنی منڈلی الگ جمائے ہوتے۔ ان دنوں ان کے ''لسانی تشکیلات'' کی بڑی دھوم تھی۔ ایک شعر سنیے:۔

بیڑی لایا ہوں، بیڑیئے اس کو
پان حاضر ہے، اس کو پایئے کہ

''کہ'' اس طرح سے پنجابی بول چال میں استعمال ہوتا ہے لیکن مرا نہیں خیال کہ اردو میں کوئی متبادل لفظ ایسا ہو جو اس جیسی کیفیت بیان کرسکتا ہو۔

شہزاد احمد بھی کسی سے کم نہ تھے۔ دوسروں سے جونیئر تھے لیکن ایسا محسوس نہ ہونے دیتے۔ انجم رومانی ایم اے او کالج میں پڑھاتے تھے، وہ بھی ان محفلوں کی جان ہوا کرتے۔ عام طور پر استاد انجم رومانی کہلاتے۔ ان کے یہ دو تین شعر یاد رہ گئے ہیں:۔

انجم غریب شہر ہیں ، اب تک اسیر ہیں
سارے ضمانتوں پہ رہا کر دیئے گئے
گرو تو پھر گرو ہے، اس کی بھلی کی
چلتا ہے کیا بالکا اچھل اچھل کے ساتھ

اور، یہ لازوال شعر:

دل سے اٹھتا ہے صبح و شام دھواں
کوئی رہتا ہے اس مکان میں کیا

جون ایلیا نے اسی زمین میں اپنی معروف غزل لکھی جس کا ایک خوبصورت شعر ہے:۔

تکتے رہتے ہو آسماں کی طرف

کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا

انجم صاحب کا کُلیات ان کے داماد نے چند سال پہلے شائع کرایا جس میں ان کا غیر مطبوعہ کلام بھی شامل ہے۔

صفدر میر یا محمد صفدر بھی اپنی قبیل کے خاص آدمی تھے۔ انتہائی پڑھے لکھے "ڈان" میں زینو کے نام سے ادبی کالم لکھا کرتے۔ رہائش انارکلی میں ایک چوبارے پر تھی جہاں ہم انھیں ملنے جایا کرتے۔ بعد میں وہ کینال بینک منتقل ہو گئے۔ عمر بھر کنوارے ہی رہے۔ نظمیں، غزلیں اور ڈرامے بھی لکھے۔ انہی دنوں میں نے ہنیر یخ ہائنے کی دو نظموں کا منظوم ترجمہ کیا جو ہفت روزہ "لیل و نہار" میں شائع ہوئیں۔ صفدر صاحب نے دیکھیں تو کہا کہ ان نظموں کا ترجمہ میں نے بھی کیا تھا لیکن آپ کا ترجمہ Compact ہے! ان کے بڑے بھائی اصغر سلیم بھی شاعر تھے اور اُردو اخبار میں قطعہ بھی لکھتے۔ صفدر صاحب کا ایک خوبصورت شعر دیکھیے:

اوس کی تمنا میں جیسے باغ جلتا ہے
تُو نہ ہو تو سینے کا داغ داغ جلتا ہے

فارسی زبان میں بھی خاصی شُدبُد رکھتے تھے چنانچہ ہم نے دیوان نظیری نیشاپوری کا ایک نسخہ خرید کر انھیں گفٹ کیا جس پر بہت خوش ہوئے۔ لاء کالج میں، میں نے اور افتخار جالب نے "راوی" کی طرز پر جو پرچہ نکالا تھا اس میں صفدر صاحب نے پنجابی شاعری میں رنگوں کے ذکر پر ایک مضمون لکھا جس میں ایک خوبصورت بولی یہ بھی تھی:

سانوں مسیاچ نیّن بُھلیکھے
تیری وے سندھوری پگ دے

انہوں نے بہت سے انگریزی ڈراموں کے تراجم اور "نیلی دا اسرار" کے نام سے ایک منظوم پنجابی ڈرامہ بھی لکھا۔ ان کا نچلا ہونٹ ذرا موٹا تھا اس لیے ہم انھیں پیار سے صفدر بُھرو کہا کرتے۔

انہی دنوں بہت عمدہ شعر کہنے والوں میں جاوید شاہین بھی تھا۔ موصوف بلدیہ میں ملازم تھے، آئے دن معطل ہوتے اور حنیف رامے انھیں بحال کرواتے۔ اشعار میں وزن کی غلطیاں بھی رہ جاتیں۔ بولنے میں اٹکتے بھی تھے، منیر نیازی اس پر کہا کرتے کہ جس طرح یہ خود تھتھا ہے اس طرح اس کی شاعری بھی تھتھی ہے!

جاوید شاہین کا ایک خوبصورت شعر یاد آ رہا ہے:۔

جما ہے جو دل کے کناروں پہ خس

نشانی یہ پانی اُترنے کی ہے

منیر نیازی جو کہ شہزاد احمد سے بھی زیادہ بڑے فقرے باز تھے۔ اس لیے ان کی شاعری کی طرح ان کے لطیفوں کا بھی ہر جگہ تذکرہ رہتا۔ ٹی ہاؤس میں کم کم ہی آتے جبکہ انتظار حسین اور ناصر کاظمی وغیرہ کے لیے تو وہاں ایک مخصوص نشست ہوتی جبکہ ٹی ہاؤس میں مسلسل اور مستقل آنے والوں میں اسرار زیدی بھی شامل تھے۔ اینگری ینگ مین ڈاکٹر انیس ناگی کے ساتھ ساتھ افتخار جالب، عبدالحق، سعادت سعید، تبسم کاشمیری، ظہیر کاشمیری اور عبدالرشید زوردار بحثوں میں علیحدہ شریک رہتے۔ جبکہ خالد احمد، احمد ندیم قاسمی گروپ کی نمائندگی کرتے۔ قاسمی صاحب اور ڈاکٹر وزیر آغا چوں کہ بزرگوں میں شمار ہوتے تھے اس لیے ٹی ہاؤس کی محفلیں ان سے محروم ہی رہا کرتیں۔ جبکہ مستقل آنے والوں میں ڈاکٹر یونس جاوید بطور خاص شامل تھے۔ ایک کونے میں عارف عبدالمتین اپنے نہایت دھیمے لہجے میں کوئی بات راز کی طرح بیان کر رہے ہوتے۔

ان میں سے بہت سوں کو موت نے ہم سے دور کر دیا۔ اب ان کا حوالہ بھی کم کم ہی ملتا ہے۔ حالانکہ ان لوگوں کا جدید شعر و ادب میں ایک قابلِ قدر اور قابلِ ذکر حصہ ہے اور اُردو ادب کی جو شکل آج نظر آتی ہے یہ انہی لوگوں کی استوار کردہ ہے اور اس لحاظ سے یہ موجودہ ادب کے معمار بھی ہیں اور محسن بھی۔ میرے سمیت، اکثر لوگوں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے اس لیے ان کا حق بنتا ہے کہ انھیں یاد رکھا جائے اور وقتاً فوقتاً یاد کیا بھی جائے۔ جو لوگ ان میں سے آگے نکل گئے، انہوں نے اپنے زور پر ایسا کیا اور جو اپنی کتابوں میں زندہ ہیں، لیکن انھیں بھی ڈھنگ سے کہاں یاد کیا جاتا ہے۔ منیر نیازی اور ناصر کاظمی کی برسیاں بالعموم خاموشی سے گذر جاتی ہیں، باقیوں کا تو ذکر ہی کیا۔

ان کے علاوہ وہ لوگ بھی ہیں جو زیادہ مجلسی نہیں تھے۔ مثلاً شکیب جلالی اور ”اثاثہ“ کے لاابالی شاعر اقبال ساجد، صرف ان کی شاعری اور یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں، اور جو باقی رہ گئے اور زندہ ہیں ان کی بھی مجلسی زندگی اگر ختم نہیں تو کم ضرور ہو گئی ہے۔ ٹی ہاؤس اب بھی موجود ہے لیکن وہاں اب لوگ اتنے ذوق و شوق سے نہیں جاتے حالانکہ اس کی شکل تبدیل کر کے اسے پہلے سے بہت بہتر بنایا جا چکا ہے۔ تاہم بہت سے لوگوں کا تذکرہ باقی رہ گیا ہے جو پھر کبھی سہی۔ نیز یہ کہ اس تحریر میں شاید کچھ باتوں کی تکرار بھی ہو گئی ہو۔

وہ عشق جو اصل میں تھا ہی نہیں

ایک دن مجھے فون آیا کہ میں ملتان سے ۔ ۔ ۔ ۔ بول رہی ہوں ۔ میں آپ سے آپ کی شاعری کے بارے میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں ۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے میرا نمبر کہاں سے لیا ہے تو اس نے کہا کہ آپ کے کلیات ''اب تک'' کی پہلی جلد مجھے سالگرہ پر میری بڑی بہن نے گفٹ کی تھی اس پر آپ کے پبلشر کا نمبر تھا، جس سے آپ کا نمبر لیا ہے ۔ اس نے کہا کہ کوئی بھی ایسی شاعری نہیں کرتا جیسی آپ کر رہے ہیں ۔ میں نے کہا، مثلاً؟ تو اس نے مجھے میرا یہ شعر سنایا: ۔

یہ کیا کہ صبح کو رہ جائے پھر بھی تُو باقی
میں اپنے آپ سے شب بھر تجھے نکالتا ہوں

میں نے اسی سے اُس کے ذوقِ شعر کا اندازہ لگا لیا جس کے بعد وقتاً فوقتاً فون پر گپ شپ ہوتی رہتی ۔ اور یہ سلسلہ کوئی دو سال سے زیادہ تک چلتا رہا ۔ باہمی دلچسپی بڑھی تو میں نے اس سے کہا کہ کچھ دنوں تک ذکریا یونیورسٹی کے کچھ اساتذہ نے میرے ساتھ ایک شام منانے کا پروگرام بنایا ہے، اگر آپ کو فرصت ہو تو آ کر مل لیں ۔ اس نے کہا میں ضرور آؤں گی ۔ اس فونا فانی کا علم میری اہلیہ کو بھی تھا جنہیں اس پر بظاہر تو کوئی اعتراض نہ تھا لیکن اس موضوع پر وہ مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہتیں ۔ اس سے پہلے اُسے دیکھنے کا شوق ہوا تو میں نے اس سے تصویر بھیجنے کی فرمائش کی کہ میں اُسے دیکھ کر واپس کر دوں گا، جو اس نے بھجوا دی اور میں نے اپنی اہلیہ کو بھی دکھائی اور اُسے واپس بھی کر دی ۔

میں ملتان گیا تو میرا پوتا شہریار بھی ساتھ تھا ۔ کچھ روز پہلے وہ کہنے لگا، دادا ابو، ملتان جائیں گے تو کتنا مزہ آئے گا، جس پر میری اہلیہ نے اپنے خاص سرائیکی لہجے میں، کہ وہ بھی دل پور سے پڑھی ہوئی تھیں، کہا ''اِک تے دو!'' اب اس کا اُردو ترجمہ تو شاید اتنے کم الفاظ میں نہیں ہو سکتا ۔ خیر، ہم ملتان گئے اور اس کے ساتھ رابطہ کر کے بتایا تو اس نے کہا کہ میں آ رہی ہوں ۔ گرمی کا موسم تھا اور شدید دھوپ پڑ رہی تھی ۔ اتنے میں اُس نے میرے میزبان کو بتایا کہ میری گاڑی فلاں جگہ پر خراب ہو گئی ہے اور کوئی دوسری سواری نہیں مل رہی، چنانچہ میزبان کے کہنے پر میں نے اپنی گاڑی بھجوا دی ۔ وہ آئی تو خادمہ ساتھ تھی ۔ اس کا نقشہ میں نے بعد میں اپنے ایک شعر میں اس طرح کھینچا:

اک مولویوں کی سی عبا پہنے ہوئے وہ
اور اس میں چھپائے ہوئے تھے بال مکمل

اس کا صرف چہرہ نظر آ رہا تھا ۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد واپسی پر میں نے اُسے ڈراپ بھی کیا ۔ یہ تھی

وہ واحد ملاقات جو میری اُس کے ساتھ ہوئی۔ لیکن فون پر گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر اُس نے مجھے ایک کارڈ بھیجا جس پر کئی جگہ تھینکس اور تھینک یو لکھا ہوا تھا اور نیچے ایک کونے میں میرا ہی یہ شعر :۔

اب تو ہر شخص کی خاطر ہوئی مطلوب ہمیں
ہم کسی کے بھی نہیں تھے جو تمہارے نہیں تھے

اس سے پہلے فون پر اس کال Miss U کا پیغام بھی موصول ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ سلسلہ کم از کم 90 فیصد انٹلیکچوئل تھا۔ میری شاعری پر اس نے سیدہ سیفو کے قلمی نام سے دو مضمون بھی لکھے جو وہاں کے ایک ادبی پرچے میں شائع ہوئے۔

فونوں کی تعداد اور وقفہ جب بہت بڑھنے لگا تو میں نے اُسے کہا کہ اگرچہ ہم نہایت شریفانہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں جو کسی طور بھی قابلِ اعتراض نہیں ٹھہرتی، تاہم آپ کے بھائی اور والدہ کو اس کا علم ہونا چاہیے کہ ہمارے درمیان فون پر گپ شپ رہتی ہے لیکن اس کے انکار پر ہی میں نے کہا کہ پھر آج سے یہ سلسلہ موقوف سمجھیں۔ کیونکہ اخلاقی لحاظ سے بھی میں اسے جائز نہیں سمجھتا۔ جس پر اس نے مجھ سے کہا کہ آپ میرے ساتھ مُتعہ کر لیں۔ میں نے کہا کہ میرا عقیدہ اس کی اجازت نہیں دیتا۔ بہرحال وہ بیل منڈھے نہ چڑھی اور گپ شپ کا وہ سلسلہ جاری رہا۔ یہ ایک عجیب بات تھی کہ اس کے بارے میں مجھے کبھی کوئی غلط قسم کا خیال نہیں آیا۔

فون پر لطیفے بازی اور چھیڑ چھاڑ بھی رہتی۔ مثلاً اس نے میرا ایک تکیہ کلام پکڑا جس کا مجھے بھی احساس نہیں تھا یعنی ”میرا مطلب ہے“ چنانچہ میں نے بھی اس کا تکیہ کلام پکڑ لیا جو وہ بات بات پر کہتی ”پتہ ہے کیا؟“۔ چنانچہ میں نے اپنے اور اس کے تکیہ کلام کو ردیف بنا کر علیحدہ علیحدہ غزلیں بھی کہیں۔ وہ لوگ چونکہ ایرانی نژاد تھے اس لیے فارسی زبان اور لہجے پر اس کا عبور حیرت انگیز تھا اور میں نے اس ضمن میں واقعتاً اس سے بہت کچھ سیکھا۔ خاص طور پر فارسی میں اس کا لہجہ جو مکمل طور پر جدید ایران کا تھا۔ اساتذہ کے فارسی اشعار و جدید فارسی لہجے میں سناتی تو مزہ آ جاتا بلکہ بعض الفاظ کی حد تک اس نے میرا تلفظ درست بھی کیا۔

غرض فون پر گفتگو کا یہ سلسلہ بعض اوقات رات گئے تک چلتا رہتا۔ اس کا بیلنس ختم ہو جاتا تو وہ اپنی چھوٹی بہن کا موبائل اٹھا لاتی۔ گرمیوں میں، میں سیر کے بہانے باہر نکل جاتا اور یہی فریضہ ادا کرتا۔ ایک طرح سے ”مبتلا“ تو ہم دونوں ہی ہو چکے تھے لیکن جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں اس کی نوعیت اور سطح ایسی تھی کہ کبھی جی نہیں چاہا کہ ایک دوسرے سے بطور خاص جا کر ملا جائے۔ اور یہ میرا تجربہ ہے کہ آپ اس

جذبے کو حسب منشا محدود بھی کر سکتے ہیں اور بے لگام نہیں ہونے دیتے۔ چنانچہ دو تین سال کے اس رابطے کے دوران ہماری خط و کتابت کبھی نہیں رہی۔ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ فون جو موجود تھا۔ میں فون پر یہ ضرور پوچھ لیتا کہ اس وقت کپڑے کس رنگ کے پہن رکھے ہیں اور کیسی لگ رہی ہو؟ کھڑی ہو، بیٹھی ہو یا لیٹی ہوئی ہو وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کچھ بیان اس لیے کر رہا ہوں کہ یہ اگر عشق تھا بھی تو نہایت مختلف قسم کا۔ کسی بھی طرح کی آلودگی کے بغیر۔ اس کا اظہار اس شعر میں غالباً زیادہ صحیح طور پر ہوا: ۔

کہہ تو سکتے ہیں محبت بھی ہم اس کو، ورنہ
اپنی دانست میں ہم نے تیری عزت کی تھی

اور، میں سمجھتا ہوں کہ محبوب کی بے انتہا عزت کرنے ہی میں محبت کی سچائی پوشیدہ ہوتی ہے۔

بہر حال، میں نے ایک بار محسوس کیا کہ میری اہلیہ اس معاملے میں واقعتاً پریشان ہیں۔ اگر چہ انہوں نے کھل کر اس کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ سلسلہ ختم بھی کیا جا سکتا ہے جس کا موقع مجھے خود ہی مل گیا کہ ایک بار اس نے باتیں کرتے کرتے نیم ناراضی کے عالم میں کہہ دیا کہ اب میں آپ سے بات نہیں کروں گی۔ میں نے کہا کہ اگر آپ کریں گی بھی تو میں نہیں کروں گا۔ چنانچہ یہی کچھ ہوا۔ اس کا فون آتا اور میں وصول ہی نہ کرتا۔ حتیٰ کہ میری اہلیہ نے بھی کہا کہ بے چاری بار بار فون کر رہی ہے، اس کی بات تو سن لیں۔ لیکن میں اس موقع سے جو فائدہ اٹھا چکا تھا اسے ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا جبکہ اس بارے اس نے فون کر کے میری اہلیہ سے بھی مجھے کہلوایا۔ لیکن اپنے دل میں اتنی سختی میں نے کبھی محسوس نہیں کی، اور یہ ثابت کر دیا کہ:

از گوشۂ بامے کہ پریدیم، پریدیم

چنانچہ میں اس پر مطمئن تو تھا لیکن خوش نہیں تھا۔

بعد میں میرے کلیات کی چوتھی جلد شائع ہوئی تو اس زمانے کی غزلوں کو میں نے اس میں ایک کتاب کی صورت شامل کیا اور جو اس کے قلمی نام پر اس کے نام منسوب کی، اس شعر کے ساتھ: ۔

یہ ایک امانت ہے جس کو لوٹانا چاہتا ہوں
ترے ستارے مرے ستاروں میں رہ گئے ہیں

ساہیوال میں قیام

پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں آ کے تو شاعری کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔ وہاں ہاسٹل میں شکیب جلالی بھی ملنے آیا کرتے۔ خاموش طبع آدمی تھا۔ افتخار جالب بھی مرے ساتھ ہاسٹل میں تھا۔ وہاں سے میں

نے ”راوی“ کی طرز پر ”میزان“ کے نام سے ایک میگزین بھی نکالا جس میں افتخار جالب میرے معاون تھے۔ اس کا معیار کسی طرح سے بھی ”راوی“ سے کم نہ تھا جس میں ناصر کاظمی، انجم رومانی، شہزاد احمد، قیوم نظر اور محمد صفدر وغیرہ کی تخلیقات شامل تھیں۔ اس کا ٹائٹل رائے صاحب نے بنایا۔ ہمارے بعد شاید اس کا ایک ہی شمارہ شائع ہوا۔

ایل ایل بی کیا تو میرے پھوپھا میاں عبدالخالق مجھے اپرنٹس شپ کے لیے ساہیوال میں چودھری نذیر احمد کرنالوی ایڈووکیٹ کے پاس چھوڑ آئے۔ وہاں چونکہ چھ ماہ کے لیے مستقل قیام تھا اس لیے مجید امجد، منیر نیازی اور اشرف قدسی وغیرہ سے مستقل اور مسلسل رابطہ رہا۔ شام کو یار لوگ جوگی ہوٹل میں پہنچ جاتے اور محفل جماتے۔ مجید امجد ان دنوں محکمہ خوراک میں افسر تھے جبکہ ریلے بائیسیکل تب پرمٹ پر ملا کرتا تھا اور امجد صاحب ہی جاری کیا کرتے۔ چنانچہ ایک بائیسکل کا پرمٹ انہوں نے اپنے لیے اور ہماری درخواست پر ایک میرے اور ایک اشرف قدسی کے لیے عنایت کیا۔ وہ بائیسکل اس قدر آہستگی سے چلاتے کہ حیرت ہوتی۔

منیر نیازی ارژنگ پبلشرز کے نام سے ایک ادارہ چلا رہے تھے جبکہ ایک ہفت روزہ ”ارژنگ“ کے نام سے نکالا کرتے تھے۔ دن کے وقت ہمارا اکٹھ وہیں ہوتا۔ ایک بار بیٹھے بیٹھے منیر نیازی نے اپنی تازہ غزل سنائی جس کا ایک شعر تھا:

گئے دنوں کی! دشمنی
کہاں ہے تو، کہاں ہے تو

تو امجد صاحب نے برجستہ یہ شعر کہا اور منیر نیازی کو تحفتاً پیش کر دیا:

یہ اک خلائے دم بخود
یہ اک جہانِ آرزو

یہ شعر بعد میں شائع ہونے والے منیر نیازی کے مجموعہ کلام میں شامل تھا اور اگر وہ حاشیے میں یہ بھی درج کر دیتے کہ یہ امجد صاحب کی عطا ہے تو زیادہ بہتر ہوتا۔

امجد صاحب کی رہائش ساہیوال کی قریبی اور نو آبادبستی فرید ٹاؤن میں تھی جہاں ہم بھی حاضر ہوا کرتے۔ اسی چھوٹے سے گھر میں جب ان کی وفات ہوئی تو کوئی بھی ان کے پاس موجود نہیں تھا۔ جبکہ اہلیہ سے بہت عرصہ پہلے علیحدگی ہو چکی تھی۔ شاعر اور ادب دوست جاوید قریشی ان دنوں ڈپٹی کمشنر تھے جنہوں نے ان کی میت ٹرک پر لدوا کر مرحوم کے آبائی شہر جھنگ روانہ کی۔ ان کی وفات پر وہاں پر ادبی ریفرنس ہوا تو میں

نے بھی غزل پڑھی جس کا ایک شعر تھا۔

تری یاد میں جلسہ، تعزیت
تجھے بھول جانے کا آغاز تھا

”گلافتاب“ 1955ء میں شائع ہوئی۔ میں انہی دنوں ایک بار اوکاڑہ سے ساہیوال گیا تو امجد صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جنہوں نے کتاب چھپنے پر مبارک باد دی اور کتاب کا مطالبہ بھی کیا۔ میں نے وعدہ کیا کہ جلد پہنچا دوں گا لیکن میں بھول گیا۔ کوئی دس روز بعد جب میں گھر میں موجود تھا کہ دروازے پر گھنٹی ہوئی۔ میں باہر نکلا تو امجد صاحب کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے کہ کتاب نکالو! ان کے آنے پر میں حیران بھی ہوا اور شرمندہ بھی۔

ان کی وفات کے بعد ان کے ہم جلیس اور شاعر ناصر شہزاد نے ایک کتاب میں ان کی داستانِ عشق بہت مزے لے لے کر بیان کی جس کے وہ بقول خود عینی شاہد تھے اور جسے دیکھ کر مجھے بے حد افسوس ہوا کیونکہ امجد صاحب اس وقت زندہ ہوتے تو اس جسارت کو کبھی پسند نہ کرتے۔

انہی دنوں مصطفی زیدی بھی وہاں ڈپٹی کمشنر تعینات رہے۔ ان سے بھی گاہے بگاہے ملاقات ہو جاتی اور جو بطور خاص ”گلافتاب“ کی غزلیں سنانے کی فرمائش کرتے۔ انہوں نے وہاں پر کئی مشاعرے بھی منعقد کروائے اور ان کی وجہ سے ادبی حلقوں میں کافی چہل پہل رہی، جبکہ وہاں کے ایک شاعر حکیم، جن کا نام بھول گیا ہوں، بھی اپنے گھر پر ہر ماہ مشاعرہ کرواتے تھے جس میں جھنگ سے شیر افضل جعفری بھی شریک ہوتے۔ اسی زمانے میں وہاں کی ایک دینی اور سیاسی شخصیت مفتی ضیاءالحسن روزنامہ ”خدمت“ کے نام سے ایک اخبار نکالا کرتے جس کے ایڈیٹر اسرار زیدی تھے جو کافی عرصہ اوکاڑہ میں بھی گزار چکے تھے جہاں میں نے اپنا ”کلیات میر تقی میر“ ان کی نذر کیا کہ میں اس شاعر کے بوجھ سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ اسی طرح ”دیوانِ غالب“ مرقع چغتائی جو میں نے خاصا مہنگا خریدا تھا، کوئی اٹھا کر لے گیا جو میرے لیے کافی اطمینان بخش تھا کیونکہ میں شعر کہنے کے لیے ان دونوں کے اثر سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔

ان دنوں نذیر ناجی بھی وہیں مقیم تھے جن کے بڑے بھائی چودھری بشیر احمد وہاں ایک وکیل کے ساتھ کام کرتے تھے۔ چنانچہ میری اور ناجی کی غزلیں اور مزاحیہ مضامین روزنامہ ”خدمت“ میں چھپا کرتے۔ جبکہ اس سے بہت پہلے میرے مزاحیہ مضامین کی ابتداء منیر نیازی کے رسالے ”ارژنگ“ میں ہو چکی تھی۔ اسرار زیدی وہاں سے فارغ ہو کر لاہور چلے آئے اور پاک ٹی ہاؤس کے ہو کر رہ گئے۔ نذیر ناجی کراچی

سدھار گئے اور وہاں صحافت میں ہاتھ سیدھا کرنے لگے۔

1977ء میں وہاں ڈپٹی کمشنر مہر جیون خاں تھے۔ میں تحریک نظام مصطفیٰؐ کے سلسلے میں قومی اسمبلی کا الیکشن لڑ کر جیل گیا تو اسی زمانے میں میری غزلیں مجیب الرحمان شامی صاحب کے ہفت روزہ میں شائع ہوا کرتی تھیں جس سے مہر صاحب بہت متاثر اور خوش تھے۔ میں باہر آیا تو وہ ایک دن میرے کولیگ اور دوستوں میاں صدیق کھیانہ اور میاں خان محمد سے کہنے لگے کہ ظفر صاحب نے جیل میں شاعری بہت زبردست کی تھی، انھیں ایک بار پھر سے اندر کر دیا جائے! مہر جیون خاں جو ریٹائرمنٹ کے بعد اخبارات میں کالم بھی لکھتے رہے ہیں۔ اپنی نام نہاد سیاسی زندگی کا احوال بعد میں رقم کروں گا۔

ساہیوال سے تربیت مکمل کرنے کے بعد اوکاڑہ آ کر باقاعدہ پریکٹس شروع کر دی۔ اوکاڑہ جب ضلع بنا اور جس میں میری کالم آرائی کا دخل بھی تھا کیونکہ اس وقت کے وفاقی وزیر میاں غلام محمد احمد مانیکا جو پاکپتن سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے شہر ہی کو ضلع بنوانے پر مصر تھے اور اس سلسلے میں اپنا پورا اثر ورسوخ استعمال کر رہے تھے، تو اوکاڑہ کے پہلے ڈپٹی کمشنر طارق محمود تعینات ہوئے اور اسی زمانے میں شیخ محمد سعید بطور اسسٹنٹ کمشنر وہاں پر لگا دیئے گئے۔ دونوں ادیب قسم کے آدمی تھے اور بعد میں فکشن رائٹنگ کے حوالے سے شہرت بھی حاصل کی۔ دونوں بڑے اپ رائٹ افسر تھے اور بعد میں بھی ایسے ہی رہے۔ طارق محمود فیڈرل سیکریٹری اور شیخ سعید ممبر بورڈ آف ریوینو پنجاب کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

☆☆☆☆

اسلم کمال

شفیع عقیل

یہ واقعہ 1979ء کا ہے۔ میں اسلام آباد میں تھا۔ آدھی رات کو مجھے خبر ملی کہ چھوٹے بیٹے فاروق کمال کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ میں فوراً بس پر بیٹھا اور بس اسلام آباد سے چلی تو طوفانی بارش نے آلیا۔ جو صبح ہونے پر بھی تھمنے میں نہیں آ رہی تھی۔ جس کے سبب چیونٹی کی رفتار چلتی یہ بس صبح 7 بجے کے قریب گجرات شہر تک پہنچی۔ کچھ سواریاں اتارنے کے لیے بس اڈے پر رکی تو کانوں میں تازہ اخبار کی آواز پڑی۔ بارش کی بیزاری، سفر کی تھکن اور بیٹے کے بارے میں وسوسوں کی یلغار میں توجہ بٹانے اور وقت کٹی کے لیے کھڑکی سے باہر بازو نکال کر ہاکر سے اخبار مانگا تو اس نے پوچھا کونسا؟ میں نے کہا کوئی بھی دے دو۔ اس کے پاس بازو پر جو پلندہ تھا اس پر سب سے اوپر والا اخبار اس نے مجھے دے دیا۔ یہ اخبار ''امروز'' تھا جو اس زمانے میں مقبول ترین بڑے اخباروں میں شمار ہوتا تھا۔ جو بائیں بازو کی حکمت و دانش کا علمبردار، ترقی پسند ادب و فن کا ترجمان اور انقلاب پسند سیاست کا نقیب تھا۔

باہر بارش کا زور و شور تھا جس میں بس رینگ رہی تھی اور اندر مسافروں کی تلملاہٹیں تھیں، انگڑائیاں تھیں، چھینکیں اور اوباسیاں اس سفری ماحول کو صبر آزما بنا رہی تھیں۔ میری سیٹ کھڑکی کے ساتھ تھی۔ میں نے اس ناقابل برداشت ماحول سے پناہ پانے کے لیے اپنے اور اس کے درمیان اخبار کو پھیلا کر اس کاغذی دیوار کے پیچھے وقت کاٹنے کے لیے شروع سے لے کر آخر تک ایک ایک چھوٹی بڑی سرخبر پڑھ ڈالی۔ اخبار کے تمام اشتہارات اور ساری تصاویر بنظر غائر دیکھ ڈالیں۔ میں آج بھی پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس دن کا اخبار پہلا اور آخری اخبار ہے جو پوری زندگی میں الف سے ے تک یعنی اخبار کی پیشانی پر نام کی لوح سے لے کر آخر میں پرنٹ لائن تک میں نے حرف بہ حرف سب کچھ پڑھا تھا۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ اخبار کے پچھلے صفحے پر عین وسط میں 4×4 انچ کا ایک بلیک باکس تھا۔ جس پر سے میری نظر طائرانہ طور پر گذر جاتی یا ہر بار اس پر سے پھسل جاتی تھی۔ میں اس باکس کے اندر کا متن پڑھنا نہیں چاہتا تھا یا یہ متن

میرے مطالعے سے دور رہنا چاہتا تھا۔ چار انچ دو کالمی رقبے پر پھیلا ہوا یہ بلیک باکس ہر طرح سے نمایاں، توجہ طلب اور نگاہ گیر تھا اور اخبار کے آخری صفحے کے عین وسط میں پڑا ہوا تھا۔ اور یہ حادثے کے شکار کسی ہوائی جہاز کا بلیک باکس بھی نہیں تھا کہ اس کی تلاش میں کوئی تحقیقاتی ٹیم روانہ کی جاتی۔

قارئین! خدا خدا کر کے جب یہ بس لاہور پہنچی تو بارش بھی رک گئی اور دھوپ بھی نکل آئی۔ جب میں علامہ اقبال ٹاؤن پہنچا تو میرے گھر کے آنگن میں میرے بیٹے کو اس کا آخری سفید لباس پہنا دیا گیا تھا۔ میرے یاروں دوستوں اور احباب کا ایک ہجوم تھا۔ اور ان میں اکثریت نے میرے بچے کی فوتیدگی کی خبر ''امروز'' کے پچھلے صفحے کے وسط میں بلیک باکس میں پڑھی تھی۔

قارئین! ایک اور واقعہ آپ کی نذر کرنا چاہتا ہوں جو مذکرہ بالا واقعہ کے تقریباً تیس برس بعد مجھے پیش آیا ہے۔ میں اس وقت ملک سے باہر ہوں اور ہوٹل کی لابی میں بیٹھا ہوں اور اپنی آرٹ پر موٹر کا انتظار کر رہا ہوں۔ جو ہر دس منٹ پر فون پر اطلاع دے رہی ہے کہ وہ راستے میں ہے۔ اس لابی کے وسط میں مختلف زبانوں اور ممالک کے نمایاں اخبارات و رسائل کا ریک ہے۔ جس کی طرف میری نظر تھوڑی تھوڑی دیر بعد خود بخود اٹھ جاتی ہے اور کچھ وقت مطالعہ میں گزارنے کو جی للچاتا ہے۔ لیکن اس جس عہد میں ہم زندہ ہیں اس میں اخبارات کا مطالعہ خصوصی طور پر تسکین کی بجائے بے چینی پیدا کر دیتا ہے۔ ایسی ایسی خبریں نظر سوزی کرتی ہیں کہ قاری کے پاس عبرت اور نہ ذوق اور اس کے ہاتھ میں دنیا اور نہ دین ہی رہتے ہیں۔ باوثوق ذرائع سے بیان کردہ ہر خبر پڑھ کر ہر شے پر سے اعتبار اٹھنے لگتا ہے۔ ہر ایک خبر کے متن کے باطن سے اسلحہ سازوں اور اسلحہ فروشوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں کہ تاریخ کا مہلک ترین بم ہم نے بنا لیا ہے ہم سے خریدو یہ ہنستے بستے شہروں کے شہر لمحہ بھر میں نیست و نابود کر سکتا ہے۔ ہم سے خرید و جدید ترین راکٹ یہ انسانوں سے بھرے ہوئے میلوں لمبے بازاروں کو آن واحد میں خاک و خون میں بدل سکتا ہے۔ ہمارا میزائل وہ فخریہ پیشکش ہے جو ہنستے مسکراتے ننھے منھے بچوں کے سکولوں پر سکول آنکھ جھپکنے میں صفحہ ہستی سے مٹا سکتا ہے۔

آرٹ پر موٹر کی آمد کی اطلاع بار بار آ رہی ہے مگر وہ ابھی تک راستے میں ہے۔ چنانچہ میں بالآخر اٹھ کر اخبارات و رسائل کے ریک پر چلا جاتا ہوں۔ ملک ملک اور مختلف زبانوں کے رسائل و اخبارات پر

سے میری نظر پھسلتی ہوئی اچانک ایک اخبار پر رک جاتی ہے۔ یہ روزنامہ ''جنگ'' کراچی ہے۔ ملک سے باہر جا کر دل عجیب محب وطن ہو جاتا ہے۔ ملک کی ہر شے سے ایک اپنائیت کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ میں نے ''جنگ'' اخبار ریک سے اٹھایا اور واپس اپنی سیٹ پر آ کر مطالعہ شروع کرتے ہی ایک خبر پر نظر یوں ٹھہر گئی جیسے اس سے آگے بڑھنے یا پڑھنے کی اس کی ہمت یکدم جواب دے گئی ہو۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھا اور بوجھل قدم اٹھاتا ہوا ریک تک گیا اور ''جنگ'' جہاں سے اٹھایا تھا وہیں پر پوری احتیاط سے واپس رکھ دیا اور بجھے ہوئے دل سے اس طرح سوچنے لگا کہ یہ خبر جو میں نے پڑھی ہے اور جس کے سوا اور کوئی خبر پڑھ نہیں سکا۔ کیا میری آرٹ پر دموڑ کے اب تک نہ آ سکنے کے ساتھ اس کا کسی انداز کا کوئی تعلق ہے اور اس کے اب تک نہ آ سکنے کی حیران کن کیفیت میں جو میری نظر اخبارات کے ریک کی طرف بار بار اٹھ جاتی تھی اور میں بالآخر اٹھ کر اخباروں کے ریک تک چلا گیا۔ وہ کیا اس ایک خبر کی کشش میں چلا گیا تھا۔ کیا سارا اخبار میرے لیے اس ایک خبر میں سمٹ گیا ہے کیا یہ ایک خبر اس سارے اخبار کو میرے لیے اس لائی تک اٹھا لائی ہے؟

قارئین! خبر یہ تھی کہ شوکت تھانوی اور مجید لاہوری کے ہمعصر شفیع عقیل اس جہانِ آب و گل سے ناطہ توڑ کر ادھر کو چلے گئے ہیں۔ جدھر کو جانے والے پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کرتے۔ اس خبر پر ہی میری نظر سب سے پہلے پڑی تو میرا جی اور کچھ پڑھنے کو اس لیے نہ چاہا کہ میرے لیے اس آج کے اخبار میں اس خبر کے پائے کی کوئی دوسری خبر تھی ہی نہیں۔ شفیع عقیل اس دنیا میں تراسی برس زندہ رہا۔ اور ان تراسی برسوں میں سے تریسٹھ برس اس اخبار کی نذر اس نے کر دیئے۔ اس اخبار نے اسے پھولنے پھلنے کا موقع دیا اور جواب میں شفیع عقیل نے اس اخبار کے ساتھ وفا کا حق ادا کر دیا۔

شفیع عقیل لاہور میں پیدا ہوا اور تریسٹھ برس لاہور سے دور کراچی میں بسر کرنے کے باوجود وہ آخری دم تک پکا ''لاہوریہ'' تھا۔ دوستوں یاروں سے وہ لاہوری گرم جوشی سے یوں ملتا کہ ان کی پسلیاں چیخ اٹھتی تھیں۔ مسکراتا ہوا چہرہ، گٹھا ہوا کسرتی بدن، میانہ قد، پینٹ پر چست سی بشرٹ میں وہ ایک بے تکلف اور بیبا ختہ انسان تھا۔ لاہور میں کیولری گراؤنڈ اور اس کے آگے والٹن روڈ کے پار ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کے آغاز تک علاقے میں کہیں تھیبہ نام کا ایک گاؤں تھا جو پہلے بے چراغ ہوا پھر بے نشان ہو گیا۔ لاہور، عظیم لاہور کی وسعت میں گم ہو جانے والے اپنے گاؤں کو وہ کبھی بھول نہ پایا۔ جب کبھی لاہور آتا تو ٹھہرتا کہیں

بھی تھا مجھ سے یہ فرمائش ہمیشہ کرتا کہ میں اُسے ساتھ لیکر چھاؤنی کی طرف چلوں۔ جب ہم فردوس مارکیٹ سے آگے اوور ہیڈ برج پر سے گذر کر کیولری گراؤنڈ میں داخل ہونے لگتے تو وہ مجھ سے تصدیق چاہتا کہ ہم ریلوے پھاٹک کے اوپر سے ہی گذر کر آئے ہیں۔ پھر وہ کہتا یہ بائیں ہاتھ پر قبرستان ہے اور اس کے آگے چاند ماری ہے۔ ادھر دائیں ہاتھ آگے والٹن ائر پورٹ کے مشرق میں سول سروسز اکیڈمی اور ریلوے سکول ہے۔ بس میرا گاؤں بھی اِدھر اُدھر ہی کہیں پر تھا۔ اب وہ یہاں نہیں رہا۔ اب وہ میرے ماضی میں رہ گیا ہے!

مدیر تخلیق مرحوم اظہر جاوید کی وفات کی ٹی وی پر پٹی پڑھ کر شفیع عقیل کا فون آیا۔ یار اسلم کمال ایہہ جیڑی اے خبر ایہہ ٹھیک ہے؟ میں نے ہاں میں جواب دیا تو شفیع عقیل نے کہا اظہر جاوید میرا دوست تھا۔ میں اس کے عزیز و اقارب سے واقف نہیں ہوں۔ چلو ہم دونوں آپس میں اظہر جاوید کا افسوس کر لیتے ہیں۔ اور یوں ہم فون پر ایک دوسرے کو دیر تک پرسہ دیتے رہے۔ آج شفیع عقیل کی وفات کی خبر دیارِ غیر میں پڑھ کر میں ذہنی اور روحانی طور پر اسی تلاش میں رہا کہ کون ہے ایسا جس کے ساتھ شفیع عقیل کا افسوس کروں۔ مجھے ڈاکٹر عثمان ملک یاد آئے۔ میں نے اپنا موبائل کھنگال مارا مگر عثمان ملک کا نمبر مجھے نہ مل سکا اور یہ میرے لیے ناقابلِ فہم تھا کہ عثمان ملک کا نمبر میرے پاس نہیں۔ وہ اب لاہور میں کلینک کرتے ہیں۔ جرمنی کے شہر ڈیوس برگ میں متعدد بار میرے اور شفیع عقیل کے میزبان رہے ہیں۔ اور اب لاہور میں ان کے کلینک اور رہائش کے فون نمبروں پر ہم شفیع عقیل سے گھنٹوں گپ شپ کرتے رہے ہیں۔ آج میں دیارِ غیر میں اس کے ساتھ شفیع عقیل کا سوگ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ مگر میرے موبائل میں اس کا نمبر ہی نہیں ہے۔ مجھے اعتبار نہیں آ رہا۔ یہ ہو نہیں سکتا۔ اس کا موبائل نمبر میرے موبائل میں ضرور ہے مگر میری نگاہ میں وہ نمبر نہیں آ رہا۔ شاید میری آنکھ دھندلا گئی ہے۔

1978ء میں کراچی آرٹ کونسل میں میری مصورانہ خطاطی کی نمائش تھی۔ نمائش کے دوسرے یا تیسرے دن میں اس نئی صنفِ اظہار یعنی مصورانہ خطاطی کے شائقین کے ساتھ محوِ گفتگو تھا جن کی تعداد میں آہستہ آہستہ اضافہ ہو رہا تھا۔ اتنے میں میانہ قامت اور سیدھ و نما ایک شخص پانچ چھ لوگوں کو اپنے پیچھے پیچھے ساتھ لیے آیا اور کچھ فاصلے پر میری ایک پینٹنگ کے سامنے کھڑے ہو کر اس کے تصویری محاسن کے بارے میں گفتگو کرنے لگا۔ وہ لوگ جو اب تک میری باتیں سن رہے تھے وہ بھی آہستہ آہستہ کھسک کر اس کے گرد جمع میں شامل ہوتے گئے۔ اور میرے پاس بالآخر میرا یہی اشتیاق رہ گیا کہ یہ کون صاحب ہیں جو میرے مداحین

کو بھی کھینچ کر لے گئے ہیں۔ اور یہ کشش پھر مجھے بھی اس کے مجمع تخاطب میں لے گئی۔ وہ شخص بولتا چلا گیا، بولتا چلا گیا اور کبھی کبھی میری طرف ایک ایسی مسکراہٹ سے دیکھ لیتا تھا جس کو میں ایک طنز پہ مجھ کر کنفیوز ہوتا جارہا تھا۔ یہ میری کیفیت اس نے بھانپ لی۔ وہ اچانک میری طرف جھپٹا اور مجھے کھینچ کر اپنے ساتھ اتنے زور سے بھینچا کہ میری پسلیاں چیخ اٹھیں۔ میں ابھی اس دردناک حیرت میں تھا کہ اس نے گرفت ڈھیلی کر کے کہا یار اسلم کمال میں شفیع عقیل ہوں۔ ”ہور سنا فٹ ہے ناں؟“

شفیع عقیل سے یہ میری پہلی ملاقات تھی اور اسی پہلی ملاقات پر میں اسے یوں جان گیا جیسے اسے میں بہت پہلے سے جانتا تھا وہ تعارف کے تکلف میں نہیں پڑتا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر ہاتھ ملانے اور گلے سے لگانے میں پہل کرتے ہوئے فخر محسوس کرتا تھا۔ یہ ایک میں ہی نہیں تھا کوئی شاعر کوئی ادیب کوئی مصور یا خطاط خاص طور پر لاہور سے کراچی جاتا تو شفیع عقیل اس کی پذیرائی اسی طرح کرتا تھا۔ لاہور جس کے پھیلاؤ میں اس کا گاؤں گم ہو گیا تھا۔

شفیع عقیل میرا سامان ہوٹل سے اٹھوا کر اپنے گھر گلشنِ اقبال لے گیا۔ رات کے کھانے میں پراٹھے، مکئی کے ڈھوڈے، سرسوں کا ساگ اور گاڑھی لسی کا کھانا کھلا کر ذرا چہل قدمی کے بہانے مصور احمد پرویز کے فلیٹ میں لے گیا جو تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ یہ 1970ء کی دہائی کے آخر کا زمانہ تھا جس میں مصورانہ خطاطی اپنا آپ بطورِ فن منوا رہی تھی۔ پاکستان کے مسلمہ جدید مصور بھی اس مصورانہ خطاطی کی تخلیقی زرخیزی کے اپنے اندر سے قائل ہو چکے تھے۔ مگر چونکہ خطاطی اور مصورانہ کے تہذیبی اور تاریخی تانے بانے میں سلکِ زریں کی حیثیت میں اسلامی فکر ہے جس کے حوالے سے وہ اقرار باللسان یا اقرار بالعمل سے گریزاں تھے کہ یوں وہ فیشن کی چمک دمک سے خارج ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ اپنی پرائیویٹ مجالس میں اس خطاطی اور مصورانہ خطاطی کو کتابت کہہ کر کاتبوں کی کاریگری اور کارگذاری سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ مسلم معاشروں کے اس معجزاور عظیم ترین فن اور اس کے تخلیقی امکانات کو نشانہ تضحیک بنانے والوں میں کراچی کی انڈس آرٹ گیلری کے مالک علی امام پیش پیش تھے۔ یہ فلیٹ جس میں احمد پرویز رہ رہے تھے یہ فلیٹ احمد پرویز کی ملکیت تھا کہ نہیں یہ تو مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ اس کے بارے میں اس وقت احمد پرویز کسی قانونی سقم یا مالی نادہندگی کے باعث سخت تشویش میں مبتلا تھا اور بیدخل کر دیئے جانے کے خطرے سے بھی دوچار تھا۔ شفیع عقیل نے اسے ایک بڑھیا تھمائی۔ جسے لے کر وہ ساتھ کے کمرے میں جا کر چند لمحوں

بعد واپس آیا تو اس کے ہونٹوں میں سگریٹ تھا جس کو سلگا کر اس نے سوٹا مارا تو اس کی بجھی بجھی اور مضمحل طبیعت میں دیکھتے ہی دیکھتے ایک ترنگ نظر آنے لگی اور احمد پرویز لندن میں گذارے ہوئے شب و روز کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے کرتے اپنے عہدِ شباب میں جا پہنچا۔ وہاں سے واپس لوٹا تو ایک رجحان ساز مصور کے طور پر اس کی فنکارانہ حیثیت مسلمہ ہو چکی تھی۔ مگر اب پیرانہ سالی بھی اس فلیٹ میں خیریت و عافیت کے لیے اس کی طرف جن سوالیہ نظروں سے دیکھتی تھی۔ فنکار کو اس تحقیر کا احساس ہو گیا۔ جس کے ردعمل میں ہماری موجودگی میں اس کی فنکارانہ انا بیدار ہونے لگی۔ وہ ہمیں ساتھ کے کمرے میں لے گیا جو اس کے بقول اس کا سٹوڈیو تھا۔ جس کی ایک دیوار کے وسط میں دروازہ تھا۔ جس کی بالائی چوڑائی پر اس کے برابر نصف دائرہ لگا کر دروازے کو محراب کی شکل دی گئی تھی۔ اس محراب کے ارد گرد احمد پرویز نے اپنے مخصوص اسلوب کے تصویری اجزاء سے ملتے جلتے حروف و الفاظ میں آیاتِ قرآنیہ کی خطاطی کی ہوئی تھی۔ ہمارے معاشرے میں فنکار اکثر مفلوک الحال ہوتے ہیں یا پھر ازخود ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ قانونی عدم استحقاق یا مالی نادہندگی کے باعث احمد پرویز کو خطرہ لاحق تھا کہ کسی بھی وقت اس فلیٹ سے اس کو بیدخل کیا جا سکتا ہے۔ اس خدشے اور خوف کے بھنور میں احمد پرویز کو بھی کسی تنکے کے سہارے کی تلاش تھی۔ چنانچہ اس نے جو دروازے کو محراب بنا کر اس پر آیاتِ قرآنیہ لکھی تھیں ان کے تقدس اور تکریم کے روحانی بھروسے پر وہ اس فریبِ گماں میں ہماری تائید اور ہماری طرح دوسرے ملنے والوں کی بھی تائید سے ایک حوصلہ کشید کرتا تھا کہ اس کو اس فلیٹ سے بیدخل نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ وہ ایک مستند اور مشہور مصور ہے۔ اس فلیٹ کی دیوار پر یہ شہکار اس کی تخلیق اور ملکیت ہے اور یہ انمول ہے اور جس دیوار پر ہے وہ دیوار ناقابلِ انتقال ہے۔ اس دیوار کو یہاں سے کہیں اور منتقل نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اس کو بھی اس فلیٹ سے بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔ اسی احمد پرویز کو جاپان میں نمائش کی دعوت ہمارے متعلقہ پاکستانی سرکاری ادارے نے اس کی رہائش پر اس وقت پہنچائی جب اسے آسودۂ خاک ہوئے پورے چھ ماہ گذر چکے تھے۔

احمد پرویز کا اسلوبِ مصوری ہلکے برش کے قط سے رنگ اٹھا کر بل کھاتے لہراتے باہم کو فراری خطوط سے عبارت ہے۔ جن کا بصری میزانیہ مرکزِ نگاہ بننے کی خاصیت رکھتا ہے۔ بعد میں گل جی نے ہلکے برش کی جگہ بھاری برش کو بھاری رنگوں سے آلودہ کر کے کینوس پر اس کو جھاڑو کی طرح چلا کر خطاطی کی نزاکت اور شناخت کو غبار میں اڑا دینے کی کوشش کی ہے۔ خطاطی کے تاریخی اور تہذیبی تانے بانے میں

اسلامی سلکِ زریں کے لازمی وجود پر ناک بھوں چڑھانے والوں کے لیے گل جی کا یہ کارنامہ باعثِ تسکین ہے۔ شفیع عقیل نے اپنی کتاب "چار جدید مصور" میں احمد پرویز پر بھرپور لکھا ہے۔ اس کتاب میں باقی تین مصور قطب شیخ، انور جمال شمزا اور علی امام ہیں۔ علی امام سے ملنے ہم دونوں انڈس آرٹ گیلری گئے۔ ملاقات کافی طویل رہی۔ معاصر مصوری اور اس کے نو بہ نوامکانات پر مختلف پہلوؤں سے گفتگو ہوئی۔ علی امام اردو اور اردو سے زیادہ انگریزی میں گفتگو کا فن خوب جانتے تھے اور یہ فن ان کی انڈس آرٹ گیلری کو تجارتی تقاضوں کے مطابق چلانے میں ان کے بہت کام آیا۔ اور اسی حوالے سے یار لوگ علی امام کو آرٹسٹ سے زیادہ آرٹ کا آڑھتی شمار کرتے تھے۔ موصوف کی ڈرائینگ خاصی کمزور تھی انسٹنٹ فیم کے لیے کسی بہانے کی تلاش میں رہتے تھے اور اسی کمزوری کے نتیجے میں کینوس پر رنگ کے سنگ خیال کی بصری تجسیم تک رسائی کے لیے ان کے خرام میں خوف اور بیدلی پائی جاتی ہے۔ ان کے طرز احساس اور طرز فکر میں اسی منفی نوع کے کئی عوامل جمع ہو گئے تھے جن کے نرغے میں موصوف کو خطاطی اور مصورانہ خطاطی سے خدا واسطے کا بیر تھا اور تو اور وہ اقبال مہدی جیسے بے مثال مصور کو سرے سے مصور ہی نہیں مانتے تھے۔

شفیع عقیل نے مصور اور مصوری پر بے شمار کالم، لاتعداد مضامین اور پانچ شاندار کتابیں لکھی ہیں۔ پاکستانی مصوری پر اس کے اس احسانِ عظیم کے اعتراف میں راقم نے اپنی ناچیز رائے میں شفیع عقیل کو پاکستانی مصوری کا ویساری (vasari) کہا۔ ویساری اطالوی مصور اور معمار تھا لیکن اطالوی مصوری کی نشاۃ ثانیہ کا سب سے معتبر مورخ تسلیم کیا جاتا ہے۔ شفیع عقیل کو ویساری کہنے پر پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فنونِ لطیفہ اور نیشنل کالج آف آرٹس کے کچھ بے توفیق مدرسوں نے بہت بُرا منایا تھا۔ ظاہر ہے انھیں ایسا کرنے سے کون روک سکتا ہے۔

قارئین! میں چاہتا تھا کہ شفیع عقیل کو ویساری قرار دینے والی اپنی وہ مطبوعہ رائے آپ کی نذر کروں۔ جس کا مطالعہ آپ کو پاکستانی ادب اور ادیب، صحافت اور صحافی اور مصوری اور مصور کے باب میں شفیع عقیل کی خدمات کا اندازہ کرنے میں سہولت فراہم کرسکتا ہے۔ میں اس غرض سے پرانے کاغذوں کا ایک انبار الٹنے پلٹنے میں گھنٹہ بھر صرف کر کے مایوس ہونے ہی والا تھا کہ یکدم میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ کاغذ جو مطلوب تھا وہ تو نہیں مل۔ کا البتہ ایک اور قیمتی کاغذ میرے ہاتھ آ گیا ہے۔ میری آنکھیں نم آلود ہو گئی ہیں۔ یہ نمی لمحاتی ہوسکتی ہے اور اس نمی میں گھلتی ہوئی کہانی میں کوئی طویل کہانی نہیں ہے۔ بلند پایہ اردو

شاعرہ محترمہ ادا جعفری کے دیور قمر جعفری میرے دوست ہیں۔ 1983ء میں وہ میری کچھ پینٹنگز برائے فروخت کراچی لے گئے۔ انہوں نے مجھے فون کیا کہ ایک پینٹنگ بِک گئی ہے۔ میں نے جواب میں کہا کہ میرے بھائی شفیع عقیل کو دے دیں۔ شفیع عقیل نے وہ پینٹنگ مجھے بذریعہ پی آئی اے (کارگو) بھجوادی۔ جس پر =/45 روپے خرچ آیا تھا۔ میں نے -/45 روپے کا چیک شفیع عقیل کو شکریے کے ساتھ بھجوادیا۔ 1998ء میں کوالالمپور ملائشیا میں "اقبال اور ایشیائی نشاۃِ ثانیہ" کے عنوان سے کانفرنس میں اپنی مصوری کی نمائش کے بعد واپسی پر میں کراچی میں شفیع عقیل کے ہاں ٹھہرا۔ ایک مناسب موقعہ تلاش کر کے مجھے بتایا اس نے کہ وہ پندرہ برس پہلے میں نے جو =/45 روپے کا چیک اُسے بھجوایا تھا وہ ڈِس آنر ہو گیا تھا۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے کہا یہ چیک بھیجتے ہوئے تمہیں یاری دوستی کا خیال نہیں آیا تھا۔ تمہارا یہ چیک کسی بینک نے بے توقیر نہیں کیا۔ اسے ڈِس آنر میری عزتِ نفس نے کیا ہے! یہ لو اسے سنبھال لو۔

شفیع عقیل اردو اور پنجابی میں لگ بھگ پچاس کتب کا مصنف ہے۔ وہ ایک باوقار اور قابلِ رشک ادیب، شاعر، محقق، نقاد، مبصر اور صحافی ہی نہیں تھا بلکہ فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، غالب عرفان، سراج منیر، حسینہ معین، عبیداللہ علیم، محسن بھوپالی، محمد عمر میمن، غازی صلاح الدین جیسے کتنے ہی اور اعلیٰ لوگوں کو عظمت کا راستہ دکھانے والا بھی تھا۔

قارئین! عظیم لاہور کی بے کراہ وسعت میں بے نشان ہو جانے والے ایک پسماندہ گاؤں میں پیدا ہونے والا محمد شفیع کسی سکول میں طالب علم بن کر داخل نہ ہو سکا۔ البتہ ایک سکول کے سامنے خوانچہ لگایا اور ریل کی پٹڑیوں سے کوئلے چن چن کر بیچے اور روٹی کمائی۔ قیامِ پاکستان پر بھارت سے آنے والی گاڑیوں میں بھرے ہوئے مردے اپنی پیٹھ پر لادنے کی مزدوری کی۔ اُس نے اپنے گاؤں کی ٹاہلیوں، دریکوں اور بیریوں کی چھاؤں میں کتابیں پڑھیں۔ 1942ء میں ادیب عالم اور 1949ء میں اُس نے منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ اُس نے علم کو ایک مشن سمجھ کر حاصل کیا تھا۔ اسی باعث اس کی شخصیت کی دیواروں میں بی اے، ایم اے، اور پی ایچ ڈی جیسی ڈگریوں کے لیے کسی حسرت یا کسی لالچ کی کوئی درز پیدا ہوئی نہ کوئی دراڑ پڑ سکی۔ اُسے آخری سانس تک اپنے پینڈو ہونے پر فخر رہا۔ وہ تکلف سے لاتعلق اور تکبر سے ناآشنا رہا۔ وہ دوستوں کا دوست اور یاروں کا یار تھا۔ وہ صرف اور صرف محمد شفیع تھا۔ جس کا ادبی نام "شفیع عقیل" اور

قلمی نام ”شین عین“ تھا۔ وہ مسکرا کر بازو پھیلا کر ملتا تھا اور پوچھتا تھا: ”اور شاہ جی فٹ ہیں ناں؟“ وہ یہ کہہ کر بچھڑ جاتا تھا: ”اچھا شاہ جی رب راکھا“۔

☆☆☆☆

محمد حمید شاہد

چوتھا کونا، دھندلا خاکہ اور احمد ہمیش

یہ کوئی بیس بائیس سال پرانا واقعہ ہے؛ جون کا مہینہ تھا۔ شاید دوسرا ہفتہ رہا ہو گا میں اندرون سندھ سے گھومتا اور وہاں کی شدید گرمی سے اُکتایا ہوا کراچی پہنچا تھا اور خواہش کرنے لگا تھا کہ کراچی کے کچھ ادبی دوستوں سے ملاقات ہو جائے۔ کیسے؟ کہ میرے پاس کسی کا فون نمبر تھا، نہ اتا پتا۔ خیر اُن دنوں، محمود واحد کا ”آئندہ“ باقاعدگی سے نکل رہا تھا۔ یاد آیا اُن کا ایک پرچہ، میں گھر سے نکلتے ہوئے بیگ میں ڈال لایا تھا؛ اُسے نکالا۔ وہاں محمود واحد کا فون نمبر موجود تھا۔ اُنھیں فون کیا۔ اگلے ایک گھنٹے میں وہ لیاقت آباد چورنگی ڈالمن آرکیڈ میں میرے پاس تھے۔ اور پھر ہم شہر میں جس آدمی کی طرف جا رہے تھے۔ محمود واحد کا کہنا تھا؛ اس نے شہر میں کسی سے بنا کر نہیں رکھی ہوئی تھی۔ ناظم آباد کے علاقے میں سیڑھیاں چڑھ کر ایک چھوٹے سے کمرے میں میری ایک ایسے شخص سے ملاقات ہونا تھی، جس کے بارے میں میں اب یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے آپ میں کناروں تک بھرا ہوا تھا۔ میں نے اس شخص کے نام کی گونج ادبی دنیا میں سن رکھی تھی اور اب اُسے دیکھنے کے لیے مشتاق تھا۔ میں یاد کرتا ہوں کہ میں کمرے میں گھسا تھا؛ ایک ایسے کمرے میں جس میں کسی بھی اور شخص کے گھس بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ میں تصور کر سکتا ہوں کہ وہ سامنے تھا؛ مناسب قامت اور اُلجھے ہوئے بالوں والا۔ بالکل اسی کمرے جیسا تھا جس میں کوشش کر کے میں اندر گھس گیا تھا۔ جی، ایک ایسا کمرہ جس کا اپنا خستہ پن اس کی دیواروں میں، کرسیوں اور میز میں، کتابوں اور رسالوں میں، حتی کہ فرش اور چھت میں بہت شدت سے بھرا ہوا تھا۔ ویسا کمرہ ”تشکیل“ کے دفتر کے سوا کسی کا ہو ہی نہیں سکتا

تھا اپنے آپ میں بھرا ہوا۔

اب مجھے یاد آتا ہے کہ تب میری احمد ہمیش سے ملاقات نہ ہوئی تھی یہ تو ایک آدھ سال بعد ہوئی تھی جس میں میرا تخیل ہر بار کاٹ پھانس کر دیتا ہے؛ یوں جیسے احمد ہمیش وہیں تھے؛ اس کمرے میں جو تشکیل کا دفتر تھا اسی کا حصہ۔ خیر واقعہ یہ ہے کہ احمد ہمیش وہاں نہیں تھے۔ وہاں تو ایک منحنی سی سانولی سی، چھوٹے قد والی لڑکی تھی انجیلا؛ اور اس نے بتایا تھا کہ بابا آنے ہی والے تھے؛ اس نے اصرار کیا تھا کہ ہم بیٹھیں وہ آئیں گے تو بہت خوش ہوں گے مگر محمود واحد وہاں رُک جانے کو تیار نہ تھے۔ ہم واپس آ گئے۔ بعد والی ایک ملاقات ہر بار اس میں مدغم ہو جاتی ہے۔ جی احمد ہمیش سے ایک اور ملاقات؛ جو ہمیشہ والی "میں" سے پوری طرح اور پنجابی محاورے کے مطابق "لتر لتر" کر بھری ہوئی تھی۔

تو یوں ہے کہ جس احمد ہمیش کو میں جانتا ہوں وہ زہر میں بجھا ہوا نشتر تھا۔ اس کے جریدے "تشکیل" کی پیشانی پر ایک اصطلاح لکھی ہوئی ہوتی تھی "شاک انگیز"۔ تو ایسا ہے کہ اس کی شخصیت بھی شاک انگیز تھی۔ مجھے یاد ہے کہ احمد ہمیش سے بعد والی ملاقات کے بعد میری جو دو ملاقاتیں ہوئی تھیں ان دونوں کا منشا یاد کا حوالہ آ جاتا ہے۔ ان آخری دو ملاقاتوں میں پہلی "آدھی ملاقات" تھی اور اس کا سبب منشا یاد کا ایک ایسا بیان بنا تھا جسے میں وعدہ معاف کی گواہی سے تعبیر دیتا آیا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ منشا یاد نے علامت نگاروں اور تجرید نگاروں کے ساتھ ان جیسا افسانہ بھی لکھا مگر یہ ان کا غالب رجحان نہیں تھا۔ میرے افسانوں کے دوسرے مجموعہ "جنم جہنم" پر لکھتے ہوئے تو وہ اس علامتی اور تجریدی افسانے پر لگ بھگ برس پڑے تھے۔ منشا یاد نے ستر کی دہائی کو افسانے سے کہانی کے برگشتہ ہونے کا زمانہ قرار دیا تھا کہ بہ قول ان کے اس زمانے میں زوال آمادہ لکھنوی شاعری کی یاد پھر سے تازہ ہونے لگی تھی؛ داستانوی صنائع بدائع کی جگہ صفت در صفت اور لفظی بازی گری کا احیاء ہو گیا تھا اور نئے افسانے کے نام پر اتنی لفظی پتنگ بازی ہوئی کہ آسمان ڈھک گیا۔ تب پلٹ کر دیکھا گیا تو وہاں نقاد تھا نہ قاری۔ منشا یاد نے تب احمد ہمیش کے ہاں محض "مکھی" کے بچ رہنے کی بات کی تھی۔

اس بیان پر مجھے دو شدید ردعمل موصول ہوئے؛ ایک خالدہ حسین کا کھلا خط جس میں مدلل بات کی گئی تھی اور دوسرا احمد ہمیش کا زہر بند خط۔ خالدہ حسین کا کھلا خط میں نے "استعارہ" میں چھاپ دیا تھا۔ اور احمد ہمیش کا زہریلا خط جس میں پنڈی افسانے کے سکول پر شدید حملے کیے گئے تھے اور انہیں حشرات الارض کہہ کر پکارا

گیا تھا، میں پی گیا۔ پھر بیچ میں کئی سال بیت گئے اور ہماری آخری ملاقات اسلام آباد میں ہوئی۔ اکادمی ادبیات نے ادبیات کا نثری نظم (کہ جسے میں بہ اصرار نثم کہتا ہوں) پر ایک خاص نمبر شائع کیا تھا اور اسی سلسلہ کی ایک تقریب ان کی صدارت میں ہوئی تھی۔ میں اس تقریب میں نہیں گیا تھا تاہم اسی روز منشا یاد کے ہاں ”افسانہ منزل“ میں ہم اکٹھے ہوئے تھے۔ تب وہ اسی پنڈی سکول اور منشا یاد کے گن گا رہے تھے اور مجھے بھی لائق اعتنا جانا تھا۔ یہ الگ بات کہ میں ہمیشہ ”تشکیل“ میں چھپنے سے مجتنب رہا۔ تشکیل، جس پر میرا خیال ہے ”ہمیشت“ کی ایسی چھاپ تھی کہ کسی اور کا تخلیقی وجود پوری طرح اس کے اوراق میں سانس نہ لے پاتا تھا۔

احمد ہمیش کا نام انور سجاد، رشید امجد، سریندر پرکاش اور بلراج مینرا کے ساتھ لیا جاتا رہا مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ ان کے ساتھ بریکٹ ہونے پر چڑتے تھے۔ انہیں اپنی بالکل الگ شناخت پر اصرار تھا۔ قیام پاکستان کے بعد، وہ ہجرت کر کے ادھر آئے اور بوجوہ واپس چلے گئے۔ دوبارہ آئے تو کراچی میں بس گئے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”مکھی“ 1955 میں حیدرآباد دکن سے چھپا تھا۔ میں نے یہ مجموعہ نہیں دیکھا تاہم اس میں شامل افسانہ ”مکھی“ کو ان کے دوسرے مجموعہ ”کہانی مجھے لکھتی ہے“ میں پڑھا جو 1970 میں چھپی تھی۔ یہ کہانی بھی اس مجموعہ میں بھی شامل کر لی گئی تھی۔ کہتے ہیں افسانہ ”مکھی“ پہلی بار شائع ہوا تو خوب ہنگامہ اٹھا تھا۔ کہا گیا ایک نیا اسلوب وضع ہو گیا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے احمد ہمیش کو کلٹ آف اگلی نیس کا نمائندہ افسانہ نگار کہہ کر سب سے الگ دکھایا تو احمد ہمیش کو اس طرح الگ ہو کر دکھنا اچھا لگا تھا۔ پھر وہ ساری عمر اسی فضا میں رہے۔ افسانہ ”مکھی“ کی فضا کیا تھی؛ تعفن، بدبو، فضلات، غلاظت اور کثافت۔ رذیل جذبوں سے لتھڑے ہوئے آدمی کا ظاہر نامہ۔ خبث، ذلالت اور کمینگی سے بھرا ہوا باطن۔ تو یوں ہے کہ ایک مہذب صاف ستھرے ماحول کی ضد اور صاف ستھرے ماحول کی تکفیر۔

خیر بات ہو رہی تھی احمد ہمیش کے افسانے کے سروکاروں کی تو ایسا ہے کہ انہوں نے ”1970 کے بعد نئی اردو کہانی“ کا عنوان جما کر لکھا تھا:

> ”دھیان سے دیکھا جائے تو برصغیر میں بسنے والے باشندوں کو اجتماعی بے گھری کا پہلا تجربہ تو ”نمرش وردہن کی موت کے بعد ہوا تھا۔ دوسرا تجربہ بہادر شاہ کے زوال کے بعد ہوا، تیسرا تجربہ برصغیر کی تقسیم کے نتیجے ہوا اور چوتھا تجربہ مشرقی پاکستان کے انقطاع کی صورت میں ہوا اس طرح ہجرت کا کشادہ و وسیع کینوس مزید وسیع ہوتا چلا گیا۔

‘‘

بچھڑنا اور بچھڑتے چلے جانا اور وہ بھی ایک وسعت بھرے تناظر اور پھر ملنا ایک تنگ نائے میں، یا ایک اندھیری کوٹھڑی کی سی ہڈیوں کے اندر ریخ کی طرح گھس جانے والی زندگی میں تو یہ احمد ہمیش کا تخلیقی مسئلہ بنا۔ میں نہیں سمجھتا کہ احمد ہمیش کی کہانی اسٹریم آف کانشس نیس کی کہانی ہے کہ واقعہ اس میں سے منہا نہیں ہوتا۔ ہاں وہ موجود کو بہت پیچھے اور بہت گہرائی میں جا کر دیکھتا جو دیکھتا اس میں اپنا گہرا حزن، شدت بھرا ملال اور تندی والا احتجاج اپنے وجود سے نکال کر بھر دیا کرتا تھا اتنا کہ بسا اوقات پڑھتے ہوئے اُسے برداشت کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ احمد ہمیش نے ’’اپنے افسانے ’’پل اینڈ پش‘‘ آسمان کی طرف حسرت سے دیکھا تھا اور اس پر تعجب کا اظہار کیا تھا کہ ’مملکت میں کوئی آدمی طبعی موت نہیں مر رہا تھا لوگ اچانک غائب ہو جاتے تھے۔‘ مرنے والوں، غائب ہونے والوں اور مارنے والوں یا غائب ہونے والوں کا پتہ نہ چلتا تھا‘ کہانی میں یہ محمد تغلق کا زمانہ تھا اور اب پڑھتا ہوں تو مجھے آج کا زمانہ لگتا ہے۔ احمد ہمیش کے افسانے کی مملکت ’’کرائے کی مملکت‘‘ تھی جس میں قرض پر قرض لیا جا رہا تھا۔ شہریوں کی ریڑھ کی ہڈیوں کا گودا بھی ٹیکس میں جا رہا تھا اور کسر رہ گئی تھی تو یہ کہ پیدا ہونے سے بہت پہلے پیٹ والیوں کے پیٹ سے حمل نکال لیے جائیں؛ تو یہ تھا تب کا منظر نامہ مگر کیا اس میں ہڈبیتی اور آج کا منظر نامہ بھی شامل نہیں ہو گیا ہے۔ سو ایسے زمانے میں کہ جب طبعی موت نہ مرنے کا چلن ہو چلا ہے احمد ہمیش طبعی موت مر گئے ہیں۔ شاک انگیز زمانے میں طبعی موت۔

تاہم ماننا ہوگا کہ جدید افسانے کا ایک اہم حوالہ احمد ہمیش بنے اور جب وہ مر گئے تو خبر کی سرخی جمائی گئی ’’مکھی کے خالق احمد ہمیش انتقال کر گئے‘‘۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کے لیے ’’اُردو افسانے کی روایت‘‘ مرتب کرتے ہوئے، عین اس زمانے میں کہ جب احمد ہمیش کا خوب خوب چرچا تھا، مرزا حامد بیگ نے اُن کی اسی کہانی کو اس انتخاب میں جگہ نہ دی تھی؛ اس کہانی کو نہ کسی اور کہانی کو۔ اور ہمارے احمد جاوید نے جب ’’منزل‘‘ کے لیے افسانوں کا ایک انتخاب کیا تو ’’مکھی‘‘ یا احمد ہمیش کی کوئی کہانی اس میں بھی نہ تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے آج ’’کل کا جدید افسانہ‘‘ موضوع نہیں بن پا رہا ہے۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ ’’مکھی‘‘ اُردو افسانے کی تاریخ کا حصہ بن گئی ہے؛ جی اردو افسانے کی تاریخ اور روایت کا حصہ؛ بالکل ایسے ہی جیسے علامتی اور تجریدی افسانہ لکھنے والے چاہے، جیتے جی مضمحل ہو کر ایک طرف بیٹھ گئے ہوں

مگران کا تجربہ تاریخ کا حصہ ہے اور کچھ اخذ بھی کرنے والے اس سے بھی اخذ کر رہے ہیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ جس طرح علامت لکھنے والوں کی زندگی میں ہم نے علامتی افسانے کو لگ بھگ الگ تھلگ کر دیا ہے احمد ہمیش کو بھی ان کی زندگی میں الگ تھلگ کرنے کا بلکہ سچ کہوں تو بھلا دینے کا سلسلہ آغاز پا چکا تھا۔ مگر کیا مرنے کے بعد یہ افسانہ نگار ققنس کی طرح اپنی ہی راکھ سے پھر سے جی اُٹھنے کی سکت رکھتا ہے یہ سوال اب ہمارے سامنے ہے۔ ”ہمیش نظمیں“ والے احمد ہمیش کی ایک نثری نظم 1962 ماہنامہ ”نصرت“ لاہور میں چھپی تھی، جو بہ قول ان کے انہوں نے 1961 میں لکھی تھی اور جسے وہ اس دعوی کے ساتھ پیش کرتے رہے کہ یہ اردو میں پہلی نثری نظم تھی اور اسی کی بنیاد پر وہ اس صنف کے بانی ہونے کے مدعی تھے۔ وہ فن پارہ یوں تمام ہوتا تھا:

”سا چھٹنان کے تیسرے کونے میں پہلی دھوپ چمکنے لگی
پہلا کونا دوسرے کونے کا دشمن ہے
اور چوتھے کونے میں دھندلے خاکے ہیں“

اِسی چوتھے کونے میں احمد ہمیش کا دُھندلا خاکہ پڑتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانے ”اگلا جنم“ میں ایک سطحی سورج کی بات کی تھی جو چار ارب آدمیوں، ان کے جانوروں، کیڑے مکوڑوں اور نباتات پر چمکتا ہے انھیں سطحی بنانے کے لیے اور پھر بجھ جاتا ہے، دن کے معنی بدلنے کے لیے۔ احمد ہمیش کا کہنا ہے ”رات کے معنی ان گنت احمقوں کی نیند ہے“۔ اس افسانے میں اس نے عمروں کے ختم ہونے کی بات کی اور موت کی ڈپلومیسی کی بھی، پھر افق کا ذکر چھیڑا جسے موت کھڈ یعنی کھائی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اور اس کھائی کا بھی ذکر ہوا جو موت کی عطا سے افق ہو جاتی ہے۔ مجھے یہ کھائی اسی نظم کا چوتھا کونہ لگی تھی۔ احمد ہمیش کی کہانی ”اگلا جنم“ ہمیں ایک کھائی کے کنارے لا کھڑا کرتی ہے۔ ایسی کھائی جس میں بہت شور تھا۔ پھر اُس میں سے شانتی کا ایک چہرہ نکلتا ہے۔ یوں کہ ہم سب اُسے دیکھنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں پھر وہ ہمارے لیے اوجھل ہو جاتا ہے۔ احمد ہمیش نے اس کہانی کے آخر میں ایک جملہ لکھا تھا وہی مقتبس کرنا چاہتا ہوں۔ یاد رکھیے ایک کھڈ؛ شور بھرا۔ ایک چہرہ جسے ہم دیکھنے پر مجبور تھے۔ اور پھر اس چہرے کا نظروں سے اوجھل ہونا۔ افسانے کے عین مین الفاظ یوں ہیں:

”کیا وہ میں تھا یا میرا اگلا جنم“

اردو کی پہلی نثری نظم/نثم کے چوتھے کونے میں احمد ہمیش کا ڈھندلا خاکہ پڑتا ہے اور اس عہد کے افسانے کا قصہ بھی۔ اور ایک فاصلے سے ہی سہی مگر میں اس دھندلے خاکے سے اور ہرائے ہوئے قصے سے خود کو جڑا ہوا پاتا ہوں۔ تجزیہ کرنے والے صاف صاف لفظوں میں کہنے لگے ہیں کہ کہانی کے اس اگلے جنم میں، احمد ہمیش کا خام تجربہ کہانی کا باطن بنانے کے لیے اب تخلیقی سطح پر برتا جانے لگا ہے۔ وارث علوی نے ترقی پسند افسانے کو سات موٹی گایوں کا خواب لکھ رکھا ہے اور علامتی تجریدی جدید افسانے کو سات دُبلی گایوں کا کابوس۔ انہوں نے یہ بھی تو کہا تھا: جدید افسانے میں کہانی کی دُم غائب، مواد پتلا اور کردار ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو جاتے ہیں۔ جب آج کے افسانے میں کہانی مکمل ہو کر اس عذاب سے نکل آئی اور اس نے ترقی پسندوں کے مرغوب ''موٹاپے'' کو پرے دھکیل کر اپنا بیانیہ چست اور باطن گہرا کر لیا تو ہمارے محترم رشید امجد کہنے لگے: ''افسانے میں کہانی لوٹ آئی ہے''۔

افسانے میں کہانی کی واپسی؟ ؛جی درست، مگر یہ محض کہانی کی واپسی نہیں ہے۔ دیکھیں تو، واپس آنے والی کی رگوں میں تو گہری رمزیت لہو بن کر دوڑ رہی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں یہی رمزیت گزر چکوں کا مسئلہ بھی تو تھی۔ بجا، اُن کا مسئلہ تھی مگر وہ ادبدا کر کہانی کو ٹھکراتے ہوئے اس مسئلے کے مقابل یوں ہوتے تھے کہ کہانی کا اسٹرکچر ریزہ ریزہ ہو جاتا جب کہ آج کا افسانہ نگار کہانی سے جڑتا ہے اور اُسے نہ صرف اسے جوڑے رکھتا ہے، متن کا ڈیپ اسٹرکچر بناتا اور اس میں رمزیت تہہ در تہہ بچھاتا چلا جاتا ہے۔ تاہم ماننا ہوگا کہ ماقبل افسانے کا تجربہ اس باب میں خوب خوب کام آ رہا ہے۔ سو یوں ہے کہ ''افسانے میں کہانی کی واپسی''/''افسانے کا نیا جنم''، احمد ہمیش اور اس کے عہد کی کہانی یا ان سے بھی پہلوں کی کہانی کا اگلا جنم تو بالکل نہیں ہے؛ ہاں افسانے کا ایسا جنم ضرور ہے جو احمد ہمیش، اُن کے ہم عصروں یا پہلے گزرنے والوں کے ذکر کے بغیر بہر حال مکمل نہیں کہا جا سکتا۔

☆☆☆☆

عقیل عباس جعفری

پٹیالہ گھرانا

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد جب مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوا تو اس سے وابستہ فن کاروں نے مختلف ریاستوں اور رجواڑوں کا رخ کیا، جہاں ان کے فن کی بڑی پذیرائی ہوئی اور پھر یہ فن کار انھی ریاستوں اور رجواڑوں کے ناموں سے پہچانے جانے لگے۔

موسیقی کی ترویج وترقی میں پنجاب کی مختلف ریاستوں اور رجواڑوں نے بے حد اہم کردار ادا کیا۔ یہاں موسیقی کے جن گھرانوں نے عروج پایا ان میں تلونڈی، شام چوراسی، ہریانہ اور کپورتھلہ گھرانوں نے دھرپد اور پٹیالہ اور قصور گھرانوں نے خیال گایکی کے حوالے سے شہرت پائی۔ پٹیالہ اور قصور گھرانے کے باہمی ربط ضبط کی وجہ سے موسیقی کے بہت سے مؤرخین نے انھیں ایک ہی گھرانا تصور کیا تاہم قصور گھرانے کے موسیقاروں کا اصرار ہے کہ وہ پٹیالہ گھرانے سے زیادہ قدیم ہیں اور انھیں ایک الگ گھرانا تسلیم کیا جانا چاہیے۔

پٹیالہ گھرانے کا بانی استاد علی بخش خان اور استاد فتح علی خان کو سمجھا جاتا ہے۔ وہ مہاراجہ پٹیالہ بھوپندر سنگھ کی سرپرستی کی وجہ سے پٹیالہ گھرانا کے نام سے معروف ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق یہ دونوں فن کار آپس میں ماموں پھوپھی زاد بھائی تھے جب کہ موسیقی کے بیشتر مورخین کا خیال ہے کہ ان میں

آپس میں خون کا رشتہ نہیں تھا پھر بھی یہ دونوں فن کار زندگی بھر حقیقی بھائیوں کی طرح رہے اور جہاں بھی گانے کے لیے گئے اکھٹے گئے۔ یہ دونوں فن کار علیا فتو کے نام سے پہچانے جاتے تھے، تاہم جب مہاراجہ پٹیالہ نے انھیں بالترتیب جرنیل اور کرنیل کے اعزاز خطاب عطا کیے تو یہ جرنیل، کرنیل کے نام سے معروف ہوئے۔ سید عارف جعفری نے اپنے مضمون استاد فتح علی خان اور پٹیالہ گھرانہ مشمولہ استاد فتح علی خان میں تحریر کیا ہے کہ ان دونوں فن کاروں کو جرنیل اور کرنیل کے خطابات وائسرائے ہند لارڈ ایلگن نے عطا کیے تھے۔

مہاراجہ بھوپندر سنگھ موسیقی کے بڑے سرپرستوں میں شامل تھے۔ ان کے دربار سے جو موسیقار وابستہ تھے ان میں برکت اللہ خان (ستار نواز)، ممن خان (سارنگی نواز)، عبدالعزیز خان (وچترا وینا کار)، محبوب علی (ستار نواز)، کریم بخش خان (شہنائی نواز) اور کالے خان (سارنگی نواز) کے نام سرفہرست ہیں۔ علی بخش خان انھی آخر الذکر کالے خان عرف بابا کالو کے صاحبزادے تھے۔

کالے خان عرف بابا کالو مہاراجہ پٹیالہ کے دربار سے بطور سارنگی نواز وابستہ تھے اور گوکھی بائی کے سازندوں میں شامل تھے۔ گوکھی بائی ایک زمانے میں مہاراجہ پٹیالہ سے وابستہ رہ چکی تھی اور اسی تعلق سے بابا کالو گوکھی بائی کے ہاں پہنچے تھے۔ بابا کالو نے گوکھی بائی سے درخواست کی کہ وہ ان کے بیٹے علی بخش کی فنی تربیت کرے۔ گوکھی بائی نے کسی زمانے میں دلّی گھرانے کے نامور موسیقار میاں تان رس خاں سے اکتساب فیض کی درخواست کی تھی مگر میاں تان رس خان نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ وہ طوائفوں کو گانا نہیں سکھاتے۔ گوکھی بائی کو میاں تان رس خان کی یہ بات ناگوار گزری اور جب بابا کالو نے اس سے علی بخش کو موسیقی کی تربیت کی درخواست کی تو اس نے میاں تان رس خان سے اپنی توہین کا بدلہ لینے کے لیے فوراً ہی آمادگی ظاہر کر دی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس بچے کی ایسی تربیت کی جائے کہ اسے تان رس خان کے مقابلے کا موسیقار تسلیم کیا جانے لگے۔ جب بابا کالو علی بخش کو لے کر گوکھی بائی کے ہاں جا رہے تھے تو ان کی بیوی نے ان سے کہا کہ فتح علی خان بھی تو اپنا ہی بچہ ہے اور علی بخش کا بچپن کا دوست ہے اسے بھی ساتھ لے جاؤ۔ چنانچہ بابا کالو علی بخش اور فتح علی خان کو گوکھی بائی کے ہاں لے گئے جس نے دونوں بچوں کی تعلیم میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ (فتح علی خان کے والد کا نام بعض مؤرخین نے طبلہ نواز محبوب علی تحریر کیا ہے تاہم یہ درست نہیں فتح علی خان کے والد نام میاں خیراتی تھا) گوکھی بائی نے جب یہ محسوس کیا کہ دونوں بچے اس قابل ہو گئے ہیں کہ انھیں تان رس خان کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے تو وہ ان دونوں بچوں کو لے کر جے پور چلی گئی۔ یہ 1975ء کا واقعہ ہے۔

گوکھی بائی کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ ان دونوں بچوں کو تان رس خان کے سامنے گوا کر اپنی

ندامت اور خجالت کا بدلہ لے۔ وہ میاں تان رس خان کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ جس فن کارہ کو تم نے طوائف کہہ کر موسیقی سکھانے سے انکار کر دیا تھا وہ اتنا کچھ جانتی ہے کہ اس کے تربیت یافتہ بچے آج تمہارا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں، مگر علی بخش خاں اور فتح علی خان گوکھی بائی کی نیت سے بےخبر تھے چنانچہ جب وہ تان رس خان کے سامنے پہنچے تو انھوں نے استاد سے مؤدبانہ درخواست کی کہ وہ انھیں کچھ سنانے کے لیے نہیں بلکہ ان سے کچھ سننے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ میاں تان رس خان نے بچوں کی اس درخواست کو پذیرائی بخشی اور انھیں تھوڑا بہت گانا سنایا۔ میاں تان رس خان کا گانا سن کر دونوں فن کار ہی نہیں گوکھی بائی بھی سحر زدہ ہو گئی۔ دونوں بچوں نے ہاتھ باندھ کر میاں تان رس خان سے شاگردی کی درخواست کی۔ گوکھی بائی بھی اپنے کیے پر نادم ہوئی اور میاں تان رس خان نے دونوں بچوں کو موسیقی تعلیم دینے پر آمادگی ظاہر کی اور یوں علی بخش خاں اور فتح علی خاں بڑے شوق و لگن سے تان رس خان نے موسیقی کی تربیت حاصل کرنے لگے۔ 1890ء میں استاد تان رس خان کی وفات کے بعد ان دونوں فن کاروں نے گوالیار گھرانے کے استاد ہدو خان اور استاد حسو خان سے بھی موسیقی کی تربیت حاصل کی، بعد ازاں وہ رام پور سہسوان گھرانے کے استاد بہادر حسین خان کے شاگرد بھی رہے۔ محمد اسلام شاہ نے اپنی کتاب نامور فن کار میں لکھا ہے کہ ان دونوں فن کاروں نے جے پور کے استاد بہرام خان اور ریوا کے استاد مبارک علی خان سے بھی موسیقی کی تربیت حاصل کی تھی۔

سالہا سال کی شدید ریاضت کے بعد علی بخش خان اور فتح علی خان، پٹیالہ واپس آ گئے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے مہاراجہ پٹیالہ یا لارڈ ایلگن نے نے ان دونوں فن کاروں کو بالترتیب جرنیل اور کرنیل کے خطابات عطا کیے جو آج بھی ان کے نام کا حصہ ہیں۔ جرنیل علی بخش کا انتقال 1920ء (یا بعض روایات کے مطابق 1925ء) میں اور کرنیل فتح علی خان کا انتقال 1900ء (یا بعض روایات کے مطابق 1909ء) میں ہوا۔

کرنیل فتح علی خان کے فرزند استاد عاشق علی خان تھے۔ عاشق علی خان لے کاری میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ چرس کے بہت زیادہ استعمال سے اگرچہ ان کی آواز میں بھاری پن اور کرختگی پیدا ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود ان کی آواز کا سوز و گداز قائم رہا۔ کرنیل فتح علی خان کے انتقال کے بعد جرنیل علی بخش خان نے عاشق علی خان کی تربیت کرنا چاہی مگر وہ پٹیالہ سے بھاگ نکلے اور جرنیل علی بخش خان کی وفات کے بعد پٹیالہ واپس آئے۔ اس زمانے میں وہ زیادہ تر غزلیں اور کافیاں گایا کرتے تھے تاہم ان کے ساتھ کے سازندوں اور ان کے والد کے عقیدت مندوں نے ان سے اصرار کیا کہ وہ کلاسیکی موسیقی کی طرف واپس آئیں اور اسی کو اپنی شناخت بنائیں۔ استاد عاشق علی خان نے اپنے ماموں امیر خان، مام دین سیالکوٹ والے اور استاد مہربان خان سے کلاسیکی موسیقی سیکھی۔ ان کے یہ تینوں اساتذہ پٹیالہ گھرانے کے شاگرد تھے چنانچہ انھوں نے اپنے استاد زادے کو موسیقی سکھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ استاد عاشق علی خان نے میاں اللہ دیا

خان اور دلی گھرانے کے استاد سردار خان سے بھی کسب فیض کیا اور خود بھی بہت ریاضت کی۔ چنانچہ جب انھوں نے کلاسیکی موسیقی کے میدان میں قدم رکھا تو پورے برصغیر میں ان کی دھوم مچ گئی۔ جن لوگوں نے استاد عاشق علی خان کو سنا ہے ان کا کہنا ہے کہ ایسا تیار گویا اس صدی میں پیدا نہیں ہوا۔ موجودہ خیال گائیکی میں سرگم، پلٹا اور تیہائی کی آمیزش بھی انھی سے منسوب ہے۔ استاد عاشق علی خان نے شادی نہیں کی تھی تاہم ان کا سلسلہ ان کے شاگردوں کے ذریعے آگے بڑھا جو پورے برصغیر میں پھیلے ہوئے تھے۔ استاد عاشق علی خان کے ان شاگردوں میں استاد بڑے غلام علی خان، استاد امانت علی خان قصوری (مانے)، چھوٹے عاشق علی خان، حسین بخش ڈھاڑی بہاولپوری، اللہ دیتو خان، استاد سرہنگ، رفیق غزنوی، مختار بیگم، فریدہ خانم اور زاہدہ پروین کے نام سرفہرست ہیں۔ استاد عاشق علی خان کا انتقال 10 مارچ 1948ء کو لاہور میں ہوا۔

کرنیل فتح علی خان کا سلسلۂ نسب تو استاد عاشق علی خان پر ختم ہو گیا تاہم جرنیل علی بخش خان کے سلسلۂ نسب نے موسیقی کی دنیا میں بڑا عروج پایا اور آج بھی پٹیالہ گھرانا جرنیل علی بخش خان کی صاحب کمال اولاد کی وجہ سے زندہ و پائندہ ہے۔ جرنیل علی بخش خان کے صاحبزادے استاد اختر حسین خان تھے۔ اپنے والد کی طرح استاد اختر حسین بھی مہاراجہ پٹیالہ کے دربار سے وابستہ رہے تاہم قیام پاکستان کے بعد جنوری 1948ء میں وہ اپنے خانوادے کے ساتھ پاکستان منتقل ہو گئے۔ عنایت الٰہی ملک نے اپنی کتاب راگ رنگ میں تحریر کیا ہے کہ ”اختر حسین خان کو اپنے گھرانے کی بے شمار بندشیں یاد تھیں لیکن انھیں عاشق علی خان جیسی شہرت نصیب نہ ہو سکی۔ ان کے گانے میں وہ رس تو نہ تھا جو اس گھرانے کا طرۂ امتیاز ہے لیکن گرائمر کی بڑی صحت تھی۔“ اختر حسین خان کی گائیکی پر اسی نوعیت کا تبصرہ داؤد رہبر نے بھی کیا ہے وہ اپنی کتاب باتیں کچھ سریلی سی میں رقم طراز ہیں:

> ”وہ (استاد اختر حسین خان) راگ داری میں کسی سے کم نہ تھے لیکن ان کی طبیعت میں بے حد پریشانی تھی حتیٰ کہ گانا بھی ان کا پریشان تھا۔ غلطی کہیں نہ ہوتی تھی لیکن ان کا گانا سن کر گھبراہٹ ہوتی تھی“۔

اختر حسین خان کے بعد ان کا فن ان کے ہونہار صاحبزادوں استاد امانت علی خان، استاد فتح علی خان اور استاد حامد علی خان میں منتقل ہوا۔ استاد امانت علی خان اور استاد فتح علی خان نے اپنی فنی زندگی کا آغاز مہاراجہ پٹیالہ کے دربار سے ہی کیا تھا، وہ جوڑی بنا کر گاتے رہے۔ امانت علی خان کلاسیکی اور ہلکی پھلکی موسیقی دونوں میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اس گھرانے نے بڑا مشکل وقت دیکھا، تاہم خوش قسمتی سے انھیں جشن کابل میں افغانستان کے بادشاہ شاہ ظاہر شاہ کے دربار میں اپنے فن کے مظاہرے کا موقع مل گیا جہاں ان کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے کلکتہ، ممبئی، دہلی، گیا، بنارس، پٹنہ، الٰہ آباد اور آسام تک گئے۔ 1950ء میں جب پاکستان میں آل پاکستان میوزک

کانفرنس کا آغاز ہوا تو یہاں بھی ان کی بڑی پذیرائی ہوئی اور وہ اس میوزک کانفرنس کا لازمی جز بن گئے۔ 1969ء میں حکومت پاکستان نے انھیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی عطا کیا اور اسی زمانے میں انھیں نیپال کے بادشاہ کے جشن تاج پوشی میں پاکستان کی نمائندگی کرنے والے وفد میں شامل کیا گیا۔

استاد امانت علی خان کی آواز میں ملائمت تھی جسے فتح علی خان اپنی مرکیوں، تان پلٹوں اور پیوندوں سے سجاتے چلے جاتے تھے اور سننے والے پر سحر طاری کر دیتے تھے۔ عموماً کلاسیکی راگ گانے والوں کو غزل اور گیت گانے میں دشواری پیش آتی ہے مگر استاد امانت علی خان اس میں استثنیٰ رکھتے تھے۔ وہ جب غزل یا گیت گاتے تھے تو ان کے کمالات مزید کھل کر سامنے آتے تھے۔ آتش کی غزل ”یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے“ ظہیر کاشمیری کی غزل ”موسم بدلا رت گدرائی اہل جنوں بے باک ہوئے“ سیف الدین سیف کی غزل ”مری داستان حسرت وہ سنا سنا کے روئے“ ادا جعفری کی غزل ”ہونٹوں پہ کبھی ان کے مرا نام ہی آئے“ ابن انشا کی غزل ”انشا جی اٹھو اب کوچ کرو“ اور ساقی جاوید کا ملی نغمہ ”چاند میری زمیں پھول میرا وطن“ ان کے چند ایسے ہی گائے ہوئے فن پارے ہیں جو ان کی یاد ہمیشہ تازہ رکھیں گے۔ امانت علی خان عین عالم جوانی میں 18 ستمبر 1974ء کو لاہور میں وفات پا گئے۔

امانت علی خان کے مقابلے میں فتح علی کی آواز رس میں ڈوبی ہوئی ہے اور ان کی گائیکی کا انداز انتہائی منفرد ہے۔ وہ تانوں کا استعمال بڑے سلیقے سے کرتے ہیں اور مرکیوں اور پلٹوں سے راگ میں وہ سجاوٹ پیدا کرتے ہیں کہ سن سن کر جی نہیں بھرتا۔ فتح علی خان کو اپنے بھائی کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا۔ انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا کہ شروع شروع میں مجھے یوں لگا جیسے میرا کیریئر بھی ختم ہو گیا ہے، تاہم بعد میں انھوں نے اپنی ہمت مجتمع کی اور امانت علی خان کے بیٹے امجد امانت علی خان (1953ء۔ 24 نومبر 2002ء) کو موسیقی کی تربیت دے کر ان کے ساتھ جوڑی بنا کر گانا شروع کیا۔ استاد فتح علی خان نے اپنے فن کا ورثہ اپنے بیٹوں سلطان فتح علی خان اور رستم فتح علی خان میں منتقل کیا جن میں رستم فتح علی خان نے نسبتاً زیادہ شہرت پائی۔ رستم فتح علی خان خیال اور ٹھمری گانے میں اختصاص رکھتے ہیں اور انھوں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے میوزکولوجی میں ایم اے کی سند بھی حاصل کی ہے۔ تاہم استاد امانت علی خان کے فن کے اصل ورثے دار امجد امانت علی خان کے چھوٹے بھائی اسد امانت علی خان (پ: 25 ستمبر 1955ء) قرار پائے جنھوں نے اپنے والد کی طرح تنہا اور اپنے چچا حامد علی خان کے ساتھ جوڑی بنا کر گانا شروع کیا۔ اپنے والد کی طرح اسد امانت علی خان نہ صرف خیال گائیکی میں مہارت رکھتے تھے بلکہ اپنے والد کی طرح غزل اور ہلکی پھلکی موسیقی میں بھی اختصاص رکھتے تھے۔ ان کے گائے ہوئے کلاسیکل، نیم کلاسیکل، گیت، غزلیں اور فلمیں گانے اپنی دلکشی اور سریلے پن کی وجہ سے زبان زد عام ہوئے۔ انھوں نے کئی فلموں کو بھی اپنی گائیکی

سے سجایا۔ وہ ایک بہت اچھے سوزخواں بھی تھے اور خصوصاً میر مونس لکھنوی کا سوز ''مجرئی خلق میں ان آنکھوں نے کیا کیا دیکھا'' پڑھنے میں اختصاص رکھتے تھے۔ اسد امانت علی خان کا انتقال 8 اپریل 2007ء کو لندن میں ہوا۔ حکومت پاکستان نے انھیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی عطا کیا تھا۔ وہ لاہور میں مومن پورہ کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔

امجد امانت علی خان اور اسد امانت علی خان کے چھوٹے بھائی شفقت امانت علی خان ہیں۔ شفقت امانت علی خان نے کلاسیکی موسیقی کی روایت سے ہٹ کر مشرقی اور مغربی موسیقی کے امتزاج کو اپنایا۔ ان کے اس انداز کو بڑی مقبولیت ملی۔ انھوں نے فیوژن کے نام سے اپنا ایک بینڈ بھی بنایا اور بھارت کی متعدد فلموں کے لیے نغمات بھی ریکارڈ کروائے۔ تاہم بعد میں انھوں نے اپنے بینڈ کو ترک کر کے تنہا گانا شروع کیا۔ ان کے کئی البم بھی ریلیز ہو چکے ہیں۔

استاد امانت علی خان اور استاد فتح علی خان کے چھوٹے بھائی استاد حامد علی خان نے نہ صرف کلاسیکی موسیقی میں نام کمایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ غزل اور ٹھمری میں بھی اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے شائقین کے دل جیت لیے۔ وہ خیال گائیکی کے بڑے سریلے فن کاروں میں شمار ہوتے ہیں اور کلاسیکی موسیقی کے علاوہ غزل، ٹھمری اور گیت گانے میں بھی اختصاص رکھتے ہیں۔ ابتدا میں وہ اپنے بھتیجے اسد امانت علی خان کے ساتھ جوڑی بنا کر گاتے تھے تاہم اب وہ تنہا پرفارم کرتے ہیں۔ حامد علی خان کے تین بیٹوں نایاب علی، ولی حامد علی اور انعام علی نے راگا بوائز کے نام سے ایک بینڈ بھی بنایا ہے جو خالص کلاسیکی موسیقی اور پاپ میوزک دونوں میں اپنے کمالات دکھا رہا ہے۔

....

پٹیالہ گھرانے سے اکتساب فیض کرنے والوں میں ایک اہم نام پاکستان کی مشہور مغنیہ زاہدہ پروین کا ہے۔ زاہدہ پروین 1925ء کے لگ بھگ امرتسر میں پیدا ہوئی تھیں۔

زاہدہ پروین نے موسیقی کی ابتدائی تعلیم بابا تاج کپورتھلہ والے سارنگی نواز سے حاصل کی بعد ازاں وہ تقریباً سات برس تک استاد حسین بخش خاں امرتسر والے سارنگی نواز سے گائکی کے رموز سیکھتی رہیں ان دونوں استادوں کے بعد وہ استاد عاشق علی خان کی شاگرد بنیں بعد ازاں انھوں نے کچھ عرصہ استاد اختر علی خان سے بھی اکتساب فیض کیا۔

زاہدہ پروین خیال گائیکی پر مکمل عبور رکھتی تھیں مگر ان کے جوہر کافی کی گائیکی میں کھلے۔ انھیں حضرت خواجہ غلام فریدؒ کے کلام سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا جب انھوں نے خود کو خواجہ صاحب کی کافیوں کے لیے مخصوص کر دیا تو پھر وہ اس سلطنت کلام کی بلا شرکت غیرے بے تاج ملکہ بن گئیں ان کے اسی منفرد اسلوب

گائیکی کی وجہ سے انھیں ملکۂ کافی کا خطاب دیا گیا۔

زاہدہ پروین کا انتقال 7 مئی 1975ء کو لاہور میں ہوا۔ ان کے بعد ان کی وراثت ان کی بیٹی شاہدہ پروین نے سنبھال لی۔

شاہدہ پروین نے موسیقی کی تربیت اپنی والدہ کے علاوہ استاد اختر حسین خان، استاد فتح علی خان اور استاد چھوٹے غلام علی خان سے حاصل کی تھی۔ وہ بھی اپنی والدہ کی طرح کافی گانے کی ماہر سمجھی جاتی تھیں۔ ان کا انتقال 13 مارچ 2003ء کو لاہور میں ہوا۔ حکومت پاکستان نے ان کے انتقال کے بعد انھیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی عطا کیا تھا۔

پٹیالہ گھرانے سے بلاواسطہ یا بالواسطہ فیض اٹھانے والے دیگر فن کاروں میں کالے خان قصوری، علی بخش خان قصوری، پیارے خان، امید علی خان، مبارک علی خان، امانت علی خان (مانے)، غلام رسول خان، مراد علی خان، چھوٹے عاشق علی خان، زیب النسأ، چنوں خان، مختار بیگم، سردار بائی، میاں جان خان، بھائی اروڑہ، فریدہ خانم، ملکہ پکھراج، طاہرہ سید اور اخلاق احمد کے نام سرفہرست ہیں۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر نثار ترابی

موسیقار نثار بزمی سے مکالمہ

نثار بزمی دنیائے موسیقی کا ایک ایسا معتبر نام ہے جو اپنی فنی زندگی کے آغاز میں ریڈیو کے گنگناتے افق سے طلوع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں شائقین موسیقی کے دلوں کی دھڑکن بن گیا۔ تال تال جھوم اٹھا، سُر سنورنے لگے، فضائیں مترنم ہونے لگیں اور عقیدت میں آکر ہر ساز پکار پکار کر یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔

دل دھڑکے میں تم سے یہ کیسے کہوں
کہتی ہے میری نظر شکریہ

بزمی صاحب کے لیے نظر جھک گئی۔ قدم قدم ادب نے سلام کیے۔ ریاضت فن میں گہرے خلوص، سچے جذبے اور ان تھک لگن نے انھیں زندگی کی بے انتہا تلخ اور تھکا دینے والی طویل آزمائشوں سے

گزار کر سراپا کندن بنا دیا۔ نثار بزمی مزاجاً بڑی شفیق، بھولی بھالی، کم گو اور دینی سوچ کی حامل شخصیت کا نام ہے۔ دھیما اسلوب اور نرم میٹھے لہجے میں گفتگو کرتے ہیں۔ برتاؤ میں ایک تہذیبی بانکپن ملتا ہے اور چہرے پر باوقار سنجیدگی ہمہ دم اپنا ہالہ مکمل کرتی دکھائی دیتی ہے۔ گھر میں، قریبی احباب اور اپنے شاگردوں میں ان کی حیثیت ایک آئیڈیل شخصیت کی سی ہے۔ سراپا خلاص۔ پیکر شفقت۔

ان کا شمار فن موسیقی کی ان گنی چنی گرانقدر شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے موسیقی کے شعبے میں جو اچھوتے اور انوکھے تجربے کیے۔ وہ بہت موثر، کشش انگیز اور کامیاب ثابت ہوئے۔ جو رنگا رنگ دھنیں عطا کیں، سبھی کو سراہا گیا۔ عوامی مزاج اور تقاضوں کے پیش نظر بزمی صاحب نے جہاں ہلکے پھلکے گیتوں کو اپنے کومل سروں سے مشکبار کیا وہاں خالصتاً کلاسیکی اسلوب و انداز کے حامل گیت اور غزلیں بھی شائقین موسیقی کی نذر کر کے داد سمیٹی۔ کمپوزیشن میں نئی نئی جہتیں اور روشیں نکال کر ندرت فن کا لوہا منوایا۔ ان کی دھن میں کوئی گیت بھی سنیں تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ موسیقی کے رموز کا گہرا ادراک رکھنے کے ساتھ ساتھ نغمے کے موضوع (Theme) اور صورت حال (Situation) کو پیش نظر رکھ کر اس کے لیے ایسی راگ راگنی کا انتخاب کرتے ہیں جو مطلوبہ نغمے کے لیے ہر لحاظ سے بہترین ہوتی ہے۔ یہ ان کی تخلیقی فسوں کاری کا اعجاز ہی تو ہے کہ جہاں ان کی پیش کردہ موسیقی کی بدولت ماضی کی معروف اور منفرد گلوکارہ رونا لیلیٰ کو اپنے دیس (بنگلہ دیش) سے زیادہ پاکستان میں جانا اور مانا جانے لگا وہاں ہمارے ہنس مکھ سینئر گلوکار مجیب عالم نے اپنے گائے ہوئے لازوال گیتوں کے ذریعے شہرت و مقبولیت کے ایسے افق سر کیے جن کی ضو آج بھی دور سے اپنی پہچان کرا لیتی ہے۔

آپ کی ترتیب دی ہوئی دھنوں میں تخلیق پانے والے شہ پاروں کو انڈیا کے مشہور گلوکاروں محمد رفیع، آشا بھوسلے اور سمون کلیان پور وغیرہ نے بھی گایا اور بہت نام پیدا کیا۔ "ایسا بھی ہوتا ہے" اور "ہیڈ کانسٹیبل" نامی فلمیں آپ کے فلمی کیریر کا نقطۂ آغاز کہلاتی ہیں۔ موسیقی کے جہاں کے بے بدل مان ملکۂ ترنم نور جہاں کی مدھر اور رس گھولتی آواز نے جب بزمی صاحب کی ترتیب دی ہوئی کمپوزیشن سے ہم آہنگ ہو کر "اے کاش مرے لب پہ ترا نام نہ آتا" اور "ہو تمنا اور کیا جان تمنا آپ ہیں" کی صورت میں ترنم کا جادو فضاؤں میں بکھیرا تو موسیقی کے سنجیدہ حلقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اپنی ابتدائی کارکردگی پر بزمی صاحب کو "نگار ایوارڈ" کا حق دار ٹھہرایا گیا اور میڈم نور جہاں نے فلم ڈائریکٹر جناب فضل کریم فضلی سے بے ساختہ کہا کہ "فضلی صاحب! آپ نے بزمی صاحب کے روپ میں پاکستان کو ایک خوبصورت تحفہ دے دیا ہے"۔ حسن طارق مرحوم کی یادگار فلموں کی بے پناہ کامیابیوں کی ایک بڑی اور اہم وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی فلموں کے لیے بحیثیت

میوزک ڈائریکٹر بزمی صاحب کا انتخاب کیا تھا۔ اہل ذوق جانتے ہیں کہ حسن طارق مرحوم کی تمام فلموں کی دیگر فنی خصوصیات کے ساتھ ساتھ ان کی بے مثال موسیقی کی بنا پر آج بھی بڑے ذوق وشوق سے دیکھا جاتا ہے۔

بزمی صاحب کی موسیقی کے شعبے میں گرانقدر خدمات کا اعتراف قومی سطح پر بھی کیا گیا۔ متعدد قومی ایوارڈ جن میں نگار، گریجویٹ، مصور اور بہت سے دیگر اعزازات بھی انہیں عطا ہوئے۔ حمد، نعت، غزل، گیت، نظم اور قطعات کی شکل میں انہوں نے اپنے فن شعر گوئی کو اظہار کی باقاعدہ سطح پر بھی پیش کیا جو اب ”پھر ساز سدا خاموش ہوا“ کے نام سے بساط ادب کراچی کے زیر اہتمام عنقریب منظر عام پر آ رہا ہے اور اس میں ہمارے دوستوں جاوید وارثی اور شمیم بازل (جو بزمی صاحب کے ہونہار شاگرد بھی ہیں) کا پر محبت اصرار بھی شامل ہے پاکستان کے تقریباً سبھی معروف گلوکاروں نے ان کے تیار کردہ میوزک میں گیت گائے اور خوب گائے مگر شہنشاہ غزل مہدی حسن، ملکہ ترنم نور جہاں، مجیب عالم اور رونا لیلیٰ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے ”یہ وطن تمہارا ہے تم ہو پاسباں اس کے“ ایسے مشہور قومی نغمے کو میٹھے دھیمے سروں میں ڈھال کر امر کر دیا۔ بحریہ کے لیے متعدد خوبصورت نغمے کمپوز کیے۔ صاعقہ، عندلیب، لاکھوں میں ایک، ناگ منی، محبت، آگ، آسرا، شمع اور پروانہ، انیلہ، انجمن، امراؤ جان ادا، تہذیب، اک گناہ اور سہی اور ایسی ہی دوسری کئی میوزیکل فلمیں اپنے ہمیشہ یاد رہ جانے والے گیتوں کی وجہ سے فن موسیقی کے آسمان پر بزمی صاحب کے لیے احترام اور اعتراف کے نئے سورج ابھارتی رہیں گی۔

قارئین محترم! بزمی صاحب کی گفتگو سے قبل آیئے پہلے ان کی ترتیب دی ہوئی موسیقی میں مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کرنے والے سینکڑوں لاثانی گیتوں کی چند یادیں تازہ کرتے ہیں:

؎ رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
؎ یہ محفل جو آج سجی ہے
؎ خدارا محبت نہ کرنا
؎ میں تیرے اجنبی شہر میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں تجھے
؎ یوں زندگی کی راہ میں ٹکرا گیا کوئی
؎ کاٹے نہ کٹے رے رتیاں، سیاں
؎ آج ہے محفل دید کے قابل
؎ مجھے آئی نہ جگ سے لاج میں اتنی زور سے ناچی آج کہ گھنگھرو ٹوٹ گئے

- نیناں ترس کر رہ گئے پیا آئے نہ کیوں ساری رات
- بہت یاد آئیں گے وہ دن صنم
- لگا ہے حسن کا بازار دیکھو
- چلو اچھا ہوا تم بھول گئے
- آپ دل کی انجمن میں حسن بن کر آ گئے
- کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے
- میرا ایمان محبت ہے محبت کی قسم
- دل دھڑکے میں تم سے یہ کیسے کہوں
- اظہار بھی مشکل ہے چپ رہ بھی نہیں سکتے
- اے بہارو گواہ رہنا
- اک ستم اور مری جاں ابھی جاں باقی ہے

○ ابتدائی خاندان پس منظر اور موسیقی سے اپنے تعلق کی وضاحت فرمائیں؟

☆ تقسیم برصغیر سے قبل دیگر صوبوں کی طرح بمبئی بھی ایک صوبہ تھا جو کئی بڑے شہروں پر مشتمل تھا۔ اس صوبے میں ایک ضلع خاندیس ہے۔ خاندیس کے دو حصے ہیں مشرقی خاندیس اور مغربی خاندیس۔ میں شرقی خاندیس کے صدر مقام جل گاؤں کے ایک قصبے نصیر آباد میں 1925ء میں پیدا ہوا۔ میرے والد کا نام سید قدرت علی تھا۔ وہ سیدھے سادھے تاجر تھے۔ موسیقی سے انھیں کوئی رغبت نہیں تھی۔ میرے والد سبزیوں کی تجارت کرتے تھے۔ میرے والد نے 1936ء میں مجھے خالو کے پاس بمبئی بھجوا دیا۔ خالو اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ میں وہیں اسکول میں داخل ہو گیا۔ تعلیم سے جو وقت بچتا تھا میں اس وقت میں اپنا موسیقی کا شوق پورا کرتا تھا۔ مجھے سہگل بہت پسند تھے اور میں اکثر انھیں کے نغمے گاتا رہتا تھا۔ میرے اس شوق کو دیکھتے ہوئے ایک آشنا مجھے مشہور قوال یاسین کے پاس لے گئے۔ بہت عرصہ ان کے ساتھ رہا مگر کلاسیکل موسیقی کی تعلیم میں نے استاد امان علی خان سے حاصل کی۔ تاہم شاگردی کا کوئی باقاعدہ سلسلہ کبھی نہیں رہا۔

○ بمبئی ریڈیو سے بمبئی فلم انڈسٹری تک کے فنی سفر کی کچھ تفصیل بتائیے!

☆ بمبئی ریڈیو میں ملازمت کے دوران ایک فرانسیسی موسیقار والڈ کاف مین سے ملاقات ہوئی۔ والڈ کاف مین بھی بمبئی ریڈیو میں ملازم تھے اور اچھے کمپوزر تھے۔ میں نے ان سے نوٹیشن کا طریقہ

سیکھا مگر میں چاہتا تھا ایک کلاسیکل سنگر کی حیثیت سے اپنی شناخت کراؤں اور میں ایک عرصہ تک بمبئی ریڈیو سے بحیثیت کلاسیکل گلوکار گاتا رہا۔ ایک موسیقار کی حیثیت سے منظر عام پر آنے کی خواہش زیادہ تھی۔ ریڈیو سے بمبئی فلم انڈسٹری کا رُخ کیا۔ وہ وقت بمبئی انڈسٹری میں بڑے بڑے ناموں کا تھا۔ ان میں سب سے بڑا نام موسیقار نوشاد کا تھا۔ لیکن میرا مقام ان دنوں ”سی کیٹگری“ کے موسیقار کے طور پر تھا۔ اس کے باوجود میں نے وہاں محمد رفیع اور آشا بھوسلے کو گوایا۔ آشا نے تو میرے کافی گانے گائے ہیں۔ گلوکار سمن کلیاں پور کو بھی گوایا۔

○ پاکستان میں آپ کی آمد کب ہوئی اور یہاں آپ نے کس طرح کا ماحول پایا؟

☆ میں 21 جون 1962ء میں پاکستان آیا۔ میرے ایک دوست پاکستان آ گئے تھے۔ میں انھیں واپس لے جانے کے لیے پاکستان آیا تھا۔ میری تمام کوششوں کے باوجود میرے دوست واپس جانے پر راضی نہ ہوئے بلکہ انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں بھی یہیں رک جاؤں۔ یہاں بہت اچھا کام ہے۔ اس وقت پاکستان میں ماسٹر عنایت حسین، خواجہ خورشید انور اور رشید عطرے جیسے ماہر موسیقاروں کا شہرہ تھا۔ میں نے کہا کہ میرا ان بڑے لوگوں کے سامنے کیا چراغ جلے گا۔ لیکن میں نے دوست کے بے حد اصرار پر یہاں رکنے کا فیصلہ کر لیا۔

○ پاکستان میں فلمی دور کا آغاز کب اور کہاں سے ہوا؟

☆ پاکستان میں میری پہلی فلم ”ہیڈ کانسٹیبل“ تھی مگر فلم ”ایسا بھی ہوتا ہے“ پہلے ریلیز ہوئی۔ اس کے تمام گانے ہٹ ہوئے بالخصوص ایک گانا ”ہو تمنا اور کیا جان تمنا آپ ہیں“ بہت مقبول ہوا۔ 1964ء میں فلم ”لاکھوں میں ایک“ ریلیز ہوئی۔ اس کے بھی تمام گانے سپرہٹ ہو گئے۔ اس کے بعد پھر انیلا، صاعقہ، آگ، انجمن، ایک گناہ اور سہی، تہذیب، امراؤ جان ادا، عندلیب اور دوسری فلموں کے نغمات بہت مقبول ہوئے۔

○ اس قدر مقبولیت کے باوجود آپ فلمی دنیا سے کنارہ کش ہو گئے، اس کی کوئی خاص وجہ؟

☆ آہستہ آہستہ فلم انڈسٹری کا مزاج بدلتا گیا جو میرے مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ اس وجہ سے مجھے کنارہ کشی اختیار کرنا پڑی۔

○ ایک نامور موسیقار ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر ہونے کی خوبی بھی زیر بحث آتی رہی، اس کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟

☆ شاعری کا ذوق پہلے سے تھا۔ میرؔ سے لے کر جگرؔ تک تمام شعراء کے کلام کو بغور پڑھا۔ دراصل

شعر کو سمجھنا موسیقار کے لیے اچھی بات ہے۔ شاعری کو سمجھے بغیر موسیقار کمپوزیشن درستی سے نہیں کرسکتا۔ اس وجہ سے بھی میں نے شاعری میں کافی دلچسپی لی۔ پھر خود بھی تک بندیاں کرتا رہتا تھا جو عادت آج تک ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ ہندوستان میں موسیقار جب کوئی دھن بناتے ہیں تو اگر نغمہ سامنے تحریر نہ ہو تو پھر خود ڈمی بول کہہ کر دھن بناتے ہیں تاکہ دھن میں تاثر پیدا ہو۔ اسی طرح میں نے بہت سے گانوں کے ڈمی بول کہہ کہہ کر دھنیں بنائیں مثلاً ''لاکھوں میں ایک'' میں گانا ''چلو اچھا ہوا تم بھول گئے اک بھول ہی تھا میرا پیار'' یہ ڈمی بول میرے ہی تھے۔ اس طرح فلم ''اجنبی'' میں ''وہ آ تو جائے مگر انتظار ہی کم ہے'' میرے کہے ہوئے بول تھے۔ اسے تسلیم فاضل نے بھی پسند کیا اور پھر پورا گانا انھوں نے لکھا۔ فلم انیلا میں ''بہت یاد آئیں گے وہ دن مجھے تڑپائیں گے وہ دن صنم تیری قسم'' میرے بول ہیں بلکہ اس گانے کا ایک انترہ بھی میرا ہے۔

وہ میرا پوچھنا تجھ سے کہ تجھ کو پیار ہے مجھ سے
وہ تیرا مسکرا دینا نگاہوں کو جھکا لینا
مرے کاندھے پہ سر رکھ کر نفی میں سر ہلا دینا
نہ بھولے جائیں گے وہ دن صنم تیری قسم

یہ انترہ میں نے لکھا دوسرا انترہ مسرور انور صاحب نے لکھا۔ اسی طرح شعر کہنے کا ذوق پیدا ہوا۔

○ آپ کی ابتدائی شعری تخلیق کیا تھی؟

☆ میں نے 1945ء میں سب سے پہلے ایک قطعہ کہا تھا:

ہمالہ کی چوٹی پہ تھا ایک پتھر
گرا اتفاقاً وہاں سے لڑھک کر
کسی نے جو پوچھا کہ اے بے حقیقت
بھلا راس آئی نہ کیوں تجھے رفعت
کیا اپنے مرکز سے میں ہٹ گیا ہوں
اسی واسطے ٹھوکروں میں پڑا ہوں

○ شاعری میں آپ نے بطور خاص کسے پڑھا اور کون زیادہ پسندیدہ رہا؟

☆ میں نے سیماب اکبرآبادی، فیض اور فراز کو پڑھا۔ مجھے پروین شاکر کا کلام بھی بہت پسند ہے کیونکہ پروین شاکر نے نسائی جذبوں کو اپنی شاعری کے ذریعے اس وقار اور حسن کے ساتھ پیش

کیا ہے جو کسی اور کے حصّے میں نہیں آیا۔

○ سنا ہے کہ ''بساطِ ادب'' کے زیرِ اہتمام آپ کا شعری مجموعہ جلد منظرِ عام پر آ رہا ہے؟

☆ میں اپنے کلام کے بارے میں تو یہی کہوں گا کہ وہ اس معیار کا قطعی نہیں ہے کہ کتابی شکل میں پیش ہوتا۔ میں نے تو ابھی تک یہ بھی نہیں سمجھا کہ کسی خیال کو نظم کرنے کے لیے کسی شاعر میں جو صلاحیت درکار ہوتی ہے وہ مجھ میں ہے بھی یا نہیں۔ میں نے اپنا کلام کہیں نہیں بھیجا۔ مشاعروں میں بھی شرکت نہیں کی۔ ہاں میرے شاگرد شمیم احمد باذل جو مضور ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر اور گلوکار بھی ہیں ان کی اقامت گاہ پر ایک مشاعرہ ہوا تھا تو مجھے انھوں نے مدعو کیا تھا۔ میں ہمیشہ اس بات پر اصرار کرتا ہوں کہ شعر کہنے کا مجھے ذوق تو ہے مگر اس کے معیار سے میں مطمئن نہیں ہوتا۔ ہاں موسیقی میں خدا نے جو تھوڑی بہت سوجھ بوجھ دی ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔

○ تقریباً کتنی فلموں کے لیے میوزک دیا؟

☆ کوئی ڈیڑھ سو سے زائد فلموں میں۔

○ موسیقی کے شائقین کے لیے کیا پیغام دینا پسند کریں گے؟

☆ خدا کی ذات پر کامل یقین کے ساتھ پرخلوص محنت، جذبے اور سچائی سے اپنے کام سے عشق، دیس پاک سے محبت اور انسانیت سے پیار کو زندگی سمجھیں۔

(یاد رہے کہ یہ منفرد موسیقار 22 مارچ 2007 کو انتقال کر گئے تھے)

انعام ندیم

کلاسیکی موسیقی میں گھرانوں کا نظام

ہماری کلاسیکی موسیقی جہاں اپنی ترتیب اور ضابطوں کے اعتبار سے بےنظیر ہے، وہیں اس میں ایک صفت ایسی بھی پائی جاتی ہے جو دنیا کی اور کسی موسیقی میں نہیں پائی جاتی۔ یہ صفت ہے، ہماری موسیقی میں گھرانوں کا نظام۔ ہماری موسیقی میں بےشمار گھرانوں کے نام ملتے ہیں، مثلاً کیرانہ گھرانا، آگرہ گھرانا، جے پور گھرانا، پٹیالہ گھرانا، شام چوراسی گھرانا، اندور گھرانا، بھنڈی بازار گھرانا، تلونڈی گھرانا، قوال بچوں کا گھرانا، کولہا پور والوں کا گھرانا، گوالیار گھرانا، دہلی گھرانا اور بہرام کا گھرانا وغیرہ۔ ان میں سے بہت سے

گھرانے ختم ہو چکے ہیں اور کچھ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔

گھرانے سے کیا مراد ہے؟ کب اور کیسے یہ وجود میں آئے؟ ان گھرانوں کی گائیکی کی ظاہری خصوصیات کیا ہیں؟ یہ اپنی لے، سُر، آواز کے اتار چڑھاؤ اور موسیقی کی اصطلاحوں میں ایک دوسرے سے کس طرح الگ ہیں؟ کیا ان گھرانوں میں کسی راگ کے بیان اور گائیکی کے لیے اپنی کوئی مخصوص طرز اور ضابطہ ہے؟ کیا ان کی تانوں کی ادائی اور اٹھان میں کوئی فرق ہے؟ کیا یہ گھرانے آواز کی اٹھان اور راگ کی کمپوزیشن میں اپنے کسی ٹھوس اصول کے پابند ہوتے ہیں؟ جب کہ راگ اور راگنیوں کی خاکہ سازی متوں اور خود ان کے ٹھاٹ کے اصول پر ہوتی ہے اور اکثر راگوں کے لیے تالیں بھی مخصوص ہوتی ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کیا یہ گھرانے ہماری موسیقی کی بقا کے لیے ناگزیر ہیں؟

برصغیر کی موسیقارانہ تہذیب پر خیال گائیکی کی ترویج اور ترقی نے نہایت خوش گوار اثرات مرتب کیے۔ بعد ازاں جب کلاسیکی موسیقی نے ادائی کے اعتبار سے مختلف رنگ اختیار کیے تو موسیقاروں نے فخریہ اپنا تعلق خیال گائیکی کے کسی ایک مخصوص گھرانے کے ساتھ جوڑا اور اس گھرانے کی روایات کو مذہبی عقیدت کے جوش سے اختیار کر لیا۔

ماضی میں اگرچہ موسیقی داں حلقوں اور خود موسیقاروں کی جانب سے ان گھرانوں کی تعریف اور ان کے جواز سے متعلق متعدد وضاحتیں پیش کی گئی ہیں، تاہم اب تک کوئی ایسی سنجیدہ کوشش سامنے نہیں آئی جو اس نادر اور انوکھے نظام کی جامع و مانع تعریف کر سکے۔ ممتاز ماہر موسیقی رشید ملک اپنی کتاب “مسائل موسیقی” میں لکھتے ہیں:

> “موسیقی میں گھرانے کے معنی ہیں “ضابطۂ فن” یعنی وہ ضابطہ جس کا اطلاق موسیقی پر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ لفظ روایت کا مترادف تو نہیں، لیکن اس کے قریب ترین معنی ضرور رکھتا ہے۔ یہ ضابطۂ موسیقی استاد سے شاگرد تک منتقل ہوتا چلا آیا ہے اور اس کی عمر صرف دو یا اڑھائی سو سال ہے۔ یہ اس وقت وجود میں آیا جب خیال گائیکی کو عروج حاصل ہوا... خیال گائیکی میں کوئی گھرانا اپنے بانی یا اس خاص اسلوب کے ایجاد یا اختیار کرنے والے کے نام سے مشہور نہیں ہے، خیال گائیکی کے یہ گھرانے ان علاقوں سے منسوب ہیں جہاں وہ مقبول ہوئے۔”

رشید ملک کی اس تعریف سے بات کافی حد تک واضح ہو جاتی ہے، لیکن گھرانوں کے نظام کا جواز

ہنوز الجھاؤ کا شکار رہے۔ بعض ماہرین کے نزدیک ہر گھرانا ایک مخصوص موسیقارانہ مکتبہ فکر ہے، جب کہ دوسرے ماہرین اسے موسیقاروں کے ایک خاندان سے زیادہ نہیں سمجھتے، درحقیقت ہر گھرانا اپنے ڈھنگ کی ایک ایسی مخصوص قسم ہے جس نے جنوبی ایشیا کی غنائی تہذیب پر اَن مٹ نقوش ثبت کیے ہیں۔ ان گھرانوں کو ہم دبستان ہائے موسیقی (Schools of Music) بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ گھرانے مجموعی طور پر ایک ایسی یونیورسٹی سے مشابہ ہیں جہاں موسیقی کے طالب علم نہ صرف موسیقی کی مستقل تعلیم حاصل کرتے ہیں، بلکہ ماہر استادوں کی صحبت میں شان دار تربیت بھی پاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ اس سخت اور کٹھن محنت ہی کا نتیجہ ہے کہ یہ یونیورسٹیاں بغیر کسی رسمی سند کے بے مثال گائیک پیدا کر رہی ہیں۔ گھرانوں سے وابستگی کا ایک جواز یہ بھی ہے کہ ہماری کلاسیکی موسیقی چونکہ لکھی نہیں جاتی اور یہ فن کتابوں سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی صحیح ادائی کسی استاد ہی سے سیکھی جاسکتی ہے۔ اس لیے ہر فن کار کسی نہ کسی بڑے گھرانے سے منسلک ہوجاتا ہے۔ اس طرح استادوں سے یہ فن سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہے اور پھر یہ سلسلہ شاگرد در شاگرد چلتا رہتا ہے۔ ہر نیا سیکھنے والا اسی خاص اسلوب کو اپناتا ہے جو اس کے استاد کے گھرانے سے مخصوص ہے۔ اس طرح اس کا انداز دوسرے گھرانے والوں سے بالکل جدا رہتا ہے اور شائقین فن کسی اچھے گانے والے کا نام ہی سن کر اندازہ لگا لیتے ہیں کہ یہ فن کار فن موسیقی کے کس گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔

ہر گھرانے کی گائیکی کی اپنی خصوصیات ہیں، دوسرے لفظوں میں سُروں کی ادائی اور آواز کی اٹھان کے مخصوص اور مختلف طریقے ہیں جن سے ان گھرانوں کی شناخت ہوتی ہے۔ اگر ہم بعض معروف گھرانوں کی گائیکی کا جائزہ لیں تو اس بات کو زیادہ آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے، مثلاً کیرانہ گھرانا سُر کی مکمل وابستگی سے پہچانا جاتا ہے۔ اس گھرانے کی گائیکی میں آواز گلے کو سکیڑ کر نکالی جاتی ہے جس کے نتیجے میں ایک تیز، مرتعش اور کسی قدر ناک سے ادا ہونے والے گائیکی وجود میں آتی ہے۔ کیرانہ گھرانا کلاسیکی موسیقی کا مشہور گھرانا مانا جاتا ہے اور اس میں بڑے مشہور موسیقار گزرے ہیں، جن میں بندے علی بین کار، حیدر بخش، عبدالغفور خان، عبدالشکور خان، عبداللطیف خان، عبدالوحید خان اور عبدالکریم خان بہت مشہور ہیں، اسی گھرانے میں ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم جیسی اعلیٰ پائے کی گائیکا بھی گزری ہیں، جن کے فن کی سارے جنوبی ایشیا میں کوئی مثال نہیں۔

آگرہ گھرانا سُر کے ساتھ دبنگ آواز کی آمیزش اور چلت پھرت کی وجہ سے مشہور ہے، اس گھرانے کی گائیکی میں بھی آواز ناک سے ادا کی جاتی ہے، لیکن یہ تیز اور مرتعش نہیں، بلکہ کسی قدر دھیمی اور

سپاٹ ہوتی ہے۔ اس گھرانے کے نامور گائیکوں میں استاد خدا بخش، حاجی سبحان خان، شیر خان، غلام عباس اور تھمن خان وغیرہ کے نام بہت اہم ہیں۔ اسی گھرانے میں آفتابِ موسیقی استاد فیاض خان پیدا ہوئے، بعد ازاں اس گھرانے کی نمائندگی استاد اسد علی خان نے کی۔

شام چوراسی گھرانا بھی گائیکی کے اپنے منفرد انداز کے باعث بہت مشہور گھرانا ہے۔ اس گھرانے کا طرۂ امتیاز ہندوستانی موسیقی کی قدیم اور مشکل صنف ''دھرپد'' تھا، بعد ازاں ''خیال'' کی مقبولیت کے سبب شام چوراسی والے ''خیال'' بھی گانے لگے۔ اس میں بھی انھوں نے اپنے مخصوص انداز کو برقرار رکھا۔ اس گھرانے کا نام چاند خان اور سورج خان جیسے موسیقاروں سے روشن ہوا۔ پاکستان میں اس گھرانے کا نام ولایت علی خان اور ان کے بیٹوں نزاکت علی خان اور سلامت علی خان نے چمکایا۔ استاد سلامت علی خان آج بھی اس گھرانے کی گائیکی کی ایک معتبر مثال ہیں۔

دوسری طرف جے پور گھرانے کے گویے پورے گلے کی آواز کے ساتھ گاتے ہیں۔ وہ آواز کو اس کے فطری انداز میں آزاد رکھتے ہیں۔

پٹیالہ گھرانا بھی ہماری کلاسیکی موسیقی کا ایک معروف گھرانا ہے۔ یہ گھرانا استاد علی بخش اور استاد فتح علی کی گائیکی کی وجہ سے مشہور ہوا، جو اپنے گانے کی تیاری کی وجہ سے ''جرنیل'' اور ''کرنیل'' کہلائے۔ یہ دونوں براہ راست آخری مغل تاج دار بہادر شاہ ظفر کے درباری گویے تان رس خان کے شاگرد تھے۔ گویا پٹیالہ گھرانے کے بانی دہلی گھرانے کے شاگردِ خاص تھے۔ پٹیالہ گھرانے میں عاشق علی خان، استاد بڑے غلام علی خان، استاد برکت علی خان، استاد اختر حسین خان اور استاد امانت علی جیسے بڑے گانے والے گزرے ہیں۔ آج پاکستان میں استاد فتح علی خان پٹیالہ گھرانے کی گائیکی کی بنیادی علامت ہیں، جو کبھی اپنے بڑے بھائی امانت علی مرحوم کے ساتھ مل کر گایا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے نامور پیش روؤں کی درخشاں روایت کو ثابت قدمی سے آگے بڑھایا ہے۔ اس گھرانے کو اختیار کرنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہندوستان اور پاکستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ پٹیالہ گھرانے کی گائیکی میں کیرانہ اور جے پور دونوں گھرانوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، ساتھ ہی بعض ایسی خصوصیات بھی ہیں جو اس گھرانے کو دوسرے تمام گھرانوں سے ممیز کرتی ہیں۔ پٹیالہ گھرانے میں تان اور پلٹوں کی ادائی کا طریقہ زیادہ بھرپور محسوس ہوتا ہے۔ یہاں تان کی اٹھان میں گلے میں زیادہ ارتعاش پیدا کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سُروں کو جھلانے کے انداز میں بھی پٹیالہ گھرانا دوسرے گھرانوں سے مختلف ہے۔ ایک خاص صفت جو پٹیالہ گھرانے کی گائیکی سے مخصوص ہے ''بول تان''

ہے۔ یہ انداز عام طور پر دادرے کی گائیکی میں ملحوظ رکھا جاتا ہے، لیکن پٹیالہ والے خیال کی گائیکی میں اس کا نہایت خوب صورت استعمال کرتے ہیں۔

دہلی گھرانے میں تان رس خان کے علاوہ شمس موسیقی استاد غلام محمد عرف ممن خان، استاد رمضان خان، استاد بندو خان اور استاد چاند خان کے نام کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ دہلی گھرانے کی خیال گائیکی ایک جداگانہ طرز رکھتی ہے جس میں چکر تان میں مہارت خاص اہمیت رکھتی ہے۔ سارنگی نوازی اس گھرانے کی خاص روایت ہے۔ استاد ممن خان بڑے سائز کی سارنگی بجاتے تھے جس میں ڈیڑھ سو طربیں لگتی تھیں۔ استاد چاند خان کے شاگردوں میں استاد امراؤ بندو خان، استاد نظام خان، شاہد احمد دہلوی اور اقبال بانو شامل ہیں۔

اسی طرح باقی تمام گھرانوں کا بھی اپنا اپنا مخصوص انداز اور منفرد خصوصیات ہیں، جن سے یہ پہچانے جاتے ہیں۔ ان خصوصیات میں منفرد اسلوب کے علاوہ راگ راگنیوں کے پیش کرنے کا طریقہ اور آواز لگانے کا انداز بھی مختلف ہے، یہاں تک کہ کہیں کہیں تضاد کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے۔

خیال گائیکی آج برصغیر میں جس مقام کی حامل ہے، اسے اس مقام تک پہنچانے میں موسیقی کے ان گھرانوں نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان گھرانوں سے وابستہ موسیقار وہ لافانی لوگ ہیں جنھوں نے کلاسیکی موسیقی کو باوقار طریقے سے مروّجہ موسیقی کی شکل میں ترتیب دیا۔ گھرانوں کی گائیکی کا یہ نظام ہندوستان کی ریاستوں کے نوابین اور امرا کی فیاضانہ سرپرستی کا مرہونِ منت رہا ہے۔ ان ریاستوں کے خاتمے کے بعد، نئے سماجی نظام میں، گھرانوں کی گائیکی کا یہ نظام بھی اپنا سابقہ مقام کھو بیٹھا ہے۔ آج گنے چنے گھرانے باقی رہ گئے ہیں جو اسلاف کی میراث کو سینوں سے لگائے بیٹھے ہیں۔

یاسر اقبال

ہندوستانی اور ایرانی موسیقی کا امتزاج اور امیر خسرو

لفظ موسیقی وسط ایشیا، جنوب ایشیا، عرب اور شمال افریقہ تک سمجھا اور بولا جاتا ہے۔ تحقیق سے متفقہ رائے یہی سامنے آتی ہے کہ لفظ موسیقی کی اصل یونانی زبان ہے اور یہ یونانی سے عربی میں آیا ہے۔ اس طرح

پھر تمام اسلامی دنیا میں اس کی تشہیر ہوئی ہے۔ ایک محققانہ رائے یہ بھی دی جاتی ہے کہ جب عربوں نے فلسفہ اور منطق کی کتابوں کے عربی زبان میں تراجم کیے تو اس لفظ کو معمولی سی تبدیلی کے ساتھ عربی میں شامل کر لیا۔ یعنی کاف سے ق میں بدل دیا۔ انگریزی میں اسے (Music) فرانسیسی میں میوزق (Musique) اور لاطینی میں میوزیکا (Musica) جرمنی میں میوزیکے سمجھا اور بولا جاتا ہے۔

اس کے معنی وہ آہنگ اور منظم آواز جو سماعت کو سوز و گداز اور لذت بخشتی ہے۔ آواز کا ترتیب سے پیدا ہونا جس میں نغمگی پائی جائے اور الاپ کانوں میں رس گھولتا ہوا دل و دماغ پر اثر کرے موسیقی کہلاتا ہے۔ زمانہ جاہلیت یا ابتدائے اسلام میں موسیقی کا لفظ عربی میں نہیں ملتا البتہ نشید اور غناء کے لفظ ضرور ملتے ہیں۔ عربوں نے اسے بحیثیت مستقل علم کبھی مرتب بھی نہیں کیا تھا۔ یونانی تاریخ سے ہی موسیقی کے ماخذات کا پتہ چلتا ہے۔ یونانیوں کے اسلاف کے کارناموں اور قصص و حکایات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان میں قدیم الایام سے حلقی Vocal اور سازگی Instrumental کا رواج عام تھا۔ اپالو Apollo دیوتا کو بڑی عظمت اور تقدس حاصل تھا اس کی حمد و ثناء میں گیت گائے جاتے تھے اور عبادات میں خوش الحان لڑکے اور لڑکیاں ہم آواز ہو کر نہ صرف دعا و مناجات گاتی تھیں بلکہ طنبورا اور" نے "وغیرہ بھی بجایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ یونانی موسیقی میں بربط اور بانسری کا بھی استعمال سامنے آتا ہے۔

یہ حقیقت تو مسلم ہے کہ خوش الحانی ایک فطری چیز ہے۔ جو انسان کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ ویسے تو جملہ فنون کا انسانی نفسیات سے گہرا تعلق ہے جس کا تجزیہ ہمارے دماغ میں ہوتا ہے۔ مصوری، مجسمہ سازی، فنِ تعمیر، خوش نویسی اپنی اپنی جگہ فنونِ لطیفہ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں لیکن فنِ موسیقی کا جو اثر نفسِ انسانی پر پڑتا ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں۔ اس فنِ لطیف میں جو معنویت اور اثر انگیزی ہے وہ محتاجِ بیاں نہیں۔ انسان کے دل و دماغ پر تصرف کر کے خیالات و جذبات میں ایک انقلاب برپا کرنا صرف موسیقی کا ہی کام ہے۔ اعصاب کو حساسیت بخشنے اور ہیجانی کیفیت پیدا کرنے میں فنِ موسیقی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

جیسا کہ تاریخی مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ فنونِ لطیفہ کو تہذیب کی علامت سمجھا جاتا رہا ہے۔ اور اس کا فروغ اور سرپرستی ہر سطح پر جاری رہی ہے۔ چونکہ ہمارا موضوع ہندوستانی اور ایرانی موسیقی کے امتزاج سے متعلق ہے

تحقیق سے یہ امر واضح ہے کہ برِ صغیر کا خطہ مختلف تہذیبوں کا سنگم رہا ہے۔ بیرونی اقوام کا اس خطے

میں آنا اور اسے اپنا مستقل مسکن بنانا شروع کیا تاہم یہ بتانا تقریباً مشکل معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے اصل باشندے کون تھے۔ دراوڑی اقوام پھر سیتھین، پھر آریا، پھر یونانی، پھر راجپوت اقوام ان کے بعد مسلمان یعنی عرب، ترک، پٹھان اور مغل اور سب کے آخر میں اہلِ یورپ نے اس خطے کو اپنا مسکن بنایا۔ یہ جملہ اقوام یکے بعد دیگرے اس خطے میں وارد ہوتی رہیں اور یہاں اپنی حکومتیں بناتی رہیں اور ساتھ ساتھ یہاں کی مقامی آبادی سے گھل مل کر ایک نئی تہذیب کی شکل بناتی رہیں۔ سب سے زیادہ جس قوم نے اس خطے میں اپنی تہذیب وتمدن کے اثرات مقامی تہذیب پر مرتب کیے وہ مسلمان ہیں۔ مسلمان حکمران جب اس خطے میں آئے تو اپنے ساتھ نہ صرف اپنا اثر انگیز کلچر لائے بلکہ کئی علما وفضلا اور شعرا اور فنکاران کو بھی ساتھ لائے۔ جس سے اس خطے کے اندر علوم وفنون میں بامعنی اور اثر انگیز تبدیلیاں سامنے آئیں۔ جہاں مسلمانوں کی آمد سے لسانی تبدیلیوں کا آغاز ہوا وہاں فنونِ لطیفہ میں بھی دو تہذیبوں کے سنگم سے تجربات نظر آنے لگے۔ ان تجربات سے فنونِ لطیفہ کا دائرہ کار وسیع تر ہوتا گیا۔ دیگر فنون کی طرح اس خطے کی موسیقی بھی تجربات وتغیرات سے دوچار ہوتی رہی۔ ان تجربات وتغیرات سے ہندوستانی موسیقی کا دائرہ کار نہ صرف بڑھتا چلا گیا بلکہ باقاعدہ طور پر علمی وعملی سطح پر اسے سمجھا جانے لگا۔ اس سے پہلے برِ صغیر کی موسیقی مندروں میں مقید تھی چنانچہ مسلمانوں کی آمد سے نہ صرف موسیقی مندروں سے باہر نکلی بلکہ سنگیت کے ماہرین اس فن کی عملی سطح کے ساتھ ساتھ علمی سطح پر بھی ترویج کرنے لگے اس طرح فنِ موسیقی بطور علمِ موسیقی سمجھا جانے لگا۔ موسیقی میں وقوع پذیر ہونے والے وہ تغیرات وتجربات جو فن موسیقی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں ان کا سہرا امیر خسرو کے سر بندھتا ہے۔ امیر خسرو کے یہ تجربات موسیقی کے لیے اصول وضوابط ٹھہرے جن کی اہمیت آج بھی مسلم ہے۔

صدیوں سے امیر خسرو کا نام فنِ موسیقی میں اتنا ہی بلند سمجھا جاتا رہا ہے جتنا کہ شاعری میں۔ انھیں ستار اور طبلے کے ساتھ ساتھ کئی نئے راگوں کا خالق سمجھا جاتا ہے۔ امیر خسرو کے یہ نئے راگ عجمی اور ہندی موسیقی کے حسین امتزاج سے تخلیق ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ گائیکی میں امیر خسرو نے دکن کے مشہور گائیک گوپال کو بھی ہرا دیا تھا۔ امیر خسرو کی تحاریر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ فنِ موسیقی پر مکمل دسترس رکھتے تھے انھیں عجمی موسیقی پیچیدگیوں مثلاً چار اصول، بارہ پردے وغیرہ پر مکمل عبور حاصل تھا۔ نہ صرف فن موسیقی کو علمی لحاظ سے سمجھتے تھے بلکہ موسیقی کی فنی باریکیوں کا بھی مکمل ادراک تھا اور اپنے دور میں موسیقی کے معرکوں میں عملاً حصہ لیتے تھے۔ اس پسِ منظر میں یہ بعید از قیاس نہیں کہ امیر نے ہندوفارس کے نئے کلچر سے متاثر ہو کر عجمی اور ہندی موسیقی کے سنگم سے نئے نئے اسلوب وضع کر کے رائج کیے ہوں۔ لیکن ان جدتوں کی نوعیت اور مقدار کا تعین کرنا مشکل ہے۔ ہندوستانی موسیقی کی ایک دیرینہ فارسی کتاب (جو کہ راجہ مان سنگھ

کی ایک اور کتاب کا ترجمہ ہے) کے مطابق امیر خسرو نے مندرجہ ذیل نئے راگ اور اصناف موسیقی ایجاد کیے۔ مجیر، سازگری، غزل، ایمن، فرغانہ، سرپردہ، فرودست، قول، ترانہ، خیال، نگار، شاہانہ۔

تمام راگ اور اصناف موسیقی کی فنی تفصیلات میں جا کر ان کی ایجاد و دریافت کا صحیح تعین کرنا ایک الگ اور جامع موضوع ہے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ امیر خسرو ہی نے سب سے پہلے غزل اور قول کے اسلوب کو ہندی موسیقی میں رائج کیا آج بھی تمام ہند میں قوال حضرات قول کی وجہ سے انھیں اپنا استاد مانتے ہیں۔ امیر خسرو نے ہندی موسیقی کے اس قدیمی جمود کو توڑ کر اسے فرسودہ و منجمد قیود سے آزاد کرایا۔

آلات موسیقی میں ستار جسے سہ تار کہا جاتا تھا، پرانے ہندی ساز وینا (جو مہادیو کی ایجاد سمجھی جاتی ہے) کی سادہ صورت ہے، کو بھی امیر خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے۔ امیر خسرو کا دور ایسی تبدیلیوں کے لیے موزوں نظر آتا ہے لیکن خسرو کی تحریروں میں ستار کا نام کہیں نظر نہیں آتا حتیٰ کہ کئی دیگر سازوں کے نام ملتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہند کا خاص ساز عجب رود بھی ستار سے نہیں ملتا۔ یہ نام کہیں بھی نہیں ملتا ماسوائے جدید ہندی و فارسی ادب کے۔ ستار نام کا ساز اصل میں فارس یا کاکیشیا میں مروج تھا اور ہندوستان میں اس کے بعد آیا۔ ستار کاکیشیا اور جارجیا کا اب بھی قومی ساز ہے۔ غالب خیال یہی ہے کہ انھی خطوں سے یہ ساز مغربی ممالک میں گیا جہاں پذنتھار یا گتار کہلایا۔

تاہم مستند محقق ستار کی ایجاد کا سہرا امیر خسرو کے سر ہی پر باندھتے ہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ ساز دیرینہ مروجہ سازوں سے اس دور میں ایجاد ہوا جب عجمی اور ہندی کلچر ایک دوسرے کے قریب آئے۔ ستار کی شکل عجمی ‘‘طنبورہ’’ یا ‘‘ٹھُوڈ’’ سے ملتی ہے اور ہندی وینا سے ترتیب مکمل طور پر ہندو فارس کی تہذیبوں کا مرکب ہے۔ ستار کی اصل کیا ہے؟ اور کس طرح وجود میں آیا؟ اس بحث سے قطع نظر اس بات پر تمام محققین کا مکمل اتفاق ہے کہ امیر خسرو نہ صرف فنِ موسیقی کے شاہسوار تھے بلکہ انھوں نے پرانی گائیکی میں منفرد تبدیلیاں لا کر اسے ایک نئے اسلوب سے روشناس کرایا اور اپنے لیے نائیک کا لقب پایا۔

امیر خسرو نے اپنے عہد کی موسیقی میں نئی روایات قائم کر کے ہندوستانی موسیقی کو ایک نیا آہنگ بخشا۔ خسرو نے اس دور میں فنِ موسیقی کو جو نئی نئی چیزیں عطا کیں وہ آج تک یادگار ہیں۔ ہندوستانی اور ایرانی موسیقی میں ایک امتزاج پیدا کیا وہ خود جس طرح ایرانی طرز موسیقی کے ماہر تھے اور اسی طرح ہندوستانی موسیقی سے بھی واقف تھے اور زندگی بھر ہندی موسیقی کے مداح رہے۔ وہ اپنی مثنوی ‘‘نہ سپہر’’ میں لکھتے ہیں کہ:

> ‘‘ہندوستانی موسیقی ایک آگ ہے جو قلب اور روح دونوں کو جلاتی ہے اور تمام ممالک کی موسیقی سے بہتر ہے’’

اس کے علاوہ اپنی مشہور تصنیف ''اعجازِ خسروی'' میں معاصر گویوں اور سازندوں کا بھی ذکر کیا ہے جن میں: محمد شاہ چنگی، حسینی اخلاق، کنجشک اور عورتوں میں ترمتی خاتوں نمایاں نام نظر آتے ہیں اس کے علاوہ سازوں کی تفصیل کا کچھ اس طرح ذکر کیا ہے۔

چنگ، رباب، دف، طنبورہ، شہنائی، معبلک، بطیرہ، ڈھول اور غودساز وں کا ذکر ملتا ہے۔ ہندی اور ایرانی راگ راگنیوں کے علاوہ سازوں میں بھی امیر خسرو نے نئی اختراعات عمل میں لائیں، مثلاً قدیم ہندی ساز مردنگ کو طبلے کی شکل میں بدل دیا اور ہندوؤں کے ساز وینا اور ایرانیوں کے طنبورہ کو ملا کر ستار ایجاد کیا۔ اس کے علاوہ سرپردہ، سازگری، مجیر، زیلف، عشاق، فرغانہ، غزان، فردوست منم، قول، ترانہ، نگار سخنہ اور بسیط راگ امیر خسرو کی اختراعات ہیں۔

امیر خسرو سے پہلے جس صنفِ موسیقی کو رواج حاصل تھا وہ دُھرپد تھی انھوں نے دھرپد کو چھوڑ کر خیال ایجاد کیا اور قوالی جیسی صنف کو ترقی دی۔ جیسا کہ ہمارا موضوع ہندی اور ایرانی موسیقی کے امتزاج کے حوالے سے ہے اور اس بات سے بھی ہم آگاہ ہیں کہ امیر خسرو نے ہندی اور ایرانی موسیقی کو ملا کر ایک نیا اسلوب وضع کر کے نہ صرف فنِ موسیقی کے کینوس کو بڑھا دیا بلکہ موسیقی میں کئی نئے ابواب کا اضافہ کر دیا۔ امیر خسرو کی مزید فنی خدمات کو جاننے کے لیے ہمیں ایک مختصر سی نظر ہندوستانی موسیقی پر ڈالنا ہو گی۔

دانشورانِ ہند موسیقی کو نغمہ خداوندی بتاتے ہیں اور اس کا موجد کرشن جی کو اور بعض مہادیو جی کو بتاتے ہیں اور ہندوستانی موسیقی ایرانی موسیقی سے بھی قدیم مانتے ہیں۔ چنانچہ ہندوؤں کا یہ دعویٰ رہا ہے کہ ہندوستان زمانہ قدیم ہی سے علم وفن کا گہوارہ رہا ہے ان کے اس دعویٰ کے مطابق یہیں سے تمام علوم وفنون ایجاد ہو کر دیگر ممالک میں پھیلے ہیں۔ ہندوستان میں موسیقی کا مترادف لفظ سنگیت ہے۔ سُر کو انفرادی طور پر گایا جائے یا اجتماعی طور پر، ساز کے ساتھ ہو یا بغیر ساز کے ان سب پر سنگیت کا اطلاق ہوتا ہے۔ پس ہندوستانی موسیقی ہر شکل پر حاوی مانی جاتی ہے۔ علم موسیقی میں آواز کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ صدائے موسیقی، یعنی وہ آواز جو فنِ موسیقی کے اصول وضوابط کے مطابق ہو جو کانوں میں رس گھول کر دل ودماغ کو سکون بخشے اور سننے میں بھلی معلوم ہو۔

۲۔ صدائے محض، یہ وہ آواز ہوتی ہے جو کانوں کو بھلی معلوم نہیں ہوتی یعنی بے ہنگم و بے ترتیب آواز جس سے محض شور وغل کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ سنگیت کا براہ راست تعلق اول الذکر قسم یعنی صدائے موسیقی سے ہے۔ ہندی سنگیت کاروں نے ہندوستانی موسیقی کو سات سروں میں تقسیم کیا ہے۔ سروں کے اس نظام کو سمجھنے کے لیے ایک اور وضاحت کو سمجھنا موسیقی کے طالب علم کے لیے ضروری ہے۔ موسیقی کی اصطلاح

میں سر کی آواز بتدریج آہستہ آہستہ بڑھتی ہے۔ مثلاً کبھی ایسا نہیں ہوا نہ سنا کہ اچانک اونچی اور زوردار آواز پیدا کر کے پھر اسے بتدریج آہستہ آہستہ نیچے لایا گیا ہو۔ اگر ایسا کیا جائے تو وہ سر کی آواز نہیں ہوگی کچھ اور بے ہنگم آواز ہوگی جس میں موسیقیت نظر نہیں آئے گی۔ اسی اصول کو بنیاد مان کر سات سروں کا نظام وضع کیا گیا ہے۔ اسطرح اگر پردوں والا ساز یعنی ہارمونیم یا ایسی کوئی وضع کا اور ساز ہے تو بائیں سے دائیں بجایا جائے گا۔ اس قاعدے کے مطابق کسی بھی ساز کی سروں کو بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ مدھ یعنی بھاری آواز یا آواز قدرے ہلکی ہوتی ہے اور اس کی ادائیگی "ہا" سے ہوتی ہے۔

۲۔ مندر (درمیانی آواز، یہ حصہ ساز کے درمیان میں ہوتا ہے۔ اس حصے میں آواز "آ" کہہ کر گلے سے ادا ہوتی ہے)

۳۔ ٹیپ یا تار (اس حصے کے سر کی آواز اونچی ہوتی ہے اور آواز کی ادائیگی نتھنوں یعنی ناک اور گلے کے ذریعے ہوتی ہے۔

ہر حصہ سپتک کہلاتا ہے۔ اس طرح ہر سپتک میں کل بارہ سر ہوتے ہیں۔ یہ بارہ سر بنیادی طور پر سات سروں سے بنتے ہیں یعنی ہر سر کے دو حصے ہوتے ہیں ماسوائے کھرج اور پنچم کے۔ ان سات سروں کو سرگم کہا جاتا ہے۔ ان سات سروں کا خاکہ کچھ اس طرح ہے:

آغاز

نی دھا پا ما گا رے سا

سروں کے صوتی آہنگ کے بتدریج بڑھنے کے عمل کو سمجھنے کے لیے ان حروف پر لکیریں کھینچ دی گئی ہیں۔ پہلے حرف یعنی سا کو اگر مقام مانا جائے تو دوسرے سر رے کا بڑھنا دوگنا، تیسرے سر کا تگنا اور اس طرح دھا تک چھ گنا اور نی تک سات گنا سر بتدریج بڑھتا جائے گا۔ ان سروں کی شرح مندرجہ ذیل بتائی جاتی ہے۔

کھرج	(سا)	طاؤس یا مور کی آواز
رکھب	(رے)	پپیہے کی آواز
گندھار	(گا)	بکری کی آواز
مدھم	(ما)	کلنگ کی آواز
پنچم	(پا)	کوئل کی آواز
دھیوت	(دھا)	مینڈک کی آواز

نکھاد	(نی)	ہاتھی کے چنگھاڑنے کی آواز

انھی سات سروں سے راگ اور راگنیاں وجود میں آتی ہیں اور پھر انھی راگوں سے مختلف نغمے اور دھنیں ترتیب پاتے ہیں۔ موسیقی میں ایک اور اصول جسے بنیادی اہمیت حاصل ہے وہ تال کی "لَے" (Tempo) ہے۔ گانے بجانے کی رفتار کو لے کہتے ہیں۔ لے کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔	بلمپت	(دھیمی اور آہستہ لے)
۲۔	مدھ	(درمیانی لے)
۳۔	دُرت	(انتہائی تیز لے)

علمِ موسیقی کے تین اہم شعبے سُر، لَے اور تال کے ہیں۔ انھیں تین شعبوں پر مشتمل آواز کے مجموعے کو موسیقی کہتے ہیں۔

موسیقی سے متعلق بنیادی باتیں جاننے کے بعد امیر خسرو کے عہد کی طرف آتے ہیں۔ یہ بات تو ہم سبھی جانتے ہیں کہ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے فنونِ لطیفہ کو فروغ ملا خصوصاً فنِ موسیقی کو درباروں کی بڑی سرپرستی حاصل رہی۔ اسلامی دور سے قبل کی ہندی موسیقی سے متعلق زیادہ معلومات تو حاصل نہ ہو سکیں کیونکہ وہ تمام معلومات سنسکرت کی کتابوں میں درج ہیں جن کا مکمل طور پر سمجھنا آسان نہیں۔ صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ سام وید کے بھجن، مناجاتیں اور ترانے زیادہ تر رائج تھے۔ اور اب بھی مندروں میں ان کا رواج عام ہے۔

پوری دو صدیاں گزرنے کے بعد جب مسلمان اور ہندو ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں، ایک دوسرے کی زبانوں کے الفاظ بولتے اور سمجھتے ہیں اور اپنی اپنی زبانوں میں استعمال کرتے ہیں تو ایک تیسری زبان کی تخلیق ہوتی ہے۔ جسے اردو کہا جاتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ہندوستان میں امیر خسرو پیدا ہوتے ہیں امیر خسرو کی تاریخ پیدائش ۶۵۱ھ ہے۔

مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں فنِ موسیقی نے بڑی ترقی کی اور بادشاہوں نے بھی ماہرین موسیقی اور اہلِ فن کی قدردانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ ہمیشہ علوم و فنون کی سرپرستی کرتے رہے۔ بعض بادشاہ تو خود بھی علمِ موسیقی کا مکمل ادراک رکھتے تھے۔

امیر خسرو عالم، فاضل اور شاعر تھے ہی مگر اس کے ساتھ وہ موسیقی کے رموز و اوقاف سے بھی مکمل آگاہ تھے۔ ایسے باکمال انسان صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں جن کی نظیر رہتی دنیا تک نہیں ملتی۔ اگر خسرو کی صرف شاعری کو ہی لیا جائے تو ان کی جامعیت اور معنویت دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ نہ صرف فارسی کے شاعر تھے بلکہ عربی اور سنسکرت زبان پر بھی مکمل عبور رکھتے تھے۔ موزونی طبع کا یہ عالم تھا کہ جس آواز کو

چاہئے نظم کر دیتے مثلاً دہل کی آواز کو کس طرح نظمیہ انداز میں برتا ہے :

دہل زن دہل زو بہ تحسین او
کہ دیں، دین او، دین او دین او

دوسری نقل دھنیے کی بھی ملاحظہ کیجیے :

در پے جاناں جاں ھم رفت ، جان ھم رفت جان ھم رفت رفت رفت ، جان ھم رفت
اَتنہم رفت وآ نہم رفت آ نہم رفت ، اَتنہم آ نہم اَتنہم آ نہم آ نہم رفت
رفتن، رفتن ، رفتن دہ دہ دہ رفتن دہ رف رف رفتن دہ رفتن دہ

کس قدر حاضر دماغی ہے کہ بے تکلف جچے تُلے حرفوں سے مختلف آلات کی صدا پیدا کر دی جو سنتا ہے ایک دفعہ تو مبہوت ہو جاتا ہے ۔

امیر خسرو ہندوستان کی موسیقی کے ایسے کامیاب غوطہ زن تھے کہ موسیقی کو حدِ کمال تک پہنچا دیا۔ ہندوستانی اور ایرانی موسیقی کے اسالیب کو ملا کر ایک تیسرا اسلوب ایجاد کیا۔ جس سے فنِ موسیقی میں ایک تازہ روح پیدا ہو گئی جو پہلے سے زیادہ پُر لطف اور اثر انگیز ثابت ہوئی ۔

ذیل میں امیر خسرو کے ایجاد کردہ راگوں کی فہرست ہے جس کا تذکرہ مولانا شبلی نے بھی امیر خسرو کے حوالے سے کیا۔ یہ امیر خسرو کے وہ راگ ہیں جو ہندوستانی اور ایرانی موسیقی کی امتزاجیت سے وجود میں آئے ۔

ایمن	ہنڈول اور نیریز
عشاق	سارنگ، بسنت اور نوا
موافق	توڑی و مالوی و دوگاہ حسینی
غم (غازاں)	پوربی میں ذرا سی تبدیلی کر دی
زیلف	کھٹ راگ میں شہ ناز کو ملایا
فرغانہ	کنگلی اور گورا کی ملاوٹ
سراپردہ (سرپردہ)	سارنگ، بلاول، اور راست کی آمیزش
فرودست (پھرودست)	کانہڑا، گوری، پوربی، اور ایک اور فارسی راگ سے مرکب
صنم (منعم)	کلیان میں ایک فارسی راگ شامل کیا ہے ۔

ان کے علاوہ قول، ترانہ، خیال، نگار، بسیط، شاہانہ، سہیلا یہ وہ راگ ہیں جو مرزا محمد صاحب نے اپنی تصنیف Llif and works of Amir Khusrau میں درج کیے ہیں ۔ ان راگوں میں قول، غزل

،خیال، اور ترانہ کی بندشیں اب بھی مقبول ہیں۔

قوال تو آج بھی امیر خسرو کا نام نہایت عزت و تکریم سے لیتے ہیں۔

امیر خسرو نے پرانی موسیقی میں جو تراش خراش کر کے نئے اسلوب کو قائم کیا جہاں ان کی اس کاوش کو سراہا گیا وہاں قدامت پسند موسیقی کے دلدادگان نے ہمیشہ خسروی اختراعات کو نظر انداز کیے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ راگوں میں سے جو امیر خسرو نے ہندوستانی اور ایرانی راگوں کی آمیزش سے نئے راگ پیدا کیے تھے ان میں سے صرف چند ہیں جو ہم تک پہنچے۔ باقی ناموں سے کوئی واقف بھی نہیں۔

چنانچہ واجد علی شاہ اپنی تصنیف ''صوتِ مبارک'' میں خسرو کو دھرپد کے نائیک خیال مانتے تھے۔ ان کے مطابق امیر خسرو ترانہ، چھند، پند، قول، قلبانہ، نقش اور گل کے بھی موجد ہیں۔

حاصل بحث یہ ہے کہ امیر خسرو نے ایرانی اور ہندوستانی موسیقی میں بڑا کمال حاصل کیا تھا وہ دونوں ممالک کی نہ صرف موسیقی سے آگاہ تھے بلکہ دونوں ملکوں کی تہذیب سے بھی مکمل آشنا تھے۔ تبھی تو ان کی شاعری میں کئی موضوعات ایسے ملتے ہیں جن میں واضح طور پر ہندوستانی معاشرت کی جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً بابل والی نظم جس میں خسرو نے ان جذبات کی عکاسی کی ہے جب لڑکی ماں باپ کے گھر سے رخصت ہوتی ہے اس کے علاوہ منڈھا، میلہ وغیرہ وہ عنوانات ہیں جو ہندوستان کی تہذیب کا حصہ ہیں۔

درحقیقت یہی اُن کا ایک بڑا کارنامہ ہے جو امیر خسرو کے بیدار مغز ہونے کا واضح ثبوت ہے۔ انھوں نے اپنی اختراعات سے ہندوستان کے فنِ موسیقی کی ایک بڑی خلیج کو پُر کر دیا۔ وہ فنِ شاعری میں بھی بے مثل ٹھہرے اور فنِ موسیقی میں بھی یکتا ہوئے ----

☆☆☆☆

سُداما پانڈے

ہندی ادب سے ترجمہ : اسد محمد خاں

شہر، شام اور ایک بوڑھا۔۔۔ مَیں

آخری کش لے کر مَیں سگریٹ کو ایش ٹرے میں ڈال دیتا ہوں
اور اب مَیں ایک مہربان آدمی ہوں
مُہذب اور شائستہ
میں چھٹیوں میں کسی سے نفرت نہیں کرتا
مجھے کسی محاذ پر نہیں لڑنا پڑتا
مَیں نے سب شراب پی لی
اور بوتل کو بیت الخلا میں رکھ دیا
جس پر لکھا ہے:
"صرف ڈیفنس سروسز کے لیے"
یہ میری زندگی کا خلاصہ ہے
(جوں ہی مَیں سائرن کی آواز سنتا ہوں
اچھے شہریوں کی طرح پردے گرا دیتا ہوں)

مَیں نے کوئی ایسا کارنامہ نہیں کیا
جس پر میرا مجسمہ بنایا جاتا
اور اس کا افتتاح ہوتا تو ذمہ دار شہری
اپنے ایک مصروف دن کی قربانی دیتے
مَیں نے تو اپنی رکابی کے گوشے میں بیٹھ کر
ایک عام سی زندگی گزاری ہے

مجھے ورثے میں جیلوں کے برابر پڑا ہوا اخلاق
اور بوچڑ خانے کے سامنے کی تواضع ملی ہے؛
انھیں مَیں نے اپنے سامانِ آسائش سے ضم کر لیا ہے

اور دو قدم بڑھ کر ان کا استقبال کیا ہے
میونسپلٹی نے مجھے بائیں جانب رہنا سکھایا ہے
(زندگی میں کامیاب ہونے کے لیے ڈیل کارنیگی پڑھنا
ضروری نہیں، روڈ سائنز سمجھنا ضروری ہے)

جو چھوٹے چھوٹے جھوٹ مَیں بولتا ہوں
بندوق کو اُن سے الگ کر دو تو مجھے اُس کا وزن
محسوس بھی نہ ہو
چوراہے میں ادھر اُدھر قوائد پریڈ کرتے ہوئے
ٹریفک کانسٹیبل کے چہرے کے تاثر میں
مجھے جمہوریت کا نقشہ دکھائی دیا ہے ---
اور اب جب کہ مجھے چھوٹی موٹی خوش حالی نصیب ہو گئی ہے
اور مَیں مطمئن ہوں،

مجھے کسی چیز کی تکمیل نہیں کرنی
مَیں عمر کے اس موڑ پہ پہنچ گیا ہوں
جب فائلیں بند ہونا شروع ہو جاتی ہیں
میں برآمدے میں کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اپنی ذاتی کرسی پر بیٹھتا ہوں
سورج میرے جوتے کی نوک پر غروب ہو رہا ہے
دور کہیں بگل بجتا ہے --- یہ سپاہیوں کے لوٹنے کا وقت ہے
اور شہر، بڑی خاموشی سے اور آہستہ آہستہ
اپنی دیوانگی کو
کھڑکیوں کے شیشوں اور قہقہوں میں تبدیل کر رہا ہے

تا دیوش روے وچ

پولش ادب سے ترجمہ : اسد محمد خاں

زندگی کے درمیان

دنیا کے خاتمے کے بعد
اور موت کے بعد
مَیں نے خود کو زندگی کے درمیان پایا
سو مَیں نے اپنی تخلیق کی
اور زندگی کی تعمیر کی
اور لوگ بنائے اور جانور بنائے اور مناظر تخلیق کیے

یہ میز ہے، مَیں نے کہا
یہ میز ہے
میز پر ایک روٹی اور چھری ہے
چھری روٹی کاٹنے کے کام آتی ہے
لوگ روٹی کھا کے زندہ رہتے ہیں

آدمی سے محبت کی جانی چاہیے
مَیں نے رات کے وقت اور دن کے وقت دہرایا اور یاد کیا
کس سے محبت کی جانی چاہیے؟
آدمی سے
مَیں نے جواب دیا: آدمی سے
یہ کھڑکی ہے، مَیں نے کہا: یہ کھڑکی ہے
کھڑکی کے اُدھر باغ ہے

مَیں باغ میں سیب کا ایک درخت دیکھتا ہوں
پھولوں سے لدا ہوا سیب کا درخت
پھول گرتے ہیں
پھل بننا شروع ہوتے ہیں
پکتے ہیں
میرا باپ ایک سیب توڑتا ہے
یہ آدمی جو سیب توڑ رہا ہے میرا باپ ہے

مَیں ایک مکان کی دہلیز پر بیٹھ جاتا ہوں

یہ بوڑھی عورت ہے جو بکری کی رسی تھامے گزر رہی ہے
دنیا کے ساتوں عجائبات سے زیادہ ضروری ہے
ان سے کہیں زیادہ قیمتی ہے
جو کوئی بھی یہ سوچتا اور محسوس کرتا ہے کہ
یہ بڑھیا ضروری نہیں ہے ---وہ مجرم ہے
بنی نوع انسان کا قاتل ہے
یہ آدمی ہے، یہ درخت ہے، یہ روٹی ہے
لوگ کھاتے اس لیے ہیں کہ زندہ رہیں
مَیں دل ہی دل میں دہراتا رہتا ہوں :
انسانی زندگی بہت اہم ہے
انسانی زندگی کی اہمیت بہت زیادہ ہے
زندگی کی قیمت آدمی کی بنائی ہوئی ہر ایک چیز سے زیادہ ہے
آدمی ایک بے بدل خزانہ ہے
مَیں بڑے ضدی پن سے دُہراتا رہتا ہوں

آدمی ایک بے بدل خزانہ ہے

یہ پانی ہے، مَیں نے کہا : یہ پانی ہے
مَیں نے ہاتھ بڑھا کر لہروں کو چھولیا
اور دریا سے باتیں کیں
پانی سے کہا: مہربان پانی
یہ مَیں ہوں
تو آدمی نے پانی سے کلام کیا
چاند سے کلام کیا
اور پھولوں سے اور بارش سے اور اس نے زمین سے کلام کیا
اور چڑیوں سے اور آسمان سے کلام کیا

آسمان چُپ تھا
زمین چُپ تھی
بڑی خاموشی تھی!

اور اگر اُس نے آواز سُنی
جو زمین سے اور پانی سے اُٹھ رہی تھی
اور آسمان سے اُتر رہی تھی
تو خبر ہو کہ وہ
دوسرے انسان کی آواز تھی

مّنو بھنڈاری

ہندی ادب سے ترجمہ : انعام ندیم

سیانی پھوپھی

سب پر گویا بُواجی کی شخصیت حاوی تھی۔ سارا کام وہاں اتنے نظم و ضبط سے ہوتا، جیسے سب مشینیں ہوں، جو قاعدے میں بندھی، بغیر رکاوٹ اپنا کام کیے چلی جارہی ہیں۔ ٹھیک پانچ بجے سب لوگ اٹھ جاتے، پھر ایک گھنٹہ باہر میدان میں ٹہلنا ہوتا، اس کے بعد چائے اور دودھ ہوتا۔ اس کے بعد انو کو پڑھنے کے لیے بیٹھنا ہوتا۔ بھائی صاحب بھی اس وقت اخبار اور آفس کی فائلیں وغیرہ دیکھا کرتے۔ نو بجتے ہی نہانا شروع ہوتا۔ جو کپڑے بواجی نکال دیں، وہی پہنے ہوتے۔ پھر قاعدے سے آکر میز پر بیٹھ جاؤ اور کھا کر کام پر جاؤ۔

سیانی پھوپھی کا نام حقیقت میں ہی سیانی تھا یا ان کے سیانے پن کو دیکھ کر لوگ انھیں سیانی کہنے لگے تھے، یہ تو میں آج بھی نہیں جانتی، لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ جس نے بھی ان کا یہ نام رکھا، وہ ناموں کے علم کا ضرور پارکھ رہا ہوگا۔

بچپن ہی سے وہ وقت کی جتنی پابند تھیں، اپنا سامان سنبھال کر رکھنے میں جتنی ذمہ دار تھیں، اور نظم و ضبط کی جتنی قائل تھیں، اسے دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں، جو پنسل وہ ایک بار خریدتی تھیں، وہ جب تک اتنی چھوٹی نہ ہو جاتی کہ ان کی پکڑ میں بھی نہ آئے تب تک اس سے کام لیتی تھیں۔ کیا مجال کہ وہ کبھی کھو جائے یا بار بار نوک ٹوٹ کر وقت سے پہلے ہی ختم ہو جائے۔ جو ربڑ انہوں نے چوتھی جماعت میں خریدی تھی، اسے نویں کلاس میں آکر ختم کیا۔

عمر کے ساتھ ساتھ ان کی ضرورت سے زیادہ سمجھداری بھی ترقی کرتی گئی اور پھر بُواجی کی زندگی میں اتنی زیادہ گھل مل گئی کہ اسے الگ کر کے بُواجی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کی ایک ایک بات کی پتا جی ہم لوگوں کو مثال دیا کرتے تھے جسے سن کر ہم سب جل جایا کرتے اور دعا کرتے تھے کہ بھگوان کرے، وہ سسرال میں ہی رہا کریں، ورنہ ہم جیسے بے سمجھ اور سست الوجود لوگوں کا تو جینا ہی حرام ہو جائے گا۔

ایسے میں سیانی پھوپھی کے پاس جا کر پڑھنے کی تجویز جب میرے سامنے رکھی گئی تو تصور کیجیے، مجھ پر کیا بیتی ہوگی؟ میں نے صاف انکار کر دیا کہ مجھے آگے پڑھنا ہی نہیں۔ پر پتا جی میری پڑھائی کے بارے

میں اتنے فکرمند تھے کہ انہوں نے سمجھا کر، ڈانٹ کر اور پیار دلار سے مجھے راضی کرلیا۔ سچ میں، راضی تو کیا کرلیا، مجھے اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے مجبور کر دیا اور بھگوان کا نام لے کر میں نے گھر سے رخصت لی اور ان کے یہاں پہنچی۔

اس میں شک نہیں کہ بُواجی نے بڑا استقبال کیا۔ پر بچپن سے ان کی شہرت سنتے سنتے ان کا جو رعب داب من پر چھایا ہوا تھا، اس میں ان کا وہ پیار کہاں غائب ہوگیا، میں جان ہی نہ پائی۔ ہاں، بُواجی کے پتی، جنھیں ہم بھائی صاحب کہتے تھے، بہت ہی اچھے مزاج کے شخص تھے اور سب سے بہتر کوئی گھر میں لگا تو ان کی پانچ سال کی بیٹی انو۔

گھر کے اس اکتا دینے والے اور عجیب و غریب ماحول میں اپنے آپ کو فٹ کرنے میں مجھے کتنی تکلیفیں اٹھانا پڑیں اور کتنا اپنے آپ کو کاٹنا چھانٹنا پڑا، یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ سب سے زیادہ ترس آتا تھا انو پر۔ وہ اس ننھی سی عمر میں ہی سمجھدار ہوگئی تھی۔ نہ بچوں کی سی خوش مزاجی، نہ کوئی چہچہاہٹ۔ ایک نامعلوم خوف سے وہ گھری رہتی تھی۔ گھر کے اس ماحول میں کچھ ہی دنوں میں میری بھی ساری ہنسی غائب ہوگئی۔

یوں بُواجی کو گھر جمائے لگ بھگ پندرہ سال ہو چکے تھے، پر ان کے گھر کا سارا سامان دیکھ کر لگتا تھا، گویا سب کچھ ابھی کل ہی خریدا ہو۔ گھر جماتے وقت جو کانچ اور چینی کے برتن انہوں نے خریدے تھے، آج بھی جوں کے توں تھے، جب کہ روز ان کا استعمال ہوتا تھا۔ وہ سارے برتن خود کھڑی ہو کر صاف کرواتی تھیں۔ کیا مجال، کوئی ایک چیز بھی توڑ دے۔ ایک بار ملازم نے صراحی توڑ دی تھی۔ اس چھوٹے سے چھوکرے کو انھوں نے اس قصور پر بہت پیٹا تھا۔ توڑ پھوڑ سے تو انھیں سخت نفرت تھی، یہ بات ان کی برداشت سے باہر تھی۔ ان کو بڑا فخر تھا اپنے اس نظم و ضبط پر۔ وہ اکثر بھائی صاحب سے کہا کرتی تھیں کہ اگر وہ اس گھر میں نہ آتیں تو نہ جانے بے چارے بھائی صاحب کا کیا حال ہوتا۔ میں من ہی من کہا کرتی تھی کہ اور چاہے جو بھی حال ہوتا، ہم سب مٹی کے پتلے ہونے کے بجائے، کم سے کم انسان تو ضرور ہوئے ہوتے۔

بُواجی کی انتہائی احتیاط اور کھانے پینے کے اتنے کنٹرول کے باوجود انو کو بخار ہوگیا، ہر طرح کے علاج کر لیے، ایک مہینہ گزر گیا، پر اس کا بخار نہ اترا۔ بُواجی کی پریشانی کی کوئی حد نہیں تھی، انو ایک دم زرد پڑ گئی۔ اسے دیکھ کر مجھے لگتا گویا اس کے جسم میں بخار کے جراثیم نہیں، بُواجی کے خوف کے جراثیم دوڑ رہے ہیں، جو اسے نوچتے جا رہے ہیں۔ وہ اس تکلیف میں ہو کر بھی خوف کے مارے کچھ کہہ تو سکتی نہیں تھی، بس

سوکھتی جا رہی ہے۔

آخر ڈاکٹروں نے کئی طرح کے ٹیسٹ لینے کے بعد رائے دی کہ بچی کو پہاڑ پر لے جایا جائے، اور جتنا زیادہ اسے خوش رکھا جا سکے، رکھا جائے۔ سب کچھ اس کے دل کے مطابق ہو، یہی اس کا صحیح علاج ہے۔ پر سچ پوچھو تو بے چاری کا دل بچا ہی کہاں تھا؟ بھائی صاحب کے سامنے ایک گمبھیر مسئلہ تھا۔ بُواجی کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں تھا، کیوں کہ ان کی مرضی کے سامنے کسی اور کی مرضی چل ہی نہیں سکتی تھی۔ بھائی صاحب نے شاید ساری بات ڈاکٹر کے سامنے رکھ دی، تبھی ڈاکٹر نے کہا کہ ماں کا ساتھ رہنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ بُواجی نے سنا تو بہت آنا کانی کی، لیکن ڈاکٹر کی رائے کے خلاف جانے کی جرات وہ کر نہیں سکیں۔ سوچتا مار کر وہیں رہ گئیں۔

زور شور سے انو کے پہاڑ پر جانے کی تیاری شروع ہوئی۔ پہلے دونوں کے کپڑوں کی لسٹ بنی، پھر جوتوں کی، موزوں کی، گرم کپڑوں کی، اوڑھنے بچھانے کے سامان کی، برتنوں کی۔ ہر چیز رکھتے وقت وہ بھائی صاحب کو سخت ہدایات دے رہی تھیں کہ ایک بھی چیز کھونی نہیں چاہیے ’دیکھو، یہ فراک مت کھو دینا، سات روپے میں نے اس کی سلائی دی ہے۔ یہ پیالے مت توڑ دینا، ورنہ پچاس روپے کا سیٹ بگڑ جائے گا۔ اور ہاں، گلاس کو تم معمولی سمجھتے ہو، اس کی پرواہ ہی نہیں کرو گے، پر دیکھو، یہ پندرہ برس سے میرے پاس ہے اور کہیں خراش تک نہیں ہے، توڑ دیا تو ٹھیک نہ ہوگا۔‘

ہر چیز کی ہدایت کے بعد وہ انو پر آئیں۔ وہ کس دن، کس وقت کیا کھائے گی، اس کا مینو بنا دیا۔ کب کتنا گھومے گی، کیا پہنے گی، سب کچھ ذہن نشین کر دیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہاں بیٹھے بیٹھے ہی بُواجی نے انھیں ایسا باندھ دیا کہ بے چارے اپنی خواہش کے مطابق کوئی کام کیا خاک کریں گے! سب کہہ چکیں تو ذرا نرم سُر میں بولیں، ’کچھ اپنا بھی خیال رکھنا، دودھ پھل کھاتے رہنا‘ ہدایتوں کی اتنی لمبی فہرست کے بعد بھی انھیں یہی کہنا پڑا، ”جانے تم لوگ میرے بغیر کیسے رہو گے، میرا تو دل ہی نہیں مانتا۔ اور ہاں، بغیر بھولے روز ایک خط ڈال دینا“۔

آخر وہ لمحہ بھی آ پہنچا، جب بھائی صاحب ایک نوکر اور انو کو لے کر چلے گئے۔ بُواجی نے انو کو خوب پیار کیا، روئیں بھی۔ ان کا رونا میرے لیے نئی بات تھی۔ اسی دن پہلی بار لگا کہ ان کی شدید سنگ دلی میں کہیں پیار بھی چھپا ہے۔ جب تک تانگا دکھائی دیتا رہا، وہ اسے دیکھتی رہیں، اس کے بعد کچھ لُٹے لُٹے ڈھال سی

ہوکر پڑی رہیں ۔ لیکن دوسرے ہی دن سے گھر پھر ویسے ہی چلنے لگا ۔

بھائی صاحب کا خط روز آتا تھا، جس میں وہ انو کی طبیعت کے خبریں دیتے رہتے تھے ۔ بُواجی بھی روز ایک خط لکھتی تھیں، جس میں وہ اپنی ان زبانی ہدایتوں کو تحریر میں منتقل کر دیا کرتی تھیں ۔ صرف خطوط کی تاریخوں میں فرق ہوتا تھا ۔ باتیں سب میں وہی کی وہی ہوتی تھیں ۔ میرے تو دل میں آتا کہ کہہ دوں، بُواجی روز خط لکھنے کی مصیبت کیوں کرتی ہیں؟ بھائی صاحب کو لکھ دیجیے کہ ایک خط گتّے پر چپکا کر پلنگ کے سامنے لٹکا لیں اور روز سویرے اٹھ کر پڑھ لیا کریں ۔ پر اتنا حوصلہ نہ تھا کہ یہ بات کہہ سکوں ۔

تقریباً ایک مہینے کے بعد ایک دن بھائی صاحب کا خط نہیں آیا ۔ دوسرے دن بھی نہیں آیا ۔ بُواجی فکر مند ہو اٹھیں ۔ اس دن ان کا دل کسی بھی کام میں نہیں لگا ۔ گھر کا کسا کسایا نظام کچھ کمزور سا معلوم ہونے لگا ۔ تیسرا دن بھی نکل گیا ۔

اب تو بُواجی کی فکر کی حد نہ رہی ۔ رات کو وہ میرے کمرے میں آ کر سوئیں، پر ساری رات ڈراؤنے خواب دیکھتی رہیں اور روتی رہیں ۔ گویا برسوں سے جمع ہوا گلیشیئر پگھل پڑا تھا اور اپنی پوری رفتار کے ساتھ بہہ رہا تھا ۔ وہ بار بار کہتیں کہ انہوں نے خواب میں دیکھا ہے کہ بھائی صاحب اکیلے چلے آ رہے ہیں، انو ساتھ نہیں ہے اور ان کی آنکھیں بھی سرخ ہیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتیں ۔ میں طرح طرح سے انہیں یقین دہانی کراتی، پر وہ تو کچھ سن ہی نہیں رہی تھیں ۔ میرا دل بھی کچھ انو کے خیال سے، کچھ بُواجی کی یہ حالت دیکھ کر دکھی ہو رہا تھا ۔

تبھی ملازم نے بھائی صاحب کا خط لا کر دیا ۔ بڑی بے صبری سے کانپتے ہاتھوں سے انہوں نے اسے کھولا اور پڑھنے لگیں ۔ میں بھی سانس روک کر بُواجی کے منہ کی طرف دیکھ رہی تھی کہ اچانک خط پھینک کر سر پیٹتی بُواجی چیخ کر رو پڑیں ۔ میں دھک سے رہ گئی ۔ آگے کچھ سوچنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی ۔ آنکھوں کے آگے انو کی بھولی سی، ننھی سی تصویر گھوم گئی ۔ تو کیا اب انو سچ مچ دنیا میں نہیں ہے؟ یہ سب کیسے ہو گیا؟ میں نے ہمت کر کے بھائی صاحب کا خط اٹھایا ۔ لکھا تھا:

پیاری سیانی،

سمجھ میں نہیں آتا، کس طرح تمہیں یہ خط لکھوں ۔ کس منہ سے تم کو یہ دردناک خبر سناؤں ۔ پھر بھی رانی، تم اس چوٹ کو حوصلے سے سہنا ۔ زندگی میں دکھ کی گھڑیاں بھی آتی ہیں، اور انھیں ہمت کے ساتھ سہنے میں

ہی زندگی کی عظمت ہے۔ یہ دنیا فانی ہے۔ جو بنا ہے وہ ایک نہ ایک دن مٹے گا ہی؛ شاید اس حقیقت کو سامنے رکھ کر ہی کہا جاتا ہے کہ دنیا کی مایا سے موہ رکھنا دکھ کا اصل ہے۔ تمہاری اتنی ہدایتوں اور اپنی ساری احتیاط کے باوجود میں اسے نہیں بچا سکا، اسے اپنے بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہوں۔ یہ سب کچھ میرے ہی ہاتھوں ہونا تھا۔۔۔ آنسو۔۔۔ بھاری آنکھوں کی وجہ سے الفاظ کی شکل واضح سے دھندلی ہوتی جا رہی تھی اور میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اپنی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا، جب میں اس طرح کسی کی موت کی خبر پڑھ رہی تھی۔ میری آنکھیں الفاظ کو پار کرتی ہوئی جلدی جلدی خط کے آخری حصے پر جا پڑی۔۔۔ ”صبر رکھنا میری رانی، جو کچھ ہوا اسے سہنے کی اور بھولنے کی کوشش کرنا۔ کل چار بجے تمہارے پچاس روپے والے سیٹ کے دونوں پیالے میرے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گئے۔ انو اچھی ہے۔ جلدی ہی ہم لوگ روانہ ہونے والے ہیں۔“

ایک منٹ تک میں گم سم سی کھڑی رہی، سمجھ ہی نہیں پائی یہ کیا سے کیا ہو گیا۔ یہ دوسرا صدمہ تھا۔ جوں ہی کچھ سمجھی، میں زور سے ہنس پڑی۔ کس طرح میں نے بُواجی کو سچ سے آگاہ کیا، وہ سب میں کوشش کر کے بھی نہیں لکھ سکوں گی۔ پر حقیقت معلوم ہونے پر بُواجی بھی روتے روتے ہنس پڑیں۔ پانچ آنے کی صراحی توڑ دینے پر ملازم کو بری طرح پیٹنے والی بُواجی پچاس روپے والے سیٹ کے پیالے ٹوٹ جانے پر بھی ہنس رہی تھیں، دل کھول کر ہنس رہی تھیں، گویا انہیں جنت کی دولت مل گئی ہو۔

☆☆☆☆

ایڈگر ایلن پو

امریکی ادب سے ترجمہ : ڈاکٹر شیخ اقبال

دل بیتی

چ تو یہ ہے کہ میں پریشان تھا، بہت ہی پریشان، میں پریشان تھا بھی اور اب بھی ہوں، لیکن کیوں! شاید آپ مجھے دیوانہ کہیں، شاید مجھے بیماری لاحق تھی، جس نے نقصان دینے کی بجائے میری حسیّات کو تیز کر دیا تھا، میری سننے کی قوت حیرت انگیز طور پر بڑھ گئی تھی، مجھے ہر چیز جو زمین و آسمان میں ہے سنائی دینے لگی تھی، یوں لگتا تھا کہ جنت اور جہنم کی تمام آوازیں سننے لگا تھا۔ تو کیا میں دیوانہ ہوں لیکن میں تو آپ کو ساری کہانی بڑے سکون سے سنا سکتا ہوں۔

مجھے معلوم نہیں، بالکل معلوم نہیں کہ یہ خیال مجھے کیسے آیا۔ میں نے ایک بار سوچا اور پھر یہ خیال دن رات مجھ پر غالب ہو گیا۔ کوئی مقصد بھی نہیں تھا اور نہ کوئی جذباتی واقعہ۔ مجھے تو بوڑھا آدمی بہت پسند تھا، اس نے مجھے کبھی ذرا بھر تکلیف بھی نہ دی تھی۔ نہ کبھی میری بے عزتی کی تھی، مجھے اس کی دولت سے کوئی سروکار نہ تھا، ہاں مجھے یوں لگتا ہے سارا مسئلہ اس کی آنکھ کا تھا ہاں یہی بات تھی مجھے اس کی آنکھ گدھ جیسی لگتی تھی۔ زرد نیلی آنکھ جس پر جھلی چڑھی ہوئی تھی، جب کبھی مجھ پر اٹھتی تو میرا خون منجمد ہو جاتا۔ آہستہ آہستہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس بوڑھے کو جان ہی سے مار دوں اور یوں مجھے اس کی آنکھ سے نجات مل جائے گی۔

یہ بات تھی، تم مجھے پاگل کہو گے، پاگلوں کو تو کچھ پتہ ہی نہیں ہوتا، آپ مجھے دیکھیں گے کہ میں نے کس چابک دستی سے سارا منصوبہ بنایا، کتنی دور اندیشی کا ثبوت دیا اور کس طرح اسے عملی جامہ پہنایا۔ اسے قتل کرنے سے پہلے اس کے لیے میری ساری ہمدردیاں ختم ہو گئی تھیں، ہر رات، ہر آدھی رات میں اس کے دروازے کی چٹخنی کو توڑتا اور دروازہ کھول لیتا، میں یہ سب کچھ بڑی آہستگی سے کرتا اور جب میں نے اس میں ایک سوراخ بنا لیا، اس میں سے میں اندر جھانک سکتا تھا۔ میں نے ایک اندھیری لالٹین تھام لی، اس لالٹین سے روشنی ادھر ادھر نہیں پھیلتی تھی اور پھر میں اپنا سر بھی اندر لے جا سکتا تھا۔ اگر آپ دیکھتے تو ہنسنے لگتے کہ میں کتنی پھرتی سے اندر گھس جایا کرتا تھا اور بوڑھے آدمی کو پتہ بھی نہیں چلتا تھا اور وہ سوتا رہتا تھا، سوراخ میں سر ڈالنے میں مجھے کوئی گھنٹہ لگ جاتا تھا اور میں دیکھ سکتا تھا کہ بوڑھا کیسے سویا ہوا ہے اور اس نے اپنا سر کیسے رکھا ہوا ہے۔ آپ ہی کہیے کہ سب باتیں کسی دیوانے کو سوجھ سکتی تھیں؟ یا ایک دیوانہ اتنا فرزانہ ہو

سکتا تھا؟ جب میرا سر کمرے کے اندر گھس جاتا تو میں لالٹین کو ڈھانپ دیتا اور ایک مہین سی روشنی بوڑھے کی گدھ جیسی آنکھ پر ڈالتا، میں ایسا مسلسل سات راتیں کرتا رہا اور ہر رات کو جب آدھی رات گزر جاتی تو اس کی آنکھیں بند ہو جاتیں اور وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا میں نے کہا نا مجھے بوڑھے آدمی سے کوئی دشمنی نہیں تھی بس اس کی آنکھ سے بیر تھا۔

ہر صبح کو میں کمرے میں چلا جاتا اور بوڑھے آدمی سے باتیں کرتا اور پوچھتا کہ کس نے رات کیسے گزاری بوڑھا آدمی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں کیا چال چل رہا ہوں۔ جب آٹھویں رات آئی تو میں کچھ زیادہ ہی ہوشیار ہو گیا، میں نے دروازہ کھولا اور میں نے یہ سب کچھ بڑی پھرتی سے کیا، یارو مجھے اس وقت تک معلوم ہی نہیں تھا کہ میں کتنا باصلاحیت ہوں، کتنا زیرک ہوں، میں بہت ہی خوش تھا، میرا انداز فاتحانہ تھا، میں سوچ کر ہنسنے لگا، مجھے لگا کہ جیسے اس نے میری ہنسی سن لی ہو کیونکہ بستر پر اس نے کچھ حرکت سی کی تھی جیسے وہ چونک گیا ہو، میں ذرا پیچھے ہٹ گیا لیکن کمرے میں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ دروازے پوری طرح بند تھے کیونکہ بوڑھا چوری چکاری سے ڈرتا تھا۔ اچانک میرا انگوٹھا ایک بٹن پر لگا، بوڑھا آدمی اپنے بستر پر چونک کر بیٹھ گیا اور چیخا ”کون ہے“ میں خاموش رہا، کچھ بھی نہیں بولا، ایک گھنٹے تک میں نے تمام اپنے اعصاب کو بے حس رکھا۔ وہ ابھی بستر پر بیٹھا تھا کہ مجھے ایک کراہنے کی آواز سنائی دی، مجھے لگا کہ یہ کوئی خوف زدہ انسانی آواز ہے، یہ کوئی درد کی آواز نہیں تھی یہ تو روح سے بیدار ہونے والی چیخ تھی، میں آواز کو پہچانتا تھا۔ یہ تو بوڑھے کی آواز تھی، میں بھی کچھ خوف زدہ سا تھا لیکن میں مسکراتا رہا، مجھے لگتا تھا کہ وہ بہت دیر سے جاگ رہا تھا، اس کا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے کہنے لگا ”یہ تو ہوا کی آواز ہے“ یا کسی چوہیا کے چلنے کی آواز یا کسی جھینگر کی آواز، وہ اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کرتا رہا، اسے تسلی نہ ہوئی اسے معلوم نہ تھا کہ موت اس کے بہت قریب تھی۔ یہ نادیدہ خوف کا پرتو تھا۔ اگرچہ نہ اس نے اس کو سنا تھا نہ دیکھا تھا۔ میں نے بہت دیر انتظار کیا، بڑے صبر و سکون کے ساتھ۔ مجھے لگا کہ شاید وہ لیٹ گیا ہے، میں نے لالٹین کو ذرا سا کھولا آپ یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں نے یہ سب کچھ کس طرح چپکے چپکے کر لیا۔ ایک تھوڑی سی شعاع باہر آئی اور بوڑھے کی آنکھ پر پڑی۔

یہ بالکل کھلی ہوئی تھی میرا غیض اس کو دیکھ کر اور بڑھ گیا، میں نے اسے دیکھا ایسا لگا کہ اس کے اوپر ایک پردہ ہے۔ میری ہڈیاں لرز اٹھیں، مجھے کچھ اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ میں نے بوڑھے کا چہرہ دیکھا نہ جسم، بس میری لالٹین کی شعاع اسی ”ملعون دھبے“ پر پڑی، میں آپ کو بتا چکا ہوں نا کہ حسیات کی بہت زیادہ پھرتی ہی تو دیوانگی ہوتی ہے، مجھے لگا کہ میرے کانوں میں ایک دھیمی، بے کیف اور نحیف سی آواز چھو رہی

ہے، جیسے کہ کسی کپڑے میں لپٹی گھڑی کی ٹک ٹک ہو، میں اس آواز کو خوب پہچانتا تھا۔ یہ بوڑھے کے دل کے دھڑکنے کی آواز تھی۔ مجھ میں جوش بیدار ہو گیا میرا غیظ و غضب اور بڑھنے لگا۔ لیکن پھر بھی رُکا رہا اور خاموش رہا، میں نے اپنا سانس تک روک لیا۔ میں نے لالٹین بھی جلنے نہ دی اور لالٹین کی شعاع باقاعدہ اس کی آنکھ پر پڑتی رہی اور اس کے دل کی دھڑکن اور زیادہ بڑھنے لگی۔ اور تیز۔۔۔ اور تیز۔۔۔ اور بلند۔۔۔ اور بلند"۔

یقینا بوڑھا بہت خوف زدہ ہو گیا ہو گا، مجھے یوں لگا کہ اس کے دل کی دھڑکن ہر لحہ بلند تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میری پریشانی بھی اور بڑھتی چلی جا رہی تھی، یہ آدھی رات کا وقت تھا اور گھر میں موت کی سی خاموشی تھی لیکن دل کی دھڑکن کا شور مجھ میں ناقابلِ برداشت خوف پیدا کر رہا تھا، میں جامد و ساکت کھڑا رہا۔ دل کی دھڑکن اور تیز ہوتی چلی گئی۔ مجھے لگا کہ اس کا دل پھٹ جائے گا، اس سے میری پریشانی میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا، مجھے ڈر لگا کہ کہیں یہ آواز اہلِ محلہ نہ سن لیں۔ بوڑھے کی موت کا وقت قریب آ چکا تھا میں نے لالٹین پھینک دی اور کمرے کے اندر زقند لگا دی بوڑھے کی چیخ بلند ہوئی، صرف ایک بار ہی وہ چیخا۔ میں نے کھینچ کر اسے فرش پر پھینک دیا اور چارپائی اس کے اوپر گرا دی اور پھر فاتحانہ مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر رقص کرنے لگی۔ میں نے کارنامہ سرانجام دے دیا تھا لیکن کئی منٹ تک میرا دل دھڑکتا رہا، میں پریشان نہیں تھا بوڑھے کا دل دھڑکتا رہا اس کی دھڑکن دیوار کے پار نہیں جا سکتی تھی۔ آخر کار یہ دھڑکن بند ہو گئی۔ میں نے بستر ہٹایا اور اس کی لاش کو غور سے دیکھا۔ وہ پتھر بن چکا تھا، میں نے ہاتھ اس کے دل پر رکھ دیا اور کئی منٹ رکھے رکھا اس میں کوئی حرکت نہ تھی، وہ مر چکا تھا، میں خوش تھا کہ اس کی آنکھ اب مجھے پریشان نہیں کرے گی۔

اگر آپ مجھے اب بھی پاگل سمجھیں تو یہ غلط بات ہو گی کیونکہ میں نے پوری احتیاط سے کام لیا اور اس کے جسم کو چھپا دیا رات بڑھتی گئی اور میں تیزی سے اور چپ چاپ اپنے کام میں محو رہا۔ پہلے تو میں نے لاش کے ٹکڑے کیے میں نے اس کا سر کاٹا، بازو کاٹے اور پھر ٹانگیں۔ پھر میں نے خوشی سے تین تختے اٹھائے اور ان ٹکڑوں کو ان کے اندر ڈال کر بند کر دیا۔ میں نے تختوں کو اتنی مہارت سے اپنی جگہ پر رکھا کہ کوئی انسانی آنکھ وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ میرے پاس دھونے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا ہاتھ پر کوئی دھبہ نہیں تھا لیکن میں بری طرح تھک گیا تھا، جب میری یہ مشقت تمام ہوئی تو صبح کے چار بج چکے تھے لیکن ابھی اندھیرا چھایا ہوا تھا پھر ایک گھنٹی بجی، ایک دستک ہوئی میں نیچے گیا۔ بڑے ہشاش بشاش انداز میں، میں نے دروازہ کھولا۔ تین آدمی داخل ہوئے انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ پولیس کے آفیسر ہیں انہوں نے بتایا کہ کسی

اہلِ محلہ نے ایک چیخ سنی تھی اور انہیں اطلاع دے دی تھی چنانچہ وہ صورتِ حال کا جائزہ لینے آئے ہیں میں مسکرا کر انہیں ملا مجھ میں ذرا سا بھی خوف نہیں تھا، میں نے انہیں خوش آمدید کہا میں نے کہا یہ چیخ تو میری اپنی تھی جو سوتے میں بلند ہوئی ہو گی۔ میں نے انہیں بتایا کہ بوڑھا آدمی تو گاؤں گیا ہوا ہے۔ میں نے انہیں سارے گھر کا چکر لگوایا۔ میں نے کہا تلاش کر لو۔ خوب تلاش کر لو۔ میں انہیں اس کے کمرے میں لے گیا۔ میں نے انہیں اس کی تمام چیزیں دکھائیں جو محفوظ تھیں، کسی نے چھیڑی تک نہیں تھیں۔ جوش ہی جوش میں میں کرسیاں بھی اندر لے آیا اور انہیں بیٹھنے کو کہا اور میں نے اپنی کرسی اس جگہ پر رکھ لی جس کے نیچے بوڑھے کی لاش کے ٹکڑے مدفون تھے۔

پولیس آفیسر مطمئن ہو گئے۔ میرا اندازِ گفتگو ہی ایسا تھا کہ انہیں مطمئن ہونا پڑا۔ میں بھی پر سکون تھا وہ بیٹھ گئے اور ان کے سوالوں کا ہنس ہنس کر جواب دیا پھر وہ اپنی گھریلو باتوں میں لگ گئے لیکن پھر کیا ہوا میرا رنگ از خود اڑنے لگا۔ میں نے چاہا کہ وہ چلے جائیں میرے سر میں درد ہونے لگا مجھے لگا کہ میرے کانوں میں گھنٹیاں بج رہی ہیں لیکن وہ بیٹھے رہے، خوش گپیوں میں مصروف رہے، میرے کانوں میں گھنٹیاں اور تیز ہو گئیں، میں نے چاہا کہ میں خوب باتیں کروں تا کہ میرا انجانا خوف ختم ہو جائے لیکن یہ خوف بڑھتا گیا۔ بڑھتا ہی گیا اور پھر مجھے یوں لگا کہ شور میرے کانوں کے اندر نہیں تھا بلکہ باہر تھا، میرا چہرہ اور زرد پڑ گیا میری باتوں کی آواز اور تیز ہو گئی۔ میں بلند آواز میں بولنے لگا آواز تھی کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ میں بے بس ہوتا چلا جا رہا تھا اور پھر مجھے یوں لگا کہ یہ آواز کسی ایسی گھڑی کی آواز ہے جو کپڑے میں بند ہو، میں ہانپنے لگا، میرا سانس بند ہوتا جا رہا تھا لیکن پولیس والوں کو کوئی اندازہ ہی نہیں تھا کیونکہ میں بڑی تیز اور زور دار آواز میں باتیں کرتا جا رہا تھا مگر شور تھا کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا، بڑھتا ہی جا رہا تھا میں کھڑا ہو گیا اور چھوٹی چھوٹی باتوں کی وضاحتیں کرنے لگا۔ اشارے کرنے لگا، ہاتھ پاؤں ہلانے لگا لیکن شور کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا آخر یہ پولیس والے کب تک بیٹھے رہیں گے کب جائیں گے۔ میں اٹھ کر ادھر ادھر چکر لگانے لگا اور مجھے ایسا لگا کہ میرا خون کھولتا جا رہا تھا۔ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ ”اے میرے مولا میں کیا کروں“ میرے منہ سے جھاگ نکلنے لگی میں دیوانہ وار قسمیں کھانے لگا، میں نے وہ کرسی اٹھا دی جس پر میں براجمان تھا لیکن شور بڑھتا جا رہا تھا، گھنٹیوں کا شور زیادہ سے زیادہ بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا تھا پولیس آفیسر آرام سے بیٹھے ہنس رہے تھے مسکرا رہے تھے، میں نے سوچا کیا یہ آواز انہیں سنائی نہیں دے رہی۔ میرے رب وہ ضرور سن رہے تھے۔ شاید وہ مجھ پہ شک کر رہے تھے، شاید وہ سب کچھ جانتے تھے اور صرف میرا مذاق اڑا رہے تھے، میں سوچنے لگا میں نے کہا کہ اس کرب سے بہتر تو یہ ہے کہ جو قیامت ٹوٹنی ہے ٹوٹ جائے، اس

بھونڈے مذاق سے بڑے سے بڑا دکھ بھی کم ہوگا، میں ان مکاروں کو برداشت نہیں کرسکتا تھا مجھے یوں لگا کہ مجھے چیخ اٹھنا چاہیئے اور مر جانا چاہیے، سنو! آوازیں کتنی تیز ہیں، بڑھتی جا رہی ہیں، میں چیخ اٹھا ”بدمعاشو! زیادہ مکار مت بنو میں اعترافِ جرم کرتا ہوں کہ میں نے بوڑھے کو قتل کیا ہے، ان تختوں کو اٹھاؤ یہاں سے، یہاں سے“۔ یہ سارا شور اس کے دل کی دھڑکن کا ہے۔

محمد عاصم بٹ

ایلس منرو

(تعارف)

بیاسی سالہ ایلس منرو کو 2013 کا نوبیل انعام برائے ادب ملنے کی خبر شائع ہوئی تو اسی مصنفہ سے متعلق ایک اور خبر نے بھی ادب کے قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔ ایلس لکھنے سے ریٹائر ہونا چاہتی ہیں۔ پہلی بار اپنے اس ارادے کا اظہار انھوں نے 2006 میں کیا تھا۔ لیکن عملی طور پر اس ارادے پر عمل درآمد کی نوبت نہ آئی۔ کہانیاں لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ کیوں کہ ان کا کہنا ہے کہ کہانیوں کے دائرے تو ذہن میں بنتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں ایلس کی کہانیوں کا آخری مجموعہ ’عزیز زندگی‘ 2012 میں شائع ہوا ہے۔ لیکن اس بار ایلس منرو اپنے ارادے میں پختہ دکھائی دیتی ہیں۔

”تو پھر غیر مطبوعہ مسودوں کا کیا کیا جائے“ ایک صحافی کے سوال پر ایلس کا جواب تھا ”انھیں تلف کر دو۔“

گذشتہ کچھ عرصے سے نوبیل انعام ناول نگاروں کے حصے میں آ رہا ہے اور یہ خیال عام ہو چلا ہے کہ شاید ادب کو لافانی تخلیقات کے بڑے اثاثے سے مستفید کرنے والی مختصر کہانی کی صنف جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے میں ناکام رہی ہے اور اب ایک مبہم مستقبل اس کا منتظر ہے۔ ایلس منرو کو ملنے والے نوبیل انعام نے ایک بار پھر اس صنف کو دنیا بھر میں اعتبار بخشا ہے۔

ایلس کو اپنی کہانیوں کی تفصیل پسندی اور پھیلے ہوئے سست رو پلاٹ، اور انسانی نفسیات کے گہرے ادراک کے تناظر میں اکثر چیخوف سے مماثل قرار دیا جاتا ہے۔ مغربی اونٹوریو کے چھوٹے قصبے کی زندگی ہی ایلس منرو کی بیشتر کہانیوں میں منظرنامے کی حیثیت سے دکھائی دیتی ہیں۔ ایلس منرو اس خیال کے

ایک نئے ثبوت کے طور پر ہمارے سامنے آئی ہیں کہ چھوٹے منظر نامے میں رہتے ہوئے بھی بڑا اور متاثر کن ادب تخلیق کیا جاسکتا ہے۔

ناول نگار ساؤل بیلو کے بعد ایلس کینیڈا کی دوسری مصنفہ ہیں جنھیں نوبیل انعام ملا۔ ذیل میں ایلس منرو کی دو کہانیوں کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے جس سے کسی حد تک ایلس منرو کے فن سے آگاہی ممکن ضرور ہوگی۔

ایلس منرو

کینیڈین ادب سے ترجمہ: احمد فرہاد

آوازیں

لڑکپن کے دنوں میں میری ماں اپنے خاندان کے ساتھ رقص کی محفلوں میں شریک ہوتی۔ جن کا اہتمام کمیونٹی سکول یا بعض اوقات کسی بڑے برآمدے والے فارم ہاؤس میں کیا جاتا۔ ان تقریبات میں چھوٹے بڑے سبھی شرکت کرتے۔ بعض پیانو بجاتے، جو یا تو گھر سے لایا جاتا یا سکول کی ملکیت ہوتا، اور کچھ وائیلن لے آتے۔ چوکور رقص ایک مشکل طرز کا رقص ہوتا، جس کے لیے ایک مخصوص شخص بلند آواز اور ایک عجیب قسم کی مایوس کن عجلت میں آواز لگاتا، جس کا قطعاً کوئی فائدہ نہ تھا، جب تک کہ آپ یہ رقص پہلے سے جانتے نہ ہوں۔ اسی لیے ہر کوئی دس یا بارہ برس کی عمر میں ہی اسے سیکھ لیتا۔ شادی شدہ اور تین بچوں کی ماں ہونے کے باوجود اگر میری ماں دیہی علاقے کے اس خاص حصے میں رہائش پذیر ہوتی جہاں ایسی محفلوں کا اہتمام ہوتا تھا، تو وہ ان محفلوں سے لطف اندوز ہو سکتی تھی۔ وہ جوڑوں کے اس دائروی رقص سے بھی مسحور ہوتی جو رقص کے پرانے اسلوب کو ایک خاص حد تک بدل رہا تھا۔ لیکن وہ ایک عجیب حالت میں تھی۔ ہمارا خاندان قصبے سے باہر ایک ایسی جگہ آباد تھا جسے آپ دیہات بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ میرا باپ جسے میری ماں سے زیادہ پسند کیا جاتا تھا، ایک ایسا شخص تھا جو حالات کو قبول کرنے پر یقین رکھتا تھا۔ لیکن میری ماں ایسی نہیں تھی۔ اس کی پرورش ایک فارم میں ہوئی تھی جسے بعد میں جا کر ایک سکول استاد بنتا تھا، لیکن یہ سب کافی نہیں تھا، یہ وہ مقام نہیں تھا جس کی اس نے خواہش کی ہوگی، یا وہ دوست جن کے ساتھ اس نے قصبے میں رہنا چاہا ہوگا، وہ ایک غلط جگہ رہ رہی تھی۔ اس کی مالی حالت ناگفتہ بہ تھی اور وہ زیادہ پر آسائش بھی نہیں تھی

۔ وہ کارڈ تو کھیل سکتی تھی لیکن برج نہیں۔ وہ سگریٹ پیتی عورت کو دیکھ کر چڑتی۔ میرا خیال ہے وہ لوگوں کو دھکیلو اور ضرورت سے زیادہ ہی نستعلیق لگتی تھی۔ جلدی سے، حقیقت میں ایسا ہی ہے، وہ اس طرح کے الفاظ ادا کرتی رہتی۔ اس کی باتوں سے ایسا لگتا جیسے وہ کسی عجیب وغریب خاندان میں پلی بڑھی ہو جہاں اسی انداز میں گفتگو کی جاتی ہو۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں تھا۔ میرے چچے چچیاں بالکل اسی انداز میں بات کرتے جیسے کہ دوسرے لوگ اور وہ میری ماں کو پسند بھی نہیں کرتے تھے

میرا مطلب یہ بھی ہرگز نہیں کہ وہ ہر وقت اسی خواہش میں مبتلا رہتی کہ چیزیں ویسی نہ ہوں جیسی وہ تھیں۔ دوسری عورتوں کی طرح وہ بھی دھونے کا ٹب کچن میں گھسیٹنے، پانی کو گرنے سے بچانے اور گرمیوں کے موسم میں سردیوں کے لیے کھانے تیار کرنے میں مصروف رہتی۔ وہ اتنا وقت بھی نہ نکال سکتی کہ جتنا وہ مجھ سے الجھنے میں صرف کر دیتی۔ اور مجھ پر حیران ہوتی کہ میں اپنے سکول سے اچھے اچھے دوست گھر کیوں نہیں لاتی۔ یا پھر میں اتوار کو سکول میں ہونے والی تلاوت سے کیوں ہچکچاتی ہوں؛ ایک ایسا کام جس پر غلبہ پانے کی میں ہمیشہ کوشش کرتی رہی؛ یا پھر میں وہ بالوں کا جوڑا کھلوا کر واپس کیوں آئی، جس کا اہتمام خصوصی طور پر میں سکول جانے سے پہلے کرتی تھی۔ کیوں کہ میرے علاوہ کوئی بھی اپنے بال اس انداز میں نہ بناتا، جیسے میری ماں میرے بالوں کو۔ لیکن حقیقت میں ایسا کیوں ہے کہ میں اپنی کچھ خوشگوار یادوں سے بھی پیچھا چھڑانا چاہتی ہوں، جیسے ایک بار میں نے شعر خوانی میں حصہ لیا اور دکھاوے کے لیے یہ کام پھر کبھی نہ کرنے کا عہد کیا لیکن میری ساری زندگی روہانسی اور تنازعات سے بھرپور نہیں ہے۔ اس وقت تک نہیں، کہ جب میں دس برس کی تھی اور بننے سنورنے اور اپنی ماں کے ساتھ رقص کی محفل میں جانے کے لیے بے تاب رہتی۔ رقص جس کا انعقاد ہماری سڑک پر ایک ساتھ جڑے ہوئے مہذب لیکن زیادہ خوشحال نہ دکھنے والے گھروں میں سے ایک گھر میں ہوتا۔ ایک بڑا آبنوسی گھر جس میں رہنے والوں کے متعلق میں کچھ نہ جانتی تھی۔ سوائے یہ کہ گھر کا مرد میرے دادا کا ہم عمر ہونے کے باوجود ایک سفارت خانے میں کام کرتا تھا لیکن اس وقت تک کہ جب تک آپ میں سکت ہے، آپ کام چھوڑ بھی تو نہیں سکتے۔ کیوں کہ آپ کو اس وقت کے لیے پیسے جوڑنے پڑتے ہیں جب آپ کام کرنے کے قابل نہ رہیں۔ یہ ایک تضحیک تھی، یا بعد ازاں جسے میں نے ایک شدید تناؤ کا نام دیا، کہ آپ خود کو بڑھاپے میں ملنے والے وظیفے کے رحم وکرم پر پائیں؛ اور یہ آپ کے بڑے ہو جانے والے بچوں کے لیے بھی شرمناک تھا کہ وہ آپ کو اس بات کی اجازت دیں۔

اب میرے ذہن میں کچھ ایسے سوالات ابھرتے ہیں جن کا سامنا میں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا

۔ کیا اس گھر میں موجود لوگ صرف تفنن طبع کے لیے اس رقص کا اہتمام کرتے تھے؟ یا پھر اس کے لیے وہ کوئی رقم بھی وصولتے تھے؟ ۔ شاید ان کی کوئی مجبوری ہوتی ہو۔ اس کے باوجود کہ گھر کا سربراہ صاحب روزگار ہو ۔ جیسے معالج کی اجرت ۔ میں جانتی ہوں کہ یہ کس بھیانک انداز میں لوگوں پر ٹوٹتی ہے ۔ ہر جاڑے میں مجھے اور میرے بھائی کو حلق کے شدید ورم کا سامنا کرنا پڑتا ۔ جس کے لیے ہمیں ڈاکٹر کے پاس جانا پڑتا اور وہ ہم سے پیسے وصولتا ۔ ایک اور بات جو مجھے حیران کیے رکھتی وہ یہ تھی کہ آخر رقص کی محفل میں جانے کے لیے میرے باپ کے بجائے میرا انتخاب ہی کیوں کیا جاتا تھا؟ لیکن یہ معاملہ اتنا حیران کن بھی نہیں تھا، کیوں کہ شاید ماں کے برعکس میرے باپ کی رقص میں دلچسپی نہیں تھی؛ اور یوں بھی گھر میں دیکھ بھال کے لیے دو چھوٹے بچے بھی تو تھے؛ اور ابھی میں اتنی بڑی بھی نہیں تھی کہ یہ سب کر سکتی ۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ میرے والدین نے کبھی کوئی آیا رکھی ہو؛ اور میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ یہ اصطلاح بھی اس دور میں عام ہوئی ہو ۔ اپنے لڑکپن میں مجھے ایک ایسی نوکری ملی بھی تھی؛ لیکن وقت اب خاصا بدل چکا ہے ۔

ہم تیار ہو چکے تھے ۔ میری ماں بتاتی ہے کہ اس بے باک چوکوروی رقص میں کبھی کوئی ایسا لباس نظر نہ آیا، جس کی جھلک آپ نے بعد میں ٹیلی وژن کے پردے پر دیکھی ہو ۔ وہاں ہر شخص بہترین لباس میں ملبوس تھا تا کہ وہ علاقے کے روایتی لباس ۔ سکارف اور سنجاف میں نظر نہ آئے ۔ جو میزبانوں اور دوسرے حاضرین کے لیے ہتک کا باعث ہو ۔ میں نے اپنی ماں کے ہاتھ کا بنا ہوا لباس پہنا ۔ جو سرما کے ملائم اون کا بنا ہوا تھا ۔ جس کا لہنگا گلابی اور قمیص پیلے رنگ کی تھی ۔ قمیص پر سامنے بائیں طرف اون کا ایک گلابی دل، کڑھا ہوا تھا ۔ میرے بالوں کو گیلا اور کنگھی کر کے قیمے سے مشابہ اس جوڑے کی شکل دی گئی تھی جس سے ہر روز سکول جاتے ہوئے میں جان چھڑاتی تھی؛ اور جب میں یہ اعتراض اٹھاتی کہ کوئی دوسرا اس طرح کے بال نہیں بناتا تو میری ماں دلیل کے طور پر یہ کہتی کہ کوئی دوسرا اتنا خوش نصیب نہیں اس لیے ۔ پھر میں اس محفل میں شرکت کے لیے اپنی بے تابی کے باعث، یا پھر یہ سوچ کر اپنی شکایت سمیٹ لیتی کیوں کہ وہاں میرے سکول کا کوئی ساتھی موجود نہ ہوگا ۔ میری ماں کا لباس گھر کا بنا ہوا نہیں تھا ۔ یہ اس کے بہترین لباسوں میں سے ایک تھا، جو چرچ یا کسی جنازے پر جانے کے لیے زیادہ موزوں؛ اور پہننے میں ہمیشہ مشکل تھا ۔ یہ سیاہ مخمل کا بنا ہوا تھا جس کے آستین کہنیوں تک تھے اور گردن لمبی تھی؛ اور سب سے خاص بات اس پر ابھرے ہوئے سنہری چاندی اور مختلف رنگوں کے چھوٹے چھوٹے موتی تھے، جو پورے کرتے پر ٹانکے گئے تھے ۔ یہ موتی روشنی کو جذب کرتے؛ اور جب میری ماں حرکت کرتی یا سانس بھی لیتی تو وہ رنگ تبدیل کرتے ۔ اس نے اپنے بالوں

کی، جو ابھی تک زیادہ تر کالے تھے، لڑیاں بنا کر انھیں سر کے اوپر پن کی مدد سے کسے ہوئے تاج کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ اگر وہ میری ماں کی جگہ کوئی اور خاتون ہوتی تو میں اسے سنسنی خیز حسینہ کا خطاب دیتی۔ میرا خیال ہے میں نے اسے ایسا ہی پایا تھا۔ جونہی ہم اجنبی گھر میں داخل ہوئے، مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں موجود ہر دوسری عورت کی طرح میری ماں کا لباس معمولی تھا؛ گو کہ ان میں سے ہر ایک بزعمِ خود اپنے بہترین انتخاب میں ملبوس تھا۔

دوسری عورتیں جن کا میں نے ذکر کیا کچن میں مصروف تھیں۔ یہاں ہم رکے اور میز پر سجائی گئی چیزوں پر نگاہ دوڑائی۔ جن میں ہر طرح کی پیسٹریاں، بسکٹس، پائز اور کیک شامل تھے۔ میری ماں نے بھی گھر سے بنا کر لائی ہوئی عمدہ چیزیں میز پر سجائیں اور پھر انھیں سنوارنے میں مصروف ہو گئی تا کہ وہ دیکھنے میں بھلی لگیں۔ یہ تمام چیزیں دیکھ کر منہ میں کیسے پانی آ رہا ہے۔ میری ماں نے تبصرہ کیا۔ کیا حقیقت میں، اس نے ایسا ہی کہا تھا؟ بہرحال اس نے جو بھی کہا وہ سننے میں بھلا نہیں لگا۔ اس وقت میں نے خواہش کی کہ کاش میرا باپ یہاں ہوتا جو ہر موقع کی مناسبت سے ہمیشہ بہترین بولتا تھا۔ چاہے بولنے میں وہ کتنا ہی اجڈ کیوں نہ ہو، وہ ایسا گھر میں تو کر سکتا تھا لیکن اس جلد بازی میں گھر سے باہر نہیں۔ وہ الفاظ کے تبادلے میں محتاط رویہ اختیار کرتا۔ وہ جانتا تھا کہ ہر چیز کے متعلق تبصرہ کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ لیکن میری ماں اس کا الٹ تھی۔ گویا اس کے لیے ہر چیز واضح، لبھانے والی اور دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے رکھی گئی تھی۔ اب ویسا ہی کچھ ہو رہا تھا۔ مجھے اس کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی، جیسے دوسروں کی توجہ نہ ملنے پر وہ خود کو مطمئن کر رہی ہو۔ وہ کسی سے پوچھ رہی تھی کہ ہم اپنے کوٹ کہاں ٹانک سکتے ہیں۔ جہاں بھی آپ چاہیں۔ آپ انھیں بالائی منزل پر پڑے بستر پر بھی رکھ سکتے ہیں۔ آپ دیوار کے ساتھ جڑی سیڑھی کے ساتھ اوپر جائیں۔ لیکن سوائے چھت کے وہاں روشنی نہیں ہے، کسی نے کہا۔ میری ماں نے مجھے ایسا ہی کرنے کا کہا اور بتایا کہ کچھ دیر میں وہ بھی میرے پاس ہو گی۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا واقعی اس رقص میں شرکت کے لیے کوئی رقم ادا کرنا پڑتی تھی، جس کا بندوبست کرنے کے لیے میری ماں پیچھے رہ گئی تھی۔ دوسری طرف کیا لوگ رقم کے تقاضے کے باوجود کھانے پینے کی اشیا ساتھ لاتے تھے؟ اور کیا ان غریب لوگوں کی لائی ہوئی چیزیں واقعی اتنی ہی لذیذ تھیں جتنا کہ مجھے یاد پڑتا ہے؟ لیکن شاید جنگ کے دوران میں ملنے والی نوکریوں اور فوجیوں کی طرف سے گھر بھیجے گئے پیسوں کے باعث وہ خود کو اتنا غریب تصور نہ کرتے ہوئے ہوں۔ اگر اس وقت میں واقعی دس برس کی تھی، اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں تھی، تو یہ تبدیلیاں دو سال تک رونما

ہوتی رہیں ۔

سیڑھیاں باورچی خانے اور سامنے کے کمرے سے اوپر کو آتی ہوئی آپس میں مل جاتیں، اور ایک ہی زینے کی شکل اختیار کرتے ہوئے بیڈرومز کی سمت لے جاتی تھیں۔ سامنے والے صاف ستھرے بیڈ روم میں اپنے جوتوں سے جان چھڑانے کے بعد بھی، میں باورچی خانے میں گونجتی اپنی ماں کی آواز سن سکتی تھی اور ساتھ ہی سامنے کے کمرے سے آنے والی موسیقی بھی، لہٰذا میں اس طرف چل پڑی کمرے میں پیانو کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ کھڑکیوں پر گہرے سیاہ رنگ کے پردے لٹکائے گئے تھے جو میرے خیال میں اداسی کا تاثر دے رہے تھے۔ لیکن کمرے کی فضا کچھ ایسی اداس کر دینے والی نہیں تھی۔ جہاں بہت سے لوگ خوبصورتی سے ایک دوسرے کو تھامے ہوئے، ایک تنگ دائرے میں قدم سے قدم ملاتے اور جھولتے ہوئے محو رقص تھے۔ سکول جانے والی لڑکیوں کا ایک جوڑا ایسا رقص پیش کرتا تھا جسے ابھی ابھی پذیرائی مل رہی تھی۔ ایک دوسرے سے مخالف سمت میں حرکت کرتے ہوئے کبھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنا اور کبھی چھوڑ دینا۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر تحقیق مسکراہٹ بکھر گئی جسے دیکھتے ہی میں پگھل سی گئی۔ کسی بھی بڑی عمر کی لڑکی کے توجہ کرنے پر عموماً میرا یہی حال ہو جاتا تھا۔ کمرے میں ایک ایسی بھی عورت تھی جسے دیکھے بنا آپ سے نہیں رہا جا سکتا تھا۔ وہ میری ماں سے عمر میں تھوڑی ہی زیادہ ہوتی ہوگی۔ اس کے سفید بال کچھ ایسے عمدہ طریقے سے بنے تھے، جنہیں گھنگھریالی لہروں کا نام دیا جاتا تھا، اور جو اس کے گنج سے نزدیک تھیں۔ وہ بڑے تن و توش والی ایک دراز قد عورت تھی۔ جو ریشم کے سنہرے مالٹائی لباس میں ملبوس تھی جس کی چوکور گردن کسی حد تک نیچے سے نکالی گئی تھی۔ اس کا غرارہ صرف اس کے گھٹنوں کو ڈھانپ رہا تھا۔ اس کے مختصر آستین اس کے بازوؤں کے ساتھ مضبوطی سے کسے ہوئے تھے اور ان پر بھاری بھرکم، شفاف اور سفیدی مائل گوشت نظر آتا تھا، جس پر سور کی چربی کا گمان ہوتا تھا۔ یہ ایک چونکا دینے والا نظارہ تھا۔ میں نہیں سوچ سکتی تھی کہ کوئی شخص بیک وقت بوڑھا بھی اور لش پش بھی لگ سکتا تھا۔ بھاری بھرکم بھی اور جاذب نظر بھی۔ چینل کی طرح بے باک اور اب تک شدت سے باوقار۔ آپ اسے بے شرمی کی حد تک بے باک بھی کہہ سکتے تھے اور بعد ازاں میری ماں نے ایسا ہی کہا! اور شاید یہ اسی کی طرز کا لفظ تھا۔ کسی نے بہتر انداز میں دو ٹوک کہا ہوگا کہ اپنے پورے انداز اور لباس کے رنگ کے بغیر وہ دکھاوا نہیں کرتی۔ وہ اور اس کے ساتھ والا مرد بے خودی کی بجائے مہذب انداز میں یوں محو رقص تھے جیسے میاں بیوی ہوں۔

میں اس کا نام نہیں جانتی تھی۔ نہ ہی میں نے اسے پہلے کبھی دیکھا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ

قصبے میں معروف تھی اور شاید میرے علم کے مطابق دوسروں سے ایک فاصلے پر بھی۔ میں سوچتی ہوں اگر میں کسی واقعے کو یاد کرنے کی بجائے کہانی لکھ رہی ہوتی تو اس کے لیے کبھی ایسے لباس کا انتخاب نہ کرتی۔ ایک ایسی تشہیر جس کی اسے ضرورت نہ تھی۔ اگر ہر روز وہاں سکول کے لیے آنے جانے کے علاوہ میں قصبے میں رہتی ہوتی۔ تو مجھے معلوم ہوتا کہ وہ ایک مشہور طوائف ہے۔ میں نے یقینی طور پر اسے کہیں دیکھا ہوتا اور لازمی نہیں کہ اسی مالٹائی لباس میں اور اس کے لیے لفظ طوائف کا چناؤ بھی نہ کیا ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ اسے گندی عورت کہتی۔ مجھے معلوم ہوتا کہ اس کے متعلق کچھ بے ہودہ، بے باک، خطرناک، اور دلچسپ باتیں گردش کر رہی ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ حقیقت میں یہ سب ہے کیا۔ اگر کوئی شخص مجھے اس کے متعلق ایسی باتیں بتانے کی کوشش کرتا تو میرا خیال ہے میں اس پر یقین نہ کرتی۔ قصبے میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو غیر معمولی دکھائی دیتے ہیں اور شاید وہ بھی مجھے اسی طرح کا کوئی فرد محسوس ہوتی۔ جیسا کہ قصبے کا وہ کبڑا شخص تھا، جو ٹان ہال کے دروازوں پر رنگ و روغن کے سوا کچھ نہ کرتا تھا۔ اور وہ ایک مناسب نظر آنے والی خاتون جو ہمیشہ بلند آواز میں خود کلامی سے کبھی نہ رکتی، اور نظر نہ آنے والے لوگوں کو کوستی رہتی۔

مجھے اس کا نام جاننے میں وقت لگتا اور آخر کار مجھے معلوم پڑا کہ وہ واقعی ان کاموں میں ملوث تھی جن کا مجھے یقین نہیں آ رہا تھا اور اس کے ساتھ محو رقص شخص جس کا نام شاید میں نہیں جانتی تھی، قمار خانے کا مالک تھا۔ جن دنوں، میں ہائی سکول میں تھی، ایک روز چند لڑکیوں نے میری ہمت بندھائی کہ میں قمار خانے کے اندر جاؤں، اور میں نے ایسا ہی کیا۔ یہ وہی شخص تھا جسے میں نے وہاں دیکھا۔ گو کہ اب اس کا وجود فربہ، سر گنجا اور لباس خستہ تھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس نے مجھے کچھ کہا ہو، اور اسے کچھ کہنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ میں دوستوں کی جانب واپس لپکی، جو بہر حال کچھ ایسی دوست بھی نہیں تھیں اور انہیں کچھ نہ بتایا۔ جب میں نے قمار خانے کے مالک کو دیکھا تو رقص کا سارا منظر تازہ ہو گیا۔ بجتا ہوا پیانو، سارنگی کی دھنیں، اور مالٹائی لباس، جسے تب تک میں مضحکہ خیز قرار دیتی ہوئی ہوں گی، اور میری ماں جو اپنے اس کوٹ کے ساتھ اچانک نمودار ہوئی جسے اس نے کبھی نہ اتارا تھا۔ اور جو موسیقی کے بیچ مجھے کچھ اس لہجے میں پکار رہی تھی جس سے مجھے خاص طور پر چڑ تھی اور جو مجھے یہ یاد دلاتی ہوئی محسوس ہوتی تھی کہ زمین پر میری موجودگی اسی کے مرہون منت ہے۔

تمہارا کوٹ کہاں ہے؟ اس نے مجھ سے کچھ اس انداز میں پوچھا جیسے میں اسے کہیں بھول آئی ہوں۔ بالائی منزل پر۔ میں نے جواب دیا۔ ٹھیک ہے جاؤ اور اسے لے آؤ۔ اس نے کہا۔ اگر وہ خود اوپر آتی

تو وہ اسے خود بھی دیکھ سکتی تھی۔ لیکن ظاہر ہے اسے باورچی خانے کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔ اسے یوں ہی کھانے کی چیزوں کے اردگرد ہی منڈلاتے رہنا چاہیے تھا، اپنے اس کوٹ کے ساتھ جس کے بٹن کھلے لیکن ابھی باقی تھے۔ یہاں تک کہ وہ اس کمرے میں نہ جھانک لیتی جہاں رقص جاری تھا، اور یہ نہ جان لیتی کہ وہ مالٹائی لباس والی رقاصہ کون تھی۔

تاخیر مت کرو، اس نے کہا۔ میں بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ میں نے زینوں کی طرف والا دروازہ کھولا اور پہلا قدم لیتے ہی میں نے دیکھا کہ جہاں سے سیڑھی پہلا موڑ لیتی تھی وہاں کچھ لوگ میرا راستہ روکے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے مجھے آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ مصروف تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ کچھ خاص ہے۔ حقیقت میں کوئی بحث بازی نہیں، لیکن ایک اہم نوعیت کی بات چیت۔ ان میں سے دو جوان مرد تھے جو فضائی فوج کی وردی میں تھے۔ جن میں سے ایک زینے پر براجمان تھا اور دوسرا اس کے گھٹنے پر ہاتھ ٹکائے آگے کو جھکا تھا۔ ان سے اگلے زینے پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اور اس کے نزدیک والا شخص اس کی ٹانگ کو یوں تھپتھپا رہا تھا جیسے اسے سکون پہنچا رہا ہو۔ میں نے سوچا ضرور وہ ان تنگ سیڑھیوں پر گر کر زخمی ہو گئی ہو گی اور اسی لیے وہ چلا رہی ہو گی۔ پیگی۔۔ اس کا نام پیگی تھا۔ وہ دونوں جوان اسے مخصوص لیکن ہمدردی بھرے لہجے میں پیگی پیگی پکار رہے تھے۔ اس نے کچھ کہا جسے میں ٹھیک سے سمجھ نہیں سکی۔ وہ بچوں کی سی آواز میں بول رہی تھی۔ وہ کچھ ایسے شکایت کر رہی تھی جیسے کوئی کسی زیادتی پر کرتا ہے۔ جیسے آپ بار بار کہہ رہے ہوں کہ کچھ صحیح نہیں ہو رہا، لیکن ایک ایسی ناامیدی میں، جیسے آپ کو توقع نہ ہو کہ اس زیادتی کی تلافی بھی ہو گی۔ ایسی صورت حال میں لفظ خود غرضی ہی وہ موزوں لفظ ہو گا جو استعمال کیا جا سکتا ہو۔ یہ بہت بڑی خود غرضی تھی اور کوئی اس کا مرتکب ہو رہا تھا۔

جب ہم گھر پہنچے تو اماں ابا کی باتیں سن کر مجھے واقعے کا کچھ علم ہوا۔ لیکن میں سب صاف نہیں سمجھ سکی۔ بیگم ہوچیسن رقص کے دوران میں اس قمار خانے کے مالک کے ہاتھوں بہک کر کچھ زیادہ ہی بے باک ہو گئی تھیں۔ جو قمار خانے والے اس شخص کی طرح تب تک میرے لیے اجنبی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری ماں نے اسے کس نام سے پکارا تھا، لیکن وہ اس شخص کے رویے سے شدید زدوکوب ہوئی تھی۔ واقعے کی خبر پھیلی تو پورٹ البرٹ پر موجود، فضائی بیس کے کچھ لڑکے بھی حاضری لگانے کو آ پہنچے تھے۔ یقیناً یہ سب صحیح ہی ہوا ہو گا۔ فضائی فوج کے وہ جوان بالکل ٹھیک تھے۔ بے عزت تو بیگم ہوچیسن تھی۔ یا پھر وہ لڑکی۔ وہ اپنی بچیوں میں سے ایک کو ساتھ لائی تھی۔ شاید تفریح کی غرض سے یا پھر اسے رقص پسند ہوا

ہو میرے باپ نے کہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میری ماں نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ ”یہ کتنا شرمناک تھا کہ آپ تفریح اور پڑوس میں ایک اچھی اور عمدہ رقص کی محفل کی امید کر رہے ہوں، اور پھر سب غارت ہو کے رہ جائے۔“ میری ماں نے کہا۔

میری عادت تھی کہ میں بڑی عمر کی لڑکیوں کی شکل و شباہت کا جائزہ لیتی رہتی۔ میرا نہیں خیال کہ پیگی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ شاید رونے دھونے سے اس کا بناؤ سنگھار خراب ہو گیا ہو۔ اس کے چوہے کے رنگ والے اکھڑے ہوئے بال؛ پن سے ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اس کے ہاتھ کی انگلیوں پر پالش تو کی گئی تھی لیکن ایسا لگتا تھا جیسے اس نے انہیں چبایا ہو۔ وہ ان چندروتی بسورتی، شاطر، اور ہمیشہ شکایت کرتے رہنے والی لڑکیوں سے زیادہ بڑی نہ تھی، جن سے میں آشنا تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان لڑکوں نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا جیسے وہ کسی برے رویے پر احتجاج کا کبھی حق ہی نہ رکھتی ہو۔ اور جیسے وہ ایسی کسی مسرت، اور ہمدردی پر پورا حق رکھتی ہو، اور اس کے آگے بچھ جانا صحیح ہو۔ ان میں سے ایک نے اسے تیار شدہ سگریٹ پیش کیا۔ اسے خود میں نے ایک دعوت کے طور پر لیا، کیوں کہ میرا باپ بھی کچھ ایسا ہی کرتا یا وہ دوسرے لوگ جنہیں میں جانتی ہوں۔ لیکن پیگی نے انکار میں اپنا سر ہلایا، اور رندھی ہوئی آواز میں کہا کہ وہ سگریٹ نوشی نہیں کرتی۔ پھر دوسرے آدمی نے اسے چیونگم پیش کی جسے اس نے قبول کر لیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ پیگی کو چیونگم کی پیشکش کرنے والے لڑکے نے جیب میں کچھ ٹٹولتے ہوئے مجھے دیکھا اور بولا۔ پیگی پیگی یہ چھوٹی لڑکی شاید اوپر جانا چاہتی ہے۔ اس نے اپنا چہرہ گرا دیا لہٰذا میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکی۔ میں ان کے پاس سے گزری تو مجھے سگریٹ، اونی وردی، اور پالش کیے ہوئے جوتوں کی بو آئی۔ جب میں اپنا کوٹ لے کر واپس پلٹی تو وہ لوگ ابھی تک وہاں موجود تھے۔ لیکن اس بار انہیں میری آمد کا احساس تھا لہٰذا جب میں پاس سے گزری تو وہ خاموش تھے۔ سوائے پیگی کے جس نے ایک بڑی چھینک ماری۔ جبکہ اس کے پاس بیٹھا ہوا لڑکا اس کی اوپر والی ٹانگ تھپتھپاتا رہا۔ اس کی قمیص اٹھی ہوئی تھی، اور میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ والے لڑکے نے اس کے موزے تھام رکھے ہیں۔ یہ آوازیں ایک مدت تک میرا پیچھا کرتی رہیں اور میں ان میں غرق رہی۔ پیگی کی نہیں صرف ان لڑکوں کی آوازیں۔ مجھے اب معلوم پڑا کہ جنگ کے ابتدائی دنوں میں فضائی فوج کے کچھ لوگ پورٹ البرٹ پر تعینات کیے گئے تھے تاکہ وہ جرمنی کے ساتھ جنگ کے لیے تربیت دے سکیں۔ میں حیران ہوں کہ کیا یہ کرخت اور حیران کن لہجہ برطانیہ کے کسی علاقے سے مخصوص تھا۔ بلاشبہ یہ سچ ہے کہ میں نے زندگی میں کبھی کسی شخص کو اس لہجے میں بات کرتے نہیں

سنا تھا۔ جس میں عورت کے ساتھ یوں سلوک کیا جائے جیسے وہ کوئی عمدہ اور اہم مخلوق ہو۔ اس بات سے قطع نظر کہ وہ کوئی بھی ہو، اور اس کے ساتھ ہونے والی کوئی بھی زیادتی روا رکھی گئی ہو۔ بہر حال یہ قانون کی خلاف ورزی اور اخلاقی طور پر ایک گناہ تھا۔

پیگی کو کس بات نے رونے پر مجبور کیا؟ بعض اوقات یہ سوال میرے لیے زیادہ اہم نہیں رہتا۔ میں خود بھی کوئی بہادر عورت نہیں تھی۔ جب اپنے پہلے سکول سے واپسی پر میرا تعاقب کیا گیا اور مجھے چھڑی سے پیٹا گیا تو میں روئی۔ جب قصبے کے سکول میں میرے میز کی شدید گندگی بے نقاب کرنے کے لیے استاد نے بھری کلاس کے سامنے مجھے کھڑا کیا تو میں روئی۔ اور میں اس وقت بھی چلائی جب اسی بات پر استاد نے میری ماں کو فون کیا، اور وہ فون کان سے لگائے تا دیر بے کسی کی تصویر بنی رہی، کیوں کہ میں اس کے لیے فخر کا باعث نہیں تھی۔ یوں لگتا ہے جیسے بعض لوگ فطری طور پر بہادر ہوتے ہیں اور بعض نہیں۔ کسی نے پیگی کو ضرور کچھ ایسا کہا ہو گا جس پر وہ بڑے بڑے سانس لے رہی تھی کیوں میرے برعکس اس کا جسم بھرواں تھا۔ یہ خود غرضی مالٹائی لباس میں ملبوس اسی عورت کی ہوئی ہو گی۔ میں نے بغیر کسی خاص وجہ کے سوچا۔ اس کے لیے عورت ہونا ہی ٹھیک تھا۔ کیوں کہ اگر اس کی جگہ کوئی مرد ہوتا، تو فضائیہ کے ان اہلکاروں میں سے کوئی ایک اسے سزا دیتا، اسے اس کی اوقات یاد دلاتا، یا پھر اسے گھسیٹ کے باہر لے جاتا اور مار پیٹ کرتا۔ لیکن مجھے پیگی، اس کے آنسو یا پھر اس کی بجھی ہوئی شکل میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دراصل اس نے مجھے میری ہی یاد دلا دی تھی۔ میں اس کے کرم فرماؤں پر حیران تھی۔ وہ اس کے آگے کیسے بچھے جا رہے تھے۔ انہوں نے کچھ خاص بات نہیں کہی۔ بس یہی کہ سب ٹھیک ہے پیگی، سب ٹھیک۔ ایک ایسی مہربانی جس کے لیے کوئی بھی تیار ہو سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ نوجوان، جو ہمارے ملک میں جنگی تربیت کے لیے لائے گئے تھے، اور ان میں سے بہت سے اس دوران میں جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ہوں گے، شاید کارنول، کینٹ، ہل یا سکاٹ لینڈ کے لہجے میں بولتے ہوئے ہوں۔ لیکن مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی مہربانی کے علاوہ منہ ہی نہ کھولتے ہوں۔ مہربانی جس کا مظاہرہ انہوں نے اس روز کیا۔ مجھے یہ خیال نہ آیا کہ ان کا مستقبل ایک سانحے سے مربوط ہے، اور ان کی معمولی زندگیاں باہر گلی میں پھینک دی گئی ہیں۔ میں تو اسی مہربانی سے چپکی رہی۔ وہ مہربانی جس کا مستحق ہونا کتنا حیران کن تھا، لیکن پیگی کتنی غیر مستحق اور عجیب خوش قسمت لڑکی تھی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں کب ان کی سوچ سے باہر نکلی۔ وہ میری سرد اندھیری خواب گاہ میں میری نیندوں کا راستہ روک لیتے۔ میں ان پر جھپٹ سکتی تھی، ان کی آوازوں اور چہروں کو حاضر کر سکتی تھی۔ لیکن

آہ۔۔اب ان کی آوازوں کا نشانہ میں تھی ۔۔کوئی اور نہیں۔۔اب ان کے ہاتھ میری رانوں پر مہربان تھے۔ اور ان کی آوازیں مجھے یقین دلا رہی تھیں کہ میں بھی اس مہربانی اور محبت کی مستحق ہوں۔۔اور اب میرے کم بھڑ کے ہوئے خیالوں میں بسیرا کرنے کے بعد وہ کوچ کر چکے ہیں۔

کوچ کسی بہتری کے لیے۔

☆☆☆☆

ایلس منرو

کینیڈین ادب سے ترجمہ: احمد فرہاد

بجری

ان دنوں ہم بجری کی کان کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ یہ کسی بھی قسم کی بڑی مشینری سے عاری ایک چھوٹا سا گڑھا تھا، جس سے اس کے مالک نے چند برس پہلے کچھ پیسے بھی کمائے ہوں گے۔ اس کا خالی پن دیکھ کر آپ یہ سوچنے پر بھی مجبور ہو سکتے تھے کہ اسے کسی اور مقصد کے لیے تعمیر کیا گیا ہوگا۔ مثلاً کسی گھر کی بنیاد، جسے بعد میں ادھورا چھوڑ دیا گیا ہو۔ میری ماں ہی ہمیشہ اس کی جانب توجہ مبذول کرانے میں لگی رہتی۔ ”ہم سروس اسٹیشن روڈ پر واقع بجری کی کان کے ساتھ رہتے ہیں“۔ وہ لوگوں کو فخر سے بتاتی۔ کیوں کہ وہ اپنی سابقہ زندگی، گھر، گلی اور خاوند سے وابستہ ہر چیز تیاگ کر بہت خوش تھی۔ میں اس زندگی کو بمشکل ہی یاد کر سکتی ہوں جس کے صرف چند گوشے ہی میرے حافظے میں پوری طرح روشن ہیں۔ اور بغیر حوالوں کے آپ مکمل تصویر کشی کر بھی نہیں سکتے۔ پرانے گھر سے متعلق واحد بات جو میرے ذہن میں تازہ ہے، دیوار پر ٹنگا وہ آرائشی کپڑا ہے جس پر ریچھ کاڑھے گئے تھے۔ اس نئے گھر میں، جو در حقیقت ایک ”متحرک گھر“ تھا، میرے اور

کیرو کے لیے دو تنگ پلنگ تھے، جنھیں ایک دوسرے کے اوپر رکھا گیا تھا۔ جب ہم یہاں منتقل ہوئے تو کیرو اپنے پرانے گھر کے بارے میں بہت باتیں کرتی اور مجھے کچھ نہ کچھ یاد کروانے کی کوشش میں لگی رہتی۔ ایسا خاص طور پر اس وقت ہوتا جب ہم بستر میں ہوتے، اور بات؛ عموماً میرے یاد کرنے کی ناکام کوشش اور اس کے حد سے تجاوز پر ختم ہوتی۔ بعض اوقات مجھے لگتا کہ میں کچھ باتیں یاد کر سکتی ہوں لیکن تضاد یا غلطی کے خوف سے میں کچھ بھی یاد نہ آنے کا بہانہ بنا لیتی۔ جب ہم اس ٹرالے میں منتقل ہوئے تو یہ گرمیوں کا موسم تھا۔ ہمارا کتا بلفری بھی ہمارے ہمراہ تھا۔ میری ماں کا خیال درست تھا کہ بلفری یہاں بہت خوش ہے۔ اور پھر ایک کتا ایسے علاقے میں خوش کیوں نہ ہو؟ جہاں بڑے گھر، کشادہ صحن، اور کھلا دیہی علاقہ میسر ہو۔ وہ ہر گزرنے والی گاڑی پر یوں بھونکتا جیسے سڑک اس کی ملکیت ہو۔ یا کبھی کبھی کسی گلہری یا مارموت کا شکار کر کے گھر لے آتا۔ اول اول کیرو اس پر پریشان ہو جاتی، اور نیل اس موضوع پر بحث چھیڑ لیتا، وہ اسے کتوں کی فطرت کے بارے میں بتاتا، یا زندگی کے اس چکر پر بات چیت کرتا جس کے مطابق بعض چیزیں دوسری چیزوں کو نوالہ بنانے پر مجبور ہوتی ہیں۔ کیرو دلیل دیتی کہ وہ اپنے کتے کی خوراک کا بندوبست کرتی ہے۔ اور نیل کہتا کہ فرض کرو کسی روز ہم سب موجود نہ ہوں اور اسے اپنی خوراک کا بندوبست خود کرنا پڑ جائے۔ اس پر کیرو کہتی کہ وہ کبھی کہیں غائب نہیں ہونے والی، وہ یہیں رہے گی اور ہمیشہ اپنے کتے کا خیال رکھے گی۔ کیا واقعی تم ایسا سوچتی ہو؟ نیل جواب دیتا۔ اور میری ماں بیچ میں کود کر بات کا رخ موڑ دیتی۔ نیل ہمیشہ امریکہ اور ایٹم بم کے موضوع پر تقریر کے لیے تیار رہتا اور میری ماں سمجھتی تھی کہ ابھی ہم ایسے موضوع پر گفتگو کے لیے تیار نہیں۔ میری ماں کو معلوم نہیں تھا کہ جب نیل نے یہ موضوع چھیڑا، مجھے یوں لگا کہ جیسے وہ ایٹم بم نہیں ایٹم بن کر بات کرنے جا رہا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ تفسیر درست نہیں تھی لیکن میں پوچھ کر تماشا نہیں بنانا چاہتی تھی۔ نیل ایک اداکار تھا۔ قصبے میں موسم گرما کا ایک پیشہ ور تھیٹر موجود تھا، جو اس دور میں ایک نئی بات تھی، جس پر زیادہ تر لوگ پرجوش اور بعض متفکر تھے کہ یہ گند پیدا کر دے گا۔ میری ماں اور باپ بھی تھیٹر کے حامیوں میں سے تھے۔ خاص طور پر میری ماں کیوں کہ اس کے پاس تھیٹر کے لیے کافی وقت تھا۔ میرا باپ ایک بیمہ فروش تھا اور اسے کافی سفر کرنا پڑتا تھا۔ میری ماں تھیٹر کے لیے چندہ جمع کرنے والی سرگرمیوں میں مشغول رہتی جس نے بطور حاجب تھیٹر کے لیے اپنی خدمات وقف کر رکھی تھیں۔ وہ خوش شکل اور اتنی جوان تھی کہ اس پر کسی اداکارہ کا شائبہ ہو سکتا تھا۔ اس نے اداکاروں کی طرح سکارف، لمبی قمیصوں اور گلے میں لٹکتے ہاروں کا استعمال بھی شروع کر دیا تھا۔ اس نے بال بنانا اور بناؤ سنگھار کرنا بھی چھوڑ دیا

تھا۔ یقیناً میں ان تبدیلیوں کو نہیں سمجھ سکی تھی، یا پھر مجھے ان کا احساس نہیں ہوا تھا۔ جہاں تک میری ماں کے متعلق میرے باپ کے احساسات کو میں جانتی ہوں، میرا خیال ہے اسے یہ دیکھ کر فخر ہوا ہوگا کہ وہ اس آزادانہ روش میں کتنی اچھی لگتی ہوئی ہوگی۔

بعد میں اس بارے بات کرتے ہوئے میرے باپ نے کہا تھا کہ وہ ہمیشہ فن کا دلدادہ رہا ہے۔ اب میں اندازہ کر سکتی ہوں کہ اپنے تھیٹر کے دوستوں کے روبرو اس بات کا اعلان کرتے ہوئے میری ماں نے کس تکلیف کا سامنا کیا ہوگا۔ قہقہے لگاتے ہوئے، اور اپنی شرمساری پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے۔ پھر کچھ ایسا ہوا جسے پہلے ہی محسوس کیا جا سکتا تھا، یا شاید محسوس کیا جا چکا تھا، لیکن میرے باپ کی طرف سے نہیں۔ ایسا اگر میرے باپ کی بجائے تھیٹر کے کسی اور شخص کے ساتھ ہوا ہوتا تو شاید مجھے یہ سب یاد بھی نہ ہوتا۔

گو کہ میں یہ سب یاد نہیں کرتی لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس روز میرا باپ رو پڑا تھا۔ وہ سارا دن گھر میں میری ماں کے پیچھے پیچھے رہا۔ وہ اسے ایک لمحے کے لیے بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا اور نہ ہی اس کی بات کا یقین کرنے کو تیار تھا۔ لیکن اس نے میرے باپ کو دلاسہ دینے کی بجائے کچھ ایسا کہا جو اس کے لیے زیادہ کرب ناک تھا۔ اس نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ نیل کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ کیا اسے یقین تھا؟ ۔۔ ہاں یقیناً کیوں کہ وہ ساری صورت حال سے آگاہ تھی۔ اور پھر کیا ہوا؟ ۔ میرے باپ نے رونا دھونا چھوڑ دیا۔ اسے کام پر جانا تھا۔ میری ماں نے ہمارا سامان باندھا اور نیل کے ساتھ رہنے کے لیے ہمیں اس متحرک گھر میں لے آئی جو اس نے دیہی علاقے میں ڈھونڈ رکھا تھا۔ بعد ازاں میری ماں نے بتایا کہ اس لمحے وہ بھی رو پڑی تھی لیکن اس احساس نے اسے زندگی کا احساس دیا تھا۔ شاید زندگی میں پہلی بار جینے کا حقیقی احساس۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے اسے جینے کا ایک اور موقع مل گیا ہو۔ اس نے نئے سرے سے زندگی کا آغاز کیا۔ وہ پچھلے گھر کی تمام آرائش و زیبائش، پھولوں سے لدا، باغیچہ، اور بک شیلف میں پڑی کتابیں تیاگ آئی تھی۔ اس کے کپڑے الماری میں ٹنگے، اور جوتے وہیں پڑے رہ گئے تھے۔ اس کی ہیرے اور شادی کی یادگار انگوٹھی بھی سنگھار میز پر دھری رہ گئی۔ وہ موسم میں خنکی آنے تک کم لباسی میں ہی رہنا چاہتی تھی لیکن ایسا ہو نہ سکا۔ کیوں کہ جب اس نے اس کی کوشش کی تو کیرواس کے کوٹ میں جا کر چھپ گئی جبکہ نیل کو بھی اس کا یہ ارادہ ایک آنکھ نہ بھایا۔ نیل کو یہ سب کیسا لگ رہا تھا؟ ۔ بعد میں جب اس نے اپنا نقطۂ نظر بیان کیا تو معلوم ہوا کہ وہ واقعے کو خوش آمدید کہنے کا قائل تھا۔ اس کے نزدیک ہر چیز ایک تحفہ ہے

جسے ہم لیتے اور دیتے ہیں۔ میں ایسے لوگوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہوں لیکن میں یہ نہیں کہتی کہ مجھے ایسا کرنے کا حق بھی ہے۔ نیل حقیقت میں کوئی اداکار نہیں تھا۔ حادثاتی طور پر اس شعبے میں آ دھمکا تھا۔ جسے وہ ایک تجربے سے تعبیر کرتا تھا۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کیا کچھ کر سکتا ہے۔ کالج چھوڑنے سے پہلے ایک بار اس نے ''ایڈی پس ریکس'' میں ایک بار اس نے چورس کا کردار نبھایا تھا۔ اس کے بقول اسے خود کو دوسروں کے سپرد کرنا اور ان کے رنگ میں رنگ جانا اچھا لگتا تھا۔ پھر ایک روز اسے ٹورنٹو کی ایک گلی میں اچانک ایک دوست مل گیا جو قصبے کے ایک چھوٹے سے تھیٹر میں ملازمت کے سلسلے میں جا رہا تھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہو لیا کیوں کہ اس وقت اس کے پاس اس سے بہتر کوئی اور راستہ نہ تھا۔ بالآخر وہ وہاں سے ملازمت کا پروانہ لے کر لوٹا جبکہ اس کے دوست کو رد کر دیا گیا۔ وہاں اسے ''بینکوؤ'' کا کردار تفویض کیا گیا۔ تھیٹر والوں کو بعض اوقات بینکوو کو دکھانا مقصود ہوتا اور بعض اوقات نہیں۔ اس بار ان کا ارادہ دکھانے کا تھا لہٰذا اسی قد کاٹھ کا حامل نیل ان کے لیے بہترین انتخاب تھا۔ بہترین جسامت کا مالک ایک عمدہ بھوت۔

میری ماں کی جانب سے یہ حیران کن قدم اٹھانے سے قبل اس کا ارادہ تھا کہ وہ سرما ہمارے ہی قصبے میں گزارے گا۔ متحرک گھر کو اس نے پہلے ہی تیار کر لیا تھا۔ تھیٹر کی آرائش و زیبائش کا کام لینے کے لیے اس کے پاس لکڑی کے کام کا کافی تجربہ تھا جو آمد بہار تک اسے مصروف رکھ سکتا تھا۔

کیرو کو سکول نہیں بدلنا پڑا۔ بس، بجری کی کان کے ساتھ ہی دوڑتی سڑک کے آخری کنارے سے اسے اٹھا لیتی۔ اسے دیہی علاقے کے بچوں کو دوست بنانا پڑ گیا اور شاید قصبے کے ان بچوں کے سامنے کچھ وضاحتیں بھی پیش کرنا پڑیں، جو ایک سال پہلے تک اس کے دوست تھے۔ لیکن اگر اسے کوئی مشکل تھی بھی تو اس نے کبھی اظہار نہ کیا۔

بلٹزی سڑک کے کنارے ہمیشہ اس کی آمد کا منتظر رہتا۔ میں، کے جی اسکول نہیں جا سکی۔ کیوں کہ میری ماں کے پاس گاڑی نہیں تھی۔ لیکن مجھے دوسرے بچوں کا ساتھ نہ ملنے کی شکایت بھی نہیں تھی کیوں کہ جب کیرو سکول سے لوٹتی تو یہ میرے بہلنے کے لیے کافی ہوتا۔ اور میری ماں بھی اکثر شرارت کے لیے تیار رہنے والی خاتون تھی۔ اس بار جب برف باری ہوئی تو میں نے اور ماں نے برف کا آدمی بنایا۔ پھر ماں نے جب پوچھا کہ کیا ہم اسے نیل کہہ سکتے ہیں تو میں نے کہا کیوں نہیں۔ ہم نے اسے مضحکہ خیز بنانے کے لیے اس پر طرح طرح کی چیزیں تھوپ دیں۔

پھر ہم نے منصوبہ بنایا کہ جب نیل گھر لوٹے گا تو میں دوڑتی ہوئی گھر سے باہر جاؤں گی اور اس

پُتلے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے زورزور سے چلاؤں گی کہ ”نیل یہاں ہے، نیل یہاں ہے“؛ اور پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ پاگلوں کی طرح گاڑی سے باہر آیا اور مجھ پر چلا کر کہنے لگا کہ وہ مجھے گاڑی کے نیچے کچل بھی سکتا تھا۔

یہ ایسے معدودے چند لمحات میں سے ایک تھا کہ مجھے اس میں باپ کی جھلک نظر آئی۔ سردیوں کے وہ مختصر دن میرے لیے بہت عجیب تھے۔ قصبے میں روشنیاں دھندلکا پڑتے ہی ٹمٹمانے لگتیں۔ لیکن بچے تبدیلیوں کے عادی ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات میں اپنے پرانے گھر کے بارے سوچ کر حیران ہو جاتی۔ اس لیے نہیں کہ میں پھر سے وہاں جانا چاہتی تھی۔ بلکہ اس لیے کہ وہ اچانک کہاں کھو گیا تھا۔ میری ماں اور نیل کے خوشگوار لمحات رات کو آغاز ہوتے۔ اگر میں رات کو جاگ پڑتی اور مجھے طہارت خانے کی طلب ہوتی تو مجھے ماں کو آواز دینا پڑتی۔ وہ خوشی خوشی آ تو جاتی لیکن تاخیر سے۔ انتہائی مختصر لباس میں یا بدن پر دوپٹہ اوڑھے ہوئے ایک خاص قسم کی بو کے ساتھ جسے میں موم بتی کی روشنی، موسیقی اور محبت سے وابستہ کرتی۔

کچھ ایسا ہو چکا تھا جو میرے لیے حوصلہ افزا تو نہ تھا لیکن اس وقت میں نے اسے زیادہ سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ ہمارا کتا بلفزی زیادہ بڑا نہیں تھا۔ لیکن کچھ ایسا چھوٹا بھی نہ تھا کہ کیرو کے کوٹ میں سما سکے۔ معلوم نہیں کہ کیرو ایسا کیسے کر لیتی تھی۔ ایک بار نہیں بلکہ دو بار۔ اس نے دو بار سکول کی بس میں کیرو کو اپنے کوٹ میں چھپایا اور اسکول جانے کی بجائے سیدھا ہمارے پرانے گھر چلی گئی۔ جو ایک بلاک سے بھی کم فاصلے کی دوری پر تھا۔ میرا باپ جب دن کے کھانے کے لیے گھر آیا تو اس نے بلفزی کو برآمدے میں پایا جو مقفل نہیں کیا گیا تھا۔ یہ سب اس کے لیے بہت حیران کُن تھا۔ بالکل ایک کہانی کے اس کتے کی طرح جو گھر واپسی کی راہ ڈھونڈ نکالتا ہے۔ کیرو نے گھر لوٹنے پر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ اس نے صبح سے کتے کو نہیں دیکھا۔ لیکن اس کے بعد اس نے شاید ایک ہفتہ بعد دوبارہ وہی غلطی دہرانے کی کوشش کی۔ سکول بس میں اس بار بھی کسی کو اس پر شک نہ گزرا لیکن ماں نے اسے پکڑ لیا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرا باپ بلفزی کو واپس چھوڑ گیا تھا۔ میں اس کے ہمارے گھر آنے، اور دروازے یا سڑک پر کھڑے رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ شاید نیل خود جا کر اسے واپس لایا ہو۔ اگر میں یہ کہوں کہ کیرو خوش نہ تھی اور ہر وقت منصوبہ بندی میں لگی رہتی تھی تو یہ درست نہ ہوگا۔

جیسا کہ میں بتا چکی ہوں کہ وہ رات کے وقت بستر میں میرے ساتھ بات چیت کی کوشش کرتی۔ ناراض ہونا اس کی فطرت میں تھا اور نہ ہی وہ مسلسل شکایت کی عادی تھی۔ وہ دوسروں پر اچھا تاثر

چھوڑنے کے لیے بے تاب رہتی۔ اسے اچھا لگتا تھا کہ وہ دوسروں کو بھلی لگے۔ وہ کسی خوشی کے وعدے پر بھی کمرے میں ہلہ گُلہ پیدا کرنا پسند کرتی تھی اور اس کے لیے وہ مجھ سے زیادہ فکرمند رہتی۔ اب میں سوچتی ہوں کہ وہ بالکل میری ماں کے جیسی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کتے والے واقعے پر گھر میں کچھ مسئلہ کھڑا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کچھ باتیں میں یاد کر سکتی ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ اس نے ایسا شوخی میں کیا تھا۔ جس پر میری ماں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ باپ کے ساتھ جا کر رہنا چاہتی ہے اور اس نے انکار کر دیا۔ میں نے اس سے اس بارے کچھ بھی نہ پوچھا۔ اس نے جو بھی کیا میرے لیے حیران کُن نہ تھا۔ شاید چھوٹے بچے ایسا ہی کرتے ہیں۔ حیران کُن قوت کے حامل ان بڑے بچوں کے برعکس جو عام بچوں کے معاملے میں غیر معمولی نظر آتے ہیں۔ ہماری ڈاک، سڑک کے ساتھ ہی ڈاک کے ڈبے میں آتی تھی۔ سخت موسم کے علاوہ میں اور ماں ہر روز وہاں چہل قدمی اور ڈاک کا پتہ کرنے جاتیں۔ ایسا زیادہ تر ہم قیلولہ کے بعد ہی کرتے۔ صبح کے وقت ہم ٹی وی دیکھتے یا وہ مطالعے میں مگن رہتی۔ اس نے ایک مدت تک مطالعے کی عادت ترک نہ کی تھی۔ دن کے کھانے کے لیے ہم تیار شدہ یخنی گرم کرتے۔ پھر میں قیلولے کے لیے چلی جاتی اور وہ مزید مطالعے میں مصروف رہتی۔

بچہ اب بڑا ہو چکا تھا اور جہاں تک میں محسوس کر سکتی تھی اس نے اب حرکت بھی شروع کر دی تھی۔ جنس کے تعین سے قطع نظر اس کا نام بریڈی تجویز کیا گیا تھا۔ ایک روز جب ہم ڈاک کا پتہ کرنے جا رہے تھے اور پوسٹ بکس سے زیادہ دور نہ تھے تو میری ماں اچانک رکی اور دم سادھتے ہوئے مجھے خاموش رہنے کا کہا۔ حالانکہ میں پہلے سے خاموش تھی اور اپنے جوتوں سے برف کے ساتھ کھیل بھی نہیں رہی تھی۔ ”میں خاموش ہوں“ میں نے کہا۔ ”ششش۔۔ مڑ جاؤ“ اس نے مجھے حکم دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ابھی ہم نے ڈاک نہیں لی۔ لیکن اس نے کہا کہ کوئی بات نہیں بس تم چلتی جاؤ۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ بلفری جو ہمیشہ آگے پیچھے ہمارے ساتھ رہتا تھا کہیں موجود نہ تھا۔ جب کہ سڑک کے پار ایک اور کتا پوسٹ بکس سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑا تھا۔

میری ماں نے گھر پہنچتے ہی تھیٹر فون کیا اور پھر بلفری کو اندر آنے دیا جو ہمارا منتظر تھا۔ تھیٹر سے کوئی جواب نہ ملا تو میری ماں نے سکول کا نمبر ملایا اور ڈرائیور کے لیے پیغام چھوڑا کہ وہ بلفری کو گھر کے دروازے پر چھوڑ دے۔ لیکن بتایا گیا کہ ڈرائیور ایسا نہیں کر سکتا کیوں کہ نیل نے رستے کی کھدائی کی تھی اور اس کے بعد وہاں برف پڑ چکی تھی۔ البتہ انہوں نے وعدہ کیا کہ ڈرائیور گھر پہنچنے تک کیرو پر نظر رکھے گا۔ اب

تک اس علاقے میں کوئی بھیڑیا نہیں دیکھا گیا تھا۔ نیل کا موقف تھا کہ وہاں کوئی بھیڑیا تھا ہی نہیں۔ اور اگر تھا بھی تو وہ ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا کیوں کہ "ہائیبرنیشن" (سخت موسم سے بچاؤ کے لیے جانوروں کا زیرِ زمین جانے کا عمل) نے اسے کمزور کر دیا ہوگا۔ کیرو نے لقمہ دیتے ہوئے کہا کہ ہم نے سکول میں پڑھا ہے بھیڑیے ایسا نہیں کرتے۔ ہماری ماں چاہتی تھی کہ نیل کوئی بندوق خرید لے۔ تمہارا خیال ہے کہ میں اب ایک بندوق لوں اور اس غریب مادہ کو گولی مار دوں جو شاید جھاڑیوں میں بچوں کا ایک غول چھوڑ کر ان کی حفاظت کو باہر نکل آئی ہوگی۔ بالکل ایسے ہی جیسے تم اپنے بچوں کو بچانے کی کوشش میں ہو، نیل نے آہستگی سے کہا۔ غول نہیں صرف دو۔۔۔ مادہ بھیڑیا ایک وقت میں صرف دو ہی بچے دیتی ہے۔ کیرو نے اسے ٹوکا۔ ٹھیک ہے، میں تمہاری ماں سے بات کر رہا ہوں۔ نیل بولا۔

کیا تم نہیں جانتے کہ اس کے پلے بھوکے ہوں گے یا نہیں؟ میری ماں اس پر چیخی۔

میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ماں نیل کے ساتھ اس لہجے میں بات کرے گی۔ اچھا صبر۔۔ ذرا سکون سے سوچو بندوق ایک خوف ناک شے ہے۔۔ اگر میں بندوق لینے جاؤں تو کیا کہوں گا؟۔ یہی کہ جو ویت نام میں ہوا ٹھیک تھا اور مجھے بھی ویت نام چلے جانا چاہیے؟ نیل نے جواب دیا۔

تم امریکن نہیں ہو۔ مجھے غصہ مت دلاؤ۔ میری ماں جذباتی ہو گئی۔ ان کے درمیان کم و بیش اسی قسم کی مکالمہ بازی ہوتی جو اس نتیجے پر ختم ہوتی کہ نیل بندوق نہیں خریدے گا۔ اس کے بعد ہم نے کبھی بھیڑیے کو نہیں دیکھا۔ اگر وہ واقعی بھیڑیا ہوتا تو میرا خیال ہے کہ ماں ڈاک کے لیے جانا ترک کر دیتی۔ لیکن شاید وہ اتنی بہادر ہو گئی تھی کہ آسانی کے ساتھ یہ سب کر بھی لیتی۔ برف اب جادوئی طور پر کم ہو گئی تھی۔ درخت اب بھی برہنہ تھے اور ماں صبح کے اوقات میں اب بھی کیرو کو کوٹ پہنانا نہ بھولتی جسے سکول کے بعد وہ کمر پر لادے گھر پہنچتی۔

میری ماں کا خیال تھا کہ بچا ایک نہیں بلکہ دو تھے لیکن ڈاکٹر اس سے متفق نہ تھا۔ بہت خوب۔۔ بہت خوب۔۔ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟ نیل نے جڑواں بچوں کا سن کر خوشی سے کہا۔ بجری کی کان اب بارش اور برف کے پگھلنے سے مکمل طور پر بھر چکی تھی لہٰذا کیرو کو اس کے کناروں سے ہوتے ہوئے سکول بس کی جانب جانا پڑتا تھا۔ کان کھلے آسمان تلے ایک چھوٹی اور شفاف جھیل کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ ایک بار کیرو نے کچھ زیادہ پر امید ہوئے بغیر پوچھا تو ماں نے کہا کہ پاگل مت بنو یہ کم سے کم بھی بیس فٹ گہری ہے۔ نیل کا اندازہ تھا کہ یہ بیس فٹ سے بھی زیادہ گہری ہے۔ لیکن یہ کناروں سے تو گہری نہیں ہوگی۔ کیرو بضد رہی۔ ضد

چھوڑ دو۔ ۔ یہ کوئی ساحل نہیں ہے کہ تم اس پر تفریح کرو۔ میں کہتی ہوں تم اس سے دور ہی رہو۔ ماں غصے ہو گئی۔ کیا مصیبت ہے۔ ۔ ۔ ماں کی آواز نیل سے بھی زیادہ بلند ہو گئی۔

''کیا ہم کتے کو بھی اس سے دور رکھیں؟'' کیرو نے معصومیت سے پوچھا۔ ''نہیں کوئی مسئلہ نہیں، کتے تیر سکتے ہیں'' نیل بولا۔ ہفتہ کو کیرو نے میرے ساتھ فلم دوست ''دوست دیؤ'' دیکھی اور پھر کچھ ایسا تبصرہ کیا کہ فلم کا سارا مزہ ہی غارت ہو گیا۔ نیل میرے اور ماں کے بستر کے درمیان پڑے صوفے پر دراز اپنے پسندیدہ سگریٹ کا کش لے رہا تھا۔ کام کے دوران میں اسے سگریٹ نوشی کی ممانعت تھی لہٰذا وہ ساری کسر چھٹی کے دن نکال لیتا۔ کیرو بعض اوقات اسے تنگ کرنے کے لیے سگریٹ کا تقاضا کرتی۔ ایک بار تو نیل نے اسے اس شرط پر سگریٹ دے بھی دیا کہ وہ ماں کو نہیں بتائے گی۔ لیکن میں بھی وہاں موجود تھی لہٰذا میں نے ماں کو بتا دیا۔ ''آئندہ ایسا کبھی نہ ہو۔ ۔ ان کا باپ بغیر کسی جھجک کے انھیں یہاں سے لے جا سکتا ہے'' ماں نے نیل سے کہا۔ ''نہیں دوبارہ کبھی نہیں۔ ۔ لیکن کیا ہو گا اگر اس نے انھیں کھانے میں زہر دے دیا؟'' نیل نے اتفاق کرتے ہوئے جواب دیا۔ شروع شروع میں تو ہم باپ سے کبھی نہ ملے لیکن پھر کرسمس کے بعد ہر ہفتے کو ملاقات کا منصوبہ ترتیب پایا۔ ہم جب بھی باپ سے مل کر لوٹتے تو ماں پوچھتی کہ کیا ہم لطف اندوز ہوئے۔ میں ہمیشہ ہاں میں جواب دیتی۔ اور ایسا تھا بھی۔ ۔ کیوں کہ اگر آپ فلم دیکھنے گئے ہوں، جھیل کی سیر کی ہو، یا کسی ہوٹل میں اپنا پسندیدہ کھانا کھایا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ لطف اندوز ہوئے ہیں۔ کیرو بھی میری ماں کی ہاں میں ہاں ملاتی لیکن کچھ ایسے لہجے میں جیسے میری ماں کا ان سب باتوں سے کوئی لینا دینا نہ ہو۔ پھر میرا باپ سرما کی چھٹیاں گزارنے کیوبا چلا گیا۔ (جس پر میری ماں نے حیرانی اور شاید منظوری کا تاثر دیتے ہوئے تبصرہ کیا تھا)

جب وہ کیوبا سے لوٹا ضدی نزلہ بھی اس کے ساتھ تھا جس کے باعث ہماری ملاقاتیں کم ہو کے ہو گئیں۔ اسے موسم بہار کیوبا میں ہی گزارنا تھا لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔

ٹی وی بند ہوا تو ماں نے ہمیں تازہ ہوا لینے کے لیے باہر بھیج دیا۔ ہم کتے کو بھی ساتھ ہی لے آئے تھے۔ باہر آتے ہی ہم نے سب سے پہلے اپنے دو پٹے ڈھیلے کیے اور ان سے جان چھڑائی جنھیں ماں نے ہماری گردنوں کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔

میں اس سے آگاہ تھی کیوں کہ یہ ایک حقیقت تھی۔ تاہم مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میں کیا سوچ رہی ہوں اور کیا کرنے جا رہی ہوں۔ شاید میں کیرو اور کتے کے ڈرامے میں کسی اگلی پیش رفت کی منتظر تھی۔ اس

وقت زیادہ سردی نہ تھی اور شاید میں پانچ منٹ بھی وہاں نہ بیٹھ سکی۔ ایک بار میں ایک ماہر سے ملنے گئی تا کہ اس واقعے پر اس سے بات کر سکوں۔ کچھ وقت کے لیے اس نے مجھے قائل کر لیا تھا کہ اگر میں دروازے پر دستک دیتی بھی تو وہ مجھے بند ملتا۔ کیوں کہ اس وقت نیل اور میری ماں دروازے کے پیچھے رکاوٹیں ٹیکیے اختلاط میں مصروف ہوتے اور میرے یوں آدھمکنے کا برا مناتے۔ کاؤنسلر مجھے اس نتیجے پر لا کر مطمئن تھی اور شاید میں بھی۔ لیکن یہ اطمینان زیادہ عرصہ نہ رہ سکا۔ میرا خیال ہے انہوں نے دروازہ مقفل نہیں کیا ہوگا۔ کیوں کہ ایک بار کیرو ایسے ہی کمرے میں داخل ہو گئی تھی اور وہ دونوں اس کا چہرہ دیکھ کر ہنس پڑے تھے۔

شاید نیل نے کہا تھا کہ کتے نہیں ڈوبتے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ کیرو کی جانب سے بلٹزی کو بچانے کی کوشش غیر ضروری تھی۔ شاید اسی لیے وہ اپنا کھیل مکمل نہ کر سکی۔ کیا میرا یہ خیال تھا کہ وہ نو برس کے دوسرے بہت سے بچوں کی طرح تیر سکتی ہے۔ پچھلے موسم گرما میں اس نے تیراکی پر کچھ سبق لیے تھے لیکن اس کے بعد ہمیں اس متحرک گھر میں منتقل ہونا پڑا جس کے باعث وہ تربیت جاری نہ رکھ سکی۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ وہ یہ سب اچھی طرح سے کر لے گی۔ اور شاید میرا یہ خیال ہوا ہو کہ وہ جو چاہتی ہے کر سکتی ہے۔ ماہر نفسیات نے مجھے یہ ہرگز نہیں کہا تھا کہ مجھے کیرو کے احکام بجالانے کی بیماری ہے۔ یہ تو میرا اپنا خیال تھا۔ تاہم اس عمر میں یہ بات کوئی بھلی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ کیوں کہ میں عمر میں اس سے بڑی تھی۔ ان دنوں بھی مجھے یہ امید رہتی کہ وہ اپنا خلا ضرور پُر کرے گی۔

میں وہاں کتنی دیر تک بیٹھی رہی؟۔۔۔ شاید بہت زیادہ نہیں۔ اور یہ ممکن ہے کہ میں نے دروازے پر دستک دی ہو۔۔ کچھ دیر یا ایک منٹ بعد کسی بھی طرح میری ماں نے دروازہ کھولا۔ ایک موقع پر بغیر کسی وجہ کے اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اگلے ہی لمحے، میں کمرے کے اندر تھی۔ پھر میری ماں نیل پر چیخ رہی تھی اور اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے کھڑا اس سے مخاطب تھا۔ وہ اس کے پاؤں پڑ رہا تھا، اسے محبت، ہمدردی اور نرمی سے چھو رہا تھا۔ لیکن مری ماں کو اس سب کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے اسے خود سے پرے دھکیلا اور دروازے سے باہر بھاگ کھڑی ہوئی۔ نیل نے اپنا سر جھٹکا اور پھر گردن جھکا کر اپنے ننگے پیروں اور بے بس لمبے انگوٹھوں کی جانب دیکھنے لگا۔ شاید اس نے مجھے رندھی ہوئی آواز میں کچھ کہا بھی۔ اس سے آگے مجھے کچھ معلوم نہیں۔

میری ماں پانی میں نہیں کودی۔ اس صدمے نے اسے ہسپتال بھی نہیں پہنچایا۔ کیرو کی تدفین کے ہفتہ یا دس دن بعد تک بھی میرے بھائی برینٹ کی پیدائش نہیں ہوئی تھی تاہم اب وہ پورے دنوں کا بچہ تھا۔

مجھے معلوم نہیں کہ بچے کی پیدائش کے انتظار میں وہ کہاں رہی ۔ شاید اسے ہسپتال میں رکھا گیا ہوتا کہ ان حالات میں وہ زیادہ سے زیادہ پرسکون رہ سکے۔ مجھے کیرو کی تدفین کا دن اچھی طرح یاد ہے ۔ جوزی نام کی ایک خوش وضع اور خوش طبع خاتون مجھے سیروتفریح کے لیے لے گئی جسے میں نہیں جانتی تھی ۔ ہم نے جھولے لیے، اور گڑیا کا ایک بڑا سا گھر دیکھا جس میں، میں باآسانی داخل بھی ہوسکتی تھی۔ دن کے کھانے میں میں نے اپنا پسندیدہ کھانا کھایا ۔ لیکن اتنا کہ میں بیمار نہ پڑ جاؤں ۔ بعد میں، میں جوزی کو بہت اچھی طرح جان گئی۔ --یہ میرے باپ کی دوست تھی جو اسے کیوبا میں ملی اور میری ماں سے طلاق کے بعد وہ میری سوتیلی ماں بن گئی۔ میرے باپ کی دوسری بیوی۔

میری ماں صحت یاب ہوگئی ۔ اسے ہونا بھی تھا کیوں کہ اسے برینٹ اور زیادہ تر میرا خیال جو رکھنا تھا۔ میں اپنے باپ اور جوزی کے ساتھ رہنے لگی جبکہ میری ماں اس گھر میں منتقل ہوگئی جہاں اس نے ملازمت سے فراغت کے بعد باقی عمر رہائش کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں اس وقت تک وہاں رہی ہوں جب تک کہ برینٹ اتنا بڑا نہ ہوگیا ہو کہ آسانی سے کرسی پر بیٹھ سکے۔ میری ماں تھیٹر میں دوبارہ اپنی ذمہ داریوں پر جانے لگی تھی۔ شروع میں تو اس نے پہلے کی مانند بطور رضا کار ہی کام کیا ہوگا۔ لیکن جب تک میں نے سکول جانا شروع کیا وہ تنخواہ اور باقاعدہ ذمہ داریوں کے ساتھ بطور کاروباری منتظم پکی نوکری حاصل کر چکی تھی اور تھیٹر کئی نشیب وفراز کے ساتھ اب بھی چل رہا تھا۔ نیل نے کیرو کے جنازے میں شرکت نہیں کی کیوں کہ وہ ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس نے برینٹ کو کبھی نہیں دیکھا۔ اس نے ایک خط میں لکھا کہ اسے برینٹ کی پیدائش کا بہت دیر سے علم ہوا، وہ باپ کی اداکاری کرنے کا خواہش مند نہیں لہٰذا بہتر یہ ہے کہ وہ آغاز میں ہی اس ذمہ داری سے سبکدوش ہوجائے۔

میں نے برینٹ کے معاملے میں کبھی اس کا ذکر نہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ میری ماں کے لیے تکلیف دہ ہے ۔ اس لیے بھی کہ برینٹ نیل کے ساتھ معمولی سی مشابہت رکھتا تھا۔ جبکہ اس کی شباہت زیادہ میرے باپ سے ملتی تھی جو میرے لیے حیران کن تھا اور میں سوچتی کہ ان خاص دنوں میں کیا ہوتا رہا جب میری ماں امید سے ہوئی تھی۔ میری باپ نے اس بارے کبھی کچھ کہا اور نہ کہے گا۔ وہ برینٹ کے ساتھ ویسے ہی پیش آتا ہے جیسے میرے ساتھ۔ اور وہ تھا ہی اسی قبیل کا آدمی ۔ اس کے اور جوزی کے اپنے بچے نہیں تھے اور میرا نہیں خیال کہ انہیں اس کا کوئی قلق بھی تھا۔ جوزی وہ واحد خاتون ہے جو ہمیشہ کیرو کو یاد کرتی ہے ۔ اس کا خیال ہے کہ میرا باپ میری ماں کی ذمہ داری نبھانے میں ناکام رہا۔ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ

جب میری ماں زندگی میں کچھ مزید راحت کی متلاشی تھی تو اسے اس کو کچھ اور آسانی فراہم کرنا چاہیے تھی۔ میرے باپ کو ایک صدمے کی ضرورت تھی جو اسے مل گیا اور اب اس پر ہاتھ ملنے کا کائی فائدہ نہ تھا۔ کیوں کہ اس صدمے کے بغیر وہ کبھی جوزی کو نہ پا سکتا اور وہ دونوں اتنے خوش نہ ہوتے۔ لیکن کون دو؟ میں اسے تجویز کرنے کے لیے پوچھ سکتی ہوں اور وہ پوری وفاداری اور اطمینان سے کہے گا، جوزی، یقیناً جوزی۔

میری ماں کو ان دنوں کی یاد دلانا بہت مشکل تھا اور میں یہ چاہتی بھی نہیں تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ اسی گلی میں منتقل ہو گئی تھی جہاں ہم رہتے تھے۔ گلی جو اس کے لیے نئی تھی اور جہاں بنجر زمینوں پر عام نظر آنے والے روایتی گھر تعمیر کیے گئے تھے۔ اس بات کا تذکرہ اس نے قدرے حقارت سے کیا تھا جو ان گھروں نے اس کے اندر ابھاری تھی۔ میں گلی میں جاتی لیکن کسی کو خبر نہ ہونے دیتی۔ آج کل خاندانوں میں ہونے والی رسہ کشی مجھے ایک کوتاہی کی طرح لگتی ہے۔

جس جگہ بجری نکالنے کا گڑھا تھا وہاں آج کل زمین ہموار کر کے ایک گھر کھڑا کر دیا گیا ہے۔

میری ایک روتھن نامی دوست ہے۔ جو مجھ سے عمر میں چھوٹی لیکن ذہانت میں بڑی ہے۔ یا کم از کم میرے توہمات کو بھگانے کے حوالے سے مجھ سے زیادہ پرامید ہے۔ میں نیل سے کبھی رابطے میں نہ رہتی اگر روتھن کا اصرار نہ ہوتا۔ یقیناً ایک مدت تک اس بات کا کوئی امکان نہ تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے میرے ذہن میں نیل سے ملاقات کا کبھی کوئی خیال نہ آیا۔ آخر کار نیل نے خود ہی الومنی رسالے میں چھپی میری تصویر دیکھنے کے بعد مجھے ایک طویل مبارکبادی خط لکھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ اس رسالے میں کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے ان تعلیمی اعزازات میں سے کسی ایک سے نوازا گیا تھا جو کسی بھی محدود علاقے میں یا کہیں اور کچھ معنی رکھتے ہیں۔ جہاں میں پڑھاتی تھی نیل وہاں سے بمشکل پچاس میل کی مسافت پر رہتا تھا اور یہ وہی علاقہ تھا جہاں میرا کالج ہوا کرتا تھا۔ میں حیران تھی کہ وہ اس وقت مجھ سے اتنا قریب رہائش پذیر تھا۔ کیا وہ ایک دانشور بن چکا تھا؟

اول اول نیل کو جواب دینے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا۔ لیکن جب میں نے روتھن کو اس کے متعلق بتایا تو اس نے مجھے اس بارے میں سوچنے کا کہا۔ نتیجتاً میں نے اسے ایک برقی خط لکھا اور معاملات طے پا گئے۔ مجھے نیل سے اس کے قصبے میں واقع ایک ریستوران میں ملنا تھا جو ملاقات کے لیے ایک محفوظ جگہ تھی۔ ”اگر وہ ناقابل برداشت دکھائی دیا تو میں کیا کروں گی؟ ۔۔۔ مجھے بس اس سوال سے گزر جانا ہے“۔ میں نے خود سے سرگوشی کی۔

اس کا قد پہلے کی نسبت پست ہو گیا تھا۔ جیسا کہ بچپن سے ہم بوڑھوں کے ساتھ ایسا ہوتا دیکھتے آئے تھے۔ اس کے بال گھنے اور آراستہ تھے۔ وہ میرے اور اپنے لیے چائے لے آیا۔ اس کی گزر بسر کیسے ہوتی تھی؟ اس نے بتایا کہ وہ بچوں کو امتحانات کی تیاری میں مدد دیتا ہے اور مضامین لکھنے میں ان کی مدد کرتا ہے۔ یا آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ان کے لیے اجرت پر مضامین لکھتا ہے۔

”میں تمھیں بتا دوں کہ ایسے کوئی امیر نہیں ہو سکتا۔“ اس نے کہا۔ وہ ایک پسماندہ یا کسی حد تک کم پسماندہ علاقے میں رہائش پذیر تھا۔ لیکن یہ اسے پسند تھا۔ وہ کپڑوں کی خریداری کے لیے سیلی این کا رخ کرتا۔۔۔ یہ بھی ٹھیک تھا۔۔

”یہ میرے اصولوں کے مطابق ہے“۔

میں نے ان باتوں پر اس کی کوئی حوصلہ افزائی نہ کی۔ لیکن مجھے شک ہے کہ درحقیقت اسے مجھ سے اس بات کی توقع تھی۔ ”بہر حال، مجھے نہیں لگتا کہ میرا طرز زندگی اتنا دلچسپ ہے۔ میرا خیال ہے تم جاننا چاہتی ہو کہ یہ سب کیسے ہوا؟“ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہوں۔ ”اس لمحے میں پتھر ہو گیا تھا۔ اور مزید یہ کہ میں ایک تیراک بھی نہیں تھا، جہاں میں پلا بڑھا وہاں کوئی زیادہ سوئمنگ پولز بھی نہیں تھے، کیا تم یہ جاننا چاہتی ہو کہ میں بھی ڈوب مرتا؟“

میں نے اسے بتایا کہ درحقیقت میں اس پر حیران نہیں تھی۔ پھر وہ تیسرا شخص تھا جس سے میں نے پوچھا کہ اس کے خیال میں کیرو کے دماغ میں کیا چل رہا تھا۔ کانوسلر نے کہا تھا کہ ہم نہیں جان سکتے تھے کہ کیرو کیا چاہتی تھی۔ ”بالکل ایسے ہی جیسے اسے خود معلوم نہ تھا کہ وہ کیا چاہتی تھی۔۔۔ شاید توجہ؟۔۔۔ اس پریشانی پر جس میں وہ مبتلا تھی؟۔۔۔ مجھے نہیں لگتا کہ اس کا ڈوبنے کا ارادہ تھا۔“

روتھن کا خیال تھا کہ اس نے ایسا اس لیے کیا کہ ہماری ماں جو چاہے کر سکے، وہ بدل جائے اور ہمارے باپ کی طرف رجوع کر لے۔

نیل نے مجھ سے کہا ”کوئی بات نہیں۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ وہ پہلے سے بہتر پاؤں چلا سکتی ہے، شاید اسے معلوم نہ ہوا ہو کہ سردیوں کے کپڑے گیلے ہونے کے بعد کتنے وزنی ہو سکتے ہیں، یا یہ کہ وہاں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس کی مدد کر سکے۔ اپنا وقت ضائع مت کرو۔ تم یہ کیوں نہیں سوچتی کہ اگر تم جلدی کا مظاہرہ کر لیتی اور اس کے متعلق بتا بھی دیتی تو کیا ہو جاتا؟ کیا تم خود کو قصوروار ثابت کرنے کی کوشش نہیں کر رہی؟“

میں نے اسے کہا کہ میں اس کی بات سمجھ گئی ہوں ۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔

اس نے کہا ”بات خوش رہنے کی ہے، کچھ بھی ہو، بس اس کی کوشش کرو، تم ایسا کر سکتی ہو اور یہ آسان ہوتا جائے گا ۔ اس کا حالات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے ۔ تم یقین نہیں کرو گی کہ یہ سب کتنا عمدہ ہے ۔ جو ہے اسے قبول کرو ۔ دکھ مٹ جائے گا یا پھر لو دینے لگے گا۔ اور اب تم اس مقام پر ہو کہ وہ آسانی میں تمہارا ہم سفر ہے۔“

”اچھا خدا حافظ۔“

میں نے دیکھا کہ جو اس نے کہا وہ ٹھیک تھا۔ یہی وہ درست راستہ تھا جسے اپنانا چاہیے تھا۔ لیکن میرے خیالوں میں کیر واب تک بھاگ رہی ہے اور خود کو پانی کے حوالے کر رہی ہے ۔ اور میں اب تک وہیں جکڑی ہوئی ہوں۔ منتظر کہ وہ کچھ کہے۔ منتظر کہ کوئی چھینٹا اڑے ۔

☆☆☆☆

نجم الدّین احمد

ڈورِس لیسِنگ

(تعارف)

ڈورِس ے لیسِنگ برطانوی ناول نگار، شاعرہ، ڈراما نگار، منظوم ڈراما نگار، سوانح نگار، اور افسانہ نگار ہے ۔ وہ لندن میں رہائش پذیر ہے ۔ اُس کے اہم ترین ناولوں میں "The Grass is singing" (۱۹۵۰) پانچ ناولوں کا سلسلہ جس کے مجموعے کا نام "Children of Violence" ۱۹۵۲-۶۹ "The Golden Notebook" (۱۹۶۲ء) اور پانچ ناولوں کا ایک اَور مجموعہ "Canopus in Argos: Archives" (۱۹۷۹-۸۳) شامل ہیں ۔

۲۰۰۷ء میں لیسِنگ کو ادب کا نوبیل انعام دیا گیا ۔ سویڈش اکیڈمی نے انعام کے اعلان کے

وقت مؤقف اختیار کیا کہ: ”وہ نسوانی تجربے کی وہ رزمیہ نگار ہے جس نے ارتیاب، جوش اور قوتِ متخیلہ سے منقسم تہذیب کی پرکھ پڑچول کو موضوع بنایا ہے۔“ لیسنگ نوبیل انعام پانے والی گیارہویں خاتون اور عمر رسیدہ ترین ادیب ہے۔

۲۰۰۱ء میں لیسنگ کو برطانوی ادب کا ڈیوڈ کوہن پرائز فار لائف ٹائم اچیومنٹ دیا گیا۔ جب کہ ۲۰۰۸ء نے اُسے ”۱۹۴۵ء تا حال کے عظیم لکھاری“ کی فہرست میں پانچویں نمبر پر رکھا۔

لیسنگ برطانوی انگریز جوڑے کپتان الفریڈ ٹیلر اور ایملی موڈ ٹیلر کے ہاں ۲۲ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو فارس (اب ایران) میں پیدا ہوئیں۔ اُس کا والد جنگِ عظیم اوّل کے دوران خدمات سرانجام دیتے ہوئے اپنی ایک ٹانگ گنوا بیٹھا تھا اور اپنی ہونے والی بیوی سے، جو ایک نرس تھی، رائل فری ہسپتال میں اپنی ٹانگ گنوانے کے بعد صحت یابی کے دوران ملا۔ الفریڈ ٹیلر اپنی بیوی کے ہمراہ امپیریل بینک آف فارس میں کلرک کی ملازمت کے لیے کرمان شاہ (ایران) چلا گیا۔ ڈورس لیسنگ وہیں ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئی۔ جب اُس کے والد نے جنوبی رہوڈیشیا (اب زمبابوے) میں تقریباً ایک ہزار ایکڑ اراضی خریدی تو وہ ۱۹۲۵ء میں مکئی کی کھیتی باڑی اور دیگر فصلوں کی کاشت کے لیے وہاں چلے گئے۔ لیسنگ کی والدہ نے نامساعد حالات میں بھی ایڈورڈین (Edwardian) طرزِ حیات برقرار رکھنے کی کوشش کی جسے دولت مند ہونے کی صُورت میں برقرار رکھنا سہل ہوتا لیکن حقیقتاً ایسا طرزِ زندگی ناممکن تھا کیوں کہ کھیت معقول آمدنی دینے میں ناکام رہے تھے۔

لیسنگ نے پہلے کونوینٹ بورڈنگ سکول اور پھر سالسبری (اب ہرارے) کے لڑکیوں کے ایک سکول ڈومینی کین کونوینٹ ہائی سکول سے تعلیم حاصل کی جو ایک رومن کیتھولک کونوینٹ تھا۔ چودہ برس کی عمر میں اُس نے سکول چھوڑ کر اپنے طور پر تعلیم جاری رکھی۔ پندرہ برس کی عمر میں گھر چھوڑا اور دائی، ٹیلی فون آپریٹر، آفس ورکر، سٹینو گرافر اور صحافی کے طور پر کام کیا۔ سیاسیات اور سماجیات کا مطالعہ کیا اور اُسی دوران خود بھی لکھنے کا آغاز کر دیا۔ اُس زمانے میں اُس کے متعدد مختصر افسانے شائع ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں لیسنگ سالسبری چلی گئی اور ٹیلی فون آپریٹر کے طور پر کام کرنے لگی۔ جلد ہی اُس نے اپنے پہلے خاوند فرانک وزڈم سے شادی کر لی جس سے اُس کے ہاں دو بچے ہوئے: جان، بیٹا اور جین، بیٹی۔ یہ شادی ۱۹۴۳ء کو اپنے انجام پر پہنچ کر طلاق پر منتج ہوئی۔

طلاق کے بعد لیسنگ کی دلچسپی لیفٹ بک کلب کے معروف لوگوں میں بڑھ گئی، جس میں اُس نے ایک سال قبل ہی شمولیت اختیار کی تھی۔ یہ گروپ نسلی معاملات سے متعلق تھا۔ وہاں وہ اپنے ہونے والے دُوسرے شوہر گوٹ فرائڈ لیسنگ سے ملی جو ایک جرمن یہودی تارکِ وطن تھا۔ اُس گروپ میں

شمولیت کے فوراً بعد اُس نے ۱۹۴۵ء میں اُس سے شادی کرلی اور اُن کی ازدواجی زندگی کے خاتمے اور طلاق سے قبل اُن کے ہاں ایک بیٹا، پیٹر پیدا ہوا۔ اِن دو ناکام شادیوں کے بعد لیسنگ نے اب تک تیسرا بیاہ نہیں رچایا۔ ازاں بعد گوٹ فرائڈ لیسنگ یوگنڈا میں مشرقی جرمنی کا سفیر مقرر ہوا اور اِدی امین دادا {Idi Amin Dada) کے خلاف بغاوت کے دوران ۱۹۷۹ء میں قتل ہو گیا۔

جب لیسنگ نے بطور لکھاری اپنے کیریئر اور اشتراکی عقائد کے تعاقب میں لندن کا قصد کیا تو اُس نے اپنے دونوں بڑے بچّے اُن کے باپ کے پاس جنوبی افریقا میں چھوڑے۔ تاہم دُوسرے خاوند سے ہونے والا بیٹا اُس کے ہمراہ رہا۔ بعد میں اُس نے بتایا کہ اُس کا خیال تھا کہ اُس کی دُوسری راہِ انتخاب نہیں ہے۔ ''بہت عرصے تک مجھے محسوس ہوتا رہا کہ میں نے بہت جرأت مندانہ کام کیا ہے۔ ایک ذہین و فطین عورت کے لیے چھوٹے بچّوں کے ساتھ نامختتم وقت گزارنے سے زیادہ بیزار کن کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ مجھے احساس تھا کہ میں اُن کی پرورش کے لیے بہترین شخص نہیں ہوں۔ میں اپنے آپ کو شراب میں ڈبو کر ختم کر لیتی یا پھر اپنی ماں کی طرح اپنی ذہانت پریشانیوں کے حوالے کر دیتی۔''

نیوکلیائی اسلحے اور جنوبی افریقا کی نسلی تقسیم کے خلاف تحریک کے سبب ڈورس لیسنگ پر جنوبی افریقا اور رَہوڈیشیا کے دروازے کئی برسوں (۱۹۵۶ء تا ۱۹۹۵ء) کے لیے بند کر دیے گئے۔ ۱۹۴۹ء میں وہ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے ہمراہ لندن چلی گئی۔ اُس کا پہلا ناول The Grass is Singing ۱۹۵۰ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ اُس کا اہم ترین کام The Golden Notebook ۱۹۶۲ء میں لکھا گیا۔

۱۹۸۴ء میں لیسنگ نے جین سومرس کے فرضی نام سے دو ناول یہ دکھانے کے لیے لکھے کہ نئے لکھاریوں کو اپنی تصنیفات چھپوانے کے لیے کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیسنگ کے اپنے برطانوی ناشر نے اُن ناولوں کو مسترد کر دیا۔ تاہم بعد میں ایک اَور انگریز ناشر مائیکل جوزف اور ایک امریکی ناشر الفریڈ اے ناف {Alfred A Knopf) انھیں شائع کرنے پر رضامند ہو گئے۔ اِس طرح ''ایک اچھے پڑوسی کا روزنامچہ'' ۱۹۸۳ {The Diary of a Good Neighbour) میں اور ''اگر بُوڑھا کرسکتا'' ۱۹۸۴ء {If the Oldman Could) میں بہ یک وقت انگلستان اور امریکا سے اشاعت پذیر ہوئے۔ ۱۹۸۴ء ہی میں دونوں ناول ''ایک اچھے پڑوسی کا روزنامچہ'' اور ''اگر بُوڑھا کرسکتا'' دونوں ہی ممالک سے مکرر ایک جلد میں ایک ہی عنوان ''جین سومرس کے روزنامچے' {The Diaries of Jane Somers) شائع ہوئے لیکن اِس بار مصنف کے نام کی جگہ جین سومرس کی بجائے ڈورس لیسنگ درج تھا۔

۱۹۹۹ء کے آخر میں اُسے ''نمایاں قومی خدمات'' سرانجام دینے پر چیمپیئن آف آنرز قرار دیا گیا۔

رائل سوسائٹی فار لٹریچر نے بھی اُسے ادب کی چیمپیئن قرار دیا۔

۲۰۰۷ء میں جب اُسے ادب کے نوبیل انعام سے نوازا گیا تو اُس کی عمر ۸۷ برس تھی۔ اِس طرح وہ ادب کا نوبیل انعام پانے والی معمر ترین ادیب اور کسی بھی شعبے میں نوبیل انعام پانے والے معمر ترین ہستیوں میں تیسرے نمبر پر ہے۔ نوبیل انعام کی ۱۰۶ سالہ تاریخ میں وہ ادب کا نوبیل انعام حاصل کرنے والی گیارھویں خاتون ادیب ہے۔ جس وقت انعام کا اعلان ہوا وہ گھر سے کریانے کا سامان خریدنے نکلی ہوئی تھی۔ واپسی پر اپنے گھر کے گرد جمع رپورٹروں سے اُس نے کہا۔ ”اوہ، میرے خُدا! میں نے یورپ کے تمام اعزازات حاصل کیے ہیں۔ میرا اعزاز کو پا کر مجھے خوشی ہوتی رہی ہے۔ لیکن یہ ایک عظیم الشان مسرت ہے۔“ ”نوبیل انعام کا نہ جیتنا“ (On Not Winning the Nobel Prize) کے عنوان سے اپنے خطبے میں اُس نے بین الاقوامی ناانصافی کی طرف توجہ مبذول کروائی کہ سب کو یکساں مواقع میسر نہیں ہیں اور یہ کہ اب ادب اور کہانی کہنے کے اسلوب میں تبدیلی آ چکی ہے۔ بعد میں خطبے کی محدود کاپیاں شائع کر کے ایڈز کے مریض بچوں کے علاج کے لیے رقم جمع کی گئی۔ ۲۰۰۸ء میں بی بی سی کے فرنٹ رو نامی پروگرام کو انٹرویو دیتے ہوئے لیسنگ نے بتایا کہ اس کے اعزاز پانے کے بعد میڈیا کا مسلسل تعاقب اُسے لکھنے کے لیے وقت نہیں دے رہا۔

لیسنگ کے افسانوی ادب کو عام طور پر تین مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اولاً اشتراکی موضوعات (۱۹۴۴ء تا ۱۹۵۶ء)، اِس دوران اُس نے بنیادی طور پر سماجی مسائل کو موضوع بنایا (اس موضوع پر اُس کی واپسی دوبارہ ”اچھا دہشت گرد“ ۱۹۸۵ (The Good Terrorist) ء میں ہوئی)۔ ثانیاً نفسیاتی موضوعات (۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۹ء) اور ثالثاً صوفی اِزم، جس کا اظہار Canopus in Argos کے عنوان سے سائنس فکشن (جسے وہ ”سپیس فکشن“ کا نام دیتی ہے) کے ناولوں اور ناولچوں میں ہوتا ہے۔

اگرچہ لیسنگ کا کینوپس (Canopus) سلسلہ اہم ادبی نقادوں کے ہاں پذیرائی حاصل نہیں کر سکا لیکن لیسنگ سے اس کی بہترین کتاب کے بارے میں دریافت کیا گیا تو اُس نے کینوپس سلسلے کا انتخاب کیا۔ یہ ناول ایک ایسے آفاقی معاشرے کو پیش کرتے ہیں جو بشمول زمین دیگر دُنیاؤں کے اِرتقا کے لیے کوششیں کرتا ہے۔ صوفیانہ خیالات کے، جن سے لیسنگ ساٹھ کی دہائی کے وسط میں ”ایک اچھے دوست اور اُستاد“ اِدریس شاہ کے ذریعے متعارف ہوئی تھی، استعمال والے ناولوں کی سیریز میں بیسویں صدی کے ابتدائی رجحانات سے استفادہ کرتی ہے۔ لیسنگ کو صوفی اِزم کی طرف رغبت اِس ادراک کی بنا پر ہوئی کہ مارکسزم نے روحانی معاملات کو نظر انداز کیا ہے۔

لیسنگ کے ناول The Golden Notebook کو کچھ دانش وروں نے نسوانی کلاسیکی

ناول کا درجہ دیا ہے لیکن یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مصنف خود ایسا نہیں سمجھتی۔ اُس نے بعد میں اِس کے بارے میں لکھا کہ اِس میں ذہنی توڑ پھوڑ بطورِ صحت یابی اور ابہامات سے آزادی کے موضوع کو نقادوں نے نظر انداز کیا ہے۔ اُس نے اِس پر بھی اظہارِ افسوس کیا کہ ناول کی استثنائی ساخت کو بھی نقاد تحسین دینے میں ناکام رہے ہیں۔ لیسنگ کو محض عورتوں کی مخصوص مصنف ہونے کا لقب ناپسند ہے۔

ڈورس لیسنگ کی تحریروں کی طرح اُسے ملنے والے اعزازات کی بھی ایک طویل فہرست ہے۔ جن میں سے چند ایک اہم تحریروں اور اعزازات کی تفصیل باب کی شروع میں دی جا چکی ہے۔

۷ دسمبر ۲۰۰۷ء کو نوبیل انعام وصول کرتے ہوئے اپنے نوبیل خطبے ''نوبیل انعام کا نہ جیتنا'' میں ادب اور ادیب کے بارے میں اُس کا کہنا تھا: ''میری پرورش سردوؤں سے بنی گارے کی ایک جھونپڑی میں ہوئی۔ اِس قسم کے گھر ہمیشہ ہر اُس جگہ تعمیر ہوتے ہیں جہاں نرسل اور گھاس ہو، گارا ہو اور دیواروں کے لیے تنے ہوں... جس گھر میں میری پرورش ہوئی اُس میں ساتھ ساتھ چار کمرے تھے اور وہ گھر کتابوں سے بھرا ہوا تھا... وہ کتابیں میری نوجوانی کی مسرت تھیں... لکھتیں اور لکھاری بے کتاب گھروں سے نہیں نکلتے... لکھنے کے لیے، ادب کی تخلیق کے لیے لائبریریوں، کتب اور روایات سے جڑا ہونا ضروری ہے... تمام لکھاریوں کو پڑھنے کی دشوار راہ سے گزرنا اور لکھاری بننے کے لیے تنہائی سہنا پڑتی ہے... اِن مشکلات سے گزر کر ہی لکھاری بنتے ہیں... اُن لوگوں کے آباواجداد یقیناً قصّہ گو رہے ہوں گے۔ سینہ بہ سینہ چلنے والی کہانیاں ایک دو نسلوں کے بعد چھپنے لگیں، کتب تخلیق ہونے لگیں۔ کتنی بڑی کامیابی ہے!... یہاں میں اُن کتابوں کی بات کر رہی ہوں جو کبھی نہیں لکھی گئیں، لکھاری اُنھیں کبھی نہیں لکھ پائے کیوں کہ ناشر نہیں ہیں۔ ناشنیدہ آوازیں۔ اِن عظیم صلاحیتوں اور جوہر کے زیاں کا اندازہ ممکن نہیں۔ کتاب کی تخلیق ناشر مانگتی ہے، حوصلہ افزائی مانگتی ہے جس کی کمی ہے۔ لکھاریوں سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ وہ کیسے لکھتے ہیں؟ کمپیوٹر پر؟ برقی ٹائپ رائٹر پر؟ پَر سے بنے قلم سے؟ ہاتھ سے؟ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ ''آپ نے وہ جگہ، وہ خالی (تنہا) جگہ کیسے پائی جو لکھتے ہوئے آپ کے اردگرد موجود تھی؟'' اُس جگہ، جو سمع کی ایک صُورت ہے، الفاظ آئیں گے، آپ کے کردار بولیں گے، خیالات آئیں گے، تحریکات ہوں گی۔ اگر لکھاری کو ایسی جگہ دستیاب نہیں ہوتی تو شعر اور کہانیاں بے جنم رہیں گی... ماضی میں مصریوں، یونانیوں، رومیوں کی طرف جائیں تو ہمارے پاس ادب کا ایک خزانہ ہے۔ ادب کے اُس خزانے تک رسائی پانے والا ہر خوش قسمت اُسے بار بار دریافت کرتا رہے گا۔ خزانہ، فرض کیجیے کہ اُس کا وجود نہیں ہے تو ہم کس قدر مفلس اور کھوکھلے ہو جائیں گے۔ ہمارے پاس ماضی کے اُن قصّہ گوؤں کی کہانیوں اور قصّوں کا ورثہ ہے جن میں سے کچھ کے نام ہم جانتے ہیں اور کچھ کے نہیں۔ قصّہ گو پیچھے اور پیچھے، جنگل کے درمیان ایک صاف جگہ پر جاتے جہاں الاؤ روشن ہوتا اور قدیمی

شمن* رقص ہو رہا ہوتا اور گیت گائے جا رہے ہوتے۔ ہماری وراثت اُسی الاؤ، طلسم اور رُوحوں کی دُنیا سے شروع ہوئی اور یہ آج بھی وہیں موجود ہے۔ کسی بھی جدید کہانی کار سے پُوچھ لیجیے، وہ یہی کہے گا کہ ایک ایسا لمحہ آتا ہے جب اُسے آگ چُھوتی ہے، جسے ہم الہام (یا تخلیقی تحریک ۔مترجم) کہنا پسند کرتے ہیں، اور یہ چیز پیچھے اور پیچھے ہماری نسل کے آغاز تک، اُن تیز ہَواؤں تک جاتی ہے جنھوں نے ہمیں اور ہماری دنیا کو متشکل کیا تھا۔ قِصّہ گو ہم سب کے اندر بہت گہرائی میں موجود ہے۔ کہانی کار ہمیشہ ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔ آیئے فرض کرتے ہیں کہ ہماری دنیا جنگ اور ان تمام خطروں کے سبب تباہ و برباد ہو جاتی ہے جن کا ہم سب بہ آسانی ادراک کر سکتے ہیں۔ فرض کریں کہ سیلاب ہمارے شہروں کو کرۂ ارض سے مٹا ڈالیں، سمندروں کی سطح بلند ہو جائے۔ لیکن قِصّہ گو موجود رہے گا کیوں کہ ہمارا تخیّل ہی جو ہمیں سرا اچھائی اور برائی کے لیے شکل و صُورت عنایت اور ہماری تخلیق کرتا ہے۔ جب ہم ٹُوٹ پُھوٹ کا شکار اور دُکھی حتّٰی کہ ختم ہو جائیں گے تو یہ کہانیاں ہی ہوں گی جو ہمیں تخلیق کریں گی۔ یہ کہانی کار ہی، خواب بُننے والا ہی، اسطورہ بنانے والا ہی تو ہمارا قُقنُس (Phoenix) ہے جو ہمیں بہترین طور پر پیش کرتا ہے اور ہمارا سب سے زیادہ تخلیق کار ہے۔"

☆☆☆☆

---

shaman*: شمال مشرقی ایشیا اور یورپ کا ایک قدیم مذہب جس کا عقیدہ تھا کہ دیوتاؤں، شیطانوں، بزرگوں کی رُوحوں کے نسلِ انسانی کے لیے تمام اچھے برے فیصلوں کا اطلاق صرف اور صرف اس مذہب کے مذہبی رہنماؤں کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس مذہب کے مذہبی رہنماؤں کو بھی شمن کہا جاتا تھا جو جادو ٹونا بھی جانتے تھے۔

ڈورس لیسنگ

برطانوی ادب سے ترجمہ: نجم الدین احمد

سُرنگ سَری

تعطیلات کی پہلی صبح ساحل کی طرف جاتے ہوئے نوجوان انگریز لڑکے نے راستے کے موڑ پر ٹھہر کر پہلے وحشی اور پتھریلی کھاڑی کی سمت دیکھا اور پھر پُرہجوم ساحل کی طرف، جس سے وہ گزشتہ سالوں سے

خوب واقف تھا۔ اُس کی ماں اپنے ایک ہاتھ میں چمکیلی تمبوں والا ایک بیگ تھامے اس کے آگے چل رہی تھی۔ ڈھیلے انداز میں جھولتا ہوا اُس کا دُوسرا بازو دھوپ میں خوب سپید دکھائی دے رہا تھا۔ لڑکے نے اس سفید عریاں بازو کو دیکھا اور اپنی خفا نگاہیں پہلے کھاڑی کی طرف پھیریں اور پھر دوبارہ ماں کی طرف۔ جب اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کے ساتھ نہیں تو وہ گھومی۔ "اوہ جیری! تم وہاں ہو۔" وہ بولی۔ وہ ناراض دِکھائی دے رہی تھی، پھر وہ مُسکرائی۔ "کیوں پیارے، تم میرے ساتھ نہیں آ رہے؟" کیا تم...؟" اس نے تیوریاں چڑھائیں۔ وہ اُس کی اِن تفریحات پر پریشان ہو رہی تھی جنھیں وہ اپنے اندر پال رہا تھا لیکن وہ اپنی مصروفیات یا احاطۂ ادراک میں نہ آنے کے سبب اُن کی طرف سے بے نیاز تھی۔ وہ اُس مشوش اور معذرت خواہانہ مُسکراہٹ سے آشنا تھا۔ شرمندگی نے اُسے ماں کے پیچھے دوڑنے پر مجبور کر دیا۔ دوڑتے ہوئے اُس نے سر گھما کر جنگلی گھاس کو دیکھا اور محفوظ ساحل پر کھیلتے ہوئے وہ دن بھر اُس کے بارے میں سوچتا رہا۔

اگلے روز حسبِ معمول پیراکی اور غسلِ آفتابی کرنے کے بعد اُس کی ماں نے کہا۔ "جیری، کیا تم روز روز اِس ساحل پر آ کر اکتا گئے ہو؟ تم کہیں اَور جانا چاہو گے؟"

"اوہ، نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ اُس نے شرمندگی کا نا آشنا احساس لیے ہوئے اُس کی طرف دیکھا... دلیری جیسا ایک احساس۔ لیکن اُس کے ہمراہ چلتے ہوئے وہ بے اختیار بول اُٹھا۔ "میں اُن چٹانوں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اُس نے اُس کی بات پر توجہ دی۔ وہ ایک ویران جگہ تھی اور وہاں کوئی دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا لیکن اُس نے کہا۔ "بے شک جیری۔ تمھارے پاس جب بھی وقت ہو اس وسیع ساحل پر یا اگر چاہو تو سیدھے بنگلے پر چلے جایا کرو۔" وہ چلنے لگی تو اُس کا عریاں بازو، جو گزشتہ روز کی دھوپ کے باعث ہلکا سا سرخ پڑا ہوا تھا، جھولنے لگا۔ اُسے اس کا تنہا جانا ناقابلِ برداشت لگا اور وہ بمشکل اس کے پیچھے دوڑا لیکن اس تک نہیں پہنچ پایا۔

وہ سوچ رہی تھی: اب وہ اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ میرے بغیر بھی محفوظ رہ سکے۔ کیا میں اُسے بہت قریب رکھ رہی ہوں؟ اُسے یہ احساس نہیں ہونا چاہیے کہ اُسے میرے ہی ساتھ رہنا چاہیے۔ مجھے احتیاط کرنا ہو گی۔ وہ گیارہ سالہ اکلوتا بچّہ تھا۔ وہ بیوہ تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ نہ خواہ مخواہ کی حد سے زیادہ الفت دکھائے اور نہ لاپروائی۔ وہ پریشانی جھٹکتی ہوئی اپنے ساحل کی طرف چلی گئی۔

جیری نے جب دیکھا کہ اُس کی ماں اپنے ساحل پر پہنچ گئی ہے تو اُس نے کھاڑی کی ڈھلوانی اترائی اُترنا شروع کر دی۔ وہ جس جگہ تھا وہاں پیالہ نُما اونچی اونچی سرخی مائل بھوری چٹانیں تھیں جن کے سروں پر سفیدی لیے نیلگوں سبز بہاؤ تھا۔ وہ نیچے اترا تو اُس نے دیکھا کہ وہاں پانی سے بھری سخت اور نوکیلی چٹانوں کی نالیاں بنی تھیں جن میں تازہ ور اُچھلتے ہوئے پانی کی سطح پر جامنی اور گہرے نیلے دھبے پڑے تھے۔ آخر میں اُسے چند گز اَور نیچے رگڑ کھاتے اور پھسلتے ہوئے سفید جھاگ کا ایک سرا اَور سفید ریت پر پانی کی ہلکی اور چمک دار حرکت دکھائی دی جس سے پرے پانی جامد اور گہرا نیلا تھا۔

وہ دوڑتا ہوا سیدھا پانی میں گیا اور تیرنے لگا۔ وہ ایک اچھا پیراک تھا۔ وہ تیزی سے چمکتی ہوئی ریت کی طرف اور وسطی حصّے میں گیا جہاں چٹانیں سطحِ آب کے تلے بد رنگ عفریتوں کی مانند پڑی تھیں اور پھر وہ اصل سمندر میں پہنچ گیا... گرم سمندر جس کی گہرائی سے آنے والی ناہموار لہروں نے اس کی ٹانگیں شل کر دیں۔

جب وہ بہت دُور نکل گیا تو اپنے عقب میں نہ صرف ایک چھوٹی سی کھاڑی بلکہ اپنے اور وسیع ساحل کے بیچ چٹان کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ سطح پر تیرنے لگا اور اپنی ماں کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ وہ وہاں ایک چھتری کے نیچے ایک چھوٹے سے زرد ڈھیر کی مانند موجود تھی جو سنگترے کے چھلکے جیسا دکھائی دے رہا تھا۔ اُسے وہاں پا کر وہ مطمئن ہو کے واپس ساحل کی طرف تیرنے لگا۔ لیکن وہ بالکل تنہا تھی۔

کھاڑی کے ایک طرف زمین کے چھوٹے سے مسطح حصّے سے پرے چٹانیں بکھری ہوئی تھیں جن پر لڑکے اپنے لباس اتار کر رکھ رہے تھے۔ وہ الف ننگے دوڑتے ہوئے چٹانوں سے اترے۔ انگریز لڑکا تیرتا ہوا اُن کی طرف گیا لیکن اس نے خود کو ان سے قدرے فاصلے پر رکھا۔ وہ اسی ساحلی علاقے کے تھے۔ اُن سب کے رنگ یکساں گہرے بھورے تھے اور وہ ناقابل فہم زبان بول رہے تھے۔ اُس کے اندر شدّید خواہش ابھری کہ وہ بھی اُن کے ساتھ، اُن میں سے ہوتا۔ وہ تیر کر تھوڑا سا قریب ہوا تو اُنھوں نے مڑ کر اُسے آنکھیں سکیڑتے ہوئے چوکنّا نظروں سے دیکھا۔ پھر اُن میں سے ایک نے مُسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ اتنا بھی بہت تھا۔ اگلے ہی منٹ وہ تیر کے اُن کے پاس ایک قریبی چٹان پر پہنچ گیا اور مایوسی سے ہیجان بھرے انداز میں مُسکرایا۔ اُنھوں نے اُسے بخوشی خوش آمدید کہا اور پھر جیسے ہی اُس کے اَوسان بحال ہوئے وہ ناقابل فہم انداز میں مُسکرایا جس سے وہ سمجھ گئے کہ وہ اپنے ساحل سے بچھڑا ہوا اجنبی ہے اور انھوں نے اس

سے اپنی توجہ ہٹالی۔ لیکن وہ پھر بھی خوش تھا کہ وہ اُن کے ہمراہ ہے۔

اُنھوں نے ایک بلند مقام سے کھردری اور نوکیلی چٹانوں کے بیچ بار بار پہلے سمندر کے کنویں میں چھلانگیں لگائیں۔ غوطہ لگا کر وہ اُبھرتے، اِدھر اُدھر تیرتے اور دوبارہ چھلانگ لگانے کے لیے اوپر ٹھیر کر اپنی باری کا انتظار کرتے اور دوبارہ غوطہ لگاتے۔ وہ بڑے لڑکے تھے... جیری کے لیے مرد کے برابر۔ اُس نے چھلانگ لگائی تو وہ اُسے دیکھتے رہے اور جب وہ اپنی جگہ پانے کے لیے اِدھر اُدھر تیرا تو انھوں نے اُسے جگہ دی۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُسے قبول کرلیا گیا ہے۔ اُس نے اپنے آپ پر فخر کرتے ہوئے احتیاط سے دوبارہ غوطہ لگایا۔

کچھ ہی دیر بعد سب سے بڑا لڑکا تن کر کھڑا ہوا، پانی میں چھلانگ لگائی اور پھر وہ واپس نہیں اُبھرا۔ دُوسرے لڑکے کھڑے دیکھتے رہے۔ جیری چمک دار بھورے سر کے نمودار ہونے کا انتظار کرنے کے بعد تنبیہی انداز میں پکارا۔ انھوں نے کاہلی سے اُس کی جانب دیکھا اور پھر اپنی نظریں پانی کی طرف پھیر لیں۔ کافی دیر کے بعد لڑکا اپنے پھیپھڑوں میں بھری ہَوا گہری سانسوں میں خارج کرتا اور فاتحانہ انداز میں چیختا ہوا ایک بڑی سیاہ چٹان کی دُوسری سمت سے اُبھرا۔ فوراً ہی اُن میں سے ایک اور کُود گیا۔ ایک لمحے کے لیے فضا لڑکوں کی کلکاریوں سے بھری لگتی تو اگلے ہی لمحے فضا اور سطح آب خالی ہوتی۔ تاہم کثیف نیلے پانی میں گہرے رنگ کی شکلیں حرکت کرتی اور چلتی دکھائی دیتیں۔

جیری کُودا، پانی کی تہہ میں پیرا کی کرنے والوں کے غول کے قریب سے گزرا، ایک بہت بڑی سیاہ دیوار کو اپنے سامنے دیکھا، اُس نے اُسے چھوا اور فوراً ہی اُوپر کی طرف اُٹھ گیا جہاں وہ دیوار کے پار ایک کم بلند رُکاوٹ دیکھ سکتا تھا۔ اُسے اپنے نیچے کوئی نہیں دکھائی دیا۔ تہہ میں پیراکی کرنے والوں کی مدہم شبیہیں غائب ہو چکی تھیں۔ پھر ایک ایک کر کے لڑکے چٹان کے دُور کے حصّے پر اُبھرے تو وہ سمجھ گیا کہ وہ دیوار میں موجود خلا یا کسی سوراخ سے گزر کر گئے ہیں۔ اُس نے دوبارہ ڈُبکی لگائی لیکن وہ آنکھوں میں چبھنے والے نمکین پانی میں سپاٹ دیوار کے سوا کچھ نہیں دیکھ پایا۔ جب وہ سطحِ آب پر آیا تو تمام لڑکے کُودنے والی چٹان پر موجود دوبارہ پھر وہی کارنامہ سرانجام دینے کی تیاری میں تھے۔ اب وہ ناکامی کا دُکھ لیے انگریزی میں پکار اُٹھا: ”مجھے دیکھو، دیکھو!“ اور ایک احمق کُتّے کی مانند پانی اُچھالنے اور پاؤں مارنے لگا۔

اُنھوں نے ناراضی سے ماتھے پر بَل ڈال کے نیچے دیکھا۔ وہ چڑھی ہوئی تیوریاں پہچانتا تھا۔

ناکامی کے لمحات میں جب اُس کی احمقانہ حرکت اُس کی ماں کی توجہ کا باعث بنتی تو وہ اُسے ایسی ہی ناراضی اور پریشان کر ڈالنے والے استفہام سے نوازتی تھی۔ اپنی بے حد خجالت اور چہرے پر کلنک کے داغ کی طرح چپکی کھسیانی ہنسی لیے، جسے وہ مٹانے سے قاصر تھا، اُس نے سر اُٹھا کر چٹان پر کھڑے بھورے لڑکوں کے گروہ کو دیکھا اور اُنگلیاں اپنے کانوں کے اردگرد گھماتے ہوئے چلّایا: ''ہیلو : شکریہ۔ خدا حافظ۔ جناب، جناب!''

اُس کے مُنہ میں پانی بھر گیا، وہ کھانسا، ڈُوبا اور پھر اُبھر آیا۔ چٹان جو پہلے لڑکوں کے وزن سے دبی محسوس ہو رہی تھی لگتا تھا جیسے اب اُن کا وزن ہٹ جانے سے پانی سے اُوپر اُٹھ آئی ہو۔ اب وہ اُس کے نزدیک سے اُڑتے ہوئے پانی میں کُود رہے تھے اور فضا اُن کے گرتے ہوئے بدنوں سے بھری ہوئی تھی۔ پھر تپتی دُھوپ میں چٹان خالی رہ گئی۔ وہ شمار کرنے لگا: ایک، دو، تین...

پچاس تک پہنچتے پہنچتے وہ دہشت زدہ ہو گیا۔ وہ تمام کے تمام نیچے پانی میں بنے غاروں میں ڈُوب رہے ہوں گے! سو اوپر پہنچ کر اُس نے قرب و جوار کی خالی پہاڑیوں کو تکنا شروع کر دیا اور کسی کو مدد کے لیے پکارنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ تیز تیز گننے لگا کہ وہ جلد کریں یا سطح پر تیزی سے آ جائیں یا پھر جلد ڈُوب جائیں... صبح کے خالی پن میں شمار کرنے سے زیادہ جو خوفناک واقعہ ظہور پذیر ہونا ہے ہو جائے۔ پھر یک صد ساٹھ پر پہنچ کر چٹان کے دُوسری سمت پانی بھوری وہیل مچھلیوں جیسے لڑکوں سے بھر گیا۔ وہ اُس کی طرف دیکھے بغیر ساحل کی طرف تیرنے لگے۔

اپنے چڈّوں میں خارش بھری گرمی محسوس کرتے ہوئے وہ واپس چھلانگ لگانے والی چٹان پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ لڑکے اپنے اپنے کپڑے اُٹھا کر ساحل کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے دُوسری خلیج کی طرف جانے لگے۔ وہ اُس سے جان چھڑا رہے تھے۔ وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بے اختیار رَو پڑا۔ وہاں اُسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا اور وہ اکیلا روتا رہا۔

اُسے لگا کہ خاصا وقت بیت گیا ہے اور وہ اُس طرف تیرنے لگا جہاں سے وہ اپنی ماں کو دیکھ سکتا تھا۔ ہاں، وہ اب بھی وہاں موجود تھی، ایک سنگتری چھتری تلے ایک پیلا ڈھیر۔ وہ بڑی چٹان کی طرف تیرا، اُوپر چڑھا اور نیلے پانی میں ترنگی اور خطرناک گول چٹان کے بیچ کُود گیا۔ وہ اِتنا نیچے اُترا کہ اُس نے دوبارہ چٹان دیوار کو چھو لیا۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں بھرا ہوا نمک اِس قدر تکلیف دہ تھا کہ وہ دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

وہ سطح پر آیا، ساحل کی سمت تیرا اور بنگلے پر جا کر اپنی ماں کا انتظار کرنے لگا۔ جلد ہی وہ پٹیوں والا بیگ جھلاتی، اپنا گلابی اور عریاں بازو ایک طرف ہلاتی ڈھیرے ڈھیرے چلتی ہوئی آئی۔ ”مجھے پیرا کی والا چشمہ چاہیے۔“ اُس نے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے ضد بھرے انداز میں فرمائش کی۔

اُس نے سرسری انداز میں بولتے ہوئے اُس کی طرف پُرسکون اور استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

”خوب، ضرور پیارے۔“ ”لیکن ابھی! ابھی! ابھی!“ وہ کسی اَور وقت نہیں بلکہ... فوراً ہی، اُسی لمحے چشمہ لینا چاہتا تھا۔ اُس نے تب تک اصرار جاری رکھا جب تک کہ وہ اُس کے ساتھ چشمہ خریدنے چل نہیں دی۔ اُس نے جیسے ہی چشمہ خریدا، اُس نے اُسے جھپٹا مار کر اُس کے ہاتھ سے یوں چھینا جیسے وہ اُسے خود اپنے لیے رکھنا چاہ رہی ہو اور خلیج کو جانے والے ڈھلوانی راستے پر بھاگتا چلا گیا۔

جیری بڑی رکاوٹی چٹان کے گرد تیرنے لگا۔ اُس نے چشمہ درست کیا اور غوطہ لگایا۔ پانی کے دباؤ نے ربڑ کے خلا کو توڑ دیا جس سے چشمہ ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اُسے سطح آب سے نیچے چٹان کی جڑ تک تیرنا ہوگا۔ اُس نے سختی اور مضبوطی سے چشمہ کو کس کر اپنے پھیپھڑوں میں ہَوا بھری اور مُنھ نیچے پانی کی جانب کیا۔ اب وہ دیکھ سکتا تھا۔ اُسے لگا جیسے اُس کی آنکھیں اَور طرح کی ہو گئی ہیں... مچھلی جیسی جو اُسے ہر شے واضح، لطیف اور روشن پانی کی لہریں دکھا رہی تھیں۔

اُس کے چھے سات فٹ نیچے چمک دار سفید ریت کا ایک مکمل صاف ستھرا فرش تھا جس سے مضبوط بلبلے اور سخت لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ وہاں لکڑی کی اور لمبی گول گیلیوں یا سلیٹ کی مانند دو سرمئی چیزیں سر اُٹھائے کھڑی تھیں۔ وہ مچھلیاں تھیں۔ اُس نے دیکھا کہ وہ ایک دُوسرے کے مُنھ سے مُنھ جوڑے بے حس وحرکت سیدھی کھڑی ہیں۔ پھر اُنھوں نے اچانک آگے کی سمت حرکت کی اور اپنے رُخ بدلے اور پھر دوبارہ گھومیں۔ وہ ایک طرح کا رقصِ آب تھا۔ اُن سے چند انچ اوپر پانی یوں جگمگا رہا تھا جیسے اُس میں ستارے گر رہے ہوں۔ پھر مچھلیاں... ننھی ننھی مچھلیوں کی نوع بہ نوع قسمیں، محض ناخن جتنی بڑی... پانی میں لہروں پر تیر رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے اُسے ان کے بے شمار ٹھنڈے ٹھنڈے لمس اپنی ٹانگوں اور بازوؤں پر محسوس ہوئے۔ اُسے لگا جیسے وہ چاندی کے مہین ٹکڑوں میں تیر رہا ہو۔ عظیم الجثہ چٹان جس میں سے بڑے لڑکے تیر کے پار جاتے تھے، سفید ریت پر تن کر کھڑی تھی اور اس پر ہلکی ہلکی آبی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ وہ اُس کی جڑ تک گیا لیکن اُسے اس میں کوئی خلا نظر نہیں آیا۔

وہ بار بار اُوپر جاتا، اپنے سینے میں ہَوا بھرتا اور پانی میں اُترتا رہا۔ بار بار اُس نے چٹان کی سطح کو اپنے ہاتھوں سے چھو کر اُس کا لمس محسوس کیا اور اُس میں داخلے کی جگہ کی تلاش میں مایوسانہ انداز میں اُس سے تقریباً لپٹ گیا۔ پھر ایک مرتبہ جب وہ سیاہ دیوار سے چمٹا ہوا تھا تو اُس کے گھٹنے Carneup، اُس نے اپنے پیروں کو آگے کی طرف دھکیلا تو راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں آئی۔ اُسے سوراخ مل گیا تھا۔

وہ سطح تک پہنچا اور راستے کی رکاوٹ چٹان کے اردگرد پھیلے پتھروں کو اپنے ہاتھوں اور پیروں سے ہٹایا یہاں تک کہ اُسے ایک بڑی کھوہ مل گئی۔ اُس نے اپنے آپ کو بازوؤں کے بل چٹان کے ساتھ گرا دیا۔ وہ وزنی ہو کر سیدھا رتیلے فرش پر گرا۔ اُس نے مضبوطی سے پتھر سے چمٹ کر اُس اندھیرے مقام میں دیکھا جہاں اُس کے پاؤں داخل ہوئے تھے۔ وہ سوراخ میں دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک ناہموار اور اندھیرا خلا تھا جس میں دُور تک نظر نہیں آتا تھا۔ اُس نے چٹان سے ہٹا کر اپنے ہاتھ کھوہ کے کناروں پر رکھے اور خود کو دھکیل کر اُس میں داخل ہونے کی کوشش کی۔

اُس کا سر اندر داخل ہو گیا لیکن کندھے پھنس گئے جنھیں اُس نے ایک طرف گھمایا تو وہ کمر تک کھوہ کے اندر چلا گیا۔ اُسے آگے کچھ دکھائی نہیں پڑ رہا تھا۔ کوئی نرم اور لجلجی شے اُس کے مُنھ سے ٹکرائی۔ اُس نے دیکھا کہ وہ سرمئی چٹان کے ساتھ ساتھ گہری کائی حرکت کر رہی تھی۔ اُس کے اندر خوف بھر گیا۔ اُسے ہزار پا اور چمٹ جانے والی آبی گھاس کا خیال آیا۔ اُس نے اپنے آپ کو پیچھے باہر کی طرف دھکیلا اور پیچھے ہٹتے ہوئے سرنگ کے منھ میں پتلی اور لمبی آبی گھاس کو بہتے دیکھا۔ اُس نے اپنے نیچے پانی کے نیلے کنویں پر نظر ڈالی۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ اپنا راستہ اسی غار یا کھوہ یا سرنگ میں ڈھونڈ کر پار جا سکے گا۔

اُس نے سوچا کہ سب سے پہلے اُسے سانس پر قابو پانا ہوگا۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک اَور بڑا پتھر تھام کر پانی میں اتر گیا تا کہ وہ بلا تگ و دو سمندر کی تہ میں پڑا رہ سکے۔ اُس نے شمار کیا: ایک، دو، تین۔ وہ مسلسل گنتی کرتا گیا۔ وہ اپنے سینے میں خون کی روانی کی آواز سن سکتا تھا۔ اکیاون، باون... اُس کا سینہ دُکھنے لگا تھا۔ اُس نے پتھر کو چھوڑا اور اُوپر فضا میں آ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ سُورج نیچے آ گیا ہے۔ وہ کوٹھی کی طرف بھاگا اور ماں کو کھانا کھاتے پایا۔ اُس نے صرف اتنا کہا۔ ”تم نے لطف اٹھایا؟“ اور اُس نے جواب دیا۔ ”جی۔“

شب بھر لڑکا چٹان میں پانی سے بھری غار کے خواب دیکھتا رہا اور جیسے ہی ناشتہ ختم ہوا وہ ساحل پر چلا گیا۔ اُس رات اُس کی ناک سے بری طرح خون بہہ نکلا۔ وہ سانس پر قابو پانے کے لیے گھنٹوں زیر آب

رہا تھا اور اب اُسے کمزوری اور چکّر محسوس ہو رہے تھے۔ اس کی ماں نے کہا۔ ’’اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو کبھی کسی کام میں زیادتی نہ کرتی۔‘‘

اس روز اور اس سے اگلے روز جیری پھیپھڑوں کی مشق کرتا رہا جیسے ہر شے، اس کی تمام زندگی اور اس کی زندگی موت اسی پر منحصر ہو۔ اس شب پھر اس کی ناک سے خون بہنے لگا تو اس کی ماں نے ہدایت کی اگلے روز وہ اس کے ساتھ رہے گا۔ یہ چیز اُس کے لیے نہایت اذیّت ناک تھی۔ اِس کا مطلب اُس کی محتاط خودتربیتی کے ایک دن کے زیاں کے مترادف تھا لیکن وہ اس روز اس دُوسرے ساحل پر اپنی ماں کے ہمراہ رہا جو اب اُسے چھوٹے بچوں کا ساحل لگتا تھا جہاں اُس کی ماں بحفاظت لیٹی دھوپ سینک سکتی تھی۔ اگلے روز اس نے اپنے ساحل پر جانے کے لیے اجازت طلب نہیں کی۔ اِس سے قبل کہ اس کی ماں معاملے کی نزاکت کو سمجھتی وہ وہاں سے چلا گیا۔ اُسے ادراک ہُوا کہ ایک دن کے آرام سے اُس کے شمار میں دس تک کا اضافہ ہو گیا ہے۔ بڑے لڑکوں نے وہ فاصلہ اُس کے ایک سو ساٹھ تک گننے کے دوران عبور کیا تھا۔ وہ اپنے خوف کے باعث تیزی سے گن رہا تھا۔ غالباً اب اگر وہ کوشش کرتا تو اس طویل سرنگ کو عبور کر سکتا تھا لیکن وہ ابھی یہ کوشش نہیں کرنا چاہتا تھا۔ احتیاط، طفلانہ اصرار اور بے صبری کے سرکش گھوڑے کو لگام نے اُسے انتظار کرنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ اِس دوران وہ زیرِ آب سفید ریت پر اپنے ہمراہ اوپر فضا سے لائے ہوئے پتھروں کو اِدھر اُدھر بکھیرتے ہوئے لیٹا سرنگ کے دہانے کا جائزہ لیتا رہا۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی اسے اس کی ہر نوک دار اور ہموار جگہ کے بارے میں علم ہو گیا۔ وہ ویسی ہی نوکیلی تھی جیسی اس کے کندھوں نے پہلے محسوس کی تھی۔

جب اس کی ماں پاس نہ ہوتی تو وہ گھڑیال کے پاس بیٹھ کر اپنے سانس پر قابو کے وقت کی پڑتال کرتا۔ اس کی کارکردگی غیر معمولی تھی کہ وہ بلا تکلیف دو منٹ تک سانس روک سکتا تھا۔ ’’دو منٹ‘‘ کے الفاظ کی تصدیق گھڑیال نے کی جس نے اس کے نزدیک انتہائی اہم مہم جوئی کو اس کے قریب کر دیا تھا۔

ایک صبح اس کی ماں نے سرسری انداز میں کہا کہ اگلے دو چار روز میں انھیں گھر جانا ہوگا۔ روانگی سے ایک روز قبل وہ یہ کام سرانجام دے گا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا کہ اسے یہ کام کرنا ہوگا خواہ یہ اس کی جان ہی کیوں نہ لے لے۔ لیکن روانہ ہونے سے دو دن پہلے...۔

فتح کا ایک دن آیا جب اس کی گنتی پندرہ زیادہ ہو گئی... اس کی ناک سے بے تحاشا خون بہا کہ

اُسے چکّر آنے لگے اور وہ مُردنی سے آبی گھاس کی طرح بڑی چٹان پر پڑا گاڑھے سرخ خون کو چٹان پر بہتا اور ڈھیرے ڈھیرے سمندر میں گرتا دیکھتا رہا۔ وہ خوف زدہ ہوگیا۔ اگر اُسے سرنگ میں چکّر آ گیا تو؟ اگر وہ وہاں مر گیا یا پھنس گیا تو؟ اگر... تیز دھوپ کی گرمی اس کے دماغ کو چڑھ گئی تو وہ تقریباً مر ہی جائے گا۔ اُس نے سوچا کہ وہ گھر جا کر بِک کر بیٹھ جائے اور اگلے موسم گرما میں جب وہ ایک سال اور بڑا ہوجائے گا تب شاید وہ سُرنگ عبور کر سکے۔

لیکن فیصلہ کر لینے کے بعد بھی، یا اس کے خیال میں اس نے فیصلہ کر لیا تھا، وہ وہیں چٹان پر بیٹھا پانی کو تکتا رہا۔ اُسے علم تھا کہ اب، اُس وقت جب اُس کی ناک سے خون بہنا بند ہوگیا ہے لیکن اُس کے سر میں اب بھی درد اور اُکھاڑ پچھاڑ ہے... اَب ہی وہ وقت ہے جب وہ کوشش کر سکتا ہے۔ اگر اس نے اب نہیں کیا تو کبھی نہیں کر سکے گا۔ وہ خوف سے کپکپا رہا تھا کہ وہ نہیں جائے گا اور پانی میں چٹان تلے اس سرنگ کی طوالت کی دہشت سے کانپ رہا تھا۔ پانی سے باہر دھوپ میں بھی وہ رُکاوٹی چٹان بہت چوڑی اور بہت بھاری دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے جہاں جانا تھا وہاں ٹنوں وزنی چٹان زمین میں دھنسی تھی۔ اگر وہ وہاں مر گیا تو وہ وہیں تب تک پڑا رہے گا... شاید اگلے سال تک... جب وہی لڑکے اُس میں تیریں گے اور راستہ بند پائیں گے۔

اُس نے اپنا چشمہ چڑھایا، اُسے مضبوط کیا اور خلا کا جائزہ لیا۔ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پھر اُس نے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے سب سے بڑے پتّھر کا انتخاب کیا اور چٹان کے کنارے سے سرک کر ٹھنڈے اور چاروں طرف پھیلے پانی میں آدھا اتر گیا۔ اُس کا آدھا بدن تپتے سورج میں تھا۔ اُس نے ایک بار خالی آسمان کو دیکھا، ایک بار، دو بار اپنے پھیپھڑوں میں ہَوا بھری اور پھر پتّھر کے ہمراہ تیزی سے تہہ میں جانے کے لیے پانی میں غوطہ لگا دیا۔ نیچے جاتے ہوئے اُس نے شمار کرنا شروع کر دیا۔ اُس نے کھوہ کے کناروں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر اپنے آپ کو اُس میں داخل کر دیا۔ کندھوں کو حشرات کی مانند اطراف میں ہلکی حرکت دیتے ہوئے، اُسے یاد آیا کہ اُسے یوں ہی حرکت دینا چاہیے تھی اور اپنے آپ کو پیر مارتے ہوئے آگے بڑھایا۔

جلد ہی وہ اندر شفاف مقام پر پہنچ گیا۔ وہ پتّھروں سے گھری ایک چھوٹی سی کھوہ میں تھا جو پیلگوں خاکستری پانی سے بھری تھی۔ پانی اُسے کھوہ کی چھت کی طرف دھکیل رہا تھا۔ چھت نوکیلی تھی اور اس

کی کمر دُکھنے لگی۔ اُس نے ہاتھوں کے ذریعے اپنے آپ کو کھینچا... تیز، تیز... اور اپنی ٹانگوں کو لیور کی طرح استعمال کرنے لگا۔ اُس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا تو تیز درد سے چکّر آ گیا۔ پچاس، اکیاون، باون... وہ اندھیرے میں تھا اور پانی چٹان کے وزن سے اُسے دبا رہا تھا۔ اکہتّر، بہتّر... اُس کے پھیپھڑوں میں کوئی کھنچاؤ نہیں تھا۔ اُسے لگا جیسے وہ ایک تیرتا ہُوا غبارہ ہو۔ اُس کا سینہ نہایت ہلکا پھلکا اور آرام دہ تھا لیکن اُس کے سر میں اب بھی اُچھل کُود ہو رہی تھی۔

وہ مسلسل تیکھی چھت سے دب رہا تھا جو پھسلواں اور نوکیلی معلوم ہو رہی تھی۔ اُسے ایک بار پھر ہزارپا کا خیال آیا اور سوچنے لگا کہ اگر سرنگ آبی گھاس سے بھر جائے تو وہ اُسے جکڑ لے گی۔ وہ خوف زدگی کے عالم میں بے قابو ہو کر آگے بڑھا اور سر جھکا کر تیرنے لگا۔ اُس کے ہاتھ پیر آزادانہ حرکت کر رہے تھے جیسے وہ کھلے پانی میں ہو۔ کھوہ کشادہ ہو گئی۔ اُس نے سوچا کہ اُسے تیزی سے تیرنا چاہیے اور وہ اپنے سر میں ہونے والے دھماکے سے ڈر گیا کہ اگر سرنگ تنگ ہو گئی تو...!

ایک سو، ایک سو ایک... پانی کا رنگ ہلکا پڑ گیا۔ اُس کے اندر فتح کا جوش بھر گیا۔ اُس نے کہا:
ایک سو پندرہ اور پھر بہت دیر بعد : ایک سو پندرہ۔ اُس کے اردگرد پانی ہیرے کی مانند صاف شفاف تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ اُس کے سر پر چٹان میں ایک شگاف ہے جس سے آتی دھوپ اندھیری چٹان کو روشن کر رہی ہے اور آگے ایک مچھلی اور اندھیرا ہے۔

وہ اپنے کام کے انجام کے قریب تھا۔ اُس نے اوپر شگاف کی سمت دیکھا جو پانی کی بجائے ہَوا سے بھرا ہوا لگ رہا تھا جس میں وہ اپنا منھ داخل کر کے سانس لے سکتا تھا۔ ایک سو پندرہ، اُس نے اپنے آپ کو اپنے ذہن میں کہتے سنا... لیکن یہ اُس نے بہت دیر بعد کہا تھا۔ اُسے اپنے آگے اندھیرے میں جانا ہوگا ورنہ وہ ڈوب جائے گا۔ اُس کا سر وزنی ہو رہا تھا اور پھیپھڑے پھٹنے کو تھے۔ ایک سو پندرہ، ایک سو پندرہ اُس کے دماغ میں گونجتا رہا اور اُس نے اندھیرے میں ناتوانی سے چٹان پکڑ کر اپنے آپ کو آگے کی طرف دھکیلتے ہوئے دھوپ سے روشن مختصر سی جگہ اپنے پیچھے چھوڑ دی۔ جلد ہی اُس پر نیم غشی طاری ہو گئی۔ وہ اندھیرے میں نیم غشی کے عالم میں جدّوجہد کرتا رہا۔ بہت زیادہ تیزی سے بڑھتے ہوا درد اُس کے سارے سر میں بھر گیا۔ پھر اندھیرے میں سبز روشنی کا دھارا نمودار ہوا۔ اُس کے ہاتھوں نے کسی شے کو محسوس کرتے ہوئے آگے سمت کی حرکت کی لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ پیچھے کی سمت اُس کے پیروں نے ٹھوکریں لگا کر اُسے کھلے سمندر میں دھکیل

دیا۔

وہ سطحِ آب کی جانب تیرا اور اس کا چہرہ فضا میں بلند ہوا۔ وہ مچھلی کی مانند تیز تیز سانس لے رہا تھا۔ اُسے لگا جیسے وہ اب نیچے پانی میں گر کر ڈوب جائے گا کہ اب وہ عقب میں چند قدم پر واقع چٹان تک تیرنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ پھر اس نے چٹان کو پکڑتے ہوئے اپنے آپ کو کھینچ کر اس کے اوپر لاد دیا۔ وہ اوندھے منہ لیٹ کر گہرے سانس لینے لگا۔ اُسے سرخ رگوں اور جمے ہوئے خون کے اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُسے خیال آیا کہ اس کی آنکھیں شدید زخمی ہو گئی ہوں گی اور ان میں خون بھرا ہو گا۔ اس نے چشمے کو توڑ کر پھینکا تو خون کی دھار سمندر میں گری۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا جس نے چشمے کو بھر دیا تھا۔ اس نے ٹھنڈے اور نمکین سمندر سے چُلّو بھر پانی لے کر اپنے منہ پر مارا تو اُسے کوئی اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس کے منہ نے جو ذائقہ لیا ہے وہ خون کا ہے یا نمکین پانی کا۔ کچھ دیر بعد اس کا دل تھم گیا اور نگاہیں صاف ہو گئیں تو وہ اُٹھ بیٹھا۔ وہ آدھ میل کے فاصلے پر مقامی لڑکوں کو غوطے لگاتے اور کھیلتے دیکھ سکتا تھا۔ وہ ان کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ گھر جا کر بستر پر پڑنے کے سوا کچھ نہیں چاہتا تھا۔

جلد ہی جیری تیرتا ہوا ساحل کا طرف گیا اور دھیرے دھیرے اوپر چڑھ کر بنگلے کو جانے والے راستے پر ہو لیا۔ اس نے اپنے آپ کو بستر پر گرایا اور سو گیا۔ اس کی آنکھ بیرونی راستے پر قدموں کی آواز سے کھلی۔ اس کی ماں واپس آ رہی تھی۔ وہ یہ سوچتا ہوا غسل خانے کی طرف بھاگا کہ وہ اس کے چہرے پر خون کے داغ یا آنسوؤں کے نشان نہ دیکھ لے۔ وہ غسل خانے سے باہر آ کر اس سے ملا تو وہ بنگلے میں مُسکراتی ہوئی داخل ہو رہی تھی اور اس کی آنکھیں دمک رہی تھیں۔

”اچھی صبح گزری؟“ اس نے اپنا سر ایک لمحے کے لیے اس کے گرم بھورے کندھے پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

”اوہ، ہاں۔ شکریہ۔“ وہ بولا۔

”تم کچھ پیلے نظر آ رہے ہو۔“ پھر تیکھے اور پریشان لہجے میں دریافت کیا۔ ”تم نے اپنا سر کیسے پھوڑا؟“

”اوہ، ٹکرا گیا تھا“ اس نے اُسے بتایا۔

اس نے اُسے قریب سے دیکھا۔ وہ تھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کیچڑ دکھائی دے رہی تھی۔

وہ پریشان ہوگئی۔ پھر وہ اپنے آپ سے بولی۔ ”اوہ، بلاوجہ پریشان مت ہو! کچھ نہیں ہوگا۔ وہ مچھلی کی مانند تیر سکتا ہے۔“

وہ اکٹھے دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔

”ممی۔“ وہ بولا۔ ”میں پانی میں کم از کم دو تین منٹ ٹھیر سکتا ہوں۔“ یہ بات اُس کے منھ سے بے ساختہ نکلی تھی۔

”واقعی، پیارے؟“ اس نے کہا۔ ”خوب، میں کسی کام میں زیادتی نہیں کرتی۔ میرا نہیں خیال کہ آج تم اور بھی پیراکی کرو۔“ وہ ارادوں کی جنگ کے لیے تیار تھی لیکن جیری نے فوراً ہی ہتھیار ڈال دیے۔ اب ساحل پر جانے کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔

☆☆☆☆

محمد عاصم بٹ

خورخے لوئیس بورخیس

(تعارف)

خورخے لوئیس بورخیس لاطینی امریکی طلسماتی حقیقت نگاری کی روایت میں گبرئیل گارسیا مارکیز کے بعد دوسرا اہم نام مانے جاتے ہیں۔ بہت کسے ہوئے معماتی پلاٹ، غیر معمولی طور پر متنوع اور وسیع تر مطالعے، تاریخ اور فلسفہ کے گہرے شعور، غیر معمولی جودت طبع اور اسطوریاتی معلوم ہونے والے پر اسرار کرداروں کے ساتھ بورخیس نے فنتاسیا کی آمیزش سے ایک منفرد اور دلچسپ اسلوب اختراع کیا جس نے افسانے کو ایک یکسر نیا ذائقہ بخشا اور خاص و عام کی توجہ حاصل کی۔ یوں دور جدید میں جب کہ دنیا بھر میں افسانہ نگاری کا فن ایک طرح کے دھندلکے میں گم ہوتا معلوم ہو رہا ہے، بورخیس کا نام اس کے اعتبار کا بہت مضبوط اور روشن حوالہ ہے۔

الہیات، تاریخ، تسریت پسندی، جرم، فلسفہ، زمان و مکان کی بھول بھلیاں اور اسطوریات، بورخیس کے محبوب موضوعات ہیں۔ فرضی کتابوں، فرضی مصنفوں، فرضی مسالک، فرضی سیاروں اور خطوں پر کہانیاں لکھیں۔ اپنی ذاتی مابعدالطبیعیات اختراع کی۔ جرم اور فلسفہ کی آمیزش سے تہہ دار پلاٹ بنائے اور کرافٹ کے نئے تجربات کیے۔ ہسپانوی کے ساتھ ساتھ متعدد زبانوں میں عبور حاصل کیا۔ چالیس برس کی عمر تک بصارت سے محرومی نے بھی بورخیس کے تخیل کو گہرا کیا اور اسے جلا بخشی۔ گبرئیل گارسیا مارکیز کے ناول 'تنہائی کے سو سال' کی اشاعت نے دنیا بھر کی توجہ لاطینی امریکی ادب کی طرف مبذول کی تو بورخیس کے افسانے بھی عالمی منظرنامے کا حصہ بنے۔ کافکا، ایڈگر ایلن پو، آسکر وائلڈ اور ایچ جی ویلز کا ذکر بورخیس نے خود اپنے انٹرویوز اور مضامین میں کیا ہے جن سے انھوں نے فن افسانہ نگاری کے رموز سیکھے اور ان کے اثرات کے تحت اپنا اسلوب وضع کیا۔

بورخیس کے افسانوی مجموعوں کی تفصیل یوں ہے: فکشنز (1945)، الف (1949)، خوابوں کے شیر، خالق و مالک (1960)، ڈاکٹر بروڈی کی رپورٹ (1970)، کتاب ریگ (1977)، شیکسپیئر کی یادداشت (1983)۔

افسانوں کے علاوہ مضامین بھی لکھے، اور شاعری کے متعدد مجموعے شائع کیے۔ ذیل میں بورخیس کے چند نمائندہ افسانوں کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اردو قاری بورخیس کے نام سے غیر واقف نہیں ہیں۔ تاہم چند منتخب افسانوں کی پیشکش بورخیس فہمی میں اضافے کا باعث بن سکتی ہے۔

خورخے لوئیس بورخیس
انگریزی سے ترجمہ : محمد عاصم بٹ

انجیل، بمطابق مارک

ان واقعات کا تعلق مارچ 1928 کے آخری دنوں میں جونین کے جنوبی علاقے میں لاس الموس کے جانوروں کے باڑے سے ہے۔ ہیرو بالسٹر ایسپینوسا طب کا طالب علم تھا۔ ہم فی الوقت اسے بیونیس ایریز کے دوسرے نوجوانوں جیسے ہی ایک نوجوان کے طور پہ بیان کر سکتے ہیں کسی بھی قابل ذکر صفت کے بغیر، سوائے غیر محدود مہربان طبیعت اور خطیبانہ اہلیت کے جس کی بنیاد پہ اس نے راموس میجا کے انگریزی سکول میں بہت سے انعامات بھی جیتے۔ اسے حجت بازی پسند نہیں تھی۔ وہ صرف تبھی اسے ترجیح دیتا، اگر وہ خود نہیں بلکہ اس کا ہم سخن راستی پر ہو۔

اگر چہ کسی کھیل میں اتفاقات کے تغیرات اسے مسحور کرتے، لیکن وہ ایک کمزور کھلاڑی تھا کیوں کہ اسے جیتنے کی کوئی آرزو نہیں تھی۔ اس کی اعلی ذہانت بے سمت تھی۔ تینتیس سال کی عمر میں آخری مضمون میں کامیابی اس کی گریجوایشن کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ حالاں کہ وہ اس کا پسندیدہ مضمون تھا۔ اس کا باپ اس دور کے شریف النفس انسانوں کی طرح ایک آزاد خیال انسان، اسے ہربرٹ سپنسر کے خیالات سے آگاہ کرنے کوشش کرتا لیکن اس کی ماں نے مونٹیویڈیو کے دورے سے پہلے اس سے وعدہ لیا کہ ہر رات وہ خدا کے حضور عبادت کرے اور صلیب کا نشان بنائے گا۔ ان برسوں میں اس نے کبھی اس وعدے کی خلاف ورزی نہیں کی۔

وہ بزدل نہیں تھا۔ ایک صبح کسی لاتعلقی کی وجہ سے نہیں، بلکہ شدید غصے میں اس نے اپنے ایک ساتھی طالب علموں کو گھونسوں سے لتاڑ دیا جو اسے یونیورسٹی کے کسی مظاہرے میں شرکت کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ وہ قابل اعتراض خیالات یا عادات سے نہ چاہتے ہوئے بھی جڑا ہوا تھا۔ اس کے ملک کے لیے خود اس سے کہیں زیادہ یہ بات زیادہ تشویش کا باعث تھی کہ دوسرے علاقوں میں لوگ یقین رکھتے تھے کہ انھیں انڈینز کی طرح پرندوں کے پر پہننے چاہئیں۔ وہ فرانس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا لیکن فرانسیسی زبان سے نفرت کرتا تھا۔ امریکیوں کی اس کی نزدیک کوئی عزت نہیں تھی لیکن بیونس ایریز میں فلک بوس عمارتوں

کی موجودگی پر بھی اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ سوچتا کہ میدانی علاقوں کے جنوبی امریکی کاؤبوائیز پہاڑی علاقوں یا پہاڑی سلسلوں کے گھڑسواروں کی نسبت زیادہ مشاق ہوتے ہیں۔

اس کے کزن ڈینئیل نے اسے دعوت دی کہ وہ گرمیاں لاس الموس میں گزارے تو اس نے یہ دعوت قبول کرنے میں ذرہ بھی تردد نہ کیا۔ اس لیے نہیں کہ اسے وہ علاقہ پسند تھا بلکہ اپنی قدرتی خوش مزاجی کی وجہ سے اور اس باعث کہ اس کے پاس انکار کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔

باڑے میں گھر کشادہ اور کسی حد تک خستہ تھا۔ فورمین، جسے گترے پکارا جاتا تھا، کے کوارٹرز نزدیک ہی واقع تھے۔ گترے تین تھے۔ باپ، بیٹا (جو خاص طور پر گنوار تھا) اور ایک لڑکی جس کی ولدیت مشکوک تھی۔ وہ دراز قد، مضبوط اور ہڈیالے جسم کے تھے، انڈین نقوش والے چہرے اور سرخی میں رنگے ہوئے بال۔ فورمین کی بیوی برسوں پہلے چل بسی تھی۔

اس دیہی علاقے میں ایسپینوسا ایسی باتیں سیکھ رہا تھا جن سے پہلے وہ بےخبر تھا اور نہ ہی جن کا اسے کبھی دھیان آیا تھا۔ مثال کے طور پر گھر کے قریب پہنچنے پر گھوڑا سرپٹ نہیں دوڑانا چاہئے اور جب تک کوئی خاص کام نہ ہو، گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نہیں جانا چاہئے۔ کبھی کبھار وہ پرندوں کو ان کی آوازوں سے شناخت کر لیتا۔

شروع کے دنوں میں ہی ڈینئیل کو سفر پر نکلنا اور دارالخلافہ جانا پڑا تا کہ مال مویشیوں سے متعلق ایک کاروباری معاملہ طے کر سکے۔ مجموعی طور پر اس کام میں ہفتہ بھر لگ گیا۔ ایسپینوسا، جو پہلے ہی اپنے کزن کے عورتوں سے اچھے تعلقات اور مردانہ فیشن کی تبدیلیوں میں اس کی ان تھک دلچسپی سے بیزار تھا، اس کے جانے کے بعد باڑے میں نصابی کتابوں تک محدود ہو کر رہ گیا۔ گرمی دم گھونٹنے والی تھی اور رات کو بھی اس کیفیت میں فرق نہ پڑتا۔ ایک صبح دن شروع ہوتے ہی طوفان کی آمد سے وہ جاگا۔ ہوا کیشوورینا کے پودوں سے سر ٹکرا رہی تھی۔ ایسپینوسا نے بارش کے اولین قطروں کی آواز سنی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اچانک سرد ہوا کمرے میں گھس آئی۔ اسی سہ پہر سلاڈو میں سیلاب آیا۔

اگلے دن اپنے برآمدے سے پانی میں ڈوبے ہوئے کھیتوں کو دیکھتے ہوئے، بالآخر ایسپینوسا نے سوچا کہ عمومی استعارہ جو ارجنٹائن کے سبز میدانوں پامپاس کا موازنہ سمندر سے کرتا ہے، کم از کم اس صبح مکمل طور پر غلط نہیں تھا۔ حالاں کہ ہڈسن کا کہنا تھا کہ سمندر ہمیں وسیع دکھائی دیتا ہے کیوں کہ ہم اسے جہاز کے عرشے سے دیکھتے ہیں، نہ کہ گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر یا آنکھوں کی سطح کے برابر رکھ کر۔ بارش بلاتوقف جاری رہی۔ گترے نے شہری مہمان کی مدد سے یا اس کے ہونے کی رکاوٹ کے باوجود مویشیوں کا ایک بڑا

حصہ بچالیا، گو چند جانور پانی میں بہہ گئے۔ سٹیشن کو جانے والے راستے چار تھے، سبھی پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ تیسرے دن رستی ہوئی چھت سے فورمین کے گھر کو خطرہ پیدا ہوا تو ایسپینوسا نے انھیں پیچھے اوزاروں کے چھپریل کے برابر ایک کمرہ دے دیا۔ اس سے وہ اور بھی قریب آ گئے۔ وہ بڑے ڈائننگ روم میں اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھاتے۔

انھیں گفتگو کرنے میں دشواری ہوتی۔ گترے، جو ملک کے بارے میں اتنا کچھ جانتے تھے، اس فن سے یکسر نابلد تھے کہ کیسے اس سب کچھ کو بیان کیا جائے۔ ایک رات ایسپینوسا نے پوچھا کہ کیا انھیں انڈینز کے حملوں کے بارے میں کچھ یاد ہے جب سرحدی فوج کی کمان جونین میں واقع تھی۔ انھوں نے بتایا کہ انھیں یاد تھا لیکن وہ اس کا جواب تبھی دے پاتے، اگر سوال چارلس اول کے سر قلم کیے جانے کے بارے میں پوچھا جاتا۔ ایسپینوسا کو اپنے باپ کی بات یاد آئی کہ ماضی بعید کے سبھی واقعات ضعیف یادداشت یا تاریخوں سے متعلق مبہم تصور کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جنوبی امریکہ کے کاؤبوائز میں یہ رجحان موجود ہے کہ وہ اپنی پیدائش کا سال اور اس شخص کا نام بھول جاتے ہیں جنھوں نے اس کی پرورش کی ہوتی ہے۔

پورے گھر میں پڑھنے کو کوئی شے نہیں تھی سوائے مویشیوں کے علاج معالجے کی ایک کتاب، ایک رسالے ‘The Farm’، یوراگوئے کی طویل نظم ‘Tabare’ کے ایک نفیس ایڈیشن، ارجنٹائن میں چھوٹے سینگوں والے مویشیوں کی تاریخ، ایک عجیب شہوت پسند یا جاسوسی کہانی والے حال ہی میں شائع ہونے والے ناول Don Segundo Sombra کے۔

رات کے کھانے کے بعد ہونے والی ناگزیر گفتگو کو معنی خیز بنانے کے لیے ایسپینوسا نے گتروں کو، جو بھی ناخواندہ تھے، ناول کے چند ابواب پڑھ کر سنائے۔ بدقسمتی سے کتاب کے ہیرو کی مانند فورمین بھی ایک چرواہا تھا اور اپنے جیسے کسی کردار کے بارے میں جاننے میں اسے ذرہ برابر دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے کہا کہ یہ کام بہت آسان ہے۔ وہ اپنے ساتھ سامان سے لدا ایک خچر رکھتے تھے جو ان کی ضروری اشیا لے کر چلتا اور یہ کہ اگر وہ چرواہا نہ ہوتا، تو اس نے کبھی جھیل گومیز نہ دیکھی ہوتی، وہ کبھی بریگیڈو کے قصبے میں بھی نہ گیا ہوتا، نہ ہی کبھی چیبا چیکو میں نیونیز کا باڑہ ہی اس کے مشاہدے میں آیا ہوتا۔ باورچی خانے میں ایک گٹار پڑا تھا۔ ان تمام واقعات سے پہلے جو میں یہاں بیان کر رہا ہوں، وہ سبھی مزدور ایک دائرے میں بیٹھ جاتے اور ان میں سے کوئی اس ساز کو سُر میں کرنے لگتا، اسے بجانے کی نوبت کبھی نہ آتی۔ اسے وہ گٹار جام کہتے تھے۔

ایسپینوسا، جس نے داڑھی بڑھالی تھی، آئینے کے سامنے سے گزرتے ہوئے رک جاتا اور اپنے

تبدیل ہوتے چہرے کا معائنہ کرتا اور اس خیال پر مسکراتا کہ وہ سلاڈو کے سیلاب کا قصہ سنا کر بیونس ایریز میں لڑکوں کو بور کرے گا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ ان مقامات کو یاد کرتا رہتا جہاں وہ کبھی گیا ہی نہیں تھا اور نہ کبھی جائے گا۔ کیبریری میں ایک گلی کی نکڑ جہاں ڈاک کا بکسا نصب تھا۔ جوجوئے میں پلازہ ڈیل ونس سے چند بلاکس کے فاصلے پر ایک برآمدے میں سیمنٹ کے بنے چند شیر، ٹائلوں کے فرش والا شراب خانہ جس کے محل وقوع کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ جہاں تک اس کے بھائیوں اور باپ کا تعلق تھا، ڈینیل کے ذریعے وہ پہلے ہی جان چکے تھے کہ سیلاب کے پانیوں کی وجہ سے، اور یہ بات علم الحروف کی رُو سے بھی قطعی درست تھی، وہ سب سے کٹ چکا تھا۔

گھر میں گھومتے ہوئے جو ابھی تک پانی سے بھرا ہوا تھا، اس کے ہاتھ انگریزی میں چھپی ہوئی ایک انجیل لگی۔ اس کے آخری صفحوں میں گتھریوں نے جوان کا اصل خاندانی نام بھی تھا، اپنے خاندان کی تاریخ لکھی ہوئی تھی۔ اصلاً وہ آئیورنس سے آئے تھے، انیسویں صدی کے ابتدائی ایام میں اس نئی دنیا میں داخل ہوئے، بلاشبہ مزدوروں کی حیثیت سے، اور یہاں ان کا واسطہ انڈینز سے پڑا۔ یہ روداد 1870 کی دہائی تک آ کر رک جاتی تھی یعنی جب ان میں خواندہ لوگوں کا وجود باقی نہیں رہا ہوگا۔ چند ہی نسلوں کے بعد وہ انگریزی سے نابلد ہو گئے۔ جب ایسپینوسا ان سے ملا، ان کے لیے ہسپانوی زبان کو بولنا سمجھنا بھی دشوار تھا۔ ان کا کوئی عقیدہ نہیں تھا، لیکن ان کے خون میں ایک مدہم لہر کی مانند کالوینیوں کی کٹر پسندی اور پامپاس میں رائج توہمات موجود تھیں۔ ایسپینوسا نے انھیں اپنی دریافت کے بارے میں بتایا لیکن وہ اس بات کو معمولی سا بھی خاطر میں نہ لائے۔

کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس کی انگلیوں نے اسے ‘انجیل بمطابق مارک’ کے حصے سے کھولا۔ ترجمہ کی مہارت اور شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا گتھرے اسے سمجھتے بھی ہیں یا نہیں، اس نے رات کے کھانے کے بعد اسے پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ ان کا بغور سننا اور اس میں ان کی خاموش دلچسپی اسے ورطہ حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی تھی۔ شاید کتاب کے سرورق پر سنہری حروف نے اس کو اعتبار بخشا تھا۔

‘یہ ان کے خون میں موجود ہے’ ایسپینوسا نے سوچا۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ انسان نے تمام تاریخ میں بس دو ہی کہانیاں بیان کیں اور اس کا اعادہ کیا ہے، ایک راہ گم کردہ جہاز کی کہانی جو ایک عزیز ترین جزیرے کی تلاش میں بحیرہ روم کے پانیوں میں سرگرداں ہے، اور ایک دیوتا کی کہانی جو گولگوتھا میں خود کو صلیب پر چڑھائے جانے کی اجازت دیتا ہے۔ راموس میجیا میں فن خطابت کی تربیت کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسپینوسا اخلاقی حکایات کی تبلیغ کے لیے اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔

اس کے بعد کے دنوں میں گترے بھنا ہوا گوشت اور سارڈینز عجلت میں ہڑپ کر جاتے تا کہ جلد سے جلد انجیل کی قرات کا دور جاری ہو سکے۔

بھیڑ کے بچے نے، جسے بچی نے آسمانی نیلے رنگ کا ربن باندھ رکھا تھا، خود کو ایک خاردار تار میں الجھا کر زخمی کر لیا۔ خون کا بہاؤ روکنے کے لیے گترے وہاں جالے لگانا چاہتے تھے۔ ایسپینوسا نے اس کے بجائے چند گولیوں سے اس کا علاج کیا۔ اس پر جس شکرگزاری کا اظہار ان کی طرف سے کیا گیا، اس نے اسے ششدر کر دیا۔ اسے گتروں پر بالکل بھروسہ نہیں تھا سو اس نے دو سو چالیس پیسوز جو اس کے پاس تھے، اپنی کتابوں میں سے ایک میں چھپا لیے۔ اب چوں کہ اصل مالک موجود نہیں تھا، اس نے ڈینیئل کا کردار سنبھال لیا۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں احکامات جاری کرتا جن کی فوراً تعمیل ہوتی۔ گترے اس کے ساتھ ساتھ کمروں اور برآمدے میں جاتے جیسے اس کے بغیر وہ گم ہو جائیں گے۔ قرات کی نشستوں میں اس نے دیکھا کہ وہ اس کے کیک وغیرہ کے بچے ہوئے ٹکڑے بھی اٹھا کر لے جاتے جو میز پر گرے ہوتے تھے۔ ایک شام وہ اچانک ہی وہاں آ نکلا اور دیکھا کہ وہ اسی کے بارے میں بہت احترام کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔

‘انجیل بمطابق مارک’ پڑھ چکنے کے بعد وہ باقی تین انجیلیں بھی پڑھنا چاہتا تھا۔ گتروں کے باپ نے فرمائش کی کہ وہ اسی انجیل کو پھر سے پڑھے تا کہ وہ اسے زیادہ بہتر انداز میں سمجھ سکیں۔ ایسپینوسا نے محسوس کیا کہ وہ بالکل بچوں جیسے تھے جو تنوع یا عجیب پن پر تکرار کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس رات اس نے حیرت میں مبتلا ہوئے بغیر سیلاب کا خواب دیکھا اور اس ٹھک ٹھک کی وجہ سے بیدار ہوا جو چھپریل کی تعمیر نو کے سلسلے میں جاری تھی، جسے اس نے طوفان کی آواز سمجھا۔ درحقیقت بارش کم ہونے کے باوجود بھاری ہو گئی تھی۔ ٹھنڈ بھی شدید تر تھی۔ گتروں نے اسے بتایا کہ طوفان نے چھپریل کی چھت کو نقصان پہنچایا تھا اور یہ کہ ایک بار اگر وہ شہتیروں کی مرمت کر لیں تو وہ اسے بھی دکھائیں گے کہ نقصان کی نوعیت کیا تھی۔ یہ بات کہ وہ ان کے لیے مزید ایک اجنبی نہیں رہا تھا اور وہ اس پر خصوصی توجہ نچھاور کرتے تھے، اس کے لیے پریشان کن تھی۔ ان میں کوئی کوفی پسند نہیں کرتا تھا لیکن وہ اس کے لیے ہمیشہ ایک پیالہ تیار رکھتے جس میں مٹھی بھر شکر ڈلی ہوتی۔

طوفان منگل کے روز آیا۔ جمعرات کی رات کو وہ دروازے پر ہونے والی معمولی دستک کی وجہ سے جاگا جو اپنے خدشات کی وجہ سے وہ ہمیشہ اندر سے مقفل رکھتا تھا۔ وہ اٹھا اور دروازہ کھولا۔ باہر گتروں کی لڑکی کھڑی تھی۔ اندھیرے میں وہ اسے پہچان نہیں سکا لیکن اس کے پیروں سے اندازہ لگایا کہ وہ ننگے پیر آئی

تھی اور بعدازاں بستر میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ وہ شروع ہی سے برہنہ تھی۔ لڑکی اس کے گلے نہیں لگی، نہ کوئی ایک لفظ ہی بولا، وہ اس کے برابر لیٹ گئی اور کانپنے لگی۔ وہ پہلی بار کسی مرد کے ساتھ لیٹ رہی تھی۔ جب وہ گئی تو جاتے ہوئے بھی اس نے اسے بوسہ نہیں دیا۔ ایسپینوسا نے سوچا کہ وہ تو اس کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔ کسی ایسی جذباتی وجہ سے جسے سمجھنے کی اس نے کوشش نہیں کی، اس نے عہد کیا کہ وہ بیونس ایریز میں کسی کو اس واقعے کے بارے میں نہیں بتائے گا۔

اگلا دن پچھلے دنوں ہی کی طرح شروع ہوا سوائے اس کے کہ ان کے باپ نے ایسپینوسا سے یہ سوال کیا کہ ’کیا یسوع مسیح نے تمام انسانیت کو بچانے کے لیے خود کو قتل ہو جانے دیا؟‘

ایسپینوسا جو خود ایک آزاد خیال انسان تھا، لیکن خود کو پابند محسوس کرتا تھا کہ جو کچھ پڑھ کر انھیں سنا چکا تھا، اس کی توجیہ بھی پیش کرے، بولا ”ہاں، ہم سب کو جہنم کے عذاب سے بچانے کے لیے۔“

گترے نے پوچھا ”جہنم کیا شے ہے؟“

”زمین کے نیچے ایسی جگہ جہاں روحوں کو مسلسل جلایا جاتا ہے۔“

”اور جنھوں نے کیل ٹھونکے، وہ بھی بچ جائیں گے؟“

”ہاں“ ایسپینوسا نے جواب دیا جس کی الہیات کچھ ڈگمگا گئی تھی۔

اسے خوف محسوس ہوا کہ فورمین کہیں اس واقعے کے بارے میں نہ پوچھ لے جو گذشتہ رات اس کی بیٹی کے ساتھ ہوا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد انھوں نے اس سے کہا کہ وہ آخری باب دوبارہ پڑھ کر سنائے۔

ایسپینوسا نے طویل دورانیہ کا قیلولہ کیا حالاں کہ اس کی نیند مسلسل اٹھاپٹخ اور مبہم پیش اندیشیوں سے مخل ہوتی رہی۔ شام کے قریب وہ بیدار ہوا اور برآمدے میں آیا۔

پھر وہ یوں گویا ہوا جیسے بآواز بلند سوچ رہا ہو ”پانی نیچے آ چکے ہیں۔ ایسا اب زیادہ دیر نہیں رہے گا۔“

”ایسا اب زیادہ دیر نہیں رہے گا۔“ گترے اس کی آواز کی گونج کی صورت میں پکارے۔

تینوں گترے اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ فرش پر گھٹنے ٹیکتے ہوئے انھوں نے اس سے ان کے حق میں دعا کرنے کو کہا۔ پھر انھوں نے اس پر لعنت ملامت کی، اس پر تھوکا اور اسے گھر کے پچھواڑے میں دھکیل دیا۔ لڑکی رو رہی تھی۔ ایسپینوسا جانتا تھا کہ دروازے کی پرلی طرف کیا متوقع تھا۔ انھوں نے دروازہ کھولا تو اسے کھلا آسمان دکھائی دیا۔ ایک پرندہ چیخا۔ ”سنہری سہرہ“ اس نے سوچا۔ چھپریل

کی چھت نہیں تھی، انھوں نے اس کے شہتیر ایک بڑی صلیب بنانے کے لیے اکھاڑ لیے تھے۔

☆☆☆☆

خورخے لوئیس بورخیس

انگریزی سے ترجمہ: محمد عاصم بٹ

قرص

میں ایک لکڑہارا ہوں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میرا نام کیا ہے۔ وہ جھونپڑی جہاں میں پیدا ہوا اور جہاں غالباً میں جلد ہی مر جاؤں گا، جنگل کے کنارے ایستادہ ہے۔

اس جنگل کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ سمندر تک پھیلا ہوا ہے جو تمام زمین کو محیط ہے اور جہاں میرے جیسے لکڑی کے جھونپڑے دور تک بکھرے ہوئے ہیں۔ میں نے سمندر کبھی نہیں دیکھا۔ اس لیے میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ نہ ہی میں کبھی جنگل کا پرلا کنارہ دیکھ پایا ہوں۔ بچپن میں میرے بڑے بھائی نے مجھ سے قسم لی کہ ہم سارے جنگل کو کاٹ ڈالیں گے۔ حتیٰ کہ ایک درخت بھی باقی نہ بچے۔ میرا بھائی مر گیا۔ جو کچھ میں اب تلاش کر رہا ہوں یا آئندہ تلاش کروں گا وہ ایک بہت مختلف شے ہے۔ مغرب کی سمت میں ایک ندی بہتی ہے جس میں سے میں اپنے ہاتھوں سے مچھلی شکار کرتا ہوں۔ جنگل میں بھیڑیے ہیں۔ لیکن میں بھیڑیوں سے خوف زدہ نہیں ہوں۔ اپنے کلہاڑے پر مجھے اعتماد ہے اور یہ ہمیشہ میرے بھروسے پر پورا اترا۔

میں نے کبھی اپنی عمر کے برسوں کا شمار نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تعداد میں کافی زیادہ ہیں۔ مجھے اب دکھائی نہیں دیتا۔ گاؤں میں، جہاں اب میں نہیں جاتا مبادا اپنا راستہ کھو بیٹھوں، مجھے سب 'بخیل' سمجھتے

ہیں۔ لیکن مجھ جیسے لکڑہارے کے پاس بھلا کیا خزانہ ہوسکتا ہے، جسے میں ان سے چھپاؤں گا۔

برف پڑتی ہے تو اسے اندر آنے سے روکنے کے لیے میں اپنے گھر کے دروازے کے آگے ایک پتھر رکھ کر اسے کس کر بھیڑ لیتا ہوں۔ بہت مدت پہلے ایک شام مجھے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر میرے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ایک اجنبی اندر داخل ہوا۔ وہ عمر رسیدہ اور دراز قد تھا اور ایک کٹے پھٹے کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک داغ تھا۔ اس کی پیرانہ سالی نے اس میں کوئی ضعف پیدا کرنے کی بجائے جیسے اسے استحکام اور وقار بخشا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک سونٹے کی مدد کے بغیر قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ہم نے چند الفاظ کا تبادلہ کیا جو مجھے اب یاد نہیں ہیں۔

آخر میں اس نے بتایا ”میں بے گھر ہوں۔ جہاں جگہ ملتی ہے سو جاتا ہوں۔ میں نے سیکسونز کی سرزمین کا عرضاً بلداً سفر کیا ہے۔“

ان الفاظ نے اس کی کہن سالی کی تصدیق کی۔ میرا باپ اکثر سیکسون کی سرزمین کا ذکر کرتا تھا جسے اب لوگ انگلستان پکارتے ہیں۔ میرے پاس روٹی اور مچھلی تھی۔ ہم نے کھانے کے دوران ایک لفظ بھی ایک دوسرے سے نہ کہا۔ بارش ہونے لگی تھی۔

چند کھالیں بچھا کر میں نے فرش پر، جہاں میرا بھائی مرا تھا، اس کے لیے گدا بنا دیا۔ رات ہوئی تو ہم سو گئے۔

دن کا اجالا پھیلنا شروع ہوگیا تھا جب ہم جھونپڑے سے روانہ ہوئے۔ بارش تھم گئی تھی اور زمین تازہ برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ میرے رفیق کا سونٹا اس کے ہاتھ سے پھسل گیا تو اس نے مجھے سونٹا اٹھانے کا حکم دیا۔

”میں تمہارا حکم کیوں مانوں“ میں نے کہا۔

”کیونکہ میں ایک بادشاہ ہوں“ اس نے جواب دیا۔

میں نے سوچا کہ وہ پاگل ہے۔ سونٹا اٹھا کر میں نے اسے تھمایا۔ اس نے قدرے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں سیکجز کا بادشاہ ہوں۔ اکثر بہت کٹھن لڑائیوں میں میں نے اپنے لوگوں کو فتح سے ہمکنار کیا۔ لیکن ایک نجس لمحے میں مجھ سے میری بادشاہت چھن گئی۔ میرا نام آئیسرن ہے اور میں اوڈن کی نسل میں سے ہوں۔“

”میں اوڈن کی پوجا نہیں کرتا۔ میں عیسیٰ مسیح کا عبادت گار ہوں۔“ میں نے کہا۔

وہ بولتا رہا گویا مجھے سنا ہی نہ ہو۔ ”میں نے جلاوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ لیکن میں ہنوز بادشاہ ہوں

کیونکہ میرے پاس ایک قرص ہے۔ کیا تم اسے دیکھنا چاہو گے۔"

اس نے اپنے ہڈیالے ہاتھ کی مٹھی کھولی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ جبھی مجھے یاد آیا کہ وہ ہمیشہ اپنے ہاتھ کو بند رکھتا تھا۔

مجھے بغور دیکھتے ہوئے وہ بولا "تم اسے چھو کر دیکھ سکتے ہو۔"

کچھ شک کے ساتھ میں نے انگلی کی پوروں سے اس کی ہتھیلی کو چھوا۔ مجھے وہاں کچھ سرد شے محسوس ہوئی اور چمک سی دکھائی دی۔ مٹھی فوراً ہی بند ہو گئی۔ میں کچھ نہیں بولا۔ وہ آدمی بڑے تحمل سے بولتا رہا جیسے کسی بچے سے مخاطب ہو۔

"یہ اوڈن کا قرص ہے" اس نے کہا "اس کا بس ایک ہی رخ ہے۔ دنیا میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جس کا بس ایک رخ ہو۔ جب تک قرص میری تحویل میں ہے، میں بادشاہ ہوں"۔

"کیا یہ سونے کا ہے" میں نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا۔ یہ اوڈن کا قرص ہے اور اس کا بس ایک ہی رخ ہے"۔

تب اسی لمحہ مجھ میں اس قرص کو حاصل کرنے کے لالچ نے جنم لیا۔ اگر یہ مجھے مل جائے تو میں اسے سونے کے ڈلے کے عوض بیچ دوں گا۔ تب میں بادشاہ بن جاؤں گا۔ میں نے اس خانہ بدوش سے کہا جس سے میں اب بھی نفرت کرتا ہوں کہ "میں نے اپنے جھونپڑے میں سکوں سے بھرا ہوا ایک صندوق دبایا ہوا ہے۔ وہ سونے کے سکے ہیں اور کلہاڑی کے پھل کی طرح چمکتے ہیں۔ اگر تم مجھے اوڈن کا قرص دے دو تو میں اس کے بدلے تمہیں وہ صندوق دوں گا۔"

اس نے تلخی سے جواب دیا "مجھے یہ سودا قبول نہیں ہے"۔

"تو پھر تم اپنا راستہ ناپو۔" میں نے کہا۔

اس نے میری طرف اپنی پیٹھ موڑ لی۔ اس کی گردن کی پشت پر کلہاڑی کا ایک ہی وار اسے پچھاڑ دینے کے لیے کافی تھا۔ لیکن جونہی وہ گرا اس کی مٹھی کھل گئی۔ ہوا میں بجلی کی ایک لہر سی لہرائی۔ میں نے اس جگہ کو اپنی کلہاڑی سے نشان زد کیا۔ اس کی لاش کو گھسیٹ کر ایک ندی میں پھینک دیا جو بہت تیز بہہ رہی تھی۔

جھونپڑے میں واپس آ کر میں نے قرص کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ مجھے کہیں نہ ملا۔ اس بات کو برسوں بیت چکے ہیں اور میں ابھی تک اس کی تلاش میں ہوں۔

☆☆☆☆

خورخے لوئیس بورخیس
انگریزی سے ترجمہ : محمد عاصم بٹ

ظاہر

بیونس ایریز میں ظاہر بیس سینٹو کی مالیت کا سکہ ہے۔ حروف NT اور عدد 2 اس پر کھرچے ہوئے ہیں جیسے بلیڈ یا چاقو سے ایسا کیا گیا ہو۔ 1929 کا سن سامنے کے رخ پر کندہ ہے۔ (گزرات میں اٹھارھویں صدی کے اواخر میں ظاہر ایک شیر تھا۔ جاوا میں سرا کرتا کی مسجد میں یہ ایک اندھا آدمی تھا جس پر باعقیدہ لوگوں نے پتھر برسائے۔ ایران میں یہ زاویاتی فاصلے ماپنے والا آلہ تھا جسے نادرشاہ کے حکم پر سمندر میں غرقاب کیا گیا۔ مہدی کے قید خانوں میں 1892 کے قریب یہ ایک چھوٹا قطب نما تھا جسے روڈولف کارل وان سلاطین نے چھوا، اور اسے اپنی پگڑی میں اڑس لیا۔ زوٹنبرگ کے مطابق مسجد قرطبہ میں یہ بارہ سو ستونوں میں سے ایک کے سنگ مرمر کی ایک رگ تھا۔ ٹیٹوان کی یہودی بستی میں یہ ایک کنویں کا پیندا تھا۔) آج نومبر کی تیرا تاریخ ہے۔ جون کی سترہ کو ظاہر میری تحویل میں آیا۔ میں اس کہانی میں اب مزید ’میں‘ نہیں رہا۔ لیکن میرے لیے اب بھی ممکن ہے کہ یاد رکھ سکوں کہ کیا ہوا تھا، اور شاید اسے بیان بھی کر پاؤں۔ میں اب بھی نامکمل طور پر بورخیس ہوں۔

کلیمنٹینا ولر جون کی چھ تاریخ کو فوت ہوئی۔ 1930 کے لگ بھگ اس کی تصویریں سوسائٹی میگزینوں کی زینت بنتی تھیں۔ شاید اس کے بے حد معروف ہونے کی وجہ سے یہ بات پھیلی کہ وہ انتہائی خوب صورت تھی۔ حالاں کہ اس کی ہر تصویر اس خیال کو غیر مشروط طور پر درست ثابت نہیں کرتی تھی۔ بہر طور کلیمنٹینا ولر خوب صورتی سے زیادہ کمال پسندی میں دلچسپی رکھتی تھی۔ عبرانی اور چینی مصنفین تمام قابل تصور انسانی ممکنات کو ضابطہ تحریر میں لائے ہیں۔ مشنا میں لکھا ہے کہ ایک درزی بھی سوئی لے کر باہر گلی میں نہیں جا سکتا سبت کے دن غروب آفتاب کے بعد۔ ہم کتاب رسوم میں پڑھتے ہیں کہ ایک مہمان کو پہلا پیالہ دیا جائے تو وہ سنجیدہ ہو جائے۔ اور دوسرے پیالے پر احتراماً قانع۔

ایسا ہی غیر لچک دار کڑا معیار تھا، گو اس سے کہیں کم تفصیل کے ساتھ، جس کی کلیمنٹینا ولر خود سے متقاضی تھی۔ کنفیوشس کے کسی ماہر یا تلمود کے کسی عالم کی طرح وہ ہر فعل میں احساس جرم سے پاک درستگی کی کوشش کرتی۔ تاہم اس کا جوش و خروش کہیں زیادہ قابل ستائش اور توجہ طلب ہوتا جب کہ اس کے اصول غیر مستقل ہوتے اور پیرس یا ہالی وڈ کے مزاج کی لہر کے ساتھ بدلتے۔ کلیمنٹینا ولر درست اوقات میں درست ساز و سامان کے ساتھ درست جگہوں پر نمودار ہوتی۔ وہ فلابیئر کی طرح ’مطلق‘ کی متلاشی تھی۔ صرف یہ کہ اس کا مطلق لمحاتی ہوتا۔ اس کی زندگی غیر معمولی تھی۔ وہ ہمیشہ نئے استعاروں کے ذریعے تجربات کرتی۔ جیسے خود ہی سے دور بھاگنا چاہتی ہو۔ اس کے بالوں کا رنگ اور ان کی شکل اہتمام کے ساتھ غیر مستقل تھی۔ وہ ہمیشہ اپنی مسکراہٹ، اپنی رنگت، اور اپنی آنکھوں کے ترچھے پن کو بدلتی رہتی۔ بتیس سال کی عمر کے بعد وہ نہایت محتاط انداز میں مزید نفیس ہو گئی۔ جنگ نے اسے سوچنے کا بہت مواد دیا۔

چوں کہ پیرس جرمنوں کے قبضے میں تھا تو پھر کیسے فیشن کا اندازہ لگایا جائے؟ ایک اجنبی جس پر عام حالات میں اسے کبھی اعتماد نہ ہوتا، اس کی شخصیت پر یوں حاوی ہوا کہ اسے بڑی تعداد میں سلنڈر جیسی صورت کی ٹوپیاں بیچ گیا۔ ایک سال بعد یہ بات افشا ہوئی کہ وہ لغو اشیا کبھی پیرس میں استعمال ہی نہیں کی گئی تھیں۔ وہ سرے سے ٹوپیاں تھیں ہی نہیں۔ بلکہ عارضی، غیر مستند انوکھی اشیا تھیں۔ مصیبتیں کبھی تنہا نہیں آتیں۔ ڈاکٹر ولر کو اراوز سٹریٹ میں منتقل ہونا پڑا اور اس کی بیٹی کی تصویریں اب سردیوں کی کریموں اور گاڑیوں کے اشتہاروں کی زینت بننے لگیں۔ (کریم جو وہ کثرت سے استعمال کرتی تھی۔ گاڑیاں جو اب مزید اس کے پاس نہیں رہی تھیں۔) وہ جانتی تھی کہ اس کے فن کی نمو کے لیے بڑے مواقع کی ضرورت تھی۔ اس نے غیر اہم مظاہروں کی نسبت منظر سے ہٹ جانے کو ترجیح دی۔ پھر یہ بھی اس کے لیے تکلیف دہ تھا کہ وہ بے حیثیت لوگوں سے مقابلہ کرنے پر مجبور ہو۔ اروز کا اداس اپارٹمنٹ اتنا بڑا تھا کہ اسے برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جون کی چھ تاریخ

کو جنوبی ضلع کے وسط میں کلیمنٹینا ولر نے خودکشی کی بے تکی حرکت کی۔ کیا میں اعتراف کروں کہ میں ارجنٹائنی جذبات اور نخوت کے اس مخلصانہ اظہار سے بہت متاثر ہوا۔ میں کلیمنٹینا کا بہت گرویدہ تھا اور اس کی موت نے مجھے رلا دیا۔

شاید قاری اس بات کا پہلے ہی سے اندازہ لگا چکے ہوں۔ تعزیتی تقریب میں حالات کی تبدیلی سے یہ سامنے آیا کہ میت نے اپنی سابقہ صورتیں اختیار کرنی شروع کر دی تھیں۔ چھ تاریخ کی اس الجھی ہوئی رات میں کسی وقت کلیمنٹینا ولر جادوئی طور پر ویسی ہو گئی جیسی وہ بیس سال پہلے تھی۔ اس کے نقوش نے وہ حاکمانہ انداز اختیار کر لیا جو غرور، دولت، جوانی، ایک سلسلہ مراتب کو ختم کرنے کی آگاہی، قوت متخیلہ کی کمی، حدود و قیود، بے حسی کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔

کسی طور میں نے سوچا کہ اس چہرے کا وہ روپ جو میرے حواس پر چھایا رہا، اتنی دیر میری یادداشت میں باقی نہیں رہا جتنا یہ چہرہ۔ یہ درست ہے کہ یہ آخری ہوگا۔ کیوں کہ ہو سکتا ہے یہی پہلا روپ ہو۔ میں نے اسے پھولوں میں گھرا ہوا چھوڑا۔ صبح کے دو بجے ہوں گے جب میں باہر نکلا۔ باہر ایک/ دو منزلہ گھروں کی متوقع قطاریں وہی مجرد صورت اختیار کر چکی تھیں جو کہ ان کی رات کو تھی، جب تاریکی اور سناٹا انھیں سادہ بنا دیتا ہے۔ ایک طرح کی غیر شخصی خدا ترسی کے احساس میں شرابور میں گلیوں میں گھومتا رہا۔

چلی اور تاکوری کی نکڑ پر میں نے ایک دکان کھلی ہوئی دیکھی اور اس دکان میں میری طبع کے خلاف تین افراد تاش کھیل رہے تھے۔ بولنے کے فن میں کسی ایک لفظ میں ایسے خطابیہ لفظ سے ترمیم کی جاتی ہے جو اس کے مخالف معنی کا حامل ہو۔ یوں باطنی علوم کے پیروکار تاریک روشنی کی بات کرتے ہیں اور کیمیادان سیاہ سورج کی۔ میرے لیے یہ بات ایسے اضداد لفظی جیسی ہی تھی کہ میں کلیمنٹینا ولر سے اپنی آخری ملاقات کے بعد ایک شراب خانے میں مے نوشی کے لیے گیا۔ یہ بات اس عمل کے کھردرے پن اور اس کی سہولت کی پیش نظر زیادہ گھمبیر ہو گئی۔ (یہ تضاد اس باعث زیادہ نمایاں ہوا کیوں کہ وہاں تاش کھیلی جا رہی تھی) میں نے برانڈی کا آرڈر دیا۔ انھوں نے بدلے میں مجھے ظاہر تھما دیا۔ میں نے لمحہ بھر کے لیے اسے دیکھا اور باہر گلی میں آ گیا شاید بخار کی ابتدائی علامات کے ساتھ۔

میں نے سوچا دنیا میں ہر سکہ ان معروف سکوں کا استعارہ ہے جو تاریخ اور حکایات میں تاباں ہیں۔

میں نے چارون کے اوبول کے بارے میں سوچا۔ اس اوبول کے بارے میں جس کی بیلی سیریس نے بھیک مانگی تھی۔ یہودا کے تیس سکوں کے بارے میں، معروف داشتہ لائی کے درہموں کے بارے میں، اس قدیم سکے کے بارے میں جسے اصحاب سفہ نے پیش کیا تھا، الف لیلہ ولیلہ کے جادوگر کے چمکدار سکوں کے

بارے میں جو کاغذ کے ٹکڑوں میں بدل گئے تھے، اسحاق لیقیدم کے ختم نہ ہونے والے پینی کے بارے میں، چاندی کے ساٹھ ہزار ٹکڑوں کے بارے میں جن میں سے ہر ٹکڑہ نظم کے کسی ایک مصرع کا انعام تھا اور جنھیں فردوسی نے بادشاہ کو لوٹا دیا تھا کیوں کہ وہ سونے کے نہیں تھے، ہسپانوی طلائی سکے کے بارے میں جسے اہب نے مستول میں ٹھونک دیا تھا، لیوپولڈ بلوم کے نا قابل واپسی فلورین کے بارے میں، لوئیس کے بارے میں جس کے تصویری چہرے نے مفرور لوئیس XVI کو وارینس کے نزدیک گمراہ کیا تھا۔ جیسے میں کسی خواب میں ہوں کہ یہ خیال، کہ ہر مالی اکائی ایسے ہی تصویری اشاروں کی حامل ہوتی ہے، مجھے بھاری بھر کم، اور اگر چہ نا قابل فہم لیکن اہم معلوم ہوا۔ خالی چورنگیوں سے گزرتے ہوئے میری رفتار بڑھ گئی۔ آخر کار تھکاوٹ نے مجھے ایک نکڑ میں رک جانے پر مجبور کیا۔ میں نے ایک آہنی باڑ دیکھی۔ اس کے پیچھے سیاہ اور سفید پتھر کی سلیں دکھائی دیں۔ میں ایک دائرے میں گھوم رہا تھا اور اب اُس دکان سے ایک بلاک کے فاصلے پر تھا جہاں مجھے ظاہر دیا گیا۔ میں واپس گھوما۔ تاریک کھڑکی نے فاصلے سے مجھے خبر دی کہ دکان بند ہو چکی تھی۔ میں نے بلگرانو سٹریٹ میں ایک ٹیکسی کرایے پر لی۔ میں نیند سے عاری، دیوانگی کی زد میں اور خوش تھا۔

میں نے غور کیا کہ دولت سے کم مادی شے کوئی نہیں ہے کیوں کہ جتنی بھی مالیت کا سکہ ہو (فرض کیجئے بیس سینٹوز کا،) وہ ممکنہ مستقبلوں کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ میں یہ بات دہراؤں گا کہ دولت مجرد ہے۔ دولت فعل مستقبل ہے۔ یہ کسی مضافات میں ایک شام ہو سکتی ہے، یا برہمز کی موسیقی۔ یہ نقشے، یا شطرنج، یا کوفی ہو سکتی ہے۔ یہ اپیکٹیٹس کے الفاظ ہو سکتی ہے جو ہم میں سونے سے نفرت پیدا کریں۔ یہ پروٹیس ہے فیروس کے جزیرے پر موجود فرد سے کہیں زیادہ ہمہ گیر۔ یہ پیشین گوئی نہ کیے جا سکنے والا وقت ہے، اسلام یا پورچ کا کٹر وقت نہیں بلکہ برگسانین وقت۔ جبریت کے ماننے والے رد کرتے ہیں کہ کوئی فعل ممکنہ نہیں ہوتا ہے جیسے کوئی ایسا فعل جو ہو سکتا یا نہیں ہو سکتا۔ سکہ انسان کے آزاد ارادے کا استعارہ ہے۔ (مجھے یہ شک نہیں ہے کہ یہ خیالات ظاہر کے خلاف کسی چالاکی پر مبنی ہیں اور اس کے شیطانی اثرات کی ابتدائی صورتیں۔) ان خیالات میں غرق رہنے کے بعد میں سو گیا لیکن پھر میں نے ایک خواب دیکھا ایسے سکوں کا جن کی حفاظت پر افسانوی مخلوق گریفن مامور تھی۔

اگلے دن میں نے اندازہ لگایا کہ میں نشے میں تھا۔ میں نے سکے سے چھٹکارا پانے کا بھی فیصلہ کیا جس نے مجھے پریشانی میں مبتلا کیا تھا۔ میں نے اسے بغور دیکھا۔ اس میں کوئی بات بھی غیر معمولی نہیں تھی سوائے چند خراشوں کے۔ بہتر کام یہ ہو سکتا تھا کہ اسے باغ میں دفن کر دیا جائے یا کتب خانے میں کسی کونے

میں چھپا دیا جائے۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ خود کو اس کے مدار سے باہر نکال لوں۔ بہتر یہ تھا کہ اسے کھو دیا جائے۔ میں اس صبح پائیلریا قبرستان نہیں گیا۔ میں نے کانسٹی ٹیوشن تک زیر زمین راستہ اختیار کیا اور پھر کانسٹی ٹیوشن سے سان حوان اور بوڈو کے کونے تک۔ ایک جذباتی تحریک پر میں ارکیوزہ اترا اور مغرب اور جنوب کی طرف چلنے لگا۔ کسی منصوبے کے بغیر میں نے کئی ایک ٹکڑوں کے چکر کاٹے اور ایک گلی میں جو میری طرف دوسروں ہی کی طرح دیکھ رہی تھی، میں ایک خستہ حال سرائے میں داخل ہوا، برانڈی کے جام کی درخواست کی اور ظاہر کے سکے سے ادائیگی کی۔ میں نے اپنے موٹے شیشوں والے چشمے کے پیچھے اپنی آنکھوں کو نیم وا کر لیا، تاکہ نہ گھروں کے نمبر ہی دیکھ پاؤں اور نہ گلی کا نام۔ اس رات میں نے خواب آور دوا لی اور پر سکون نیند سویا۔

جون کے آخر تک میں ایک فنتاسیہ کی کہانی لکھنے میں مشغول رہا۔ اس میں دو یا تین معماتی ہیر پھیر یا روایتی علامتی نام شامل تھے۔ مثال کے طور پر خون کے بجائے اس میں آب تلوار کا ذکر تھا۔ اور سونے کو سانپ کا بستر کہا گیا۔ کہانی کو صیغہ متکلم میں پیش کیا گیا۔ راوی ایک تیاگی ہے جس نے انسانی معاشرے کو خیر آباد کہا اور ایک طرح کے ویرانے میں رہتا تھا۔ (اس جگہ کا نام گنی تا ہیدر تھا)

تیاگی کی زندگی کی سادگی اور خلوص کے پیش نظر ایسے لوگ بھی تھے جو اسے فرشتہ تصور کرتے تھے۔ لیکن یہ ایک سادہ مبالغہ تھا کیوں کہ کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو گناہ سے آزاد ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے اپنے ہی باپ کا گلا کاٹا تھا، جب کہ وہ بوڑھا شخص ایک بدنام جادوگر تھا جس نے جادو کے زور سے لامحدود خزانہ حاصل کر لیا۔ انسانوں کی جنونی حرص سے اس خزانے کی حفاظت ہی وہ مقصد ہے جس کے لیے ہمارے تیاگی نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ دن اور رات وہ اس خزانے کی پہرے داری کرتا ہے۔ جلد ہی، شاید بہت ہی جلد، اس کی پہرے داری اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ ستاروں سے اسے خبر ملتی ہے کہ ایسی تلوار بن چکی ہے جو اسے ٹکڑوں میں تقسیم کر دے گی۔ (تلوار کا نام گرام ہے۔) وہ خطابیہ انداز میں جو مسلسل پیچیدہ ہوتا جاتا ہے، اپنے جسم کی عمدگی اور لچک پذیری کے بارے میں غور و خوض کرتا ہے۔ ایک پیراگراف میں وہ بے دھیانی میں اپنی پپڑیوں کی بات کرتا ہے۔ ایک دوسرے پیراگراف میں وہ کہتا ہے کہ خزانہ، جس کی وہ حفاظت کر رہا ہے، چمکتا ہوا سونا اور سرخ چھلوں کی صورت میں ہے۔ آخر میں ہم سمجھ جاتے ہیں کہ تیاگی فیفنر سانپ ہے اور یہ کہ جس خزانے پر وہ براجمان ہے، وہ نائب لنگو کا خزانہ ہے۔ سگرڈ کا ظہور اس کہانی کو ایک فوری اختتام سے دو چار کر دیتا ہے۔

میں بتا چکا ہوں کہ اس معمولی کہانی کی بنت کاری کی مصروفیت نے (جس میں میں نے نام نہاد دانائی کے ساتھ فین فسل کے ایک یا دو شعر نقل کیے) مجھے اس سکے کو فراموش کرنے کا موقع دیا۔

ایسی راتیں بھی آتی ہیں جب میں خود کو اس بات کو فراموش کر دینے کے قابل محسوس کرتا ہوں کہ جسے میں نے خود ہی یاد کیا ہوتا ہے۔ کسی کام کو شروع کرنا آسان ہے، اسے مکمل کرنے کی نسبت۔ خود کو یہ سمجھانا البتہ بے سود تھا کہ نقلی چاندی کا یہ قابل نفرین سکہ ان سکوں سے مختلف نہیں تھا جو ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتے رہتے ہیں، ایک جیسے، لاتعداد، غیر مضر۔ اس خیال سے تحریک پا کر میں نے دیگر سکوں کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی لیکن ایسا نہیں کر سکا۔ مجھے ایک مایوس کن تجربے کے بارے میں یاد ہے جو میں نے چلی کے پانچ اور دس سینٹو کے سکوں اور یوراگوئے کے ونٹن کے ساتھ کیا تھا۔ جولائی کی سولہ تاریخ کو میں نے ایک پاؤنڈ سٹرلنگ حاصل کیا۔ دن میں مجھے اسے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن رات کو (اور بعد کی راتوں کو) میں نے اسے ایک عدسے کے نیچے رکھا اور بجلی کے طاقت ور لیمپ کی روشنی میں اس کا معائنہ کیا۔ بعد ازاں میں نے پنسل سے کاغذ پر اس کا خاکہ بنایا۔ لیکن اس کی عظمت، اور اژدھے اور سینٹ جارج کو تصویر کرنا میرے بس سے باہر تھا۔

میں نے اگست کے مہینے میں فیصلہ کیا کہ کسی نفسیاتی معالج سے رجوع کروں۔ لیکن اسے اپنی ساری مضحکہ خیز کہانی نہیں سنائی۔ میں نے کہا کہ مجھے بے خوابی کا مرض ہے۔ اور یہ کہ کسی نہ کسی شے کا خیال میرے دماغ میں سمایا رہتا ہے۔ جیسے پوکر چپ یا ایک سکہ۔

کچھ ہی عرصہ بعد میں نے سامیئنو سٹریٹ میں کتابوں کی ایک دکان میں جولیئس بارلاچ کی کتاب 'Urkunden zur Geschichte der Zahirsage.Breslau.1899' ڈھونڈ نکالی۔ اس کتاب میں میری بیماری کی تفصیل درج تھی۔ دیباچے میں مصنف نے ظاہر کے توہم سے متعلق دستاویز اور ہیبچٹ کی کلیات اور فلپ میڈوز ٹیلر کی تنقید کی کتاب کے اصل مسودے سمیت، سبھی دستاویزات کو ایک جاذب نظر دہ جلد میں اکٹھا کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ ظاہر پر اعتقاد کا منبع اسلامی تہذیب ہے اور لگتا ہے کہ یہ اٹھارھویں صدی سے متعلق ہے۔ (بارلاچ اس پیراگراف کی صداقت سے انکار کرتا ہے جو زوٹنبرگ کو ابوالفدا سے منسوب کرتا ہے۔) عربی میں ظاہر سے مراد 'قابل دید' ہے۔ اس حوالے سے یہ خدا کے ننانوے ناموں میں سے شامل ہے اور (مسلمانوں کے علاقوں میں) لوگ اسے ایسی' ہستیوں یا اشیا کے مظہر کے بیان کے لیے استعمال کرتے ہیں' جن میں فراموش نہ کیے جا سکنے کی غیر معمولی خصوصیت موجود ہوتی ہے، اور جس کا تصور بالآخر انسان کو مجنوں بنا دیتا ہے۔''

اس کی پہلی ناقابل تردید شہادت ایران کے لطف علی آذر سے ملتی ہے۔ 'آگ کا معبد' نامی سوانحی انسائیکلوپیڈیا کے واضح صفحات میں یہ ہمہ جہت درویش لکھتا ہے کہ شیراز میں ایک سکول میں پیتل کا زاویاتی

فاصلے ناپنے والا آلہ موجود ہے’ جسے اس طرح بنایا گیا ہے کہ جو کوئی اسے ایک بار دیکھ لیتا ہے، وہ پھر کسی بھی اور شے کے بارے میں سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ چناں چہ بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے سمندر کے گہرے حصے میں غرقاب کر دیا جائے کہ کہیں لوگ کائنات ہی کو فراموش نہ کر بیٹھیں۔’

میڈوز ٹیلر کی تحقیق زیادہ تفصیلی ہے (وہ حیدرآباد کے ناظم کی ملازمت میں تھا اور اس نے معروف ناول ’ایک ٹھگ کے اعترافات‘ لکھا۔) لگ بھگ 1832 میں بھوج کے مضافات میں ٹیلر نے پاگل پن یا بزرگی کو بیان کرنے کے لیے ایک غیر معمولی جملہ سنا کہ ”ضرور اس نے شیر کی طرف دیکھا تھا۔“ اسے بتایا گیا کہ اس میں حوالہ ایک جادوئی شیر کا ہے کہ جو کوئی اسے دیکھے گا، چاہے کتنی ہی دور سے، تباہ ہو جائے گا۔ کیوں کہ اسے دیکھنے والا زندگی کے آخری لمحے تک اس کے بارے میں سوچنے سے خود کو روک نہیں پائے گا۔ کسی نے بتایا کہ ان بدقسمتوں میں سے ایک شخص میسور بھاگ گیا جہاں اس نے کسی محل کی دیواروں پر شیر کی تصویر بنائی۔

برسوں بعد ٹیلر اس بادشاہت کے قید خانوں کی جانچ کر رہا تھا جہاں نٹر میں گورنر نے اسے ایک قید خانہ دکھایا جہاں فرش پر، دیواروں اور چھت پر تیز رنگوں سے جنھیں وقت محو کرنے سے پہلے زیادہ چمکدار بنا رہا تھا، ایک مسلمان فقیر کی بنائی ہوئی ایک طرح کے لامحدود شیر کی تصویر تھی۔ یہ شیر ایک انتہائی چکردار انداز میں بہت سے شیروں سے مل کر بنا تھا۔ یہ شیروں پر محیط تھا، شیروں میں گھرا ہوا تھا اور اس میں سمندر اور کوہ ہمالیہ اور فوجیں تھیں جو دیگر شیروں کو ظاہر کر رہی تھیں۔ مضور کئی سال پہلے اسی قید خانے میں فوت ہوا۔ وہ سندھ سے یا شاید گزرات سے آیا تھا اور اس کا اصل مقصد دنیا کا ایک نقشہ تیار کرنا تھا۔ بے شک اس کی نشانیوں کو اس دیوہیکل تصویر میں شناخت کیا جا سکتا تھا۔

ٹیلر نے یہ کہانی فورٹ ولیم کے محمد الیمنی کو سنائی۔ محمد الیمنی نے اسے بتایا کہ دنیا میں کوئی شے ایسی تخلیق نہیں ہوئی جس میں ظہیر (کہ ٹیلر نے اسے یونہی لکھا ہے) کی خصوصیات موجود نہ ہوں۔ لیکن ذات خداوندی دو اشیا کو بیک وقت موجود ہونے کی اجازت نہیں دیتی جبکہ اکیلی شے ہی انسانی گروہوں کو مسحور کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اس نے کہا کہ ظاہر ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ معصومیت کے دور میں یہ ایک دیوتا ’یوق‘ تھا۔ بعد ازاں یہ ایک پیغمبر ’جوراسان‘ تھا جو پتھروں سے سجا ایک سنہری نقاب پہنا کرتا تھا (بارلاج نے دیکھا کہ یوق کا قرآن مجید میں بھی ذکر موجود ہے 71-23، اور وہ پیغمبر المکنہ یعنی نقاب پوش تھے۔ اور یہ کہ فلپ میڈوز ٹیلر کے حیران کن مخبر کے سوا کسی نے انھیں ظاہر سے منسوب نہیں کیا تھا۔) اس نے یہ بھی بتایا کہ خدا مخفی ہے۔

میں نے بارلاچ کا کتا بچہ پڑھا ہے۔ بلکہ اسے بار بار پڑھا۔ مجھے اپنے احساسات بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اپنی مایوسی یاد ہے جب میں نے محسوس کیا کہ اب میرا بچنا محال ہے۔ صرف یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اپنی خستہ حالی کے لیے میں خود کو ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتا۔ مجھے ان سے حسد محسوس ہوا جن کا ظاہر، سکہ نہیں تھا بلکہ سنگ مرمر کا ٹکڑہ، یا ایک شیر تھا۔ ایک شیر کے بارے میں نہ سوچنا کتنا آسان تھا۔ اور مجھے وہ عجیب بے چینی بھی یاد ہے جس کے ساتھ میں نے یہ کتا بچہ پڑھا: ”گلستان راز کا ایک شارح کہتا ہے کہ جس کسی نے ظاہر کو دیکھ لیا، وہ جلد ہی گلاب کو بھی دیکھے گا۔ وہ عطار کے اسرار نامہ میں سے ایک شعر کا حوالہ دیتا ہے: ’ظاہر گلاب کا سایہ اور نقاب کا اوڑھنا ہے۔“

کلیمنٹینا کے گھر اس رات میں اس کی چھوٹی بہن مسز اباسکل کو وہاں نہ پا کر حیران ہوا۔ اکتوبر کے مہینے میں اس کی ایک سہیلی نے مجھے بتایا۔ ”بے چاری جولی۔ بہت عجیب ہو گئی تھی۔ انھیں اس کو اوپر کمرے میں بند کرنا پڑا۔ وہ ان نرسوں کی موت کا سبب بننے کو تھی جو اسے چمچ سے خوراک پلاتی تھیں۔ کیوں کہ وہ ایک سکے کے بارے میں گفتگو کرتی رہتی تھی، مورینا سیکمین کے شوفر کی طرح۔“

وقت جو عام طور پر یادوں کو محو کرتا ہے، صرف ظاہر کی یاد کو گہرا کرتا ہے۔ ایسا وقت تھا جب میں اس کے سامنے کے اور پیچھے کے رخ کو دیکھ سکتا تھا۔ اب میں انھیں بیک وقت دیکھ پاتا ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ ظاہر شیشے کا بنا ہوا ہے بلکہ یہ کسی ایک چہرے کا معاملہ نہیں ہے جسے کسی دوسرے پر عائد کر دیا جائے۔ اس کے بجائے وجہ یہ ہے کہ میری نظر کروی ہے جس کے درمیان میں ظاہر موجود ہے۔ جو کچھ بھی ظاہر کے علاوہ ہے، وہ مجھ تک حصوں بخروں میں پہنچتا ہے جیسے بہت فاصلے سے آ رہا ہو۔ کلیمنٹینا کا مغرور امیج، جسمانی درد۔

ٹینی سن نے ایک بار کہا تھا کہ اگر ہم کسی ایک پھول کو سمجھ سکیں تو پھر ہم سمجھ لیں گے کہ ہم کیا ہیں اور یہ دنیا کیسی ہے۔ شاید اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی ایسی حقیقت نہیں ہے، چاہے وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، جس میں عالمی تاریخ اور سبب وعلل کا لامحدود تسلسل موجود نہ ہو۔ شاید اس کا مطلب یہ تھا کہ ظاہری دنیا ہر مظہر میں مضمر ہے جیسے شوپن ہار کے مطابق ارادہ ہر شے میں موجود ہے۔

یہودی عارفانہ روایت کبالہ کے ماننے والے کہتے ہیں کہ انسان ایک مختصر ترین اکائی ہے، کائنات کا ایک علامتی آئینہ۔ ٹینی سن کے مطابق ہر شے ہوگی۔ ہر شے، حتی کہ ناقابل برداشت ظاہر بھی۔

1948 سے پہلے جولیا کی حالت مجھ جیسی ہوگی۔ انھیں مجھے خوراک دینی اور لباس پہنانا پڑے گا۔ میں نہیں جان پاؤں گا کہ آیا یہ سہ پہر ہے یا صبح۔ میں نہیں جان پاؤں گا کہ بورخیس کون تھا۔ اس منظرنامے کو

دہشت ناک کہنا ایک مغالطہ ہے کیوں کہ ان میں کوئی بھی صورت حال میرے لیے باقی نہیں رہے گی۔ ایسا بھی کہا جاسکتا ہے کہ انستھیزیا میں مبتلا شخص تب درد محسوس کرے گا جب اس کی کھوپڑی کھولی جاتی ہے۔ میں تب کائنات کا مزید ادراک نہیں کر پاؤں گا۔ میں صرف ظاہر ہی کا ادراک کر پاؤں گا۔

تصوریت پسندوں کی تعلیمات کے مطابق ’زندگی گزارنا‘ اور ’خواب دیکھنا‘ جیسے الفاظ، باہم مماثل ہیں۔ میں ہزاروں شبیہوں میں سے ایک تک پہنچوں گا۔ ایک انتہائی پیچیدہ خواب سے مکمل سادہ خواب تک۔ دوسرے یہ خواب دیکھیں گے کہ میں پاگل ہوں۔ میں ظاہر کا خواب دیکھوں گا۔ جب کہ روئے عرض پر سبھی انسان دن رات ظاہر کے بارے میں سوچتے ہیں، تو کیا خواب ہوگا اور کیا حقیقت، زمین یا ظاہر؟

میں رات کے خالی لمحوں میں گلیوں میں چل پھر سکتا ہوں۔ طلوع آفتاب مجھے گارے پارک کے کسی بنچ پر حیرت زدہ کرسکتا ہے، اسرار نامہ کے بند کے بارے میں سوچتے ہوئے (یا سوچنے کی کوشش کرتے ہوئے) جس میں کہا گیا ہے کہ ظاہر گلاب کا سا ہے اور نقاب کا اوڑھنا ہے، اسی سے جڑی ہوئی ایک بات کا اضافہ کرتا ہوں کہ خود کو خدا کی ذات میں گم کر دینے کے لیے صوفی اپنے ہی ناموں کا یا ننانوے خدائی ناموں کا ورد کرتے ہیں جب تک کہ وہ اس کے لیے اپنی معنویت نہ کھو دیں۔ میں اس راستے پر سفر کرنے کا خواہش مند ہوں۔ شاید میں محض اسے بار بار سوچنے کے عمل کے ذریعے اس سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہوجاؤں۔ شاید اس سکے کے پردے میں مجھے خدا مل جائے۔

خورخے لوئیس بورخیس
انگریزی سے ترجمہ : محمد عاصم بٹ

الف

اوہ خدایا، میں چاہوں تو خود کو اخروٹ کے چھلکے میں سمولوں اور لامحدود علاقے کا بادشاہ تصور کروں۔

ہیملٹ، II، 2

لیکن وہ ہمیں یہ پڑھائیں گے کہ ابدیت زمانہ حال ہی کا ٹھہر جانا ہے یعنی Nunc-stans (جیسا کہ مختلف مکاتب اسے عنوان دیتے ہیں۔) جسے نہ ہی وہ، نہ کوئی دوسرا سمجھ پاتا ہے، کم از کم اس سے زیادہ تو نہیں کہ وہ ’مکان‘ کی لامحدود عظمت کے لیے یہ اصطلاح Hic-stans استعمال کریں۔

لیوی آتھم، IV، 46

فروری کی ایک جلتی ہوئی صبح جب بیٹرز ویٹربو فوت ہوئی، ایسی ذہنی اذیت کو برداشت کرنے کے بعد کہ جس نے ایک لمحے کے لیے بھی اس میں خود ترحمی یا خوف پیدا نہ ہونے دیا، تو میں نے دیکھا کہ کانسٹی ٹیوشن پلازہ کے اطراف میں لگے بل بورڈ امریکی سگریٹوں کے کسی موجودہ یا نئے برانڈ کی تشہیر کر رہے تھے۔ اس بات سے مجھے تکلیف ہوئی کیوں کہ میں نے محسوس کیا کہ کشادہ اور لامختتم کائنات تو پہلے ہی سے اس سے دور ہٹنے لگی تھی اور یہ معمولی تبدیلی ایک لامختتم سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔ میں نے یہ بات پر ملال بے وقعتی کے ساتھ سوچی۔ میں جانتا تھا کہ کبھی کبھار میرا یہ بے ثمر اخلاص اسے کھلتا تھا۔ اب چوں کہ وہ فوت ہو چکی تھی، میں خود کو اس کی یاد کے لیے مختص کر سکتا ہوں، کسی امید بلکہ کسی شرمندگی کے بغیر۔

میں نے یاد کیا اپریل کی تیرا تاریخ اس کی سالگرہ کا دن۔ اب اس دن گارے سٹریٹ میں اس کے گھر جانا اور اس کے باپ اور اس کے اول کزن کارلوس ارجنٹینو ڈینیری کو سلام کہنا، ایک ناقابل مذمت اور شاید ناگزیر شائستگی کا مظاہرہ ہو گا۔ ایک بار پھر میں لدے پھندے مختصر ڈرائنگ روم کے نیم اجالے میں بیٹھ کر انتظار کروں گا، ایک بار پھر میں اس کی بہت سی تصویروں کی تفصیلات کو بغور ملاحظہ کروں گا۔ بیٹرز وائٹربو کی یک رُخی اور رنگین تصویر، بیٹرز نقاب پہنے ہوئے، 1921 کے کارنیوال کے دوران، بیٹرز رابرٹو الیسینڈری کے ساتھ اپنی شادی کے دن، بیٹرز اپنی طلاق کے بعد ٹرف کلب میں دوپہر کے کھانے کے موقع پر، بیٹرز ڈیلیا سان مارکو پورسل اور کارلوس ارجنٹینو کے ساتھ کیولمز کے ساحلی ریستوران میں، بیٹرز گود میں رکھنے والے کتے پیکنگیز کے ساتھ جو اسے ویلیگاس ہائیڈو نے دیا تھا، بیٹرز کے سامنے کے رُخ اور تین اطراف سے تصویریں، مسکراتے ہوئے، ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے ہوئے۔ جیسا کہ ماضی میں ہوتا تھا مجھے وہاں اپنی موجودگی کا جواز فراہم کرنے کے لیے معمولی کتابوں کا نذرانہ پیش نہیں کرنا پڑے گا۔ کتابیں جن کے جڑے ہوئے صفحات میں پہلے ہی کاٹ لیتا تھا تا کہ ایسا نہ ہو کہ مہینوں بعد وہ مجھے یونہی بغیر کٹے ہوئے صفحات کے ساتھ دکھائی دیں۔

بیٹرز وائٹربو 1929 میں فوت ہوئی۔ اس وقت سے کوئی بھی اپریل کی تیرا تاریخ ایسی نہیں گزری جب میں اس کے گھر نہ گیا ہوں گا۔ میں پورے سوا سات بجے اس کے گھر جاتا اور کوئی پچیس منٹ وہاں ٹھہرتا۔ ہر سال میں کچھ زیادہ دیر سے وہاں پہنچتا ہوں اور کچھ دیر زیادہ ٹھہرتا ہوں۔ 1933 میں موسلا دھار بارش میری اعانت کو آئی اور انھوں نے مجھے رات کے کھانے کے لیے روک لیا۔ قدرتی طور پر میں نے اس اچھے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ 1934 میں آٹھ بجے کے بعد سانتافی کے شکر لگے بڑے کیک کے ساتھ وہاں پہنچا اور بلالحاظ رات کے کھانے تک وہاں ٹھہرا۔ یوں ان اداس اور بے کار کی شہوت انگیز سال

گرہ کے موقعوں پر جانے سے میں بتدریج کارلوس ارجینٹینو ڈنیری کا اعتماد جیت پایا۔

بیٹرز دراز قد، نحیف اور کچھ آگے جھکے ہوئے جسم کی تھی۔ اس کی چال میں (اگر متضاد خصوصیت کے ذکر کی اجازت ہو تو) ایک طرح کا وقار تھا، کچھا چھا واقع ہونے کا اشارہ سا۔ کارلوارجینٹینو زردرُو، فربہ، سفیدی مائل بالوں والا متناسب جسم کا انسان تھا۔ وہ بیونس ایریز کے جنوبی علاقے کے کنارے میں ایک کم رجوع کی جانے والی لائبریری میں معمولی حیثیت کا ملازم تھا۔ اس کا لہجہ تحکمانہ لیکن غیر متاثر کن تھا۔ حال ہی میں اس نے اپنی راتوں اور چھٹیوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ سارا وقت گھر پر گزارنا شروع کر دیا تھا۔ دو نسلوں کے گزر جانے کے بعد بھی اس کے لہجے میں اطالوی 'ایس' اور واضح اطالوی انداز باقی تھے۔ اس کی ذہنی فعلیت مسلسل، متنوع، گہری اور سب سے بڑھ کر بے معنی تھی۔ وہ بے کار تمثیلات اور معمولی اخلاقی اقدار سے وابستہ تھا۔ اس کے (بیٹرزی کی طرح) بڑے خوب صورت اور عمدہ ساخت کے ہاتھ تھے۔ کئی مہینوں تک وہ پاؤل فورٹ کے زیر اثر رہا۔ وہ اس کے گیتوں کی نسبت اس کی غیر معمولی شہرت سے زیادہ متاثر تھا۔ ''وہ شاعروں کا شہزادہ ہے۔'' ڈینری احمقانہ طور پر یہ بات دہراتا۔ ''تم بے کار ہی اسے کم تر ثابت کرنے کی کوشش کرو گے ۔۔ لیکن نہیں، کتنا ہی سر پٹک لو، تمہاری انتہائی سنگین ملامت بھی اسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتی۔''

اپریل 1941 کی تیرا تاریخ کو شکر لگے ہوئے کیک کے ساتھ میں نے ارجنٹائنی کوگنیک کی ایک بوتل کا بھی اضافہ کر لیا۔ کارلوس ارجینٹینو نے اسے چکھا، اور اس کے مزیدار ہونے کا اعلان کیا اور چند ہی جام لینے کے بعد جدید انسان کی عظمت و رفعت کے گن گانے لگا۔

''میں اسے دیکھتا ہوں کہ،'' وہ خاص بے لگام جوش و خروش سے بولا، ''وہ اپنی اندرونی مقدس جائے پناہ میں دبکا بیٹھا ہے، جیسے کسی قلعے کے برج میں، جب کہ اس کے پاس سبھی کچھ ہے، ٹیلی فونز، ٹیلی گرافس، فونوگرافس، بے تار برقی آلات، متحرک فلموں کی سکرینیں، سلائیڈ پراجیکٹر، فرہنگیں، اوقات کار کی فہرستیں، دستی کتابچے، بلیٹن، ۔۔۔۔''

اتنے احمقانہ، اس کے خیالات مجھے لگے، اتنے خود پسندانہ، اور اتنی تفصیلی وضاحتوں والے کہ میں نے انھیں فوراً ہی ادب سے وابستہ قرار دیا اور اس سے کہا کہ وہ انھیں لکھ کیوں نہیں لیتا۔ جیسا کہ متوقع بھی تھا، اس نے جواب دیا کہ ایسا وہ پہلے ہی سے کر چکا تھا۔ کہ یہ خیالات اور بہت سے دوسرے بھی جوان سے کم حیران کن نہیں تھے، دیباچے یا پہلے باب یا کہیں زیادہ سادگی کے ساتھ اس نظم کے ابتدائی بند میں جگہ پا چکے تھے جس پر وہ کئی برسوں سے کام کر رہا تھا، تن تنہا، کسی تشہیر، کسی شور شرابے کے بغیر، صرف اپنے اس

جڑواں عملے کی ہمراہی میں جسے عام طور پر محنت، اور تنہائی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ سب سے پہلے اس نے اپنے تخیل کے بند کھولے۔ پھر اوزاروں سے لیس ہو کر وہ فائل کی طرف متوجہ ہوا۔ نظم کا عنوان ’دھرتی‘ تھا۔ اس میں زمین کا بیان شامل تھا اور بلا شبہ اس میں خوش نما انحرافات اور واضح حذفی علامتوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔

میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے اس میں سے کچھ پڑھ کر سنائے، چاہے کوئی مختصر بند۔ اس نے اپنے لکھنے کی میز کا دراز کھولا، کاغذوں کا بھاری پلندہ باہر نکالا۔ بڑے حجم کے کاغذوں کا پلندہ جن پر عنوان کریسوس ٹو مولیفیر لاچھپری کا نام چھپا ہوا تھا اور مترنم اطمینان قلبی کے ساتھ پڑھنا شروع کیا، ’’میری آنکھیں، یونانیوں کی آنکھوں کی طرح، انسانی قصبوں اور شہرت سے آگاہ ہیں، یہ کارہائے نمایاں روشنی میں نہائے دنوں کی مانند، زردی میں ڈھل جاتے ہیں، میں کسی حقیقت کو تبدیل نہیں کرتا یا نام کو غلط نہیں لکھتا، جس سفر پر میں روانہ ہوا ہوں، وہ autour de ma chambre ہے۔

’’میرے حساب سے ایک انتہائی دلچسپ بند‘‘ اس نے اپنا بیان دیتے ہوئے کہا، ’’ابتدائی مصرعہ ہی پروفیسروں، ماہرین تعلیم اور ہیلنیاتی مفکروں سے داد سمیٹ لے گا، چھوٹے موٹے علما اور عوام کی تو بات ہی کیا۔ دوسرا مصرعہ ہومر سے ہیسوئیڈ تک روایت کا احاطہ کرتا ہے، (آغاز ہی میں معلمانہ شاعری کے امام کو خراج تحسین) اس عمل میں پھر سے جان ڈالتے ہوئے جس کی جڑیں صحائف میں پیوست ہیں، شماریات، مجموعہ بندی اور ذخیرہ اندوزی۔ تیسرا مصرعہ، بہت تفصیلی، زوال پذیر، خاص قسم کے مسلک کی مثال، دو برابر نصف مصرعوں پر مشتمل۔ چوتھا مصرعہ صحیح طور پر ذولسانی، مجھے خاص تفریح کی لذتوں کے شائق اذہان کی مضبوط پشت پناہی کی یقین دہانی کراتا ہے۔ مجھے پوری ایمانداری کے ساتھ دوسرے اور چوتھے مصرعے کی عجیب شعریت اور اس علمیت پر بات کرنی چاہئے جو کسی علمی خودنمائی کے بغیر مجھے اجازت دیتی ہے کہ ان چار مصرعوں میں ادبی روایت سے مملو تیس صدیوں کا احاطہ کرتے ہوئے تین عالمانہ اشاروں کو ٹھونس دوں، پہلا اوڈیسی کی طرف، دوسرا ‘Works and Days’ کی طرف اور تیسرا سیووئے کے رہائشی زیویئر ڈی میستری کے خوش ادا قلم سے نکلے ہوئے لافانی شاہکار کی طرف۔ ایک بار پھر مجھے احساس ہوا کہ جدید فن کو قہقہے کے مرہم، یعنی لطیفے کی ضرورت ہے۔ واضح طور پر گولڈ ونی ہی چھایا ہوا ہے۔‘‘

اس نے کئی اور بند بھی پڑھ کر سنائے جن میں سے ہر ایک کا وہ گرویدہ تھا اور ان کی اس نے تفصیلی وضاحتیں بھی پیش کیں۔ حالاں کہ ان میں کوئی بات غیر معمولی نہیں تھی۔ وہ پہلے بند سے کم گھٹیا نہیں تھے۔ التجا، استغنا اور اتفاق اس کی تحریر میں شامل تھے۔ میں نے دیکھا کہ ڈنیری کا حقیقی کام اس کی شاعری میں نہیں تھا

بلکہ ان توجیہات کی اختراع میں تھا، جو وہ شاعری کی مدح کو باجواز بنانے کے لیے کرتا تھا۔ بے شک اس کی کوشش کے اس دوسرے حصے نے تحریر کو اس کی نظروں میں بدل دیا گو دوسروں کی نظر میں نہیں۔ ڈنیری کا بیان کرنے کا اسلوب غیر محتاط تھا۔ لیکن وزن اور بحر پر اس کے انتہائی اصرار سے اس غیر محتاط پسندی کا کچھ ازالہ ممکن ہوتا تھا۔

(میری یادداشت میں ایک طنزیہ بند کے چند مصرعے گونج رہے ہیں جن میں اس نے برے شاعروں کو بے نقط سنائی تھیں۔ ان پر یہ الزام لگانے کے بعد کہ وہ اپنی نظموں کو علمیت کی سپریں پہنا دیتے ہیں، اور اپنے بے کار پروں کو فضول میں پھڑ کاتے رہتے ہیں، اس نے اس مصرعے پر اپنی بات ختم کی :

لیکن وہ فراموش کر دیتے ہیں، ایک بنیادی حقیقت، خوب صورتی۔

(اس نے مجھے خود بتایا کہ) اس نظم کو دلیری کے ساتھ شائع کرنے سے اسے صرف یہی خوف باز رکھتا ہے کہ اہل ارادے والے دشمن کی نہایت مضبوط فوجیں تیار ہو جائیں گی۔

زندگی میں صرف ایک بار مجھے موقع ملا کہ polyolbion کے پندرہ ہزار اشعار دیکھ سکوں۔ وہ جغرافیائی نظم جس میں مائیکل ڈریٹن نے انگلستان کے پودوں، حیوانوں، دریاؤں، پہاڑوں، فوجوں اور خانقاہوں کی تاریخ رقم کی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ محدود مگر ضخیم کتاب کارلوس ارجینٹینو کے ایسے ہی کام کی نسبت کم بور کن ہے۔ ڈنیری کے ذہن میں تھا کہ وہ اس سیارے کے مکمل چہرے کو اس میں نظم کر دے اور 1941 تک بہت تیزی سے کوئینز لینڈ کی ریاست کی ایکڑوں زمین، دریائے اوب کے ساتھ ساتھ ایک میل لمبا راستہ، ویرا کروز کے شمال میں گیس تیار کرنے والا پلانٹ، بیونس ایریز میں کونسپسین کے کلیسائی حلقے میں معروف دکانوں، ارجنٹائن کے دار الخلافہ کے بلگرانو والے حصے میں میریانا کیمبیسر ز ڈی ایلویئر کے بنگلے، اور معروف برائٹن ایکویئریم سے قریب ہی واقع ترکی غسل خانوں کو شامل کر چکا تھا۔ اس نے اس کے آسٹریلوی حصے میں سے لمبے مصرعوں والے چند حصے سنائے اور ایک مقام پر اپنے ہی اختراع کیے ہوئے لفظ کی مدح کی، یعنی ایک رنگ ’آسمانی سفید‘، جو اس کے خیال میں ’آسمان کا اشارہ ہے، جو آسٹریلیا کے منظر نامے میں انتہائی اہمیت کا حامل عنصر ہے‘‘ لیکن ان پھیلے ہوئے بے جان بندوں میں اس نام نہاد آگورل کینٹو کا سا متعلقہ جوش و خروش بھی موجود نہیں تھا۔ آدھی رات کے قریب میں وہاں سے اٹھ آیا۔

دو اتواروں کے بعد ڈنیری نے مجھے فون کیا۔ شاید اپنی زندگی میں پہلی بار۔ اس نے تجویز پیش کی کہ ہم چار بجے کے قریب اس کے گھر کے برابر ہی واقع سیلون، جسے ترقی پرست زونینو اور زنگری جنھیں آپ بلاشبہ اس کے مالک مکان بھی کہہ سکتے ہیں، عوام کے لیے کھول رہے ہیں، میں کاک ٹیل پینے کے لیے جمع

ہوں۔ یہ ایسی جگہ ہے جہاں تم ضرور جانا چاہو گے۔''

کسی طرح کی مسرت سے زیادہ، راضی برضا ہونے کی کیفیت کے زیر اثر میں نے یہ دعوت قبول کر لی۔ وہاں اپنے لیے میز تلاش کرنا مشکل تھا۔ 'سیلون' سفاکانہ حد تک جدید کہلایا جا سکتا تھا، اور اس سے کچھ ہی کم بدصورت تھا جتنی میں نے اس سے توقع کی تھی۔ قریب کی میزوں پر پرجوش گاہک اس رقم کی بابت بے تکان بات کر رہے تھے جو زونینو اور زنگری نے بلا سوچے سمجھے اس کی آرائش و زیبائش پر خرچ کر دی تھی۔ کارلوس ارجنٹینیو نے اس میں روشنی کے انتظامات پر حیران ہونے کا ڈھونگ کیا (جن سے میرے خیال میں وہ پہلے ہی آگاہ تھا) اور اس نے مجھ سے خاص سنجیدہ لہجے میں کہا، ''نہ چاہتے ہوئے بھی تمھیں یہ بات ماننی پڑے گی کہ عوام کی نظروں سے کہیں اوجھل کئی دوسری جگہوں کی طرح ان جگہوں میں بھی کوئی الگ بات ہے۔''

پھر اس نے اپنی نظم میں سے چار یا پانچ مختلف اقتباسات سنائے۔ اس نے ان میں اپنی مخصوص لفظی نمائش کے قانون کے مطابق ترامیم کیں جیسے لفظ نیلا جہاں مناسب معلوم ہو رہا تھا، اس کی جگہ اس نے 'نیلگوں'، 'گہرا آسمانی' اور 'گہرا نیلا' لکھ دیا۔ لفظ 'دودھیا' اس کے لیے بہت ہلکا تھا۔ اس چھپریل کا پرجوش انداز میں خاکہ کھینچتے ہوئے جہاں اُون کو دھویا جاتا ہے، اس نے یہ الفاظ استعمال کیے جیسے ''دودھ جیسا'، 'شیرہ دار'۔ اس کے بعد اس نے سیدھے سیدھے کتابوں میں دیباچے شامل کرنے کے ہمارے جدید خبط کی مذمت کی۔ ''ایک روایت جسے مزاح کے شہزادے کیخوتے کے پروقار دیباچے میں تضحیک کا نشانہ بنایا ہے۔''

اس نے اعتراف کیا کہ کسی نئی کتاب کے آغاز کے طور پر ایک توجہ کھینچنے والا دیباچہ وقیع ہو سکتا ہے، ''ایک تحریر جس پر معروف اہل قلم کے دستخط ہوں۔'' پھر بولا کہ وہ اپنی نظم کے ابتدائی بند شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تب مجھے اس کی غیر متوقع فون کال کی سمجھ آئی۔ ڈنیری مجھ سے اپنی بے کار تفصیلی نظم کا دیباچہ لکھنے کو کہنے والا تھا۔ میرا یہ خوف بے بنیاد ثابت ہوا۔ کارلوس ارجنٹینیو نے تحسین اور حسد کے ساتھ یہ کہا کہ وہ اس حیثیت کو جو الویرو میلان لیفینر کو ہر طبقے میں حاصل ہے، 'ٹھوس' کا لقب دینے میں باجواز ہے۔ اس سے اگر میں اصرار کروں تو وہ نظم پر چند ابتدائی الفاظ لکھنے میں خوشی محسوس کرے گا۔ رسوائی اور ناکامی سے بچنے کے لیے اس نے تجویز پیش کی کہ میں کتاب کی دو ناقابل تردید خصوصیات باضابطہ اکملیت اور سائنسی درستگی کو اپنا ترجمان بنا لوں۔ ''جس حد تک یہ استعاروں کا، محاوروں کا، رفعت کا باغ سچ کی ادائیگی کے لیے غیر ضروری تفصیلات کے لیے ناموافق ہے۔'' اس نے مزید کہا کہ بیٹریز بھی الویرو کی گرویدہ تھی۔

میں نے اس سے اتفاق کیا، شدید اتفاق، اور اس پر اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لیے کہا کہ میں

الویرو سے اگلے دن پیر کو بات نہیں کروں گا بلکہ جمعرات کا انتظار کروں گا جب ہم غیر رسمی طور پر رات کے کھانے کی ضیافت پر اکٹھے ہوں گے جو رائٹرز کلب کے ہر اجلاس کے بعد ہوتا ہے۔ (ایسی کوئی ضیافت کبھی نہیں ہوئی لیکن یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ یہ اجلاس جمعرات کو ہوتے تھے جس کا ثبوت کارلوس ارجینٹینو ڈنیری یومیہ اخباروں سے بھی حاصل کرسکتا تھا اور جس سے میرے وعدے کو حتمیت حاصل ہوئی۔) کچھ تو غیب دانی اور کچھ مکاری کے ساتھ میں نے کہا کہ دیباچے کا تقاضہ کرنے سے پہلے میں اس کام کا ایک خاکہ تیار کروں گا۔ ہم نے ایک دوسرے کو الوداع کہا۔

اس کے بعد نئے سرے سے اس بات پر غور کرتے ہوئے میں نے ممکنہ حد تک غیر جانب داری کے ساتھ ممکنہ متبادلات پر غور کیا جو یوں تھے ا : ۔الویرو سے بات کی جائے اور اسے بتایا جائے کہ بیٹریز کے ایک کزن نے (صاف خوش کلامی مجھے اس کا نام لینے کی گنجائش دے گی) ایک نظم لکھی ہے جس میں شور اور انتشار کے امکانات کو لامحدود انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ۲۔الویرو سے قطعاً کوئی بات نہ کی جائے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ کاہل مزاجی دوسرے متبادل ہی کو ترجیح دے گی۔

جمعہ کی صبح کو مجھے اس کے فون کا دھڑکا لگا رہا۔ مجھے یہ بات سوچ کر تکلیف ہوئی کہ یہ آلہ جو کبھی بیٹریز کی ناقابل فراموش آواز سناتا تھا، اب اپنی حیثیت سے گر کر جعل باز کارلوس ارجینٹینو ڈنیری کی بے کار اور شاید ناراض کٹ حجتی سننے کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔ خوش قسمتی سے کچھ بھی ایسا نہیں ہوا۔ سوائے اس کے اس شخص کے لیے میرے دل میں ناگزیر طور پر بغض پیدا ہوا جس نے مجھے اپنے لیے ایک نفیس کام کرنے کو کہا تھا لیکن پھر دوبارہ اس بارے میں استفسار تک نہیں کیا۔

بتدریج فون کا خوف کافور ہوا لیکن اکتوبر کے ایک دن یہ پھر سے بجا اور دوسری طرف کارلوس ارجینٹینو لائن پر تھا۔ وہ بہت زیادہ پریشان تھا۔ اتنا زیادہ کہ شروع میں مجھے اس کی آواز ہی کی شناخت نہیں ہو پائی۔ افسوس کے ساتھ مگر برہم آواز میں وہ ہکلا کر بولا کہ قابو سے باہر زونینو اور زنگری اپنے پہلے سے ہی کشادہ سیلون بار کو مزید پھیلانے کے ارادے سے اس پر قبضہ کرنا اور اسے گرا دینا چاہتے تھے۔

’’میرا گھر، میرا آبائی گھر، میرا قدیم اور دیرینہ گارے سٹریٹ کا گھر۔‘‘ وہ مسلسل دہرا رہا تھا جیسے الفاظ کی موسیقی نے اس کی توجہ اپنے دکھ سے ہٹا دی ہو۔

اس کے دکھ کو بانٹنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ پچاس سال کی عمر کے بعد ہر تبدیلی گزرتے ہوئے وقت کا ستعارہ بن جاتی ہے۔ اور پھر ایک ایسے گھر سے متعلق ایک منصوبہ، جو میرے لیے ہمیشہ بیٹریز سے جڑا ہوا ہو۔ میں نے اس دکھ کے نفیس احساس کو اس سے بانٹنے کی کوشش کی لیکن جیسے وہ مجھے سن ہی

نہیں رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر زونینو اور زنگری اس تباہی پر مصر ہیں، تو اس کا وکیل ڈاکٹر زُنّی ازخود ان پر مقدمہ دائر کر دے گا اور انھیں پچاس ہزار ڈالر کا ہرجانہ ادا کرنے پر مجبور کرے گا۔

زُنّی کے نام سے میں متاثر ہوا۔ اس کا ادارہ اگرچہ کیسر وز اور ٹیکوری جیسی عجیب جگہ موجود تھا، لیکن ایک پرانے اور معتبر ادارے کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس کام کے لیے زُنّی کی خدمات مستعار لے لی گئی ہیں؟ ڈنیری نے بتایا کہ وہ سہ پہر کو اسے فون کرے گا۔ تب ہچکچاتے ہوئے ایسی آواز میں جو ہم کسی پوشیدہ بات کو رازداری کے ساتھ بتانے کے لیے استعمال کرتے ہیں، اس نے بتایا کہ اس کی نظم اس گھر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی کیوں کہ اس کے گودام میں الف موجود ہے۔ اس نے وضاحت کی کہ الف، خلا میں موجود ایسا نقطہ ہے جو باقی سبھی نقاط کا احاطہ کرتا ہے۔

”یہ گودام میں ہے، ڈائننگ روم کے نیچے۔“ وہ بولتا چلا گیا اور اپنی پریشانی میں ایسا الجھا ہوا تھا کہ ساری خود پسندی بالائے طاق رکھ دی۔ ”یہ میرا ہے، میرا۔ میں نے اسے تب دریافت کیا جب میں بچہ تھا، خود سے کیا تھا۔ گودام کی سیڑھیاں اتنی گہری ہیں کہ میری آنٹی اور انکل نے مجھے ان کو استعمال کرنے سے منع کر دیا تھا۔ لیکن میں نے کسی کو کہتے سنا تھا وہاں ایک دنیا آباد ہے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اس بات میں اشارہ دنیا کے ایک پرانے طرز کے گلوب کی طرف تھا۔ لیکن تب میں نے سوچا تھا کہ وہ ایک نئی دنیا کی بات کر رہے ہیں۔ ایک دن جب گھر پر کوئی نہیں تھا، میں اس راز سے پردہ اٹھانے کے لیے نیچے اترا لیکن میرا پیر رپٹ گیا اور میں نیچے جا گرا۔ میں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو میرے سامنے الف تھا۔“

”الف“ میں نے دہرایا۔

”ہاں، زمین پر واحد جگہ جہاں سبھی جگہیں، ہر سمت سے دیکھی جا سکتی ہیں، ہر جگہ واضح، کسی الجھاؤ یا آمیزش کے بغیر۔ میں نے یہ راز اپنے تک ہی رکھا اور جب بھی موقع ملتا وہاں چلا جاتا۔ جب میں بچہ تھا، میں نے تب نہیں سوچا کہ یہ فضیلت مجھے اسے لیے عطا کی گئی ہے تاکہ میں ایک نظم لکھ سکوں۔ زونینو اور زنگری مجھے اس شے سے علیحدہ نہیں کر سکتے، جو میری ہے۔ نہیں، ہزار بار نہیں۔ قانونی ضابطہ ہمارے حق میں ہو تو ڈاکٹر زُنّی ثابت کر دے گا کہ الف ناقابل انتقال ہے۔“

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”لیکن گودام کیا بہت تاریک نہیں ہے۔“

”سچ کسی بند ذہن کی پہنچ سے باہر ہے۔ اگر کائنات میں تمام جگہیں الف میں ہیں، تو پھر تمام ستارے، تمام لالٹینیں، روشنی کے تمام ذرائع بھی اسی میں ہیں۔“

”ذرا دم لو۔ میں ابھی آتا ہوں اسے دیکھنے۔“

اس کے نہ کہنے سے پہلے ہی میں نے ریسیور نیچے رکھ دیا۔ کسی ایک حقیقت سے مکمل آگاہی آپ کو کبھی کبھار اس قابل بنا دیتی ہے کہ آپ بہت سی معاون مگر پہلے سے غیر مشتبہ باتوں کو سمجھ لیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اب تک کیوں یہ خیال مجھے نہ آیا کہ کارلوس ارجینٹینو دماغی توازن کھو چکا تھا۔ جیسے کہ وائٹربو کے سبھی رہائشی ہوتے ہیں، اگر آپ اس بات کی تہہ میں جائیں تو۔ بیٹریز (میں اکثر خود کہتا ہوں) ایک عورت تھی، ایک بچی تھی، غیب دانی کی تقریباً پراسرار قوتوں کے ساتھ، لیکن بھلکڑ پن، پراگندہ خیالی، نفرت اور سفاکی کی رمق بھی اس میں موجود تھی، اور شاید ان کے لیے کسی مرضیاتی توجیہ کی ضرورت تھی۔ کارلوس ارجینٹینو کے پاگل پن نے مجھے بد اندیش سرخوشی سے بھر دیا۔ اندر ہی اندر کہیں ہم ہمیشہ ایک دوسرے سے نفرت کا تعلق رکھتے ہیں۔

گارے سٹریٹ میں ملازمہ نے مجھے کچھ انتظار کرنے کو کہا۔ حسب معمول اس کا آقا گودام میں تصویریں ڈویلپ کر رہا تھا۔ بڑے گلدان کے برابر، جس میں کوئی پھول نہیں تھا، ایک نہ بجائے جانے والے پیانو پر بیٹریز کی بڑی تصویر بھڑکیلے رنگوں میں مسکرا رہی تھی (جو محض ماضی کی ایک نشانی ہی نہیں تھی بلکہ وقت کی حد سے ماورا تھی۔) وہاں کوئی ہمیں دیکھنے والا نہیں تھا۔ لگاوٹ کی لہر میں میں پورٹریٹ کے قریب ہوا اور بولا ’’بیٹریز، بیٹریز ایلینا، بیٹریز ایلینا وائٹربو، پیاری بیٹریز، بیٹریز ہمیشہ کے لیے جا چکی ہو، یہ میں ہوں، میں بورخیس۔‘‘

تھوڑی ہی دیر میں کارلوس آیا۔ وہ خشک روی سے مجھ سے مخاطب ہوا۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ اس کا دھیان الف کے کھو جانے کے دھڑکے ہی میں اٹکا ہوا تھا۔

’’پہلے نام نہاد کوگنیک کا ایک جام‘‘ اس نے حکم جاری کیا، ’’اور پھر تم گودام میں چلے جانا۔ میں تمھیں تنبیہ کرنا چاہتا ہوں کہ تمھیں اپنی پشت کے بل لیٹنا ہوگا۔ مکمل تاریکی، مکمل سکوت، اور آنکھوں کی خاص موافقت بھی ضروری ہے۔ فرش سے تم آنکھوں کو انیسویں زینے پر مرکوز کرو گے۔ ایک بار جب میں تمھیں وہاں چھوڑ دوں گا تو میں سقفی دروازے کو نیچے کر دوں گا اور تم وہاں بالکل تنہا ہو گے۔ تمھیں چوہوں وغیرہ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، حالاں کہ میں جانتا ہوں کہ تم ڈرو گے۔ ایک دو منٹوں ہی میں تم الف کو دیکھ لو گے، کیمیادانوں اور سریت پسندوں کی کائنات اصغر، ہماری حقیقی کہاوتی دوست، multum in
‘‘parvo

ڈائننگ روم میں اکٹھے ہونے پر اس نے کہا ’’بے شک، اگر تم اسے نہ دیکھ پاؤ، تو تمھاری نااہلی میرے تجربے کی تردید نہیں کر سکتی۔ اب تم نیچے چلو۔ تھوڑی ہی دیر میں تم بیٹریز کی سبھی شبیہوں کو ایک ساتھ

دیکھ لوگے۔"

اس کی فضول گفتگو سے تنگ آ کر میں فوراً ہی چل دیا۔ گودام جو سیڑھیوں سے معمولی سا ہی زیادہ کشادہ ہوگا، ایک گڑھے جیسا تھا۔ میری آنکھیں تاریکی میں بے کار ہی اس گلوب کو تلاش کرتی پھریں، جس کا ذکر کارلوس ارجینٹینو نے کیا تھا۔ خالی بوتلوں کے چند ڈبے اور سن کی چند بوریاں ایک کونے میں دھری تھیں۔ کارلوس نے ایک بوری اٹھائی، اسے دہرا کیا اور ایک خاص مقام پر بچھا لیا۔

"سرہانے کے طور پر" وہ بولا، "یہ پھٹا پرانا ہے لیکن اگر یہ آدھا انچ بھی اونچا ہوگا تو تم کچھ بھی نہ دیکھ پاؤ گے اور تم یہاں لیٹے رہو گے، پشیمان اور مضحکہ خیز۔ تو اب ٹھیک ہے، خود کو چت لٹا لو یہاں فرش پر اور انیس سیڑھیاں گنو۔"

میں نے یہ مضحکہ خیز اہتمام کیا اور آخر کار وہ چلا گیا۔ سفلی دروازہ احتیاط سے نیچے گرا لیا گیا۔ روشنی کی ایک درز کے باوجود جو میں نے بعد ازاں دریافت کی، وہاں مکمل اندھیرا تھا۔ پہلی بار میں نے اس خطرے کا احساس کیا جس میں میں گر چکا تھا۔ میں نے ایک دیوانے کے ہاتھوں خود کو ایک گودام میں مقید کروا لیا تھا، زہر سے بھرا گلاس پینے کے بعد۔ میں جانتا تھا کہ کارلوس کی بلند بانگ شیخی سے یہ گھمبیر خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ ہوسکتا تھا میں اس موعودہ حیرت کدے کا دیدار نہ کر پاؤں۔ اپنے پاگل پن کو آشکار ہونے سے بچانے اور یہ ماننے سے اجتناب کرنے کے لیے کہ وہ پاگل تھا، کارلوس مجھے قتل بھی کرسکتا تھا۔ میں نے دہشت محسوس کی جسے میں نے اپنی غیر آرام دہ حالت کا نتیجہ قرار دیا، نہ کہ کسی زہر کا نتیجہ۔ پھر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ جب انھیں کھولا تو الف میرے سامنے تھا۔

میں اپنی کہانی کے ناگفتنی حصے تک آ پہنچا تھا۔ اور یہاں بطور مصنف میری پریشانی کا آغاز ہوا۔ تمام زبان استعاروں کا ایک سیٹ ہے جسے اس کے بولنے والے ایک مشترکہ ماضی کو فرض کرتے ہوئے استعمال کرتے ہیں۔ تو میں کیسے لامحدود الف کو بیان کرسکتا ہوں جس کا میرا غیر متوازن ذہن احاطہ کر سکے؟

ایسی ہی دشواری سے دوچار سرّیت پسند، استعاروں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ الوہیت کو بیان کرنے کے لیے ایک عجمی سریت پسند ایک ایسے پرندے کی بات کرتا ہے جو سبھی پرندوں پر محیط ہے۔ ایلانس ڈی انسولس نے ایک دائرے کی بات کی ہے جس کا مرکز ہر جگہ ہے اور جس کا محیط کوئی نہیں۔ ایزکیل نے چار چہروں والے فرشتے کا ذکر کیا ہے جو ایک ہی وقت میں مشرق و مغرب، شمال و جنوب میں حرکت کرتا ہے۔ (ان ناقابل فہم تمثیلات کی یاد بے کار نہیں تھی۔ ان کا کوئی تعلق الف سے تھا۔) شاید دیوتاؤں نے مجھے ایک ایسا ہی استعارہ عطا کیا تھا لیکن یہ بیان ادب اور فکشن سے آلودہ ہوجائے گا۔ حقیقتاً جو

میں کرنا چاہتا ہوں، وہ ناممکن ہے کیوں کہ لامختتم سلسلے کی ایسی کوئی بھی فہرست ناقابل تعین تعداد تک پھیل جائے گی۔ اس واحد عظیم الشان لمحے میں میں نے لاکھوں واقعات بیک وقت دیکھے، خوش گوار اور ناخوش گوار دونوں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی کسی ایک مقام پر نہیں ہوا، نہ وہ ایک دوسرے میں مدغم ہوئے اور نہ ہی واضح تھے۔ میری آنکھیں جو دیکھ رہی تھیں، وہ بے ساختہ تھا لیکن جو میں اب لکھ رہا ہوں، وہ ایک ترتیب میں ہے، کیوں کہ زبان کی اپنی ترتیب ہوتی ہے۔ تاہم میں یاد کرنے کی کوشش کروں گا، جو میں دیکھا۔

سیڑھیوں کے پچھلے حصے میں دائیں حصے کی طرف میں نے ایک مختصر ست رنگا دائرہ دیکھا تقریباً ناقابل برداشت حد تک تاباں۔ پہلے پہل مجھے لگا یہ گردش کر رہا تھا۔ پھر محسوس ہوا کہ یہ حرکت ایک التباس تھی جو اس مدہوش خلا کی وجہ سے تھی جس میں یہ موجود تھا۔ الف کا قطر شاید ایک انچ سے کچھ ہی بڑا تھا لیکن سبھی خلا وہاں تھا، حقیقی اور تقلیل ناپذیر۔ ہر شے (جیسے ایک آئینے کا چہرہ) لامحدود اشیا تھی کیوں کہ میں نے واضح طور پر اسے کائنات کے ہر زاویے سے دیکھا۔ میں نے فراواں سمندر دیکھا۔ میں نے دن طلوع ہوتے اور شام ہوتی دیکھی۔ میں نے امریکہ کے انبوہ کو دیکھا۔ میں نے ایک سیاہ اہرام کے مرکز میں ایک نقرئی جالا دیکھا۔ میں نے ایک پارہ پارہ بھول بھلیاں دیکھیں (یہ لندن تھا۔) میں نے آئینے میں سے خود ہی کو غور سے دیکھتی آنکھیں دیکھیں۔ میں نے زمین پر موجود سبھی آئینے دیکھے اور ان میں سے کسی ایک میں بھی میرا عکس نہیں تھا۔ میں نے سولر سٹریٹ کے پچھواڑے وہی ٹائلیں لگی دیکھیں جو تیس سال پہلے فرے بینٹوس میں ایک گھر کے داخلی راستے میں لگی دیکھی تھیں۔ میں نے انگوروں کے گچھے، برف، تمباکو، دھاتوں کے انبار، ابخارات دیکھے۔ میں نے کروی استوائی صحرا اور ان میں ریت کے ہر ذرے کو دیکھا۔ میں نے آئیورنس میں ایک عورت کو دیکھا جسے میں کبھی بھلا نہیں سکوں گا۔ میں نے اس کے پریشان بالوں، دراز قد کو دیکھا۔ میں نے اس کے سینے میں کینسر کو پنپتے دیکھا۔ میں نے راستے کے ایک طرف آگ میں تپے کیچڑ کے دائرے کو دیکھا جہاں اس سے پہلے ایک درخت تھا۔ میں نے ایڈروگ میں موسم گرما والے ایک گھر اور پلینی کے انگریزی میں اولین ترجمے کو دیکھا، فیلمون ہالینڈ کے ترجمے کو۔ اور اس کے ساتھ ہی ہر صفحے کے ہر حرف کو دیکھا (جب میں ایک لڑکا تھا تو حیران ہوا کرتا کہ ایک بند کتاب میں موجود الفاظ ایک دوسرے پر تھپٹتے نہیں اور راتوں رات غائب نہیں ہو جاتے۔) میں نے کیورٹیرو میں غروب آفتاب کا منظر دیکھا جو بنگال کے گلاب کی رنگت کو منعکس کر رہا تھا۔ میں نے اپنی خالی خواب گاہ دیکھی۔ میں نے الکمار میں ایک الماری میں ایک زمینی گلوب کو دو آئینوں کے درمیان پڑا دیکھا جنھوں نے اسے لامختتم انداز میں پھیلا دیا تھا۔ میں نے صبح کے وقت بحیرہ کیسپیئن کے ساحل پر گھوڑوں کو دیکھا جن کے گردن کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ میں نے ہاتھ

کاہڈیوں کا نفیس ڈھانچہ دیکھا۔ میں نے ایک جنگ سے بچ رہنے والوں کو تصویری پوسٹ کارڈ بھیجتے دیکھا۔ میں نے مرزا پور میں ایک شو کیس میں ہسپانوی تاش کے پتوں کا ایک پیکٹ دیکھا۔ شیشے کے پودگھر میں فرن کے پھولوں کے ایک طرف جھکے ہوئے سایے دیکھے۔ شیر، پسٹن، ارنا بھینسا، مدوجزر کی لہریں اور فوجیں دیکھیں۔ زمین پر موجود سبھی چیونٹیاں دیکھیں۔ ایرانی اسطرلاب دیکھا۔ لکھنے کی ایک میز کے دراز میں (لکھائی دیکھ کر میں کانپ کر رہ گیا) ناقابل یقین، مخرب الاخلاق تفصیلی خطوط دیکھے جنھیں بیٹریز نے کارلوس ارجینٹینو کو لکھا تھا۔ میں نے ایک یادگار دیکھی جس کی چارریٹا کے گورستان میں میں نے عبادت کی تھی۔ گلی سڑی مٹی اور ہڈیاں دیکھیں جو کبھی بہت عمدہ حالت میں بیٹریز وائٹربو کی تھیں۔ میں نے اپنے گاڑھے خون کی گردش کا نظارہ کیا۔ محبت کے جنسی وصل کا منظر اور موت کی ترمیم کو دیکھا۔ الف کو ہر مقام اور زاویے سے دیکھا اور الف میں مجھے دھرتی دکھائی دی اور دھرتی میں الف اور الف میں دھرتی۔ میں نے خود اپنا چہرہ اور اپنی انتڑیاں دیکھیں۔ میں نے تمھارا چہرہ دیکھا۔ اور بدحواسی محسوس کی اور رو دیا۔ کیوں کہ میری آنکھوں پر وہ راز آشکار ہو گیا اور وہ قیاسی شے دیکھی جس کا نام سبھی انسانوں میں مشترک تھا لیکن جسے کوئی انسان نہیں دیکھتا، بعید از قیاس کائنات۔ میں لامحدود حیرت اور لامحدود افسوس سے دو چار ہوا۔

”تمھیں اچھا لگ رہا ہے احمق انسان، ایسی جگہوں میں جھانکنے کے بعد بھی جن سے تمھارا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔“ ایک قابل نفرین اور خوش مزاج آواز نے کہا، ”اگر تم اپنے دماغ پر بہت زور ڈالو تب بھی اس انکشاف کے لیے تم سو برسوں میں بھی میرا قرض نہ چکا سکو گے۔ ایک زبردست رصدگاہ، ہاں، بورخیس۔“

کارلوس ارجینٹینو کے قدم سب سے اونچی سیڑھی پر جمے ہوئے تھے۔ اس فوری مدھم روشنی میں میں نے کسی طور خود کو سنبھالا اور کہا، ”ایک زبردست رصد۔۔۔ ہاں، ایک زبردست۔۔۔“

میری آواز کے واقعیتی پن نے خود مجھے بھی ششدر کر دیا۔ اپنے جوش میں کارلوس بولتا چلا گیا، ”کیا تم نے ہر شے دیکھی۔ واقعی صاف صاف، اصل رنگوں میں؟“

اس موقع پر مجھے اپنا بدلہ لینے کا موقع ملا۔ شفقت سے، واضح طور پر اس پر ترس کھاتے ہوئے، پریشان حال، مائل بہ گریز، میں نے اس گودام کے حوالے سے کارلوس ارجنٹینو ڈینزی کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور اسے اصرار کیا کہ وہ مسماری کے عمل میں رکاوٹ نہ ڈالے تا کہ اس مہلک شہری ماحول سے بچ نکلے جس کی زد سے کوئی نہیں بچ پاتا، میرا یقین کرو، کوئی نہیں بچ پاتا۔ خاموشی اور اصرار کے ساتھ میں نے الف کے بارے میں بات کرنے سے انکار کر دیا۔ اسے خدا حافظ کہتے ہوئے میں اس کے گلے لگا اور یہ بات دہرائی کہ مضافات، تازہ ہوا اور خاموش ماحول بہت طاقت ور معالج ہوتے ہیں۔

باہر گلی میں، کانسٹی ٹیوشن سٹیشن کی سیڑھیاں اترتے ہوئے، سب وے میں سوار ہوتے ہوئے ہر چہرہ مجھے شناسا معلوم ہوا۔ میں خوف زدہ تھا کہ اس زمین کی کوئی شے شاید کبھی مجھے حیران نہیں کر پائے گی۔ مجھے یہ خوف بھی دامن گیر ہوا کہ میں کبھی اس سب کچھ سے آزاد نہیں ہو سکوں گا جو میں دیکھ چکا تھا۔ بہت خوشی سے، چند بے نیند راتوں کے بعد میں ایک بار پھر اسی فراموش گاری سے دو چار ہوا۔

یکم مارچ 1943 کی عبارت مزید

گارے سٹریٹ میں ایک خاص عمارت کو مسمار کیے جانے کے چھ مہینے بعد پبلشرز پروکرسٹیز اینڈ کو نے ڈنیری کی نظم کی زیادہ طوالت کو خاطر میں لائے بغیر اس کے 'ارجنٹائن والے حصوں' کا ایک انتخاب شائع کیا۔ اس سب کچھ کو دہرانا اب اضافی بات معلوم ہوتی ہے، جو تب ہوا۔ کارلوس ارجنٹینو ڈینزی نے ادب کا دوسرا قومی انعام جیتا۔ (مجھے تمھاری بہ تکلیف دی گئی مبارک باد موصول ہوئی'' اس نے مجھے لکھا، ''تم میرے بے چارے دوست حسد کے مارے طیش میں ہو، لیکن یہ تو مانو گے کہ چاہے یہ ماننے میں تمھیں حبس دم ہی کیوں نہ ہو جائے، کہ اس مرتبہ میں نے میدان مار لیا۔ میری پگڑی میں سب سے قیمتی ہیرا جڑا ہوا ہے۔'') پہلا انعام ڈاکٹر ایٹا نے حاصل کیا۔ تیسرا انعام ڈاکٹر میریو بونفینٹی کو ملا۔ ناقابل یقین بات یہ ہے کہ میری اپنی کتاب 'پتے باز کے پتے' کو ایک ووٹ بھی نہ ملا۔ ایک بار پھر بودے پن اور حسد نے فتح حاصل کی۔ ڈنیری سے ملے ہوئے مجھے اب کچھ عرصہ ہو چکا ہے۔ سننے میں آتا ہے کہ اس کی نظموں کا دوسرا مجموعہ زیر اشاعت ہے۔ اس کا محتاط طور پر چنیدہ قلم اب ہمارے قومی سورما جنرل سان مارٹن پر ایک طویل نظم لکھنے کے کام میں جتا ہوا تھا۔

میں اب اپنی آخری دو گزارشات پیش کرنا چاہوں گا۔ ایک تو الف کی ہیئت سے متعلق، اور دوسری اس کے نام سے متعلق۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں کہ الف عبرانی حروف تہجی کا پہلا حرف ہے۔ میری کہانی میں ایک عجیب دائرے کے لیے اس کا استعمال محض اتفاقی نہیں ہے۔ کبالہ والوں کے لیے اس حرف سے مراد 'En Soph' ہے، یعنی خالص اور لامحدود دیوتا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ایک شخص کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو آسمان اور زمین دونوں کی طرف اشارہ کر رہا ہوتا ہے، تا کہ یہ بتا سکے کہ زیریں دنیا عالم بالا کا نقشہ اور آئینہ ہے۔ کینٹور کی تحریر 'Mengenlehre' کے لیے یہ لامتناہی اعداد کا استعارہ ہے جس کا کوئی ایک حصہ اتنا ہی عظیم ہے جتنا کہ وہ سب مجموعی طور پر۔ میں جاننا چاہوں گا کہ کیا کارلوس ارجنٹینو نے یہ نام خود منتخب کیا یا اس نے اسے کہیں پڑھا، کسی دوسرے مقام پر منطبق ہوتا ہوا جہاں سبھی نقاط باہم مدغم ہو جاتے ہیں، ان لامحدود سمتوں میں جو الف نے اس گودام میں اس پر منکشف کیے۔ یہ ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے لیکن

مجھے یقین ہے کہ گارے سٹریٹ والا الف ایک جعلی الف تھا۔

میں اس کی یہ وجوہات پیش کرتا ہوں۔ 1867 کے قریب کپتان برٹن نے برازیل میں برٹش کونسل کا عہدہ سنبھالا۔ جولائی 1942 میں پیڈرو ہنری کوئیز یورینا کو سینٹوز کی ایک لائبریری میں برٹن کا ایک مسودہ ہاتھ لگا جو ایک آئینے سے متعلق تھا جسے اہل مشرق اسکندر ذوالقرنین یا مقدونیہ کے سکندر بیکورنس سے منسوب قرار دیتے ہیں۔ اس آئینے میں تمام دنیا منعکس ہوتی ہے۔ برٹن نے دیگر آلات کا بھی ذکر کیا۔ جیسے کائی کوسرو کا سات تہوں والا پیالہ، آئینہ جو طارق ابن زیاد کو ایک مینار میں ملا تھا (الف لیلہ ولیلہ، 272)، آئینہ جسے سموسٹا کے لوسین نے چاند پر ملاحظہ کیا تھا (حقیقی تاریخ، 1، 25)، آئینے جیسا برچھا جس کا ذکر کیپیلا کی پہلی کتاب 'Satyricon' میں موجود ہے، مرلن کا کائناتی آئینہ جو دائروی اور کھوکھلا تھا اور شیشے کی ایک دنیا معلوم ہوتا تھا۔" (The Faerie Queene، III، 2، 19)، اور پھر وہ یہ اہم بیان شامل کرتا ہے، "لیکن مذکورہ بالا اشیا (غیر موجود ہونے کے نقصان کے ساتھ ساتھ) محض بصری آلات ہیں۔ قاہرہ میں مسجد عمر میں جمع ہونے والے معتقدین اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ ساری کائنات پتھر کے ستونوں میں سے کسی ایک میں سمائی ہوئی ہے، جو اس کے مرکزی صحن میں دھمکتی ہے۔ بے شک کوئی اسے حقیقی طور پر نہیں دیکھ سکتا لیکن جو فرش سے کان لگا کر سننے کی کوشش کرتے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ کچھ دیر بعد انھیں دھمک سنائی دیتی ہے۔ مسجد ساتویں صدی عیسوی میں تعمیر کی گئی تھی۔ یہ ستون قبل از اسلام عہد کے مذاہب کی عبادت گاہوں سے اکھاڑے گئے تھے۔ کیوں کہ جیسا کہ ابن خلدون نے لکھا، "ان اقوام میں جن کی بنا خانہ بدوشوں نے رکھی، متعلقہ معماری کے کام میں بدیسیوں کی مدد ضروری تھی۔"

کیا یہ الف پتھر کے مرکز میں واقع ہے؟ کیا میں نے اسے وہاں گودام میں دیکھا جب میں نے تمام اشیا کو دیکھ رہا تھا اور جسے اب میں بھول چکا ہوں؟ ہمارے اذہان مسام دار ہیں اور فراموشی ان میں سرایت کر جاتی ہے۔ میں خود بھی برسوں کی تھکا دینے والی گزران تلے، بیٹریز کے چہرے کو توڑ پھوڑ رہا اور اسے کھو رہا ہوں۔

خیر النساء جعفری

مترجم: سعیدہ درانی

قربتیں اور فاصلے

“کبھی کبھی قربتیں فاصلوں کو بڑھا بھی دیتی ہیں۔ تاروں کا حسن تو انہیں دوری سے دیکھنے میں ہوتا ہے۔۔۔” اس نے کہا تھا اور میں سمجھ ہی نہیں سکا تھا۔

میں نے پہلی بار اسے اپنی چچا زاد بہن فرزانہ کی شادی میں دیکھا تھا۔ وہ معمولی شکل و صورت والی لڑکی تھی، اس میں کوئی بھی ایسی بات نہیں تھی جو کسی اجنبی آدمی کو سوچنے پر مجبور کر دے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں کراچی جیسے شہر میں اس کے لباس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

شادی جیسے ہنگامی موقعوں سے میں ویسے بھی بہت الرجک رہتا ہوں۔ ایسے موقعوں پر ہوتا ہی کیا ہے؟ خوامخواہ میں بوکھلا دینے والی روشنیاں اور آواز، مصنوعی چہرے اور لباس، خوامخواہ کے رسمی قہقہے اور جملے! شخصیت اور سماج کے یہ دو دو روپ، اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ!

لیکن اس شادی میں مجھے ضرور شریک ہونا تھا کیوں کہ فرزانہ سے وعدہ کیا تھا۔ اس نے کہا تھا رشتے داری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ رشتوں ناتوں کو نبھانے کے لیے اگر کبھی دو چار گھنٹے قربان بھی کرنے پڑیں تو کیا حرج ہے اور نتیجے کے طور پر چاروں طرف سے گھمسان کے اس میلے میں جہاں بھانت بھانت کے لوگ حقیقت کی تنہائی سے خائف ہو کر بڑے بڑے قہقہوں میں پناہ لے رہے تھے اور میں اس ماحول میں خود کو خود الگ ہی محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے خود پر اور دوسروں پر خوامخواہ غصہ آ رہا تھا کہ اچانک میں نے اسے دیکھا۔ وہ مجھے دوسروں سے بہت مختلف اور اوپری سی لگی۔ انتہائی معمولی اور سادی، بے حد قدیم اور اجنبی!

آگے بڑھ کر اس سے پوچھا “آپ کہاں سے آئی ہیں؟” “آپ” میں نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر کہا تھا ورنہ وہ تو “تُو” کے قابل بھی نہیں تھی۔

جواباً کہنے لگی “موہن جوڈارو سے۔”

میرا دھیان ایک دفعہ پھر اس کے سراپے پر گیا۔۔۔ خاموش معمولی آنکھیں۔۔۔ سانولا رنگ، سوسی کی شلوار، گج بھرا کرتا اور اجرک!

شادی کا ہنگامہ گزرا تو دیکھا اس کے ہاتھ میں کوئی رسالہ تھا۔

”پڑھی لکھی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”پھر یہ رسالہ کیوں دیکھ رہی ہو؟“

”ہوا کرنے کے لیے۔“

شادی کے دوسرے دن وہ بہت بے تکلفی سے گھر میں گھوم پھر رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے فرزانہ سے پوچھا۔

”یہ پرانی چیز کیا ہے؟“

اس نے بتایا ”دُور کی ایک رشتہ دار ہے اور میری اچھی دوست بھی۔“

”اور خیر سے بیکار بھی ہے“ میں نے ہنس کر آہستہ سے جواب دیا۔

اس دن شام کو دولہا دلہن کو ہل پارک لے جانا پڑا۔ گاڑی کے بیک مرر سے دیکھا تو وہ دلہن کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس شام اس نے بہت پُروقار رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ جس میں وہ خوبصورت اور گوری چٹی لگ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ نئے شادی شدہ جوڑے کے ساتھ مجھے کیا لطف آئے گا۔ اس لیے اس پرانی چیز کے ساتھ وقت گزاری کرنا اچھا لگا۔

ہل پارک کی ہواؤں سے لطف لیتے اور کافی پیتے ہوئے میں نے بہت دفعہ اس کو باتوں میں چھیڑنے کی کوشش کی، لیکن وہ چھلکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ تب میں نے دل میں سوچا کہ مجھے ایسی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ ببول سے آم کی امید رکھنے والے بے وقوف ہوتے ہیں اور اس لمحے میں نے خود کو بے وقوف محسوس کیا۔

پھر پتہ نہیں کس طرح کوئی دلچسپ موضوع چھڑ گیا تو وہ بھی جیسے کھل گئی اس طرح جیسے دریا کے پوتر پانی کے بند ٹوٹ گئے ہوں۔ اس کی گفتار اور ذہنی پرواز دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ میں حیرت سے اس پرانی چیز کو دیکھ رہا تھا، جس میں اتنا علم و عرفان، ادب اور تہذیب کا ایک دریا موجزن تھا۔ اس پل میں نے خود کو اس کے آگے ایک حقیر زرے کی طرح محسوس کیا اور خود کو اس کے بہاؤ میں بہتا ہوا محسوس کیا۔ اس لمحے میں نے عقیدت سے سوچا کہ یہ قدیم چیز پانچ ہزار سال پہلے بھی تازہ دم ہوئی ہوگی اور کل بھی تازہ دم رہے

گی۔ وقت کا ہر لحظہ اس کی قدامت کو نیا پن اور تازگی بخشے گا اور اس کے جوبن کو زندہ رکھے گا۔ یہ قدیم چیز امر ہے اور ہمیشہ امر رہے گی۔ شہد کی طرح میٹھی!

تب میں نے سوچا تھا کہ اس کے مقابلے میں میری زندگی جیسے بنجر دھرتی کی طرح ہے جس پر کسی پوتر پانی کا چھینٹا بھی نہیں پڑا۔ جہاں اب تک کوئی ہریالی ہی نہیں تھی۔ میں نے سوچا میرے حصے کی ساری ہریالی تو اس جگہ تھی جہاں جہاں اس کے قدم پڑے تھے۔ بھلا ہریالی بنا دھرتی اور جوت بنا جیا بھی کوئی جیا تھا۔

اس رات میں اپنی گزری ہوئی زندگی کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ وہ قدیم چیز رہ رہ کر مجھے اپنے وجود کا احساس دلا رہی تھی۔۔۔ اس رات میں نے بہت سے خواب دیکھے تھے (خواب میں میں نے سندھو دریا کی ٹھنڈی ہوائیں، ہریالی اور چھوٹی چھوٹی کونپلیں پھوٹتی ہوئی محسوس کی تھیں۔ ہری ہری امیدوں کی ہری ہری کونپلیں جن کی دھرتی میں جڑیں تو تھیں لیکن جن کا اب تک مجھے پتہ نہیں تھا) خواب میں، مَیں نے پورے چاند کی چاندنی اور امیدوں کے مور ناچتے دیکھے تھے اس رات!

☆☆☆☆

ادل سومرو

سندھی سے ترجمہ: حبدار سولنگی

مراقبہ

بزرگ نے فرمایا:
’’اب نیلے رنگ کی
روشنی کا مراقبہ ہوگا
آنکھیں بند کر کے
قدرت کا مشاہدہ کیجئے“
میں نے آنکھیں بند کیں
مجھے تمہارے سوا
اور کچھ نظر نہیں آیا

☆☆☆☆

مصطفیٰ ارباب
سندھی سے ترجمہ: حبدار سولنگی

بہت چالاک ہو

مجھے تم سے محبت ہے
اور تم
مجھ کو چاہتی ہو
بہت چالاک ہو
تم مجھ سے ہو کر
خود تک پہنچ رہی ہو
تم اپنے
آپ سے
محبت کر رہی ہو

☆☆☆☆

احمد راہی
پنجابی سے ترجمہ: اختر رضا سلیمی

جانے والے

اگر چھوڑ جانا ہی تھا
اگر وعدہ کر کے مکرنا ہی تھا
تو پھر دل لگی کی ضرورت ہی کیا تھی
مجھے جس کا ڈر تھا
بالآخر وہی بات ہو کے رہی ناں
سو اب چاہے مر کے جیوں
یا میں جی کے مروں ۔ بس تری ہوں ۔ تری
مگر جی اٹھی تو تمھارے لیے ہی جیوں گی
کہ شاید
کسی دن تجھے
میرے ٹوٹے ہوئے دل پہ رحم آ ہی جائے
کسی دن مری یاد تجھ کو
دوبارہ مرے پاس لائے

☆☆☆☆

افضل احسن رندھاوا

پنجابی سے ترجمہ: زاہد حسن

عاشق ہیں کمزور دِلے

عاشق ہیں کمزور دِلے---
عشق میں جل جل خاک ہو جائیں
منہ پہ لبک اقرار نہ لائیں
عین شباب پیار گرائیں
---دل آنگن کے سوکھے تنکوں میں
پیار نظر کی پھینک چنگاری
نا معلوم کی پھونکیں ماریں
روز---!
مجھے جب آتش تو
ڈور دور سے دیکھیں
---چھگاریں
آگ کو گلے لگانے کی خواہش، آخر
بدنامی کے ڈر سے
مرمرا، سی جاتی ہے

☆☆☆☆

حنیف باوا

پنجابی سے ترجمہ :ارشد چہال

بیٹی

حقہ تازہ کیا ہوا تھا۔ آگ بھی ابھی ابھی رکھی تھی۔ اس نے ایک دو کش لگا کر حقے کی نے میری طرف بڑھا دی۔ میں کش لگاتا اور دھواں آسمان کی طرف اڑا دیتا۔ وہ سامنے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا جیسے سوچوں کا لاوا اس کے ذہن میں پھوٹ پڑا ہو۔

موسم بڑا ہی سہانا تھا، درختوں کی شاخیں نئے پتوں کو جنم دے رہی تھیں۔ چڑیاں درختوں پر بیٹھی کچھ یوں چونکتی تھیں جیسے کوئی گیت گا رہی ہوں۔ ان کے گیت سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ گیت میری بیٹی کی شادی کا گیت ہو۔ مگر ان کے میٹھے گیت میں جب کسی گدھ کی آواز شامل ہو جاتی تو جانے کیوں میں خوف زدہ ہو کر رہ جاتا۔ شاید اسی لیے میں سوچتا کہ میری بیٹی کے شگنوں کا وقت ہے کہیں یہ آواز کوئی بدشگونی نہ پیدا کر دے۔ میرے اس وہم نے میرے ذہن میں گدھ کی آواز کو یوں کھینچ دیا جیسے پتھر پر کوئی گہری لکیر کھینچ دے۔

آج میری بیٹی کی بارات آنے والی تھی۔ میں باہر درختوں کے نیچے کھڑا، بارات کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

یہ ساری باتیں اللہ دتہ نے جانے کیوں ایک ہی سانس میں کہہ ڈالیں۔ اب اس نے حقے کا ایک لمبا سا کش لیا۔ کش لینے کے بعد وہ یوں چپ ہو گیا جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا ہو۔

بارات آ گئی تھی، ڈھول باجوں کے ساتھ، پیسوں کی جھنکار کے ساتھ۔ باراتی کیا تھے راجے تھے راجے۔ ایک سے ایک خوبصورت اور گھبرو۔ دولہے کی تو بات ہی نہ کریں وہ تو چاند کا ٹکڑا تھا۔ تبھی تو سارے محلے کی لڑکیاں اسے دیکھنے کے لیے جھانک رہی تھیں۔ جو دیکھ لیتی وہ بے ساختہ کہتی۔

’’ارے دولہا تو ڈبی میں ڈال کے رکھنے والا ہے‘‘۔

’’ہاں ہاں، میرا تو جی چاہتا تھا اسے دیکھتی رہوں‘‘۔

باراتیوں کی خاطر تواضع کے لیے کہیں قورمہ پک رہا تھا، کہیں پلاؤ تو کہیں زردہ۔ میں دیگوں کی

طرف سے ہو کر پھر انہی درختوں کے نیچے آ کھڑا ہوا جہاں تھوڑی دیر پہلے کھڑا میں بارات کا انتظار کر رہا تھا۔ چڑیاں ابھی بھی وہی پیارا سا گیت گا رہی تھیں۔ یہ گیت ہی تو دوبارہ مجھے یہاں کھینچ لایا تھا۔ گدھ کی آواز پھر کہیں سے آ گئی۔ میں اور بھی ڈر گیا تھا۔ میں نے اوپر جھانک کر دیکھا وہاں گدھ نہیں تھا۔ میرا خوف اور بڑھنے لگا تھا۔ میرا وہ وہم اب کچھ یقین میں بدلنے لگا تھا۔ میں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

حقہ جلد ہی دم توڑتا نظر آ رہا تھا۔ شاید اس میں ڈالا ہوا تمبا کو کچھ ہلکا تھا۔ اس نے اس بُجھتے ہوئے حقے کے تین چار بڑے بڑے کش لیے۔ جس کے باعث چاروں طرف دھواں ہی دھواں پھیل گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اللہ دتہ اس دھوئیں میں کہیں گُم ہو گیا ہو۔ مجھے اس کے ہونے کا احساس اس وقت ہوا جب اس نے دوبارہ بات شروع کی۔

میں نے لاڈو بیٹی کا جہیز بھی اس کے سسرال والوں کی خواہش کے مطابق بنایا تھا۔ گرم بستر، ٹھنڈے بستر، اعلیٰ قسم کے ٹی سیٹ، واٹر سیٹ، ان گنت سٹیل کے برتن، فریج، ٹیپ ریکارڈر، ریڈیو اور بہت کچھ۔

اس نے حقے کی نے میری طرف بڑھا کر نظریں نیچے کر لیں اور انگلی سے زمین کریدنے لگا۔ مجھے اس کی یہ حرکت بہت عجیب سی لگی۔ میں سوچنے لگا یہ بیٹی کے جہیز کی بات کرتے کرتے یکا یک چپ کیوں ہو گیا ہے۔ میں اس کا سبب پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ خود ہی بول پڑا۔

جب میری بیوی نے یہ جہیز محلے والوں کو دکھانے کے لیے پھیلایا۔ تبھی گدھ کی خوفناک آواز میرے کانوں میں گونجی، میری نظر فوراً آسمان کی طرف اٹھی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کہیں یہ آواز، یہ بدصورت اور ڈراؤنی آواز میرے خوف کا حصہ تو نہیں بن گئی تھی۔

کھانا تیار ہو چکا تھا، لاگی کو بلانے کے لیے بھیج دیا گیا۔ بارات آ گئی اسی طرح ڈھولوں باجوں کے ساتھ پیسے لٹاتی ہوئی۔ سب سے پہلے نکاح ہونا تھا۔ نکاح کے کپڑے دیے گئے۔ میری بیٹی کی سہیلیاں گاتی تھیں اور دلہن کو سرخ جوڑا پہناتی جاتی تھیں۔

سرخ جوڑا پہن لے لاڈو
خود کو خوب سجا لے لاڈو

بابل کا گھر چھوڑ کے جانا
سسرال میں دل لگا لے لاڈو

نکاح ہوا، چھوارے بانٹے گئے۔ مجھے بھی کسی نے دو چھوارے لا دیئے۔ چھوارے دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔

شکر ہے مولا، وہ گھڑی آ گئی، جس کا مجھے پچھلے دس سالوں سے انتظار تھا۔ چھوارے جب میں نے منہ میں ڈالے تو وہ مجھے بڑے ہی میٹھے لگے۔ میٹھے کیسے نہ لگتے میری بیٹی کی شادی کے تھے۔ یہ چھوارے مجھے چڑیوں کے گیت سے بھی زیادہ میٹھے لگے۔ بیٹیاں اور چڑیاں ایک ہی تو بات ہوئی۔ چڑیاں پیڑوں پر بیٹھی ہمکتی اچھی لگتی ہیں تو بیٹیاں سسرال میں چہکتی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔ یہ بات کرتے ہوئے اللہ دتہ کا چہرہ بچوں کی طرح معصوم دکھائی دینے لگا تھا۔

بارات کو کھانا دیا گیا۔ کھانا کھلانے کا بہت اچھا انتظام کیا گیا تھا۔ اچھا تو خود ہی ہونا تھا۔ کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ بارات کے بعد دیگر مہمانوں کی باری تھی۔ بڑی مشکل سے کوئی پانچ بجے کے بعد کھانا کھلانے سے فارغ ہوئے۔ ویسے تو کوئی بات نہیں تھی بارات نے کونسا بسوں میں جانا تھا ماشاءاللہ ان کے پاس اپنی کاریں تھیں۔

"میری بیٹی تو راج کرے گی"۔ کاروں کو دیکھ کر میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

گدھ کی منحوس آواز پھر گونجی۔ اب تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس آواز میں کوئی بھیانک قہقہہ بھی تھا۔ یہ کون تھا اور اتنے خوفناک قہقہے کیوں لگا رہا تھا۔ اس کا مجھے کچھ علم نہیں تھا۔

بیٹی کو رخصت کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ بیٹیوں کو بر چاہے کتنا اچھا ہی کیوں نہ مل جائے پھر بھی انہیں رخصت کرتے وقت ایک بار تو کلیجہ پھٹ کر رہ جاتا ہے۔ کلیجہ کیسے نہ پھٹے۔ بیٹاں تو جگر کا ٹکڑا ہوتی ہیں۔ بیٹیاں ہی تو اپنے بابل پر مرمٹتی ہیں مگر کیا کیا جائے بیٹیاں تو سدا ماں باپ کے گھر نہیں رہ سکتیں۔ بیٹیوں کو تو راجے، مہاراجے، پیر، پیغمبر بھی سدا گھروں میں نہیں رکھ سکے۔ ان کو بھی رخصت کرنا پڑتی ہیں۔ میں کس باغ کی مولی ہوں۔

بالآخر بیٹی ماموں کی شفقت بھری بُکل میں، تائیوں، چاچوں، پھوپھیوں اور چاچیوں سے آگے آہستہ آہستہ ڈولتی ہوئی جا رہی تھی۔ سب کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ بیٹی کی سہیلیاں کبھی گاتی

تھیں، کبھی روتی تھیں۔

”اے بھائی مجھے رخصت کرتے ہوئے آج کی رات روک لے“
”بی بی میں کیسے روکوں ، میں نے خود ہی تو انھیں بلایا ہے“
”ماموں مجھے رخصت کرتے ہوئے آج کی رات روک لے“
”بیٹی میں تجھے کیسے روکوں، تیری بارات میں نے خود ہی بلائی ہے“

لڑکیوں کے اس گیت نے گویا چاروں طرف اداسی سی تان دی تھی۔ میں جدھر دیکھتا مجھے کائنات کی ہر چیز روتی ہوئی دکھائی دیتی۔

بیٹی ڈولی میں بیٹھ گئی۔ ڈولی لے چلے، ساتھ ہی جہیز بھی چل پڑا۔ دھیرے دھیرے بیٹی کی ڈولی آگے بڑھتی گئی۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی۔ بیٹی رخصت ہوگئی۔ میں آنکھوں میں آنسو لیے انہی درختوں کے نیچے آ کھڑا ہوا۔ کہتے ہیں بیٹیاں چڑیاں ہوتی ہیں۔ بیٹی کو تو میں رخصت کر چکا تھا مگر چڑیاں تو ابھی تک یہیں تھیں۔ مجھے ان کی آواز اپنی بیٹی کی آواز معلوم ہوتی۔ میں آنسو پونچھ کر انھیں دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا ایک بڑا سارا گدھ درخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے اس کی آنکھیں سانپ سے بھی زیادہ ڈراؤنی دکھائی دیں۔ جب میں نے اسے غور سے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھے چڑا رہا ہو۔ میں ڈر گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے چڑیاں اڑ گئی ہوں اور اب وہ درخت خالی ہو گیا ہو۔ میں بہت زیادہ گھبرا گیا۔ میں وہاں سے سرک کر اپنے دروازے کے پاس آ کھڑا ہوا۔ میرے گھر کا دروازہ بند تھا۔ بند دروازے کے آگے دو کتے ٹانگیں پھیلائے سو رہے تھے۔ دروازے کی یہ حالت دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہاں کوئی بارات نہ آئی ہو۔ کسی بیٹی کی ڈولی نہ اٹھی ہو۔ میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔ میں چارپائی سے ہڑبڑا کر اٹھا تو کیا دیکھتا ہوں۔

بیٹی سُونے کانوں اور سفید ہاتھوں کے ساتھ بابل کے گھر کی لاش کی طرح لیٹی ہوئی ہے۔

حقہ بالکل ہی بُجھ چکا تھا مگر اللہ دتہ نے بُجھے ہوئے حقے کے بھی لگاتار اتنے کش لگائے جس سے اس کو کبھی نہ ختم ہونے والا کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

☆☆☆☆

تخلیق وترجمہ: زاہد حسن

بجھتے ہوئے اک چاند کی قاش

بجھتے ہوئے اک چاند کی قاش
کچھ بیتی رات کے تارے
دن تھے جو، خوشیوں والے
تیری آرزو، میں گذارے
ہجر تیرے کامل کے وٹنا ☆۱
ہم چڑھ بیٹھے آج کھارے ☆۲

☆☆☆☆

☆ ۱۔ابٹن
☆ ۲۔شادی کی ایک رسم

طارق عزیز

پنجابی سے ترجمہ: نوشین اختر

گناہ کیا ہے ثواب کیا ہے
یہ فیصلے کا عذاب کیا ہے

ہے چار دن کی یہ زندگانی
یہ خواہشوں کا حباب کیا ہے

جو حرفِ مشکل بھی پڑھ نہ پاؤں
جہاں کی پھر یہ کتاب کیا ہے

یہ سارے دھوکے یقین کے ہیں
کہیں تو شاخِ گلاب کیا ہے

یہ ساری بستی عذاب میں ہے
تو حکمِ عالی جناب کیا ہے

☆☆☆☆

غازی سیال

پشتو سے ترجمہ: ارشد سائر

کوہستانی دوشیزہ

دامن کوہ میں وہ دیکھ ذرا
کوئی شہزادی کوئی ماہ جبیں
اپنے ریوڑ کو چراتی جو چلے
ہر اک انداز ہر اک چال حسیں
سادہ ملبوس میں بھی شوخ لگے
نئی تہذیب سے آگاہ نہیں
رخ اور دل ہے آئنے کی طرح
نہ سجاوٹ نظر آتی ہے کہیں
وہ سراپا ہے محبت کا پیکر
نہیں نفرت کو جانتی وہ حسیں

کوہ و کوہسار کی وہ پروردہ
فطرتی حسن کی جو ملکہ ہے
کوہ و کہسار کی وہ پروردہ
جس کے چہرے سے چاند جلتا ہے
سات پردوں میں وہ گلرنگ پیکر
جس کے نس نس میں حسن پلتا ہے
راہ چلتی ہے جب وہ شہزادی
دل اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے
اس کا نام پیام روز و سحر

وہ اُتر آئے تو دن ڈھلتا ہے
اور ہوا میں وہ گلابی آنچل
کبھی اُڑتا کبھی سنبھلتا ہے

کوہ و کوہسار کی وہ پروردہ
فطرتی حسن کی جو ملکہ ہے

جس کو اللہ نے دیا ہے جمال
ساتھ بخشی ہوئی نزاکت ہے
یہ نزاکت یہ بے مثال حسن
یہ سبھی کچھ عطائے قدرت ہے
وہ جس پہ شوخیاں نثار کروں
وہ جس کی سادگی بھی زینت ہے
ہر ایک نگاہ میں معصومیت
ہر ایک نگاہ میں شرارت ہے
اس کی بولی بھری ہے جادو سے
اس کی ہر بات میں محبت ہے
کوہ و کوہسار کی وہ پروردہ
فطرتی حسن کی جو ملکہ ہے

وہ اترتی ہے کوہسار سے جب
پسینہ رخ پہ ہے بوندوں کی طرح
پھول کی طرح وہ نازک چہرہ

تازگی رخ پہ ہے پھولوں کی طرح
وہ ہر ایک حال میں مسرور و خوش
حوصلہ کوہ کے حوصلوں کی طرح
نرم ایسی کہ جیسے شبنم ہو
قہر میں آگ کے شعلوں کی طرح
وہ سادہ لوح پہاڑوں کی مکیں
جس کی فطرت ہے جیالوں کی طرح

کوہ و کوہسار کی وہ پروردہ
فطرتی حسن کی جو ملکہ ہے

☆☆☆☆

صابر علی صابر

پشتو سے ترجمہ: اسد اللہ اسد

طلب

طلب مرقد نہیں ہے
کہ کتبے پر لکھا ہو
یہ منزل آخری ہے

☆☆☆☆

معصوم

کون معصوم؟
وہ بچہ
یا اس کے ہاتھ میں تتلی کا تڑپتا بچہ

☆☆☆☆

بلوچی ادب سے
تخلیق و ترجمہ: غنی پرواز

چشمہ اور گُلاب

غمشاد آگے چلنا چاہتا تھا۔ لیکن ہمزاد نے اُسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اور برابر پیچھے کی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس لیے وہ ایک قدم آگے بڑھ رہا تھا اور دو قدم پیچھے ہٹ رہا تھا۔ دو قدم آگے بڑھ رہا تھا اور چار قدم پیچھے ہٹ رہا تھا۔ چار قدم آگے بڑھ رہا تھا اور آٹھ قدم پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اور اس طرح منزل سے نزدیک ہونے کی بجائے دُور ہوتا جا رہا تھا۔

سامنے والے پہاڑ کے دامن میں، کھجور اور چیڑ کے درختوں کے درمیان، ایک چشمہ تھا۔ یہ چشمہ اُس کی منزل تھا۔ وہ وہیں جانا چاہتا تھا۔ اور اگر وہاں پہنچ جاتا، تو زندگی میں کامیاب ہو جاتا۔

پچھلی جانب گلاب کا ایک پھول تھا۔ وہ پھول اُس کی منزل نہ تھا۔ بلکہ اُس کی منزل کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ لیکن ھمزاد اُسے اسی پھول کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔ اس لیے اُسے کھینچتا ہوا وہیں لے جا رہا تھا۔

”آپ کیوں اتنا زور لگا رہے ہیں اور چشمے کی طرف جانے کی کوشش کر رہے ہیں“ ھمزاد نے اُس سے پوچھا۔

”اس لیے کہ میری منزل وہی ہے۔ اگر مجھے کوئی کامیابی نصیب ہو گی، تو وہیں سے۔ مگر آپ مجھے گلاب کے پھول کی طرف کیوں لے جانا چاہتے ہیں؟“ اُس نے ھمزاد کی بات کا جواب دیتے ہوئے اُس سے پوچھ بھی لیا۔

”اس لیے کہ گلاب کے پھول کے پاس دُنیا کی ہر خوشی موجود ہے۔ دُنیا کی ہر قسم کی خوشی۔ اور انسان دنیا میں انہی خوشیوں کے لیے دن رات سرگرداں رہتا ہے“۔ ہمزاد نے اپنا وجود اس کے وجود کی گہرائیوں میں گُھس کر کے کہا۔

”مگر آخر وہ تھوڑی دیر کی خوشیاں ہیں نا۔۔۔“

”لوگ انہی تھوڑی دیر کی خوشیوں کے لیے تڑپتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ ہر کسی کو نصیب نہیں

ہوتیں۔ اگر آپ کو نصیب ہو رہی ہیں، تو پھر آپ کیوں اُن کی قدر نہیں کرتے؟“

”ایسا نہ ہو کہ میرا انجام آدم وحوّا جیسا ہو----“ اُس نے سوچ کر کہا۔

”آدم وحوّا کے انجام میں بھلا کیا خرابی رہی ہے؟ اگر آپ کا انجام اُن جیسا ہو، تو پھر آپ کو اور کیا چاہیے؟“ ہمزاد نے مزید ترغیب دی۔

”مگر----مگر مجھے ڈر لگتا ہے----“

”ڈریے نہیں---دل بڑا کیجیے---خوشیاں آپ کی منتظر ہیں---“

ہمزاد کے مسلسل اصرار کی وجہ سے وہ نرم پڑ گیا۔ اور اُس کے ساتھ ہو لیا اور گلاب کے پھول کا رُخ کیا۔ ذرا قریب پہنچ کر رُک گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ اُس کی نظر میں وہ ایک عجیب وغریب گلاب تھا۔ ہر لحہ رنگ بدلتا ہوا گلاب! جو کبھی ایک چیز بنتا اور کبھی دوسری!---کبھی جنتی باغ بن جاتا۔ کبھی بنگلہ!---کبھی کار موٹر!---کبھی شراب کا پیگ!---کبھی حسین وجمیل لڑکی---اور کبھی روپوں سے بھری ہوئی تجوری!

یکا یک وہ اشتیاق سے گلاب کی جانب بڑھنے لگا۔ لیکن پھر ایکدم دوبارہ رُک گیا اور افسردگی اور حیرانی سے بولا۔

”مگر----مگر اس کے تو چاروں جانب بہت بڑی دلدل ہے۔“

”پرواہ نہ کریں----“ ہمزاد نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ اور کہا ”دلدل کے اوپر ایک پُل ہے---ذرا وہاں دیکھیے تو سہی---وہ پُل ہے---“

جب اُس کی نگاہیں پُل پر پڑیں تو اُس کی افسردگی اور حیرانی میں کمی آ گئی۔ اُس نے ہمزاد کے ساتھ پُل عبور کر لیا اور گلاب کی گوناگوں خوشیاں لوٹنے میں مصروف ہو گیا۔

خوشیاں لوٹنے کے بعد، اُس نے واپس اپنی منزل کی طرف جانا چاہا۔ چشمے کی طرف۔ اور اُس نے اپنی رہنمائی کے لیے ہمزاد کو تلاش کرنا شروع کیا۔ لیکن ہمزاد دکھائی نہ دیا۔ اس لیے وہ تنِ تنہا پُل عبور کرنے لگا۔ پُل لمبا اور تنگ تھا۔ اُس نے ابھی تک اُس کا آدھا حصہ بھی عبور نہیں کیا تھا کہ بادل گرجنے لگے۔ بادل کی گرج سن کر وہ اِس بُری طرح چونکا کہ پُل پر سے گرتے گرتے بچا۔ پھر گھبراہٹ کے عالم میں اُس نے نگاہیں اوپر اٹھا کر بادلوں کی طرف دیکھا۔ اور بارش کے ڈر سے اپنے چلنے کی رفتار میں اضافہ کر لیا۔ لیکن ابھی

وہ پانچ چھ قدم سے زیادہ آگے نہیں بڑھا تھا کہ اچانک زور کی بارش ہونے لگی اور آن کی آن میں پُل کے اوپر پانی ہی پانی نظر آنے لگا۔

اب اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ جلد از جلد پُل کو عبور کر لے۔ لیکن پُل پر بہت زیادہ پھسلن ہو گئی تھی۔ جس کی بنا پر اس کے لیے جلدی جلدی چلنا مشکل تھا۔ بلکہ اس کے قدم پہلے سے بھی سُست پڑ گئے تھے۔ پھر جب اس نے محسوس کیا کہ صرف پاؤں سے چلنے میں، پھسل کر، گرنے کا اندیشہ ہے، تو اس نے بیٹھ کر پاؤں کے ساتھ ساتھ، ہاتھوں سے بھی کام لیا۔ لیکن اس کے لیے اب بھی جلدی جلدی چلنا مشکل تھا۔

اب بارش مزید زور پکڑنے لگی تھی۔ جس پر اس نے بوکھلاتے ہوئے ایک بار پھر نگاہیں اٹھا کر اوپر آسمان کو دیکھا۔ مگر اچانک اس کے ہاتھ پاؤں پھسل گئے۔ اور وہ پُل سے نیچے دلدل میں گر گیا۔ اور کیچڑ کے اندر دھنستا چلا گیا۔ اس نے پاگلوں کی طرح دونوں ہاتھ مدد کے لیے اوپر اٹھائے ۔۔ اور چیخنا چلانا شروع کیا۔ ”بچاؤ۔۔۔۔۔ بچاؤ۔۔۔۔ بچاؤ۔۔۔!“ لیکن کوئی شخص مدد کے لیے آتا ہوا نظر نہ آیا۔ پھر اس نے اپنے ہمزاد کو زور زور سے پکارا ”اے میرے ہمزاد! تم کہاں ہو؟ میں دلدل میں پھنس گیا ہوں، آ کر مجھے بچاؤ۔۔۔“ مگر وہ بھی پہلے کی طرح غائب رہا۔۔۔

تاہم اس کی چیخ و پکار سن کر، نجانے کہاں سے، ایک خوفناک مگرمچھ ضرور نمودار ہو گیا تھا، جو اس کی جانب تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔۔۔۔!!

☆☆☆☆

پروفیسر صبا دشتیاری

بلوچی سے ترجمہ : مجبور بدر

سُوکھے پتّوں کا سنگیت

”پت جھڑ کا موسم بھی عجیب موسم ہے۔ ہر طرف ایسا لگتا ہے جیسے موت کا راج ہو۔ پیڑوں کی طرف آنکھیں پھیلائیں تو ایسا لگتا ہے جیسے موت کا فرشتہ اپنے دانت بجا رہا ہو۔ لوگ لمحہ بھر کے لیے اپنی نگاہیں بے پتے اور بے ثمر پیڑوں پر ٹھہرا نہیں سکتے ہیں۔ کوئی کتنا بھی نہ ہونے کے خوف کو کچھ نہ سمجھے لیکن وہ بڑے باغوں میں چھوٹے بڑے پیڑوں کو دیکھتا ہے تو اپنے دل میں ایک نادیدہ خوف سر اٹھائے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ اور یہی چاہتا ہے کہ اپنی نگاہیں بند کر لے لیکن آنکھیں بند کرنے سے پیڑوں کے بے لباس بدن ایسے ہی غائب ہو جائیں گے۔ شاید یہ ہو جائے کہ نہ ہو جائے یہ تو ہر کسی کے اپنے محسوسات ہیں۔ کچھ تو زندگی سے خائف ہیں اور کچھ موت کی اتھاہ گہرائیوں میں زندگی کے معنی تلاش کرتے ہیں“۔

”عبدل“ نے اپنی کتاب کی یہ سطریں پڑھتے ہی اضطراب کے ساتھ کتاب بند کر کے ایک طرف پھینک دی اور اک لمحہ کے لیے کھڑکی کے باہر کے مناظر کو دیکھنے لگا۔ وہ کتاب کی مطالعہ شدہ باتوں کی نقشیں باہر ڈھونڈ رہا تھا۔ مگر وہ شب دیجور میں کیا دیکھ سکتا ہے، لیکن جیسا کہ اس کے دل نے چاہا کہ یہ ناول کے یہی حصہ نے جس کو اضطراب کی ہے کچھ معنٰی دے جائیں۔ اسی لیے اِدھر اُدھر اپنی نگاہیں چار کیں۔ اُس نے یہی سوچا تھا کہ ناول کے اس حصے نے اس کے باطن میں ایک روشنی پیدا کر دی ہے۔ اور وہ اس شب دیجور میں بھی گھر کے پیچھے کے پیڑوں کے جسم کو دیکھ سکتا ہے۔ اور ان کے بے لباس زندگی کو پڑھ سکتا ہے۔ لیکن اندھیرے کے لیے اندر (باطن) کی روشنی کچھ کام نہ آ سکتی ہے۔ بلکہ باہر کی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور باہر خوفناک ہوا لمحہ کتوں کی بھونک اور مینڈکوں کی ٹرٹر کی آواز کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ عبدل نے بہت کوشش کی کہ اپنے اندر کی روشنی سے کام لے مگر اس نے جلد ہی محسوس کیا کہ اندر کی روشنی کھو رہی ہے اور اندھیرا پھر بڑھ رہی ہے۔ اس لیے کھڑکی بند کر کے چارپائی پر لیٹا اور کتاب ہاتھ میں لی لیکن اب تک اُسے اوپر والا حصہ ہضم نہ ہو سکا تھا۔ اس لیے کتاب اُسے ستا رہی تھی۔ اس لیے ٹوٹی ہوئی کرسی پر، سگریٹ لے کر جلایا اور کش لگانا شروع کیا پھر دانشوروں کے طرز پر سگریٹ کے دھوؤں میں بے لباس پیڑوں کے بدن کو دیکھنے لگا لیکن اس نے جلد ہی سوچا کہ خالی سگریٹ کے دھوئیں کچھ کام کے نہیں ہیں۔ اس نے دیکھا کہ آنکھیں جل رہی ہیں۔ اس لیے اپنے اوپر خود ہنسنے لگا۔

”یہ دانشور کیسے سگریٹ کے دھوؤں میں زندگی کی بڑی بڑی حقیقتوں کو دیکھ سکتے ہیں۔۔۔

میں۔۔۔ میں تو کچھ نھیں دیکھ سکتا۔۔۔ شاید میں دانشور نھیں ہوں۔۔۔ لیکن دانشور بھی ناول اور افسانے پڑھتے ہیں۔ میں بھی اس کے علاوہ کوئی اور کام نھیں کرتا۔۔۔ وہ بھی فلسفہ کی کتابوں کے دیوانے ہیں اور میں بھی۔۔۔ اگرچہ فلسفہ کو سمجھ نھیں سکتا ہوں مگر فلسفیوں کے نام اور عملوں کو جانتا ہوں۔۔۔ لیکن پھر بھی میں سگریٹ کے دھوئیں میں زندگی کے معنی کو کیوں دیکھ نھیں سکتا ہوں؟”

عبدل نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ جل رہے ہیں یعنی سگریٹ کب کے جل کر راکھ ہو چکی تھی۔

اب عبدل کے دماغ نے سوچنا چھوڑ دیا تھا اور نیند کے سرد جھونکے اُسے مدہوش کر رہے تھے۔

سورج ڈھلوانوں میں اتر چکا تھا۔ عبدل اپنی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر ایسا پرسکون تھا جیسے وہ شاہی بوپ اور بالشتوں پہ آرام کر رہا ہے۔ دیگر اور کام تو اُسے نہ تھا والد کی وفات کے بعد میٹرک کیا اور اب روزگار کے لیے دربدر تھا۔ بیوہ ماں نے محلہ میں “بانکانی چلو بگی” کر کے دو وقت کی سوکھی روٹی ڈھونڈ نکالتی ماں کا اکلوتا تھا۔ اس لیے “پیرزال” کو گوارا نہ ہوا کہ اُسے روزگار کے لیے مجبور کرے۔ ماں کو دیر تھی کہ وہ “بانک” کہ پاس گئی تھی۔ وہ پتہ نھیں کیسے خواب سے بیدار ہو کر باورچی خانہ کی طرف گیا۔ کوہلوں پہ چائے رکھی ہوئی تھی۔ اس نے بغیر دیکھے ایک، دو جیسہ کا لے کر گھر سے نکل گیا، دو قدم باغوں کی طرف گیا تو رات کے ناول کے پہلے حصہ کے حرف حرف پھر سامنے آنے لگے۔ خشک اور بےلباس درخت۔۔۔ زندگی اور موت کے معنی۔ اُس نے جلد جلد قدم اٹھاتے ہوئے، سائنسدانوں کی طرح باغ کی جانب روانہ ہوا۔ اُس نے نزدیک سے دیکھا کہ درخت بےلباس ہیں۔ مگر اس کے پاؤں پتوں کے سمندر میں ڈوب گئے۔ اُس نے جانا کہ درختیوں نے اپنے لباس کھیت پر پھیلا دیئے ہیں اور فطرت کی طرح بےلباس ہونا چاہتے ہیں۔

عبدل نے جب اپنے قدم آگے بڑھائے تو پھر پتوں کر کر نے اس کے دل میں خیالوں کی سنگیت سمندر کی لہروں نے شروع کی۔ خیالوں کے سمندر، زندگی کے معنی ڈھونڈنے کے جذبے، پتوں کی سنگیت کے اندر خیالوں نے اپنے جسم پہاڑوں کی طرح نمایاں کرنا شروع کیے لیکن عبدل نے نھیں جانا کہ ان خیالوں کو کیسے ایک مکمل فلسفہ کہ طور پر پیش کروں۔ وہ خود کو ہمیشہ دانشور سمجھتا تھا مگر زندگی کے معنی کی جستجو اور تلاش اُس کے لیے جیسے پہاڑ ڈھانے کے برابر تھا۔

وہ ابھی تک پتوں کے سمندر میں اپنی رات کے ساتھ مصروف تھا کہ اس کو کوئی اور بڑا کھڑ کھڑ کی آواز نے چونکا دیا۔ یہ آواز دور سے نھیں بلکہ اس کے نزدیک ہی سے آ رہی تھی۔ پہلے تو لرزا کہ شاید کوئی بھوت پریت ہو کہ اس کی ماں نے کہا تھا کہ پت جھڑ کے موسم میں بھی بھوت ہوتے ہیں۔ پتوں کو روندنا انھیں بُرا لگتا ہے۔ عبدل نے منہ موڑا تو دیکھا کہ ایک “پیرمرد” بوڑھا آدمی بڑا کتاب بغل میں لیے ہوئے ہے۔ اس کی طرف آ رہا ہے۔ مگر وہ نہ رُکا اور تیز وہاں سے گذرا جیسا کہ ہوا “گوات” گذرتی ہے اور اسی لحہ غائب ہو گیا۔

عبدل کو اتنا بھی ہمت نہ ہوا کہ اُسے روک کر حال احوال پوچھے۔ پھر اُس نے یہی سمجھا کہ شاید وہ پاگل اور دیوانہ ہو۔

روزمرّہ کی طرح عبدل آج پھر نوکری کی تلاش کرتے ہوئے ایک محلے سے اپنے گاؤں کی طرف آرہا تھا۔ وہ خوش تھا کیونکہ آج اُسے ماسٹری کی نوکری ملی تھی اور اس کی دلی خواہش بھی یہی تھی کہ وہ ایک استاد بن جائے۔ ناسمجھ اور جہالت کے سماج کے اندر زندگی کے معنی اور مطلب تلاش کرنے، لوگوں کو سمجھانے کا کام کر سکے۔ ایسے تو اس کی خواہش کبھی مری نہیں ہوئی تھی۔ لیکن آج نجانے کہاں سے اس کا سویا ہوا نصیب جاگ اٹھا تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ اس کی ماں اس نوکری سے خوش نہیں ہوگی مگر وہ خوش تھا۔

اس محلے سے گذرتے وقت اس نے دیکھا کہ کچھ بچوں کا ہجوم ہے، شوروغوغا کر رہے ہیں۔ وہ اس بھیڑ کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے نزدیک آکر دیکھتا ہے کہ ایک آدمی بندر لے کر نچا رہا ہے۔ اس کے مختلف جمپ اور چھلانگوں پر بچے بہت خوش تھے۔ تالیاں بجا رہے تھے، ناچ رہے تھے۔ بندر نے بہت رقص دیکھایا۔ بچوں کے ہاتھوں میں جو بھی تھا انہوں نے وہ ساری چیزیں بندر کے سامنے پھینک دیں۔ بندر کو نچانے والا شخص پہلے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اب اسے اپنا کھیل ختم کرنا تھا اس لیے کھڑا ہو گیا۔

عبدل نے دیکھا تو اس کا سر چکرانے لگا کیونکہ وہ اس شخص کو جانتا اور پہچانتا تھا مگر وہ حیران تھا کہ کہاں اور کیسے؟۔۔۔ ذہن پہ زور دیا۔۔۔ دیکھتا ہوں کہ میں نے اسے کہاں دیکھا تھا۔ اچانک خیال آیا کہ یہ وہی آدمی ہے کہ بڑی کتاب بغل میں لیے ہوئے تھا اور درختوں کے خشک پتوں کو روندتا ہوا اس کے قریب سے گذرا تھا جیسے کوئی بجلی چمک کر گذرے۔ وہ لمحے اور یہ وقت ۔۔۔ وہ آدمی اور یہ حالت ۔۔۔

عبدل سمجھا نہیں کہ بات کیا ہے اس لیے اسی وقت آگے جاتے ہوئے پیرمرد کا ہاتھ پکڑا اور پوچھا:

”واجا! آپ کون ہیں؟ یہ سب کیا ہے؟“

پیرمرد نے جواب دیا:

”میں ایک ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر ہوں۔۔۔ زندگی کی جستجو کے بعد اب کھانے کی جستجو میں نکلا ہوں۔۔“

یہ پیرمرد کی باتوں سے جیسے کوئی تیز ہوا چلی اور سارے پیڑوں کے پتوں نے ہجرت کر کے کھیت میں پھیل گئے۔

عبدل نے یہی سوچا کہ جیسے کہ یہ پیڑ میں بیٹھے ہوئے بچے اور عورت سوکھے پتے ہیں اور وہ اور پیر مرد بے لباس درخت ہیں اور دونوں درختوں کے پتوں کے سمندر میں ڈوب گئے ہیں مگر یہ سوکھے پتوں کی سنکیت غائب ہے۔

بلوچی ادب سے

تخلیق و ترجمہ: یعقوب شاہ غرشین

سب مر گئے۔۔۔

اٹھو۔۔۔۔بھاگو۔۔۔۔نکلو۔۔۔۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ تاریک کمرے میں زوردار آوازیں گونجنے لگیں۔ صبور خان کا سارا گھرانہ گہری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھا اور سب بے اختیار دیواریں ٹٹول کر دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہر ایک کے منہ سے عجیب وغریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ قیامت خیز شور وغوغا بپا تھا، کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ زمین پر عجب لرزش طاری تھی اور یوں لگ رہا تھا کہ جیسے دھرتی شق ہونے والی ہے۔ گھر کے کچے کمروں کی دیواریں اور چھتیں شرارتی بچوں کی طرح اچھل کود رہی تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے کواڑ یوں بج رہے تھے جیسے کوئی انہیں پیٹ رہا ہو۔ خوف و دہشت کی شدت پورے جسم میں سنسنی پیدا کر رہی تھی۔ زمین کی لرزش سے اٹھنے والی لہریں اعصاب میں بجلی کے کرنٹ کی مانند دوڑ رہی تھیں۔ زمین پر قدم نہیں ٹک رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی قدموں سے زمین سرکا رہا ہو۔ ایک حشر برپا تھا اور عجب نفسانفسی کا عالم تھا۔

صبور خان اور اس کی بیوی کو چھوٹے بچوں کی پڑی تھی۔ دونوں گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اپنے بچوں کو زور زور سے پکار رہے تھے اور انہیں کمرے سے جلدی نکلنے کی تاکید کر رہے تھے۔ دونوں چھوٹے بچوں کے بستر کی طرف لپکے۔ اس کی بیوی نے دیوانہ وار سوئے ہوئے اسد خان کو گود میں اٹھایا اور نکلو!۔۔۔بھاگو! دوڑو!۔۔۔ کے نعرے لگاتی ہوئی دروازے کی جانب بھاگیں۔

گھر کی دیواریں مست ہاتھیوں کی طرح جھوم رہی تھی۔ چھت کی لکڑیوں اور بانسوں سے چیں چیں کی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے پورا گھر کسی جھولے میں رکھ دیا گیا ہو اور وہ سب جھول رہے تھے۔ آرائشی سامان اور طاقچوں میں رکھے برتنوں کے گرنے اور ٹوٹنے کی جھنکار میں ان کی چیخ وپکار دب کر رہ گئیں تھیں۔ دروازے کے قریب پہنچتے ہی دھڑام سے دیوار گرنے کی ہولناک آواز سنائی

دیں۔ اسد خان کی ماں کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی، اس نے پوری قوت سے فوراً بیٹے کو باہر دھکیل دیا جو صحن میں منہ کے بل گر پڑا۔ اس کے بعد زوردار آوازوں کے ساتھ مسلسل دیواروں کے گرنے کی صدائیں بلند ہونے لگیں جس سے زمین کی لرزش میں مزید اضافہ ہوا۔

بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان واقع چھوٹی وادی زلزلے کی گڑگڑاہٹ اور بڑے بڑے پتھروں کے لڑھکنے کے شور سے گونج رہی تھی۔ چٹانوں کے تڑکنے کی تیز آوازیں اس پیالہ نما وادی میں بازگشت پیدا کر رہی تھیں۔ اس میں شہتیروں کے چٹخنے کی کھڑکھڑاہٹ، دیواروں کے گرنے کی دھوم دار آوازیں، ملبے تلے دبنے والوں کی خوفناک چیخیں اور زخمیوں کی کراہنے کی آوازیں شامل تھیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے عجیب روشنیاں پھوٹ کر آسمان پر بجلی کی مانند کوند رہی تھیں۔ رات کی تاریکی میں دھول کے طوفان سے ٹمٹماتے ہوئے تارے بھی چھپ گئے تھے۔

اسد خان کے سر پر ہلکی سی چوٹ لگی تھی۔ وہ خوف و دہشت سے مغلوب ہو کر درد کا احساس بھول چکا تھا۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے سر زمین سے اٹھایا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی جھولے میں بیٹھا ہو۔ اس نے اٹھنے کی پوری کوشش کی لیکن چکرا کر پھر گر پڑا۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا اور دھول کے طوفان میں سب کچھ چھپ گیا تھا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا، یوں محسوس ہوا جیسے وہ اندھا ہو چکا ہو۔ تیز ہواؤں کی دھول سے بچنے کے لیے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ وہ زور زور سے بے ساختہ چلانے لگا، ''سب مر گئے، سب مر گئے''۔

چیخ و پکار کا شور اور گھروں کے گرنے کی ہولناک آوازوں کی بازگشت دیر تک گونجتی رہی۔ چند لمحے بعد اس میں پہاڑی تودوں کے گرنے کا مہیب شور اور تیز ہواؤں کے اٹھنے والے بگولوں کی سرسراہٹ بھی شامل ہو گئی۔ ایک ہنستا بستا گاؤں آناً فاناً پیوند خاک ہو چکا تھا۔ دھیرے دھیرے شور تھما اور ہر طرف موت کی خاموشی چھا گئی۔ اسد خان نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا دیر تک بڑبڑاتا رہا ''سب مر گئے، سب مر گئے'' ۔۔ اس کے بعد اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔

دھیرے دھیرے رات کی تاریکی چھٹنے لگی تو سردی کی شدت میں اضافہ ہوا۔ ستاروں کی روشنی ماند پڑنے لگی، سپیدیِ سحر نمودار ہوئی تو گرد و غبار کا طوفان بیٹھ چکا تھا۔ ہر طرف اداس سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کہیں سے نہ اذان کی صدائیں گونجیں، نہ مرغوں نے بانگ دیں، نہ ہی کتوں کے بھونکنے اور بھیڑ بکریوں کے ممیانے کی آوازیں ابھریں۔ اسد خان ہوش میں آیا تو اس نے کروٹ بدلی اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا

"ماں"۔۔۔ شدید سردی سے اس کا جسم اکڑ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے اردگرد نگاہیں دوڑائیں تو صبح کی مدہم روشنی میں چاروں طرف ملبے کے ڈھیر ہی ڈھیر نظر آئے۔ ہو کا عالم تھا، نہ گاؤں تھا نہ کوئی گھر۔۔۔ اونچے اونچے پہاڑوں کے دامن میں کھنڈرات ہی کھنڈرات دکھائی دے رہے تھے۔ وہ گھر کے ملبے کے بیچ میں تنہا لیٹا ہوا تھا۔ اس کا سارا جسم مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ وہ حیران و پریشان بادلوں کی طرح اردگرد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ گزرے سانحے کی یاد اس کے ذہن میں خواب کی مانند گھومنے لگی۔ دھیرے دھیرے اس کے ہوش و حواس بحال ہوئے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اپنے ماں باپ کو پکارتے ہوئے دیوانہ وار اپنے منہدم کمرے کی جانب بھاگا۔ وہ دیر تک مٹی کے ڈھیر پر گم سم کھڑا سوچتا رہا کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ اس کی حالت اس نوزائیدہ بچے کی مانند تھی جسے اس کی ماں سنسان جنگل میں جننے کے بعد چل بسی ہو۔ اس کی نال مردہ ماں کے جسم سے اٹکی ہوئی ہو اور وہ فطرت کے رحم و کرم پر اکیلا پڑا زار و قطار رو رہا ہو۔ اب نیلا آسمان اس کا باپ اور خاکی زمین اس کی ماں تھی۔

ایک بار پھر خوف کی شدت سے اس کے دماغ میں زلزلے کی ہولناک گڑگڑاہٹ کی بازگشت گونجی۔ اس کے رگ و پے میں سنسناہٹ پیدا ہوئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی رگوں میں گرم خون کی بجائے پگھلی ہوئی برف کی ندیاں بہہ رہی ہوں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا بدن منجمد ہو چکا ہو۔ دہشت زدہ دماغ کے تہہ خانوں میں وسوسوں کے بگولے اٹھ رہے تھے۔ میرا ہنستا بستا گاؤں اچانک کھنڈرات میں کیسے تبدیل ہو سکتا ہے؟ یہاں تو سنسانی کا عالم ہے۔ نہ کوئی آواز، نہ در و دیوار، نہ کوئی ذی حس۔۔۔ اس نے اپنے دماغ پر بے تحاشا زور ڈالا۔ اس کے ہر سوال کا ادھورا جواب "زلزلہ" پر آ کر اٹک جاتا تھا۔ ذہن میں زلزلے کی گڑگڑاہٹ گونجنے لگتی اور اس کا سر چکرانے لگتا۔ زلزلے کی ہم سے کیا دشمنی تھی؟ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ اس نے سب کچھ کیوں پیوند خاک کیا؟ پورے گاؤں کو مٹی کے ڈھیر میں کیوں تبدیل کر دیا؟ اس کا ننھا سا ذہن اپنے گھر بار کی تباہی کو تسلیم کرنے سے گریزاں تھا۔ اسے یاد آیا، رات کو بابا نے اخروٹ توڑ کر کھلائے تھے اور ماں "موسیٰ خان گل مکئی" کی لوک داستان سناتی رہی۔ اس دوران نہ جانے کب میری آنکھ لگی تھی۔ ہاں، پچھلی رات کو میں ایک بار اس وقت جاگ گیا تھا جب چھوٹا بھائی جانان زور زور سے رو رہا تھا اور ماں اس کا جھولا جھولتے ہوئے "للے للو" کہہ کر اسے سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔

میرے ماں باپ، بہن بھائی اور رشتہ دار مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے؟ کہاں چلے گئے؟ یہ سوچتے ہوئے اس نے دیوانہ وار اپنے چھوٹے سے گاؤں کے اردگرد کئی چکر لگائے۔۔۔ روتے ہوئے اس

کی ہچکی بندھ گئی۔۔۔ وہ پوری قوت سے چیخا چلایا۔۔۔ اپنے خاندان کے ہر فرد کو بار بار پکارا۔۔۔ رشتہ داروں اور دوستوں کے نام لے کر آوازیں دیں۔۔۔ اس کی زوردار آوازیں اونچے پہاڑوں کی سنگین چٹانوں سے ٹکرا کر بازگشت پیدا کرتی رہیں۔۔۔ مگر اپنی ہی آواز کی بازگشت کے سوا اسے کوئی صدا سنائی نہیں دی۔ دور پہاڑ کی اونچی چوٹی سے اداس سورج کا روشن چہرہ اُبھرا، اس کی لطیف کرنوں نے اسے اپنے حصار میں لیا اور اسد خان کی ذرا ڈھارس بندھی۔ اس نے چاروں طرف پھیلے ہوئے پہاڑوں کی طرف نگاہیں دوڑائیں۔ پہاڑی جھرنے کا رستا پانی اشکوں کی مانند اونچی چٹان سے ٹپک رہا تھا۔ یہ پانی سنگلاخ چٹانوں کے درمیان برساتی نالے میں یوں بہہ رہا تھا جیسے کسی روتے ہوئے بچے کے چہرے پر آنسوؤں کا دھارا ہو۔ صنوبر کے درخت دھول سے اٹے ہوئے ماتم کناں نظر آئے۔ سیب اور چیری کے باغات کے پتے جھڑ چکے تھے اور اس کے برہنہ درخت سر جھکائے سوگوار کھڑے تھے۔ چاروں طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ وہ اپنائیت کے احساس سے دیر تک اس اداس منظر کو تکتا رہا۔ پہاڑ جوں کے توں اپنی جگہ پر ڈٹے کھڑے تھے صرف کوہ تکلو کی تین اونچی چوٹیوں میں سے ایک نظر نہیں آ رہی تھی، شاید وہ بھی ڈھے چکی تھی۔

اسد خان ہر طرف سے مایوس ہو کر واپس اپنے گھر کی طرف پلٹا تو اپنی بہن گل بشرہ کے کتے ''زڑ گئی'' کو گھر کا ملبہ کریدتے ہوئے پایا۔ اس کے قدموں کی چاپ سنی تو اس نے دم ہلاتے ہوئے ہوا میں کئی چھلانگیں لگائیں اور دوڑ کر اسد کے قدموں سے چمٹ گیا۔ اس کے منہ سے دردناک چیخیں یوں نکل رہی تھیں جیسے رو رہا ہو۔ گھر کے پچھواڑے میں جانوروں کا کمرہ زمین بوس ہو چکا تھا۔ وہ وہاں سے جان بچا کر نکلا تھا۔ اس کی پچھلی ٹانگ پر چوٹ لگی تھی، اس لیے لنگڑا کر چل رہا تھا۔ اسد خان نے بے اختیار اسے گود میں اٹھایا اور بے تحاشا چومنے لگا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی کتے کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھے۔ اس کے حلق میں بھی شدت غم سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔ زڑ گئی مچل کر اس کی گود سے نکلا اور اسی جگہ چلا گیا جسے وہ پہلے کرید رہا تھا۔ اسد خان بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ اس کی نظر ملبے میں دبے چادر کے کونے پر پڑی جس کے اوپر پڑی مٹی کو کتا، بہت احتیاط سے کرید رہا تھا۔ اسد خان تیزی سے لپکا اور مٹی اور پتھر ہٹانے لگا۔ اسے مٹی سے آلودہ بے جان ہاتھ نظر آیا جس میں وہ سنہرا کڑا دکھائی دیا جو اس کا بابا اپنی چہیتی بیٹی گل بشرہ کے لیے شہر سے لایا تھا۔ اس کے نازک ہاتھ پر عید کے موقع پر مہندی سے بنے بیل بوٹے موجود تھے۔ اس نے روتے ہوئے تیزی سے مٹی اور پتھر ہٹانے شروع کیے۔ کچھ دیر بعد گل بشرہ کا خاک آلود بدن نظر آیا۔ وہ دیر تک اس کی پیشانی کے سبز خال کو تکتا رہا۔ یہ خال اس کی ماں نے نظر بد کی خاطر کھدوایا تھا۔ اس نے پوری قوت

سے اسے اوپر کھینچا اور ملبے کے ڈھیر سے باہر نکالا۔۔۔ گل بشرہ کا چہرہ خزاں رسیدہ پھول کی طرح مرجھا چکا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی اور جسم اکڑ چکا تھا۔ اسد نے اسے ہلایا جلایا۔۔۔ زور زور سے آوازیں دیں۔۔۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس کے ذہن میں سوال ابھرا۔ کیا وہ مر چکی ہے؟ اس نے کسی مردے کو کبھی قریب سے نہیں دیکھا تھا، البتہ وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ مرنے کے بعد انسان کا جسم بے جان ہو جاتا ہے۔ اس سے لپٹ کر رونے کے بعد اسے یہ اندازہ ہوا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ گل بشرہ کو زلزلے نے مار دیا ہے۔۔۔ اس کے معصوم اور حسین چہرے کو دیکھتے ہوئے اسد کے دل میں ٹیس اٹھی اور اسے زلزلے سے شدید نفرت کا احساس ہوا۔۔۔ کتے نے اس کا جسم سونگھا اور پاگلوں کی طرح چاروں طرف کئی چکر لگائے اور پھر آسمان کی طرف سر اٹھا کر دردناک انداز سے یوں بھونکنا شروع کیا جیسے رو رہا ہو۔ آخر کار نڈھال ہو کر وہ تھوتھنی اپنی مالکن کے قدموں پر رکھ کر سوگوارانہ انداز میں بیٹھ گیا۔

اپنی بہن کی لاش ملبے سے نکالنے کے بعد اسے یہ یقین ہو گیا کہ اس کا خاندان کہیں نہیں گیا بلکہ گھر کے ملبے تلے دبا ہوا ہے۔ اچانک اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید اس کے خاندان کا کوئی فرد اب بھی زندہ ہو۔ مجھے جیسا بھی ہو سب کو ملبے سے جلد از جلد نکالنا چاہیے۔ اسے یاد آیا کہ ماں نے باہر دھکیل کر میری جان بچائی۔ وہ خود دوسرے بچوں کو نکالنے کی خاطر کمرے کے اندر پلٹی اور اسی دوران کمرے کی چھت گر پڑی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے تیزی سے پتھر اور اینٹیں باہر پھینکنا شروع کر دیئے۔ اس کے نازک ہاتھ شل ہوئے۔ شدید سردی کے باوجود آنسوؤں اور پسینے کے قطروں نے اس کے خاک آلود چہرے کو دھو ڈالا تھا۔۔۔ اس دوران جب اس نے چھت کے بانسوں کے درمیان پڑی چٹائی ہٹائی تو اس کے نیچے اسے لال رنگ کا زری لباس نظر آیا۔ اس کی ماں اکثر اسی رنگ کے کپڑے پہنتی تھی۔ اس نے تیزی سے چٹائی کے تنکوں کو ایک ایک کر کے کھینچتے ہوئے سوچا۔ یہاں ہی ہوگی۔ وہ مجھے موت کے منہ سے نکال کر خود منوں مٹی تلے دب چکی ہے۔۔۔ آہستہ آہستہ ماں کا چہرہ اور ہاتھ نمودار ہوئے۔۔۔ اس نے پیار سے اس کے اکڑے ہوئے ہاتھوں کو چوما جو برف کی طرح سرد تھے۔۔۔ ماں کے سینے سے لپٹ کر اس کا گرد آلود چہرہ صاف کیا۔۔۔ اس کی پکار نے آسمان کا سینہ چیر ڈالا۔

ماں۔۔۔ پیاری ماں۔۔۔

ماں کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔۔۔ اس نے نہ اپنے غمزدہ بیٹے کو سینے سے لگایا اور نہ ہی اپنے مخصوص الفاظ "قربان، صدقے جاؤں۔۔۔" کہے۔ اس کی چیخوں کی بازگشت فضا میں گونجی۔ میری ماں

نہیں مر سکتی۔۔۔میری ماں نہیں مر سکتی۔۔۔، ماں کی ٹانگیں بڑے شہتیر کے نیچے بری طرح پھنسی ہوئی تھیں۔ اس نے پورا زور لگایا مگر وزنی شہتیر کو ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ چیونٹی کی طرح شہتیر سے چمٹ کر اسے ہٹانے کی کوشش میں تھک ہار کر ہانپنے لگا۔۔۔آخر کار بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے پھر ماں کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگا۔۔۔چند لمحے بعد اسے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ رکھنے کا احساس ہوا۔ غم اور خوشی کی ملی جلی کیفیت کے احساس کے ساتھ مڑ کر دیکھا تو پھٹے پرانے قمیص میں ملبوس، دراز الجھے بالوں والا، برہنہ پا، لمبا تڑنگا سراپا سامنے کھڑا تھا۔۔۔یہ جانو دیوانہ تھا۔ یہ وہی درویش تھا جو دنیا و مافیہا سے بے خبر دور کہیں پہاڑوں میں رہتا تھا اور کبھی کبھار آبادی کا رخ کرتا۔ وہ اکثر خاموش رہتا تھا، جب کبھی بولتا تو اس کی معنی خیز باتیں ان پڑھ دیہاتیوں کی سمجھ میں نہ آتیں۔ وہ اکثر ایک ہی بات کی رٹ لگایا کرتا تھا۔ بدبختو! زمین پر اکڑ کر نہ چلا کرو، دھرتی کا انتقام بہت سخت ہوتا ہے۔۔۔آج جانو دیوانہ بہت بدلا ہوا لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر کرختگی کی بجائے محبت اور شفقت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس سے ڈر کر بھاگ جاتا لیکن اس حالت میں جانو دیوانہ اسے سر پر تنے ہوئے چھت کی مانند لگا۔ وہ بے اختیار جانو سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ گل بشرہ مر گئی۔۔۔ماں مر گئی۔۔۔سب مر گئے۔۔۔کوئی زندہ نہیں بچا۔۔۔سب مر گئے۔۔۔جانو نے اسے گلے لگایا اور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ بیٹا! انسان اور فطرت ہر وقت حالتِ جنگ میں ہوتے ہیں، قدرتی آفات تو فطرت کے ہتھیار ہوتے ہیں۔ ہم اس کے وار نہیں سہہ سکتے البتہ خود کو محفوظ رکھنے کی تدابیر ضرور کر سکتے ہیں۔۔۔ہم جب بھی غفلت کا مظاہرہ کرتے ہیں تو فطرت پچھلی شب کی طرح شب خون مارتی ہے۔۔۔ویسے بھی زندگی اور موت کا ازلی کھیل جاری رہتا ہے۔۔۔ہم سب نے مرنا ہے۔۔۔ہم سب مریں گے۔۔۔اس اٹل حقیقت کو جھٹلانا ہی انسان کی سب سے بڑی بدبختی ہے۔۔۔افسوس، لوگ مٹی کے گھروندوں سے دل لگاتے ہیں اور آخر کار انہیں کے ملبے تلے دب کر مر جاتے ہیں۔۔۔جانو نے اسد خان کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا، بیٹا! تم میری باتوں کو دیوانے کی بڑ نہ سمجھنا، انسان اس وقت تک خواب غفلت سے بیدار نہیں ہوتا جب تک اس پر کوئی بڑی افتاد نہ آن پڑے۔۔۔خیر، ہمیں ہر وقت مالک کی مرضی پر راضی بہ رضا ہونا چاہیے۔ حوصلہ رکھو، اللہ غفور و رحیم ہے۔ آؤ! مل کر ملبہ ہٹاتے ہیں اور مرحومین کی تدفین کا بندوبست کرتے ہیں۔

اسد خان کے والد اور چھوٹے بھائی جانان کی لاشیں کمرے کے وسط سے برآمد ہوئیں۔ بابا نے اسے اپنی بانہوں میں مضبوطی سے سمیٹا تھا۔ انہوں نے جانان کو بہت مشکل سے بابا کے اکڑے ہوئے بازوں

سے الگ کیا۔ گویا وہ مرنے کے بعد بھی اسے اپنے آپ سے دور رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ کمرے کی چھت بابا کے عین سر پر گری تھی اور اس کے سر سے خون رس رہا تھا۔ بڑا بھائی صمد خان اپنے بستر کے قریب دیوار کے نیچے دبا تھا۔ وہ سونے کا بہت شوقین تھا، اب بھی یوں لگتا تھا جیسے گہری نیند سو رہا ہو۔

سورج غروب ہونے سے پہلے دونوں نے مل کر بہت مشکل سے پورے خاندان کی لاشیں نکالیں اور ایک بڑی قبر کھود کر انھیں اکٹھا دفنا دیا۔ مردوں کے نکالنے کے کام میں کتے (زڑگنی) نے بڑی مدد کی۔ اس نے مٹی سونگھ کر اپنے مالکوں کے دبنے کے مقام کی نشاندہی کی۔ جانو نے اسد خان میں ہمت اور حوصلے کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ دونوں تھک کر چور ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ذرا دیر نہیں سستائے اور بھوکے پیاسے خاموشی سے ملبہ ہٹانے اور مردوں کو دفنانے کے کام میں لگے رہے۔ اس روز آسمان پر بے شمار گدھ منڈلا رہے تھے جو ان کے اردگرد چکر لگاتے رہے۔۔۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو جانو پر عجیب کیفیت طاری ہوئی، وہ کہنے لگا، ہم سب نے مرنا ہے۔۔۔ ہم سب مریں گے۔۔۔ اس نے اسد خان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ بیٹا! تم میرے ساتھ چلو، ہم اپنے غار میں گزر بسر کریں گے۔ اس آفت زدہ بستی میں اب مردوں کا تعفن پھیلے گا جس سے وبائی امراض پھوٹنے کا خطرہ ہے۔ میں تمھیں اس شدید سردی کے موسم میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر مرنے کے لیے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ ویسے بھی دن کو سر پر منڈلاتے گدھ اور رات کو پہاڑوں سے اترنے والے بھیڑیے بہت سفاک ہوتے ہیں۔ وہ مردوں کے ساتھ تمہارا بھی تکا بوٹی کر دیں گے۔۔۔ اسد خان نے اس کا مہربان ہاتھ تھاما، مایوسی سے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اور ”سب مر گئے“ کہہ کر جانو کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اس نے قبر کے سرہانے بیٹھے ہوئے کتے کو چمکارا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا اور اپنا سر اگلی ٹانگوں پر رکھ کر گویا ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس وقت دور سے گیدڑوں اور بھیڑیوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔۔۔ جانو نے آسمان کی طرف دیکھ کر زوردار قہقہہ لگایا اور اسد خان کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر اپنی منزل کی جانب قدم بڑھانے لگا۔ اس کے منہ سے سورۃ زلزال کی مقدس آیات پھوٹ رہی تھیں جس کے انوار کی تجلی بہار کی ہلکی برکھا کی مانند پوری وادی پر برس رہی تھی۔

اِذَا زُلزِلَتِ الاَرضُ زِلزَالَهَا۔ وَاَخرَجَتِ الاَرضُ اَثقَالَهَا۔ وَقَالَ الاِنسَانُ مَالَهَا۔۔۔

☆☆☆☆

براہوی ادب سے

تخلیق وتراجم : افضل مراد

آج میں پہاڑوں پر جاؤں گا

کوئی نئی بات
کوئی نیا خیال
نیا حال
نئے احوال نہیں
کوئی نیا دکھ
نیا درد نہیں
غرض زندگی یکسانیت کا شکار ہو کر رہ گئی ہے
آج میں پہاڑ پر جاؤں گا
اور (سب سے) بلند چوٹی پر جا کر
چیخ چیخ کر
لوگوں کو بلاؤں گا
کہ ”اگر کسی کے پاس ہے
تو مجھے دے دے
کوئی نئی بات، نیا خیال
(اور) آنے والے دنوں کا پتہ
کہ ان پرانے اور بوسیدہ دن راتوں میں
دم گھٹنے لگا ہے“
اب مجھے چاہیے
کوئی نیا نظارہ، نیا اشارہ
آج میں پہاڑوں پر جاؤں گا
اسے بلاؤں گا۔۔۔۔!!

مبارک قاضی

بلوچی سے ترجمہ عمران ثاقب

سایۂ دھوپ

دوپہر کی کانچ جیسی دھوپ میں
برہنہ سائے پہ مری لاش پڑی ہے
کوئی نہیں جو دل میں غم وارس کا موسم کرے
مری برہنہ لاش کی بربادی پہ ماتم کرے
اے چشم چوگان و چاپ
ہے گم شدہ فصل بہار
رحلِ درد پہ دل رکھا مثلِ قرآں
کہ میں اب حجرۂ عشق میں
سرابِ آگہی کی تلاوت کروں
دیوانگی دھوپ کی ملامت کروں
ساہِ ہستی و نیستی سنگت کروں
چھاؤں کو یکسر جلا دوں آب میں
نگہہِ چار سُو قیامت کروں
باد کو زیارت کروں

☆☆☆☆

محمد رفیق مغیری

بلوچی سے ترجمہ: غلام قادر خان بزدار

تو لاشریک و قادر و رب قدیم ہے
تو مہرباں ہے اور غفور الرحیم ہے
داتا بھی تو ہے مالک و مولا کریم ہے
شاہوں کا شاہ تو تری شاہی عظیم ہے
تُو ہی رازق تُو ہی علیم و حلیم ہے
ہر روگ کا ہر یاس کا حازق حکیم ہے
یارب ہیں تیری نعمتیں بے حد و بے شمار
بخشے ہیں داد دل ہمیں تو نے جو صد ہزار
تیری عطا ہیں مہروماہ تحفہ ترا بہار
آرائشِ گلاب ہے سبزہ ہے بے کنار
کتنے رسیلے پھل ہیں انگور اور انار
شاکر سدا ہیں تیرے یہ بندے گناہگار
ساری حیات کٹ گئی آیا نہ یہ خیال
آنے لگا ہے زیست پہ دن رات اک زوال
تو شاہِ بے مثال ہے آقائے لم یزال
ہو عزم اس قدر کرے بندہ ترا سوال
الفت ہو دین سے ہمیں دل میں نہ ہو ملال
روزی جو ہو نصیب میں وہ رزق ہو حلال
پروردگار بھی ہے تو ہستی تری غفور
اس شیطنت کے شر سے اماں چاہیے ضرور
ابلیس بدنصیب ہے رکھ دور اور نفور
یا رب خطائیں معاف ہوں، ہوں درگزر قصور
منکر جو تیرے ہیں رہیں مردود تا نشور
تیرے رفیق کو ہوں عطا جنت کے سب سرُور

براہوی ادب سے

تخلیق و ترجمہ: امرت مراد

Nature Cannot be Changed

سیاہ شب کی سیاہی سے گھبرا کر
ہوا کسی روشن دیے کے پاس
رات گزارنے کی خواہش لے کر
یہاں وہاں بھٹکتی
درودیوار سے ٹکراتی
مجھ تک آ ہی گئی
میں دیے روشن کیے
رات کی سیاہی مٹانے کی کوشش کیے
جہدِ مسلسل میں مصروفِ کار
اور دیا بچاؤں بار بار
وہ حیران کہ جاؤں یا آؤں؟
پھر دبے پاؤں
آنچل سمیٹے، ڈری ڈری سی آنکھوں سے
یہاں وہاں تکتے تکتے
ان کے پاس آ بیٹھی تھی
ساری رات سانس بھی لیتی تھی
آہستہ آہستہ

کہ لو نہ تھرتھرا جائے
ٹھنڈی آہ سے دیا نہ بجھ جائے
پو پھٹے پر چل پڑی وہ
بے نیازی سے آنچل کو لہرا کر وہ
اٹھکیلی کرتی
اور مسکراتی
کہنے لگی الوداع
تب تک کمزور سا ایک دیا
اس کی بے نیاز فطرت سے
الوداع کہنے پر
آنچل کے لہرانے پر
جلتا رہتا؟؟؟؟

☆☆☆☆

مسرّت کلانچوی

سرائیکی سے ترجمہ : سلیم شہزاد

بند کھڑکی

ماسٹر کریم بخش سیانے چالاک، ہوشیار اور جلد سبق یاد کرنے والے بچوں کے لیے جتنا سخت تھا، بھولے بھالے کند ذہن بچوں کے ساتھ اُسے اُتنا ہی پیار کرتا تھا۔ وہ اکثر ایسے بچوں کو چھٹی کے بعد بھی پڑھاتا۔ سب بچوں کو سکول سے بھیج کر وہ کسی بچے کو اکیلا بٹھا کر پیار سے سبق یاد کرواتا۔ سارا محلہ ماسٹر کریم بخش کے گُن گاتا۔ ماسٹر کریم بخش کا باپ اُس کے بچپن میں ہی مر گیا تھا۔ اُس کی ماں نے دُوسری شادی کی جس میں سے عائشہ تھی جسے سب آشاں کہہ کر بلاتے تھے۔ اور پھر آشاں کا باپ اُسے بھی یتیم کر گیا۔ ماں نے دوکان کے کرایے سے اُنھیں بڑی مشکل سے پالا دونوں جوان ہوئے۔ آشاں محلے کی لڑکیوں کو سلائی کڑھائی سکھاتی اور کریم بخش بھی ماسٹر لگ گیا

۔ اور پھر ایک دن اماں نے بھی آنکھیں مُوند لیں۔ کریم بخش کو ماں کے مرنے کا قلق بہت تھا۔ وہ یہ سوچ کے غم کے اندھے کنوئیں میں گر جاتا کہ جس گھر میں وہ رہتے، جس دوکان کے کرایے پر گزارا کرتے وہ آشاں کے باپ کی تھی جسے وہ اپنی بیماری کے دوران آشاں کے نام کر گیا تھا۔ اب آشاں چاہتی تو اپنی شادی کے بعد کریم بخش کو گھر سے چلتا کر سکتی تھی۔

آج تو آشاں نے بھی پُرسے کے لیے آئے رشتے داروں کے جانے کے بعد پہلی مرتبہ رات کو اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ دونوں جو بچپن میں آنکھ مچولی اور گاڑی گاڑی کھیلتے، ایک تھالی میں کھاتے اور ایک کٹورے میں پیتے تھے، اب ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن گئے تھے۔ پہلے آشاں خود کریم بخش کا کھانا لایا کرتی تھی لیکن اب کسی شاگرد کے ہاتھ بھیجنا شروع کر دیا۔ اماں کا چہلم ہوا تو چاچا جندن شاہ نے ایک طرف لے جا کر کریم بخش کو بہت سی باتیں سمجھائیں۔ جن میں سے سب سے اہم بات یہ تھی کہ جوان بہن کو گھر میں بٹھانے والے پر اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے اور سر مہینے وہ میکے میں جتنے کپڑے دھوئے گی اُتنے ہی رسّے وارث کی گردن میں باندھے جائیں گے۔

”تم کیا سمجھتے ہو چاچا۔“ کریم بخش غصے پر قابو وپاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے احساس نہیں ہے۔ سیّدوں کے رشتے کی خاطر اب تک اماں نے اُسے گھر بٹھائے رکھا۔ اب غیروں میں بہن بیاہ کرا پنے گلے میں عذاب ڈال لوں اور اُس کا بھی خانہ خراب کروں۔ جب تمھیں سیّدوں میں کوئی رشتہ مل جائے تو مجھے بتانا۔“

آشاں دھیری دھیری آواز میں لڑکیوں کو یوں درس دیتی جیسے اُجاڑ میدان میں کوئی اکیلا بیٹھا سسکیاں بھرتا ہو یا جیسے تھل میں کوئی کونج راہ بھول جانے پر درد بھری آواز میں بچھڑی ڈار کو پکارتی یا جیسے پہلی مرتبہ پنجرے میں بند ہونے والی چڑیا چوں چوں کرتی ہے۔

اور پھر یہ آواز بھی بند ہو گئی اور اُس نے وقت سے پہلے لڑکیوں کی چھٹی کر دی اور اپنے بستر پر آن گری۔ دادی بختو نے بتایا تھا کہ چاچا جندن شاہ کسی غریب سیّد کا رشتہ ڈھونڈ آیا تھا جس پر کریم بخش نے اُس کو اچھی خاصی جھاڑ پلائی۔

”میری بہن زمین جائیداد والی ہے۔ کوئی جوڑ تو دیکھتے اور پھر وہ نیک اور معصوم ہے۔ کوئی اللّٰہ کا نیک اور سیدھا سادھا بندہ ہی اُس کا جوڑ ہو سکتا ہے۔“

اور پھر اللّٰہ کے نیک بندے کے انتظار میں کچھ سال اور گزر گئے۔ دن کو حویلی میں اماں کی لگائی ہوئی بوڑھی بیری ہَوا کے ساتھ سَاں سَاں کرتی تو یوں محسوس ہوتا کہ اماں ہولے ہولے رو رو کر آشاں کے لیے امان مانگ رہی ہو۔ رات کو تارے نکلتے تو لگتا جیسے اماں کے آنسو آسمان پر موتی بن کر پھیل گئے ہوں۔

کریم بخش اور آشاں ایک دُوسرے کے لیے زیادہ اجنبی ہوتے گئے۔ کریم بخش کا دل بچوں کے ساتھ لگتا گیا اور آشاں کا دل اُتنا ہی بچّیوں سے کھٹا ہوتا گیا۔ کوئی یار دوست کریم بخش کو شادی کا کہتا تو وہ چڑ جاتا۔ ”میں اِتنا بے غیرت نہیں۔ یتیم بہن کو گھر بٹھا کر خود سہرے باندھ لوں۔“

”بھائی ہو تو ایسا۔“ کوئی تعریف کرتا تو کوئی طنز کے ساتھ مسکرا پڑتا۔ اماں کی تیسری برسی پر چاچا جندن شاہ کریم بخش کو پھر ایک طرف لے گیا۔

”کچھ خبر بھی ہے کہ لوگ کیسی باتیں بنا رہے ہیں۔ لوگ تو سگے بہن بھائیوں کو نہیں بخشتے تم تو پھر بھی۔۔۔“ چاچا جندن شاہ نے بہت ڈرتے ڈرتے بات کی۔ اس کا خیال تھا کہ کریم بخش گرم لُو کی طرح تپ کر اُس کے گلے پڑ جائے گا مگر وہ بالکل خاموش رہا، صرف اتنا بولا: ”پھر؟“

”پھر تم ہی کہیں شادی کر لو۔ لوگوں کا منہ بند کرنے کی خاطر ہی سہی۔“ رات ہوئی۔ برسی پر آئے رشتے دار واپس چلے گئے۔ روز کی طرح صحن پھر ویران ہو گیا۔ ہَوا بند تھی۔ بیری کی سَاں سَاں بھی رُک گئی تھی۔ آسمان پہ تاروں پر میلے بادلوں نے اپنی چادر بچھا دی تھی۔ دھرتی بہت ٹھنڈی تھی۔ اس دھرتی پر کچھ

دیر کریم بخش ننگے پاؤں کھڑا رہا اور پھر جوتا پہن کر آشاں کے کمرے کی طرف گیا اور آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔

”جی بھائی۔“

”دروازہ کھولو۔ ضروری بات کرنا ہے۔“

کچھ دیر دُوسری طرف سے سانسوں کی آواز آتی رہی اور پھر آشاں نے دروازہ کھول دیا اور ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ کریم بخش آہستگی سے چلتا ہوا اُس کی چارپائی پر جا بیٹھا۔ جس چارپائی پر اماں کے ایک بازو پر کریم بخش اور دُوسرے بازو پر کریم بخش سر رکھ کر سوتے تھے۔

اُس چارپائی کا بستر بھی لاش کی طرح ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

”بیٹھو۔“ کریم بخش نے بمشکل کہا۔ آشاں نیچے زمین پر بچھی صف پر بیٹھ گئی۔ ”میں تو بہت پہلے سے چاہتا تھا کہ تمھیں بیاہ دوں مگر تم تو خاندان کے رسم و رواج جانتی ہو۔ مگر اب میں مجبور ہو گیا ہوں۔۔۔“ آشاں کی آنکھوں میں اُمید کی ایک کرن چمکی۔ ”کہ لوگوں کی بات مان لوں۔۔۔“

آشاں کی آنکھوں کی چمک ہوا ہو گئی۔

”میں خُود ہی شادی کر لوں۔“

دیا بجھ گیا اور آشاں کے مُنہ پر اندھیرا اچھل گیا۔

”مگر میں شادی تمھاری مرضی سے کروں گا۔ جو لڑکی تم پسند کرو گی اور ویسے بھی ماں کے بعد یہ حق بہنوں کا ہوتا ہے۔“

”ماں کے بعد۔۔۔“ آشاں سسکیاں بھرتے بھرتے رونے لگی خبر نہیں کتنے آنسو وہ آنکھوں کے دریا میں سمیٹے کھڑی تھی۔ بند ٹوٹ گیا اور آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ پڑا۔ کریم بخش نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور باہر نکل گیا۔

پھر کچھ مہینے بعد ہی آشاں، صاحبو کو بھابی بنا کر گھر لے آئی۔ صاحبو غیر تھی مگر اپنی ذات برادری کی تھی۔ صحن کی خاموشی ٹُوٹ گئی۔ ڈھول باجوں کا بہت شور مچا۔ دلہن کی پائل کی چھن چھن نے برف کی سلوں پر چنگاریوں کا مینہ برسا دیا۔ مگر یہ چھن چھن، یہ چنگاریاں جیسے کرم بخش پر نہیں آشاں پر برس رہی تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں خوابوں کی بارات چلنے لگی۔

کریم بخش اب بھی سارا دن بچوں کو پڑھانے میں مصروف رہتا۔ شام کو لوٹتا تو صاحبو کی نظروں سے نظریں نہ ملا سکتا۔ رات ہوتی تو آشاں بھائی، بھابی کی خدمت کے لیے صحن میں لگے نل سے پانی بھر

کے غسل خانے میں رکھ دیتی۔ مگر صبح بالٹی ویسی ہی بھری دیکھ کر وہ حیران رہ جاتی۔

صاحبو کی آنکھوں میں کچھ عرصہ تک تو شام کا اندھیرا ابھرا رہا مگر پھر وہاں تارے چمکنے لگے۔ وہ سارا دن آشاں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتی رہتی۔ دیر تک اُس کے بالوں میں تیل لگاتی۔ کنگھی پھیر کر اُس کی چوٹی بناتی۔ اپنے کپڑوں میں سے کچھ کپڑے بھی اُسے سی کر دیے۔

پھر صاحبو کے خاندان سے آشاں کے لیے بھی ایک رشتہ آ گیا۔ مگر صاحبو نے کریم بخش تک بات پہنچنے سے پہلے ہی کہہ دیا: ”یہ تو وٹہ سٹہ بن جائے گا۔ میں یہ کام کبھی نہیں ہونے دوں گی۔“

پھر اُن کی اپنی برادری سے ایک رشتہ آیا۔ مگر اُس پر بھی صاحبو نے نہ کر دی کہ لڑکا اُس کی شہزادیوں جیسی نند جتنا خوبصورت نہیں تھا۔ سال ہونے والا تھا۔ بڑی بوڑھیاں صاحبو کو صحن میں بھاگتے دوڑتے بھاری بھاری اشیاء اُٹھاتے سیڑھیاں چڑھتے دیکھتیں تو انگلیاں دانتوں میں دبا لیتیں اور کوئی اُسے جھڑک بھی دیتی کہ دُلہن، آرام کے ساتھ، دھیان کے ساتھ۔ مگر جھڑکنے پر صاحبو زور سے ہنستی۔ اُس کی ہنسی میں جانے کیا بات ہوتی جو کسی کو سمجھ نہ آتی۔

آج صبح سویرے کریم بخش کی طبیعت خراب تھی۔ ہلکا ہلکا بخار بھی تھا۔ بچوں کو پڑھانے میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ چھٹی سے پہلے ہی وہ گھر چل پڑا۔ وہ گھر پہنچ کر صاحبو سے اپنا سر دبوانا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے کمرے میں نظر دوڑائی تو صاحبو اسے نظر نہ آئی۔ آشاں کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کریم بخش نے کھڑکی کو ذرا سا کھول کر دیکھا۔ آشاں اور صاحبو ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر سو رہی تھیں۔

☆☆☆☆

طاہر شیرازی

سرائیکی سے ترجمہ: خورشید ربانی

جان پہچان

اے اللہ
تیری حقیقت کیا بیان کروں
تجھ کو حق اور سچ ماننے والے
ایک دن اپنی تلاش میں
دکھوں کے دریا کے سفر پر نکلے
اور جب پار اترے
تو وہاں تجھ کو موجود پایا

☆☆☆☆

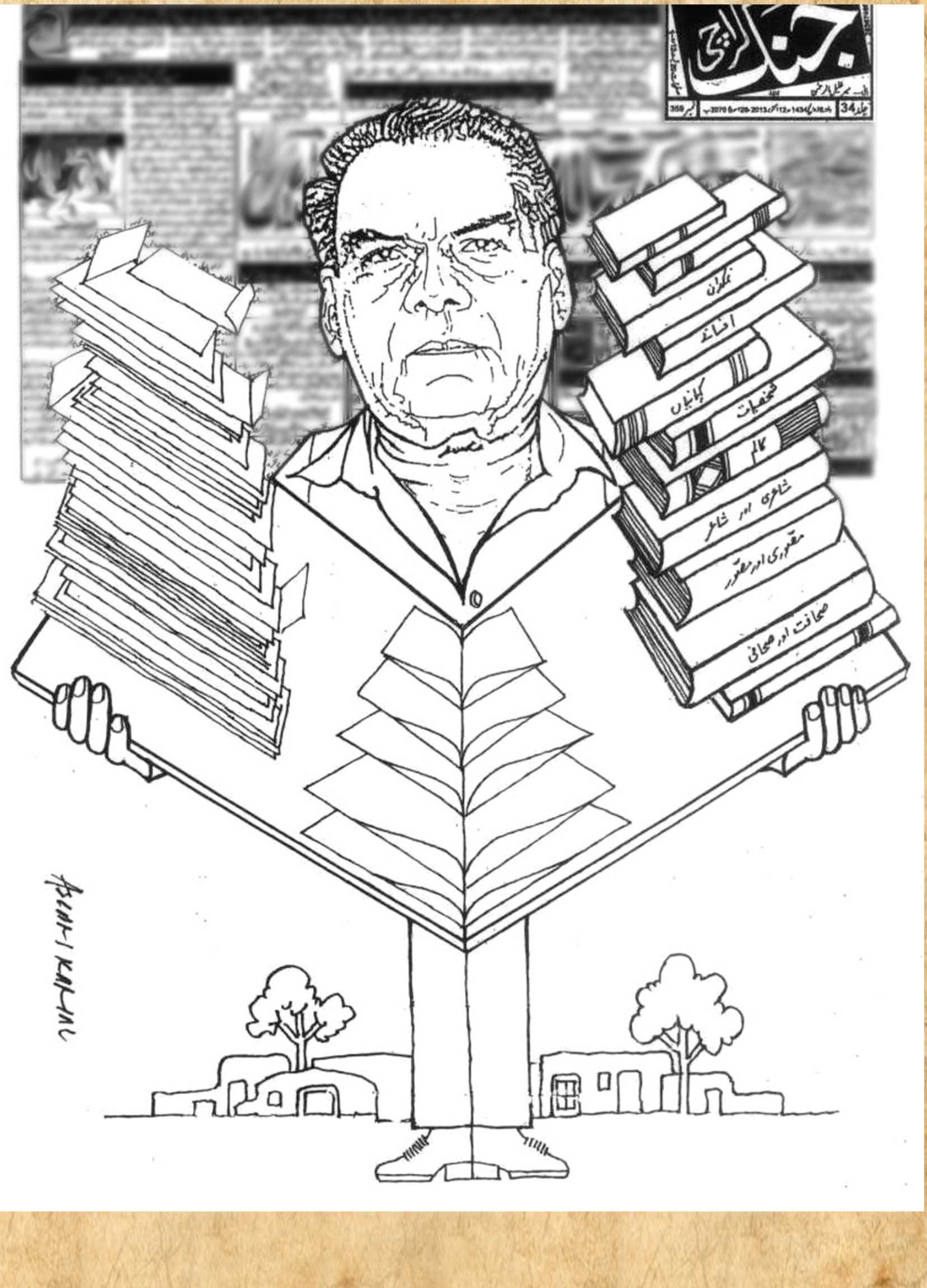

جنگ کراچی
جلد 34
نگران
افسانے
کہانیاں
شخصیات
کالم
شاعری اور شاعر
مصوری اور مصور
صحافت اور صحافی
AZAM KAMAL

Quarterly **Adabiyaat** Islamabad

July to December 2013

Issue No. 100

ادبیات کے خصوصی شمارے

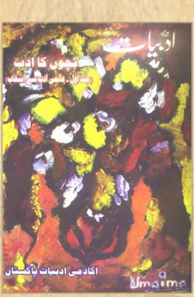
ادبیات
بچوں کا ادب
اکادمی ادبیات پاکستان

ادبیات
جوش ملیح آبادی نمبر
1894 - 1982
اکادمی ادبیات پاکستان

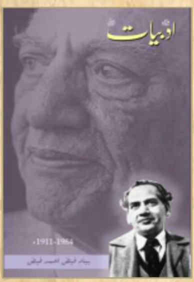
ادبیات
1911-1984

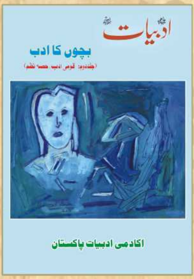
ادبیات
بچوں کا ادب
اکادمی ادبیات پاکستان

ادبیات
پاکستانی زبانوں کے چار اہم شاعر
1914-1983
1923-1987
1923-2002
اکادمی ادبیات پاکستان

ادبیات
1931-2008

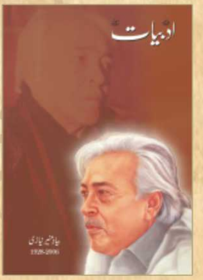

ادبیات
بچوں کا ادب
اکادمی ادبیات پاکستان

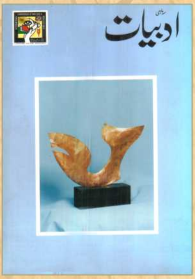

ادبیات
اکادمی ادبیات پاکستان

PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS

Patras Bukhari Road, Sector H-8/1,
Islamabad, Pakistan
Phone: +92-51-9250582,9235729 Fax: +92-51-9250590
Website: www.pal.gov.pk - email: adbiyaat@gmail.com

Price Rs.200